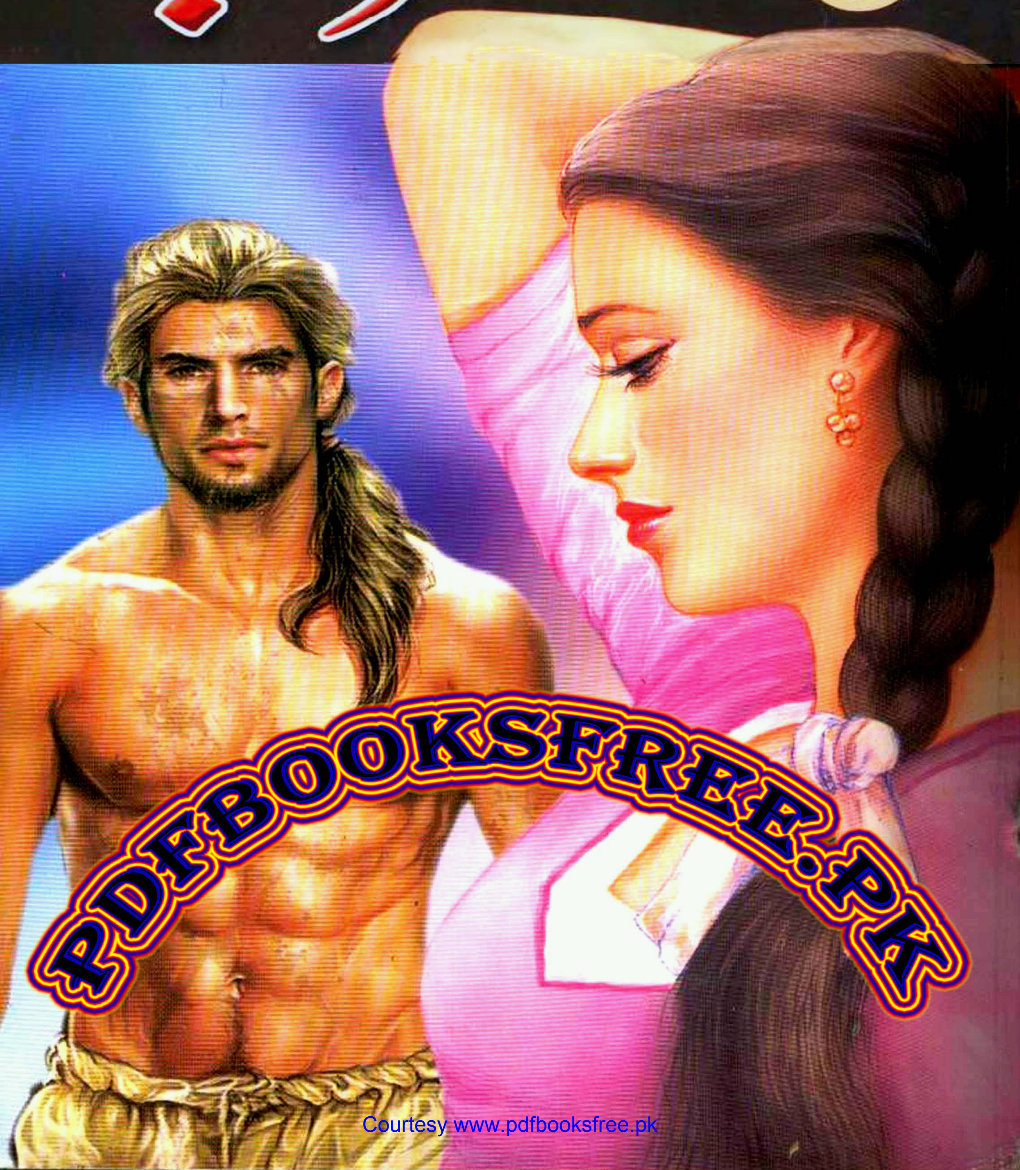
ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی تہلکہ خیز کہانی

سراب

راوی: شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

1



ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی ایک تہلکہ خیز کہانی

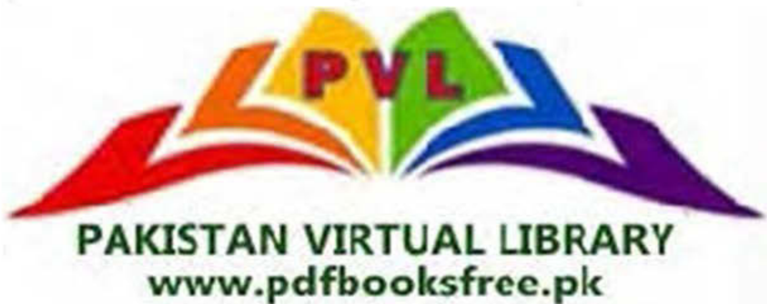
سراب

پہلا حصہ

کاشف زبیر

علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون: 37247414

بار اشاعت ——— اول
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف رحمٰن۔ لاہور
قیمت ——— 200 روپے
بیرون ملک ——— 10 برطانوی پونڈ
15 امریکی ڈالر



ISBN 978-969-517-320-6

Stokist:(U.K)
Azhar Enterprises
315, Dickenson Road
Longsight, Manchester, M13 ONR
Tel: 0044 (0) 161 224 6331

اسٹاکسٹ
علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

میں نے نیچے دیکھا، رسے سے لٹکے سفیر کے چہرے پر ذرا بھی خوف وہراس نہیں تھا۔ سب سے اوپر مونا تھی۔ اس کے بعد رسی کا سرا اس لمبی سی فولادی کیل میں بندھا تھا جو رفتہ رفتہ چٹان سے نکلتی جا رہی تھی۔ چند لمحے پہلے ہم اس بلند اور تقریباً سیدھی چٹان پر کامیابی سے چڑھ رہے تھے، اس قت ترتیب اُلٹ تھی۔ سفیر سب سے اوپر تھا ہم سب میں وہی سب سے تجربہ کار کوہ پیا تھا۔ جدید اصطلاح میں چٹانوں پر چڑھنے کے شوقین افراد کو چٹان یعنی ROCK کی مناسبت سے ROCKERS کہا جاتا ہے۔ میں اس وقت بھی درمیان میں تھا۔ سب سے پیچھے مونا تھی۔ کوئی سات سو فٹ کی بلندی پر سفیر نے چٹان میں کیل گاڑی اور رسا اپنی کمر کے کلپ سے باندھ کر اوپر جانے لگا۔ وہ مناسب وقفے سے کیلیں گاڑ کر ان سے رسے کو باندھ رہا تھا کیونکہ میں اور مونا اتنی اہلیت نہیں رکھتے تھے کہ خالی ہاتھوں سے چٹان سر کر سکتے۔

غلطی مونا سے ہوئی، اسے کیل کے پاس رک کر انتظار کرنا چاہیے تھا کہ سفیر اگلی کیل گاڑ کر اس سے رسا باندھ دے۔ اس نے ایسے ہی اوپر آنے کی کوشش کی۔ میں اس سے دس فٹ اوپر اور قطعی بے خبر تھا ورنہ اسے روکنے یا کم سے کم خود کو روکنے کی کوشش ضرور کرتا۔ جھٹکا اچانک اور شدید تھا۔ میں اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ مونا کا پاؤں سلپ ہوا تھا اور وہ چٹان پر اپنی گرفت نہ رکھ سکی اوپر سفیر بھی نہ سنبھل سکا اور ہمارے برابر سے گزرتا نیچے چلا گیا۔ مجھے نیچے گرتے ہوئے ایسا جھٹکا لگا کہ مجھے خدشہ ہوا، ابھی کیل چٹان سے نکل جائے گی اور ہم نیچے جا گریں گے مگر خیریت رہی کہ کیل اپنی جگہ قائم رہی اور جب تک یہ قائم رہتی، ہماری زندگی کی امید بھی باقی رہتی۔ مونا کے چہرے ہر ہراس نہیں تھا لیکن وہ گھبرائی ہوئی ضرور تھی۔

"شوبی! کیا سب ٹھیک ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ٹھیک کی بچی!...... ہم سب زندگی کے آخری سرے پر ہیں۔ اوپر جا کر کیل کو مضبوط کرو۔" میں نے اسے ڈانٹا تو وہ روہانسی نظر آنے لگی۔

"پلیز........ میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

اچانک رسی کو جھٹکا لگا اور ہم چند انچ نیچے آئے۔ ایک لمحے کو میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ مگر جب مزید کوئی حرکت نہیں ہوئی تو وہ دوبارہ دھڑکنے لگا تھا۔ مونا کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔ رسی مونا سے کوئی دس فٹ اوپر تک تھی، اس کے بعد کیل تھی۔ میں مونا سے کوئی بیس فٹ نیچے تھا اور سفیر اتنے ہی فاصلے پر تھا۔ اچانک سفیر نے

کہا۔ شوبی! میں رسا کاٹ رہا ہوں...... ورنہ ہم سب گر جائیں گے۔"

جب اس کے الفاظ کا مفہوم میری سمجھ میں آیا تھا تو میرے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی تھی میں نے بے ساختہ کہا۔ "سفیر! بکواس نہ کرو...... خبردار ایسی حرکت مت کرنا۔"

"سفیر کیا کر رہے ہو؟" مونا چلائی۔

"دیکھو...... وہ کیل میں نے گاڑی ہے۔" سفیر نے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "مجھے معلوم ہے وہ تین افراد کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی، میں سب سے زیادہ وزنی ہوں۔ میرا وزن کم ہوگا تو تم دونوں کے بچنے کا امکان ہو گا۔"

"سفی......!" مونا چلائی۔ "تم نے ایسی حرکت کی تو میں خود نیچے چھلانگ لگا دوں گی۔"

"بکواس مت کرو۔" سفیر گرجا تھا۔ "یہ جذباتی ہونے کا وقت نہیں ہے۔ اگر میں نے رسی نہ کاٹی تو کیل نکل جائے گی، ہم تینوں مر جائیں گے۔"

"سفیر! مونا ٹھیک کہہ رہی ہے، تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔" میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ میں ایک چٹانی چھجے سے کوئی چھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ مونا بالکل سپاٹ چٹان سے لگی تھی اور سفیر خلا میں جھول رہا تھا۔ اگر میں کسی طرح اس چھجے تک پہنچ جاتا تو بات بن سکتی تھی۔ اسی لمحے ایک جھٹکا اور لگا۔ سفیر چلایا۔

"شوبی......! مونا، مجھے رسا کاٹنے دو۔"

"تم ایسی کوئی حماقت نہیں کرو گے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "مجھے اس چھجے تک پہنچنے کی کوشش کرنے دو، اپنے حواس بحال رکھو۔"

رسا جس کلپ سے منسلک تھا، اسے میں نے اپنی بیلٹ سے الگ کیا۔ چھجا مجھ سے کوئی تین فٹ نیچے تھا اگر میں اس کی طرف چھلانگ لگاتا تو اس کے کنارے تک پہنچنے کا امکان کم تھا۔ مجھے رسے پر مزید اوپر جانا تھا اور اس میں خطرہ تھا کہ رسے پر دباؤ بڑھنے سے کیل نکل سکتی تھی۔ چھ سو فٹ کی بلندی سے گر کر بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ "شوبی! کیا کر رہے ہو؟" مونا مجھے اوپر کی طرف سرکتے دیکھ کر بولی۔

سفیر اور مونا دم سادھے مجھے رفتہ رفتہ اوپر جاتے دیکھ رہے تھے۔ اب میں چھجے سے کوئی پانچ فٹ اوپر تھا مگر یہ بلندی بھی ناکافی تھی، مجھے اور اوپر جانا تھا۔ مغرب کی طرف جاتے سورج کی تیز کرنیں براہِ راست ہم پر پڑ رہی تھیں اور مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے ذرا اوپر رک کر پانی پیا۔ اس کے بعد دوبارہ سرکنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ رسے کو جھٹکا نہ لگے۔ ہم نہایت نازک پوزیشن میں تھے، میرا اندازہ تھا کہ کوئی دس فٹ کی اونچائی سے میں چھلانگ لگا کر چھجے تک پہنچنے کی پوزیشن میں ہوتا اور اس سے رسی کو بھی جھٹکا نہ لگتا۔ اس دوران میں مونا بار بار سفیر کو رسی کاٹنے سے باز رکھنے کی تلقین کر رہی تھی حتیٰ کہ وہ جھنجلا گیا اور دانت پیس کر بولا۔

"کاش کہ میں اوپر ہوتا اور تم نیچے تو رسی ضرور کاٹتا۔"

میں مسکرا دیا۔ اس حالت میں بھی وہ نوک جھوک سے باز نہیں آ رہے تھے۔ اب میں چھجے سے کوئی آٹھ فٹ اوپر تھا اور رسے کے جھکاؤ کی وجہ سے چٹان سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ نو فٹ بلند ہونے پر رسی کو ایک بار پھر جھٹکا لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب میں نے رسی نہ چھوڑی اور اس پر بوجھ کم نہ ہوا تو کیل نکل جائے گی۔ ہم سب

نیچے گر جائیں گے۔ میں نے جسم کو جھولا دیا اور رسی چھوڑ دی۔ میرا جسم چٹان کی طرف جانے کی نسبت نیچے کی طرف زیادہ تیزی سے گیا تھا۔ چھجا مجھے اپنی پہنچ سے دور نظر آیا تھا لیکن میں نے آخری کوشش کی۔ ہاتھ پاؤں مارے اور کسی پرندے کی طرح اُڑ کر چھجے تک پہنچنے کی کوشش کی مگر میں آج تک نہیں جان سکا کہ میں چھجے تک کس طرح پہنچا۔ اس کی کوئی منطقی وجہ نہیں ہے کیونکہ میں ایک بار خلا میں آنے کے بعد کشش ثقل کے خلاف اپنی مرضی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ جب میرے حواس بحال ہوئے تو میرے ہاتھ چھجے پر جمے تھے اور جسم نیچے لٹک رہا تھا اور میرے کانوں میں مونا کی چیخ گونج رہی تھی۔ میں نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا اور انہیں بدستور لٹکے پا کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ ورنہ مونا جس طرح چیخی تھی، ایسا لگا کہ کیل چٹان سے نکل گئی ہو اور وہ دونوں نیچے گر گئے ہوں۔ بعد میں مونا نے بتایا کہ مجھے گرتے دیکھ کر اس نے چیخ ماری اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ سفیر نے بھی سر کھجاتے ہوئے کہا تھا۔ ''یار! میں نہیں سمجھ سکا کہ تم چھجے تک کیسے پہنچے۔ میں تو سو فی صد یہی سمجھ رہا تھا، تم نیچے گر رہے ہو۔''

''محسوس تو مجھے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''بس اللہ کو بچانا تھا اس لئے میرے ہاتھ چھجے تک پہنچ گئے۔''

میں نے پاؤں جمائے اور چھجے پر چڑھ گیا۔ اپنے بیگ سے ہتھوڑی اور کوئی دو فٹ لمبی کیل نکالی۔ اس کے سرے پر رسی باندھی اور اسے گاڑنے کے لئے کوئی موزوں جگہ تلاش کرنے لگا۔ اچانک مونا نے ایک عدد چیخ اور ماری۔ رسی کو جھٹکا لگا تھا۔ ''شوبی! جلدی، رسی نکلنے والی ہے۔''

''ہلو مت!'' میں نے اسے پیر چلاتے دیکھ کر کہا۔

چھجے کے کونے میں ایک جگہ مجھے چٹان ہلکی سی چٹخی ہوئی محسوس ہوئی، میں نے وہاں کیل رکھ کر اس کو ٹھونکنا شروع کیا۔ میرے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ وقت پھسل رہا تھا، جیسے ہی کیل نصف چٹان میں گئی، میں نے اس کے سرے پر بندھی رسی کا گچھا سفیر کی طرف اچھال دیا۔ یہ رسی کوئی تین سو فٹ طویل تھی۔ سفیر کے پاس اتنی ہی طویل رسی تھی۔ اس کی مدد سے وہ بہ آسانی نیچے جا سکتا تھا۔ سفیر نے خود کو فوری طور پر اس رسی سے منسلک کر لیا تھا۔ دوسری رسی سے مونا منسلک تھی۔ اب ان کے گرنے کا امکان نہیں تھا۔ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر میں کیل کو مزید چٹان میں گاڑنے لگا اور جیسے ہی میں نے کیل کو مکمل طور پر چٹان کے قلب میں اتارا، اوپر والی کیل نکل گئی۔ مونا نے ایک چیخ اور ماری تھی۔ وہ تیزی سے نیچے گئی تھی۔ راستے میں سفیر سے ٹکرائی اور کوئی چالیس فٹ نیچے جا کر جھٹکے سے رک گئی تھی۔ میں نے احتیاطاً رسی مضبوطی سے تھام لی لیکن کیل نے ان دونوں کا بوجھ بہ آسانی برداشت کر لیا تھا۔ خود کو لٹکے پا کر مونا نے مسرت بھری چیخ ماری۔ تمام خواتین کی طرح اسے موقع بے موقع چیخ مارنے کا شوق تھا۔

''خدا کے لئے چیخنا بند کرو...... ورنہ یہ چٹانیں نہ گر جائیں۔'' سفیر نے ہنس کر کہا۔

''اب تم نیچے اترنا شروع کرو۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔ ''اس سے پہلے کہ یہ کیل بھی نکلنا شروع ہو جائے۔''

سفیر نے اپنی رسی میری طرف پھینکی ہوئی رسی سے باندھی اور نیچے اترنا شروع کر دیا۔ راستے میں اس نے

مونا کو بھی اس رسی سے منسلک کیا۔ جب وہ دونوں نیچے پہنچ گئے تو میں نے ہتھوڑی کی مدد سے کیل نکال کر اپنی اپنی رسی اس سے الگ کر دی۔ رسی سمیٹ کر واپس کمر سے لٹکائی۔ نیچے سفیر اور مونا میری اس حرکت پر پیچ و تاب کھا رہے ہوں گے لیکن موت کے منہ سے نکل آنے کے بعد مجھے ایڈونچر سوجھ رہا تھا۔ میں نے چھجے کے دائیں طرف سے چٹان کے کھردرے حصے پر قدم رکھا اور باہر نکلے ہوئے حصوں پر پیر جماتے ہوئے نیچے اترنے لگا تھا۔ بعض مقامات پر دشواری پیش آئی لیکن نصف گھنٹے بعد میں نیچے آ چکا تھا۔ چٹانوں یا پہاڑوں پر اترنے کی نسبت چڑھنا آسان ہوتا ہے۔

''آپ شرافت سے رسی سے نیچے نہیں آ سکتے تھے؟'' مونا غصے میں تھی۔

''بے شک......لیکن اس صورت میں آپ نصف گھنٹے تک آزادی سے گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔''

سفیر نے دانت نکالے۔ ''بجا ارشاد فرمایا پیر و مرشد! آپ اب بھی جلدی آئے، خیر......''

مونا کے گھورنے پر سفیر کی زبان کو بریک لگ گیا۔ ''اب چلیں......اوپر تو جا نہیں سکے۔'' مونا بولی۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا، یہ جگہ مشکل ہے۔ میں اکیلا ہوتا تو اب تک اوپر پہنچ بھی چکا ہوتا۔''

''ہاں، تم تیس مار خان ہو......'' مونا نے چڑ کر سفیر کی طرف دیکھا۔

''فی الحال تو ایک مار خان ہوں۔'' سفیر معنی خیز انداز میں بولا تو مونا کھسیا گئی۔ اس نے جلدی سے بات بدل دی۔

''بس اب چلو......ورنہ رات ہو جائے گی پہنچتے پہنچتے۔''

''تمہارے کون سے اماں ابا انتظار کر رہے ہوں گے؟'' سفیر نے سرسبز ڈھلان پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''اماں ابا نہیں ہیں لیکن میری ایک عدد پیاری سی بلی ہے، جسے میرا انتظار ہوگا۔''

''مجھے بھی پہلے دفتر جانا ہوگا۔'' میں نے مونا کی تائید کی۔ ''آج تم لوگ زبردستی لے آئے تھے۔''

''اگر پنچوں کا فیصلہ یہی ہے تو سر آنکھوں پر۔'' سفیر اٹھ گیا تھا۔

مری سے نتھیا گلی کی طرف جاتے ہوئے یہ تقریباً سیدھی پہاڑ نما چٹان راستے میں آتی تھی۔ اس کے ایک طرف ڈھلان تھی جس پر اونچے درخت لگے تھے لیکن دوسری جانب سپاٹ چٹانی سینہ تھا۔ راکر اور ہائکرز کے لئے خاصی آئیڈیل قسم کی جگہ تھی۔ سفیر نے اسے چند ہفتے پہلے دیکھا اور اس دن سے بضد تھا کہ ہمیں اس چٹان کو سر کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔ ایک روز پہلے وہ مونا کے ساتھ میرے دفتر میں وارد ہوا اور میرے احتجاج کی پروا کئے بغیر مجھے زبردستی ساتھ لے گیا۔ ان دنوں کام اتنا تھا کہ مجھے محاورتاً نہیں حقیقتاً سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ میں جانے کے لئے تیار نہیں تھا لیکن ان دونوں نے خود طے کر لیا۔ طے تو اصل میں سفیر نے کیا تھا۔ مونا اس کی ربڑ اسٹیمپ تھی۔ اگر سفیر کہتا کہ ہم نے کے ٹو سر کرنی ہے تو وہ اس کے لئے بھی راضی ہو جاتی۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ سفیر سے محبت کرتی تھی بلکہ محبت کیا، وہ اس کے عشق میں اتنا ڈوب چکی تھی کہ اس کے لئے جان بھی دے سکتی تھی۔ دونوں کا ساتھ بھی خاصا پرانا تھا۔ چھ سال پہلے یونیورسٹی میں ملے تھے۔ دونوں نے جیالوجی ڈیپارٹمنٹ کا انتخاب خود کیا تھا یا تقدیر انہیں اس طرح ملانا چاہتی تھی، بدقسمتی سے دونوں کی ابتدائی چند

ملاقاتیں بڑے گرما گرم ماحول میں ہوئی تھیں اور بقول مونا کے بس ہاتھا پائی کی نوبت آتے آتے رہ گئی تھی۔ اس کے بعد چھ سال گزر گئے تھے۔ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر وہ ملازمت کر رہے تھے۔ سفیر معدنیات کے محکمے میں کام کرتا تھا اور مونا ایک نجی فرم میں تھی جو معدنیات کو پروسیس کیا کرتی تھی۔ اس عرصے میں ان کی اَنا نے انہیں وہ چند لفظ کہنے سے روکے رکھا تھا جس کے بعد تمام پردے اٹھ جایا کرتے ہیں۔ دونوں جانتے تھے کہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں مگر یہ بات زبان سے نہیں کہتے تھے، لڑتے تھے، جھگڑتے تھے، روٹھتے اور مناتے تھے، بس ایک دوسرے کے نہیں ہو چکتے تھے۔ سفیر کو سرکاری گھر ملا تھا گاڑی اس نے خود رکھی تھی، چاہتا تو گھر بھی خود لے لیتا۔ جہلم کے ایک زمیندار خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ مونا نے اسلام آباد میں ایک چھوٹا سا فلیٹ لے رکھا تھا اور اکیلی رہتی تھی۔ ایک بھائی تھا جو امریکا جا کر اسے بھول گیا تھا۔ ماں، باپ چند سال پہلے گزر گئے تھے۔ دور پرے کے چند رشتے دار تھے جنہیں وہ خود منہ نہیں لگاتی تھی۔ لے دے کے بس میں اور سفیر تھے جن سے وہ ملتی تھی۔

مجھ سے ان کی ملاقات بھی گرما گرم ماحول میں ہوئی تھی، انہوں نے شمالی علاقے کے ٹور کا پروگرام بنایا اور میرے دفتر پہنچ گئے۔ ان کے مطالبات سن کر میرا منیجر طاہر بھاگا ہوا آیا۔ ''سر! ایک مسئلہ ہے بلکہ دو مسئلے ہیں۔''

''کیا مسئلے ہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''باری باری بیان کرو۔''

''سر! ایک لڑکا اور ایک لڑکی آئے ہیں، دونوں کا کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن وہ بضد ہیں کہ انہیں ایک ہی فلائٹ پر اسکردو کے لئے سیٹیں اور وہاں کے -ٹو ہوٹل میں کمرے درکار ہیں۔''

''ڈبل بیڈ روم!'' میں نے غور کیا۔

''جناب، دو سنگل روم میں کہاں سے لاؤں۔'' منیجر طاہر فریادی لہجے میں بولا۔ ''اس وقت اسکردو میں درختوں کی شاخیں تک بُک ہو جاتی ہیں اور یہ کے-ٹو ہوٹل میں دو سنگل کمرے مانگ رہے ہیں۔''

میں نے کیلنڈر کی طرف دیکھا۔ دو جولائی کے دن یہ فرمائشیں واقعی بے حد مشکل بلکہ جوئے شیر لانے کی حد تک ناممکن تھیں۔ ''ایسا کرو، ان سے کہو...... اگلے سیزن تک آئیں، ان کی فرمائشیں پوری ہو جائیں گی۔''

''بہتر ہوگا، یہ بات آپ ان سے خود کہہ دیں۔'' طاہر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مرد تو معقول ہے لیکن اس کے ساتھ جو خاتون ہیں، اللہ معاف کرے......'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''وہ فساد پر آمادہ ہے جناب!''

میں ایک بکھرے ہوئے ٹور پیکیج کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ جو خاندان سیاحت پر آمادہ تھا، ان میں سے ہر ایک مختلف الخیال تھا۔ مثلاً ساس صاحبہ پہلے کاغان جانا چاہتی تھیں کہ اس دنیا سے جانے سے پہلے جھیل سیف الملوک دیکھ لیں حالانکہ ان کی پیرانہ سالی کے باعث مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ اس سفر کے دوران میں ہی سفرِ آخرت نہ اختیار کر لیں۔ بہو اور بیٹے کا ارادہ پہلے مری جا کر شاپنگ کرنے کا تھا، وہ مری کی خاص ہینڈی کرافٹس لینا چاہتے تھے جو راولپنڈی سے بن کر جاتی تھی جبکہ سسر صاحب ہنزہ جا کر ٹراؤٹ مچھلی کا شکار کرنا چاہتے تھے۔ ذریعہ سفر کے بارے میں بھی ان کے خیالات آپس میں متضاد تھے اور میں اس الجھے معمے کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ ایک نیا مسئلہ طاہر نے لا کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔

باہر لاؤنج میں ایک خوش رُو نوجوان ٹورسٹ میگزین دیکھ رہا تھا۔ کسی قدر چھریرا جسم اور سرخ و سفید چہرے پر ہلکی سی داڑھی بھلی لگ رہی تھی۔ براؤن بال اور اسی رنگ کی آنکھیں۔ اس کے پاس اس سے کسی قدر ملتی جلتی لڑکی چاروں طرف دیکھتے ہوئے ہر چیز کے بارے میں تبصرہ کر رہی تھی۔

''کس قدر چبھتے ہوئے کلر ہیں یہاں اور یہ کولر شاید پانی کے بغیر چل رہا ہے، اس سے گرم ہوا آ رہی ہے۔ سفی! کیا ضروری تھا، ہم اس ٹورنگ ایجنسی میں آتے۔ اس کو دیکھا تھا، ہماری بات سنتے ہی کیسے غائب ہوا تھا۔''

''بھئی وہ معلوم کرنے گیا ہے۔'' سفیر نے مونا کو سمجھانے کی کوشش کی، اس وقت مجھے ان کے نام نہیں معلوم تھے۔

''وہ غائب ہے۔'' لڑکی نے چٹکی بجائی۔ ''تم لکھ کر رکھ لو۔ ہمیں یہاں سے مایوس جانا پڑے گا۔''

''خاتون! آپ نے فرمائش ہی ایسی کی ہے۔'' میں نے ملائمت سے کہا۔

''آپ کون ہیں مسٹر اور بلاوجہ ہماری گفتگو میں کیوں انٹر ہو رہے ہیں؟'' اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''اتفاق سے میں اس ایجنسی کا مالک ہوں، جس کے بارے میں آپ مایوسی کا اظہار کر رہی ہیں۔''

وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی پھر چمک کر بولی۔ 'تو کیا غلط کر رہی ہوں، ابھی تک آپ لوگوں نے کیا، کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''کیونکہ آپ کی فرمائش آسمان سے تارے توڑ کر لانے سے کم نہیں ہے، طیارے کی نشستوں اور ہوٹل میں کمروں کی بکنگ مہینوں پہلے ہو جاتی ہے۔ نہ تو کوئی سیٹ خالی ہے اور نہ کوئی کمرہ۔''

''یہ بات آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' اس کا انداز مزید جارحانہ ہو گیا۔

''اس لئے خاتون کہ......''

''پلیز...... میں لڑکی ہوں، اَن میریڈ...... لہٰذا آپ مجھے خاتون نہ کہیں۔'' اس نے ٹوکا۔

میں نے خود پر جبر کیا اور دانتوں کی نمائش کی۔ ''مس، میں اس وجہ سے اتنا پُر یقین ہوں کہ میرا کام یہی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں، اسکردو جانے والے کسی طیارے کی سترہ اگست سے پہلے کوئی نشست نہیں ہے، ستمبر سے پہلے کوئی کمرہ خالی نہیں ملے گا۔''

''تب آپ کا کیا کام ہے؟ کوئی بندہ یہاں آتا ہی اس مقصد کے لئے......''

''درست ہے مگر خا...... میرا مطلب ہے مس!''

''مونا رحیم!'' اس نے بتایا۔

''اوکے مس مونا...... میں نہ تو ایئر لائن کا مالک ہوں اور نہ ہی اسکردو میں کوئی ہوٹل ہے۔ ہاں، میں بائی روڈ سفر کا بندوبست کر سکتا ہوں بلکہ ایک آفر ہے، پرسوں میں خود بائی روڈ اسکردو جا رہا ہوں۔ مجھے وہاں کے دفتر کے معاملات دیکھنا ہیں۔ وہاں آپ کو کہیں نہ کہیں سیٹ کرا دوں گا۔''

''ہم نے بائی ایئر ہی جانا ہے اور کے ٹو ہوٹل میں ٹھہرنا ہے۔'' مونا نے حتمی لہجے میں کہا۔

میں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ ''مسٹر! آپ کا تعارف؟''

''سفیر شایان!'' اس نے کہا۔

''مسٹر سفیر! ان خاتون کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''

''بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس نے کہیں سے مستنصر حسین تارڑ کا سفرنامہ پڑھ لیا ہے تب سے مونا پر دُھن سوار ہے کہ اس نے پی آئی اے کے فوکر سے اسکردو جانا ہے اور وہاں کے۔ٹو ہوٹل میں ٹھہرنا ہے۔''

''خیر، یہ اتنی بری خواہش نہیں ہے۔''

''اصل خواہش کے بارے میں آپ نہیں جانتے۔'' سفیر شایان کراہا تھا۔ ''یہ دیوسائی پر ٹریکنگ کے لئے جانا چاہتی ہے۔''

''یہ بھی بری خواہش نہیں ہے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''ان دنوں ایک ٹیم جا رہی ہے، میں آپ دونوں کو اس میں فٹ کرا سکتا ہوں۔''

''میں تیار ہوں۔'' سفیر سے پہلے مونا بولی۔

''لیکن اس کے لئے آپ کو دو دن بعد اسکردو میں ہونا چاہئے۔'' میں نے آگاہ کیا۔ ''کیونکہ دو دن بعد ٹیم روانہ ہو رہی ہے۔ چار جرمن ہیں، دو اٹالین اور تین جاپانی۔ کوئی انگریزی بھی نہیں جانتا۔ آپ سکون سے سفر کریں گے۔''

''بدقسمتی سے مجھے جرمن اور اٹالین آتی ہے۔'' سفیر بولا۔

''آپ کو یہ بات انہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس وجہ سے جا رہا ہوں کہ انہیں بعض ضروری اشیاء پہنچانی ہیں جو اسکردو میں دستیاب نہیں ہیں۔''

''ہم چلیں گے۔'' مونا بے تابی سے بولی۔

''طیارے کی نشست۔'' سفیر نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''بھاڑ میں گئی۔''

''اور کے۔ٹو ہوٹل قیام......''

''دو دن بعد ہم نے دیوسائی جانا ہے۔'' مونا بولی۔ ''لہٰذا رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''کل صبح چھ بجے میں نکلوں گا۔'' میں نے انہیں آگاہ کیا۔

''آپ پتا بتائیں ہم آجائیں گے۔'' سفیر بولا۔

''آپ دونوں کہاں رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا اور ان کی رہائش کا سن کر تجویز پیش کی۔ ''اس صورت میں بہتر ہے، آپ صبح چھ بجے تک یہیں آجائیں۔ ہم اس جگہ سے روانہ ہوں گے کیونکہ مجھے سامان یہیں سے لے کر جانا ہے۔''

''معاف کیجئے گا، آپ کے پاس کنوینس کیا ہے؟'' مونا بولی۔

''ایک بڑی سی جیپ ہے، اس قسم کے سفر میں جیپ ہی سب سے بہتر رہتی ہے۔''

''ہمارا سامان اس میں آجائے گا؟'' سفیر نے پوچھا۔ ''دیوسائی کے سفر کے لئے ہم نے بھی خاصا سامان

جمع کر لیا ہے۔''

''اگرچہ اس کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن سامان لے لیا ہے تو ٹھیک ہے، جیپ میں آپ جہیز بھی لے جا سکتے ہیں۔ آپ جاتے ہوئے دیکھ لیجئے گا۔ سبز رنگ کی کیبن والی جیپ ہے۔''

گرما گرم ماحول میں ہونے والی گفتگو نہایت خوشگوار طریقے سے انجام کو پہنچی اور وہ دونوں خوش خوش رخصت ہوئے تھے۔ میرا دفتر راجا بازار کے قریب ایک چھوٹے سے بنگلے کے بیرونی حصے میں تھا۔ اس علاقے میں بے شمار ہوٹل اور گیسٹ ہاؤسز تھے۔ سیاح جو شمالی علاقے کی طرف جاتے تھے، وہ ان ہی ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں ٹھہرا کرتے تھے، ان سیاحوں سے میرا بزنس چلتا تھا۔ خاص طور سے شمالی علاقے سے ناواقف غیر ملکی سیاحوں سے مجھے اچھا بزنس ملا کرتا تھا۔ ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں میرے ایجنٹس تھے جنہیں میں کمیشن دیا کرتا تھا اور وہ میرے لئے کسٹمرز گھیر کر لاتے تھے۔ تین سال پہلے میں نے ایک معمولی سی دُکان میں اس کام کا آغاز کیا تھا، اب اس مقام پر تھا کہ اسکردو کے علاوہ گلگت میں بھی اپنی برانچز کھولی تھیں۔

میری رہائش آفس سے ذرا فاصلے پر ایک کئی منزلہ عمارت کے دوسرے فلور کے تین کمروں کے فلیٹ میں تھی مگر گرمیوں میں مجھے گھر جانے کا موقع کم ملتا تھا۔ اکثر دفتر میں ہی سو جاتا تھا۔ اس رات بھی میں دفتر میں سو گیا۔ صبح پانچ بجے مجھے چوکیدار نے اٹھایا۔ میں نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔ ایک کپ کافی پی کر میں باہر آیا تو چوکیدار نے سامان جیپ میں رکھ دیا تھا۔ میں نے اس کا معائنہ کیا اور اندر جا رہا تھا کہ ایک گاڑی آ کر گیٹ پر رکی۔ چوکیدار نے مجھے سفیر کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ اور مونا اندر آئے۔

''دیکھا، ہم وقت پر آ گئے۔'' مونا چہکی۔

''ایک مسئلہ ہے، میں اپنی کار کا کیا کروں؟'' سفیر بولا۔ ''کیا اسے ساتھ لے جاؤں؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''ورنہ ہم وقت پر اسکردو نہیں پہنچ سکیں گے، اوّل تو کار جیپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے، دوسرے آپ رستوں سے بھی ناواقف ہیں، پیچھے رہ گئے تو بچھڑ جائیں گے۔''

''میں اسے کہاں چھوڑوں، اب گھر واپس جاؤں گا۔'' سفیر پریشان ہو گیا تھا۔

''اس کا بھی وقت نہیں رہا ہے۔'' میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''ہم دس منٹ بعد روانہ ہوں گے۔ ایک کام ہو سکتا ہے، کار یہیں چھوڑ جاؤ، واپسی میں مل جائے گی۔''

''یہ ہوئی ناں بات!'' سفیر خوش ہو گیا۔ ''آپ تو ہمارے حق میں فرشتہ ثابت ہوئے مسٹر!''

''شہباز احمد ملک۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تعارف نہیں ہوا تھا کل۔''

''چلیں اب سہی۔'' مونا بولی۔ ''کیا ہم اپنا سامان رکھ لیں۔''

''جو بھیگنے کے خطرے سے محفوظ ہے وہ چھت پر اور جو بھیگ سکتا ہے وہ نیچے۔'' میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ مجھے طاہر کے لئے کچھ ہدایات چھوڑنی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں باہر آیا تو وہ دونوں سامان کا ایک انبار جیپ میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ان کی طرف لپکا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''سامان رکھ رہے ہیں۔'' مونا نے ایک بیگ اس سامان کے اندر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، جو میں لے جا رہا تھا اور اس میں بعض نازک چیزیں بھی تھیں۔ میں نے اس سے بیگ چھین لیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟......اس میں کیا ہے؟''

''میرے جوتے۔'' اس نے ایک دوسرا سوٹ کیس اٹھالیا جو بیگ سے بھی بڑا تھا۔

حیران ہونے کا وقت نہیں تھا۔ ''یہ نہیں جا سکتا۔'' میں نے اس سے سوٹ کیس بھی لے لیا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

''میرے کپڑے۔'' مونا اطمینان سے بولی۔

سفیر ایک بڑا سا کارٹن کھینچتا لا رہا تھا۔ وہاں ایسا ہی ایک کارٹن، دو عدد سوٹ کیسز اور تین چار بیگز پہلے سے جمع تھے۔ ''ان کارٹنز میں کیا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ہمارے خیمے اور سلیپنگ بیگز۔'' سفیر ہانپتے ہوئے بولا۔

''اور ان بیگز میں؟''

''راشن، ہائیکنگ کا سامان اور دوسری ضروری اشیاء۔''

''یہ سب وہاں مل جاتا ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور اتنے جوتے اور کپڑے لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''میرے پاس صرف پانچ جوڑے ہیں۔'' سفیر بولا۔ ''باقی سب سامان اس کا ہے۔''

''مس مونا! میں تمہیں صرف دس منٹ دیتا ہوں۔ اپنے لئے سات آٹھ جوڑے اور ایک جوڑا جاگرز کا لے لو۔ ورنہ میں روانہ ہو جاؤں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''لیکن......'' مونا نے احتجاج کرنا چاہا لیکن میرے تاثرات دیکھ کر سفیر اور وہ سوٹ کیسز اور بیگز کی طرف لپکے، انہوں نے جوگرز اور کپڑے نکال لئے، باقی سامان میں نے دفتر میں اپنے آرام کے کمرے میں رکھ دیا۔

''تمہیں ایسے ہی ملے گا، اَن پَچ۔'' میں نے انہیں تسلی دی لیکن راستے بھر مونا کا منہ بنا رہا تھا۔ باقی سامان کسی نہ کسی طرح جیپ کے اندر اور اوپر بار کر دیا تھا۔ بمشکل ایک گھنٹے کی تاخیر سے ہم سات بجے روانہ ہو سکے تھے۔ یہ سفر کم سے کم چودہ گھنٹے کا تھا اور آخری دو تین گھنٹے کا سفر کم روشنی یا تاریکی میں ہوتا۔ راستے میں ہمیں دو بار رکنا تھا۔ پہلے لنچ کے لئے اور پھر شام کی چائے کے لئے۔ راستے میں سب مل جاتا تھا اس لئے میں سوائے پانی یا کافی کے تھرماس کے کچھ لے جانے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ بارہ بجے کے قریب جب میں بھوک سے قریب المرگ تھا، تب میں نے ایک ریستوران کے سامنے جیپ روکی۔

''یہاں کیوں رکے ہیں؟'' مونا نے عقبی نشست سے پوچھا۔

''کیونکہ بندہ کھانے پینے پر چلتا ہے، صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔''

''تو اس کے لئے اس سڑے سے ریستوران میں جانا ضروری ہے۔ میں آلو بھرے پراٹھے بنا کر لائی تھی، اب بھی گرم ہوں گے۔ ساتھ میں شامی کباب بھی ہیں۔''

''جیو مس مونا!'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''ذرا آگے ایک آبشار ہے، اس کے کنارے لنچ کرنے کا مزہ آئے گا۔'' میں نے جیپ دوبارہ اسٹارٹ کی۔

''لیکن چائے تو لے لیں۔'' سفیر بولا۔ ''میرا چائے کے بغیر گزارہ نہیں ہے۔''

''اگر آپ خاکسار پر اعتماد کریں تو میں مس مونا کے ساتھ آبشار تک جاتا ہوں۔ آپ اتنی دیر میں چائے بنوا کر لے آئیں۔'' میں نے کہا تو سفیر ہچکچایا مگر مونا جلدی سے بولی۔

''تم ہو کر آؤ۔ شہباز صاحب شریف آدمی لگتے ہیں، مجھے لے کر نہیں بھاگیں گے۔''

بادلِ ناخواستہ سفیر تھرماس لے کر ریستوران کی طرف چلا گیا۔ میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ ''اعتماد کا شکریہ۔''

''اعتماد مجھے خود پر ہے۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔ ''تبھی اکیلے رہ رہی ہوں۔''

''ماں، باپ نہیں ہیں؟''

''گزر چکے ہیں۔ ایک بھائی ہے جو خود امریکا میں ہے۔ سال چھ مہینے میں اسے ایک بار بہن کی یاد آتی ہے۔''

''اوہ...... آئی ایم سوری!'' میں نے تعزیت کی اور جیپ سڑک سے ذرا فاصلے پر موجود آبشار کی طرف موڑ دی۔ آبشار کا پانی ذرا آگے سڑک سے گزر رہا تھا۔ جیپ روک کر ایک تھیلے سے مونا نے بڑا سا ہاٹ پاٹ نکالا۔ میرا بھوک سے اتنا برا حال ہو رہا تھا کہ میں نے سفیر کے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ مونا نے کہہ دیا، وہ سفیر کے ساتھ کھائے گی۔ اس نے چست ٹراؤزر پر فل آستین کی جرسی پہن رکھی تھی۔ وہ بلاشبہ دلکش لڑکی تھی اور مجھے حیرت تھی، سفیر نے اب تک اسے پروپوز نہیں کیا تھا۔ سفیر نصف گھنٹے بعد چائے لے کر آیا تو میں ہاٹ پاٹ کے بیشتر حصے کا صفایا کر چکا تھا۔ آبشار کا منرل واٹر پی کر میں نے ایک آسودگی بھری ڈکار لی تھی۔

''اب ہم کیا کھائیں گے؟'' مونا نے ہاٹ پاٹ دیکھا تھا۔

''سوری، مجھے بھوک میں خیال نہیں رہا...... لیکن کوئی بات نہیں ہے۔ شام تک ہم ایک جگہ پہنچیں گے جہاں ٹراؤٹ مچھلی ملتی ہے۔ میں تمہیں مچھلی کھلاؤں گا۔''

ٹراؤٹ کے وعدے پر انہوں صبر شکر سے باقی ماندہ کھانا کھایا۔ ہم نے چائے پی اور آگے روانہ ہو گئے۔ آگے راستہ خراب اور پُر پیچ تھا۔ ایسے میں بے حد محتاط رہ کر ڈرائیونگ ضروری تھی۔ اس راستے پر آئے دن حادثے ہوتے تھے۔ شام چھ بجے ہم اسکردو سے ابھی تین گھنٹے کی مسافت پر تھے۔ فوکر جیسا سُست رفتار طیارہ یہ فاصلہ محض پینتیس منٹ میں طے کر لیتا ہے جبکہ سڑک سے یہ فاصلہ پندرہ سے اٹھارہ گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ وہ بھی سڑک درست اور موسم صاف ہو تو۔ اس روز خوش قسمتی سے سڑک پر کہیں لینڈ سلائڈنگ نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی موسم خراب تھا۔ جب ہم اسکردو پہنچے تو مونا کا موڈ خراب تھا کیونکہ میں نے راستے میں حسبِ وعدہ اسے ٹراؤٹ نہیں کھلائی تھی نہ اس کا وقت نہیں تھا۔ میں نے سیدھا دفتر کا رخ کیا جو اسکردو بازار میں تھا۔ رات ہونے کی وجہ سے شہر نیند کی لپیٹ میں تھا۔ جس گروپ کے لئے میں سامان لایا تھا اسے صبح چھ بجے روانہ ہونا تھا۔ مونا اور سفیر کے لئے جگہ تلاش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ان سے کہا۔

''تم دونوں یہیں سو جاؤ...... پیچھے ایک کمرا ہے۔ کمبل مل جائیں گے، سردی زیادہ نہیں ہے۔''

''بھوکے سو جائیں؟'' مونا نے خفگی سے کہا۔

''سوری...... میں ابھی لڑکے کو بھیجتا ہوں۔'' میں نے شرمندگی سے کہا۔

ان دونوں کو کھانا منگوا کر دیا۔ اسکردو برانچ کا منیجر گل شاہ صبح ہی آتا اس لئے میں نے خود ہی ضروری کام نمٹا دیئے۔ اس چکر میں رات دو بجے سو سکا اور صبح پانچ بجے پھر اٹھ گیا۔ یخ بستہ پانی کے چھینٹے مار کر اور تلخ سیاہ کافی پی کر نیند بھگائی۔ اس دوران میں گل شاہ آ گیا۔ سفیر اور مونا کو جگا کر میں نے تیار ہونے کے دلئے کہا اور خود ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ گروپ کے لئے دو عدد جیپیں آ گئی تھیں مگر جب میں نے گروپ کے لیڈر جرمن باشندے سے بات کی تو اس نے بتایا، ان کے پاس گنجائش نہیں تھی۔ اس صورت میں ایک جیپ اور کرنی پڑتی اور اس کا سارا خرچ مونا اور سفیر کو دینا پڑتا۔ میں واپس دفتر تک آیا اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ مونا اطمینان سے بولی۔

''ہمیں نہیں پتا...... ہم آپ کے بھروسے پر یہاں آئے تھے اس لئے اب آپ ہمیں بھیجیں۔''

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ہمدردی مجھے مہنگی پڑ گئی تھی۔ اب یہ میرے سر تھے۔ دونوں کسی صورت ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ''شہباز صاحب! ہمیں بہرصورت اس پارٹی کے ساتھ جانا ہے۔ آپ لارا دے کر لائے تھے ہمیں۔'' سفیر نے کہا۔ ''لہٰذا آپ ہی کچھ کریں۔''

''او کے! آپ پچیس ہزار دیں...... باقی حساب کتاب اسلام آباد آنے پر ہو گا۔ واضح رہے، یہ آپ کو یہاں تک لانے اور دیوسائی کے سفر کے لئے ہیں۔ واپسی آپ کو اپنا خرچ کرنا ہو گا۔''

انہوں نے مجھے پچیس ہزار دیئے۔ ''یہ رقم زیادہ نہیں ہے؟'' مونا بولی۔

''غیر ملکی سیاحوں سے میں نے فی کس پچیس ہزار لئے ہیں، جبکہ یہاں آنے اور رہائش کی ذمے داری ان کی اپنی تھی۔ جلدی سے تیار ہو جائیں۔ سامان جیپ میں رکھا ہے۔''

راستے میں ان کے لئے سامان لیا، بہت کچھ وہ اسلام آباد سے ساتھ لائے تھے۔ ''تم دونوں کو تین پورٹرز اور دو گھوڑے لینا ہوں گے۔''

''گھوڑے کیوں؟'' سفیر نے اعتراض کیا۔

''دیوسائی پر گرمیوں میں برف پگھلنے سے پانی کے وسیع دریا بن جاتے ہیں۔ ان کی گہرائی تین چار فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن پانی اتنا یخ ہوتا ہے کہ اس میں چلنے والوں کے پیر فراسٹ بائٹ کا شکار ہو سکتے ہیں اس لئے گھوڑے لے جانے ضروری ہیں۔''

''مجھے گھڑ سواری نہیں آتی ہے۔'' مونا بولی۔

''فکر مت کرو۔ یہ گھوڑے سدھے ہوئے اور دھیمی رفتار سے چلنے کے عادی ہیں۔''

غیر ملکی سیاحوں کی پارٹی روانہ ہو چکی تھی اور سورج کی اوّلین کرنوں میں وہ بلندی کی طرف جاتی نظر آ رہی تھی۔ دریائے سندھ عبور کر کے ہم نے ان کا تعاقب جاری رکھا تھا۔ میں ایک بار دیوسائی کا سفر کر چکا تھا اس لئے راستے میں انہیں اپنے تجربات سے مستفید کرتا رہا۔ راستے میں آنے والے ایک گاؤں پر رک کر میں نے تین عدد پورٹرز اور دو گھوڑوں کا بندوبست کیا۔ وہ شام تک دیوسائی کے دامن تک پہنچ جاتے۔ جہاں سے پارٹی اگلی صبح اپنے سفر کا آغاز کرتی۔ میں نے انہیں جھیل کچورا بھی دکھائی تھی۔ دوپہر تک ہم دیوسائی کے دامن تک جا پہنچے

تھے۔ دیوسائی دنیا کے چند بلند ترین میدانوں میں سے ایک ہے۔ کم سے کم دس ہزار فٹ بلند اس سطح مرتفع کی بلندی بعض مقامات پر بارہ ہزار فٹ سے زیادہ ہے۔ چاروں طرف سے معروف سیاحتی مقامات اور دنیا کی معروف ترین چوٹیوں سے گھرے دیوسائی کا سفر ہر ٹریکٹر کا خواب ہوتا ہے لیکن ان میں سے کم ہی خوش نصیب اس پر سفر کر پاتے ہیں کیونکہ اکثر ناموافق موسم آڑے آتا ہے۔ کبھی گرمیوں میں برف ہی نہیں پگھلتی ہے اور کبھی اتنی زیادہ پگھلتی ہے کہ پورے دیوسائی پر سیلاب آ جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں سیاح اس طرف کا رخ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ میں نے مونا اور سفیر سے کہا۔ ''شام تک پورٹرز اور گھوڑے آ جائیں گے۔ وقت ہوا تو تم لوگ اوپر چلے جانا ورنہ کل صبح سفر کا آغاز کرنا، وش یو گڈ لک!''

سفیر نے گرم جوشی سے معانقہ کیا۔ ''شہباز! آپ نے واقعی ہمارے لئے بہت کیا ہے۔ ہم صرف شکریہ ادا کر سکتے ہیں۔''

''شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے جیپ تھپتھپائی۔ ''تم نے مجھے ادائیگی کی ہے۔ اب مجھے اجازت دو، ابھی مجھے واپس جانا ہے اور برانچ کے معاملات درست کر کے واپس اسلام آباد جانا ہے۔''

مونا نے ہاتھ ملایا۔ ''پھر واپسی پر ملاقات ہوگی۔''

''ان شاء اللہ۔'' میں نے کہا اور جیپ اسٹارٹ کر کے اسے موڑنے لگا۔ جب تک وہ نظر آتے رہے، ہاتھ بھی ہلاتے رہے تھے۔ یہ تھی میری مونا اور سفیر سے اوّلین ملاقات۔

☆======☆======☆

ہر بچہ خواب دیکھتا ہے لیکن میں کچھ زیادہ ہی تخیل پسند تھا۔ میاں والی کا خطہ مردم خیز رہا ہے بلکہ زیادہ ہی مردم خیز ہے۔ یہ سراسر مردوں کا معاشرہ ہے۔ شجاعت اور مردانگی کا گڑھ ہے۔ اس خطے کے جیالوں نے جنگِ عظیم اوّل اور دوم میں یورپ اور افریقہ کے محاذوں پر تاجِ برطانیہ کی سر بلندی کے لئے جان دی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد ان جیالوں کو ازالے کا موقع ملا اور انہوں نے پاک فوج میں شامل ہو کر دو جنگوں میں ملک کے دفاع کی جنگ لڑی۔ میرے والد ایاز ملک فوج سے میڈیکل پر ریٹائر ہوئے، ان کے پاؤں میں اکہتر کی جنگ میں گولے کا ٹکڑا لگا اور وہ فوج سے فارغ کر دیئے گئے۔ میرے دو بڑے بھائی شجاع اور شاہد فوج میں تھے۔ شجاع بھائی کرنل بن چکے تھے اور شاہد بھائی ابھی کیپٹن تھے۔ بابا کی خواہش تھی کہ ان کا تیسرا بیٹا بھی فوج میں جائے۔

بچپن میں، مَیں تعلیم کے نام سے بھاگتا تھا۔ اسکول جانے کی نسبت مجھے اپنے گاؤں کے اردگرد کے ٹیلوں پر گھومنا زیادہ پسند تھا لیکن بابا کے ڈر سے اسکول جاتا اور وہاں بور ہوتا۔ اسکول سے آتے ہی بستہ رکھ کر اور ماں جی سے نظر بچا کر باہر نکل جاتا۔ ویرانوں میں گھومتا، تھک جاتا تو کسی درخت کی چھاؤں تلے سو جاتا۔ جب گرمی اپنے جوبن پر ہوتی تو باہر جانے کے بجائے حویلی کے عقبی صحن میں لگے دو نیم کے درختوں کے تنوں سے بندھے نیٹ کے جھولے پر لیٹ کر خواب دیکھا کرتا تھا۔ میرے خواب بھی فکشن ہوتے تھے۔ انوکھی دنیاؤں اور انوکھی چیزوں کے بارے میں۔ جب اردو پڑھنا آئی تو بابا کی لائبریری سے داستانِ امیر حمزہ، الف لیلہ اور اسی قسم کی تمام کتابوں کو چاٹ ڈالا تھا پھر اس سے آگے بڑھا۔ غیر ملکی فکشن پڑھا۔ اس زمانے میں فلمیں صرف سینماؤں پر دکھائی جاتی تھیں۔ شجاع بھائی ان دنوں کاکول میں تربیت حاصل کر رہے تھے۔ وہ آتے تو میرے لئے کتابیں

لے آتے تھے اور بابا ان پر خفا ہوتے۔ ''یہ لڑکا پاگل ہے۔ سارا دن گھومتا رہتا ہے یا کتابیں پڑھتا ہے۔''

''نہیں بابا! شوبی ذہین اور مختلف لڑکا ہے۔'' شجاع بھائی میرا دفاع کرتے تھے۔ ''اور ابھی بچہ ہے۔''

''اسے سمجھا دو، اسے بھی فوج میں جانا ہے۔ میں اسے کیڈٹ اسکول میں داخل کرانے والا ہوں۔''

بابا کی اس دھمکی نے مجھے دہلا دیا تھا۔ میں حویلی سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں ماں جی تھیں اور صغراں آپا تھی۔ صغراں آپا سب سے بڑی تھیں۔ شادی کے تین سال بعد ہی بیوہ ہو کر گھر آ بیٹھی تھیں۔ ایک بیٹی تھی، شمسہ جسے پیار سے شمی کہتا تھا۔ جب میں پانچویں میں تھا تب صغراں آپا کے شوہر ایک تنازع میں ثالثی کرانے گئے اور فریقین کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تب سے صغراں آپا نے بیوگی کا سفید لباس پہن لیا اور کسی صورت اسے اتارنے کو تیار نہیں ہوئیں۔ ماں جی، بابا اور شجاع بھائی نے ہر ممکن کوشش کر لی۔ ہمارے تایا زاد بھائی یاسین ملک ان سے شادی کے خواہش مند تھے مگر صغراں آپا کی ناں ہاں میں نہ بدلی۔ کوئی زیادہ زور دیتا تو شمی کو سینے سے لگا کر رونا شروع کر دیتی تھیں۔

شمی میں ہم سب کی جان تھی، خاص طور پر میرے بغیر وہ ایک پل بھی رہنے کو تیار نہیں تھی۔ جب وہ آئی تو میرے اسکول کی چھٹیاں تھیں، جب اسکول کھلے اور میں پہلے دن جانے لگا تو شمی نے رو رو کر پورا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔ ''چھوبی نہیں جائے گا۔'' اس کی یہی رٹ تھی لہٰذا میرا اسکول جانا ملتوی کر دیا گیا۔ دو دن تک یہی ہوتا رہا۔ اس کے بعد حل نکالا گیا کہ ایک ملازمہ شمی کو لے کر میرے ساتھ جاتی تھی اور جب تک شمی آپا کے پاس جانے پر اصرار نہیں کرتی تھی، شمی ملازمہ کے ساتھ میری کلاس میں رہا کرتی تھی۔ بابا کی وجہ سے اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے یہ رعایت دی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ شمی نے میرے ساتھ جانے کی ضد ترک کر دی تو میں اکیلا اسکول جانے لگا۔

بابا نے مجھے کیڈٹ اسکول میں داخل کرانے کی بات کی تو میں پریشان ہو گیا۔ اب میں شمی اور دوسروں سے الگ نہیں ہو سکتا تھا۔ شمی کی وجہ سے میں نے باہر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ماں جی اور صغراں آپا کے توسط سے بابا کے فیصلے کو بدلنا چاہا مگر ناکام رہا تھا۔ بابا تعلیم میں بہت سخت تھے۔ میرے دونوں بڑے بھائی کیڈٹ اسکول سے پڑھے ہوئے تھے۔ ماں جی نے شجاع بھائی کو اتنی سی عمر میں گھر سے دور بھیجنے پر خاصا واویلا کیا تھا لیکن ماں جی سے محبت کرنے والے اور ان کی ہر بات ماننے والے بابا نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ میری باری میں بھی انہوں نے کسی کی بات سننے سے انکار کر دیا۔

''جب اس کے دونوں بھائی گھر سے دور رہ کر پڑھے ہیں تو اس میں کون سی نوابی گل ہے۔ یہ بھی کیڈٹ اسکول جائے گا۔'' نوابی گل کی اصطلاح بابا کی ایجاد کردہ تھی اور زیادہ تر میرے لئے ہی استعمال کی جاتی تھی۔ جانے کا فیصلہ ہو گیا تھا اس لئے مجھے جانا پڑا۔ میں نے آٹھویں تک اسکول میں پڑھا تھا اور عام طور سے کیڈٹ اسکول میں بچوں کو آغاز سے لیا جاتا ہے لیکن بابا کی کوشش سے مجھے داخلہ مل گیا۔ یوں میں گھر سے دور ہو گیا۔ ابتدائی ایک مہینہ سخت گزرا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ عادت ہونے لگی۔ شمی اور ماں جی یاد آتی تھیں۔ جیسے ہی اسکول میں چھٹیاں ہوتیں میں گھر کی طرف بھاگتا۔ میٹرک کے بعد میں نے اس اسکول میں انٹر میں داخلہ لے لیا تھا۔ دوسرے سال جب گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تب شجاع بھائی کورس مکمل کر کے کیپٹن آفیسر بن چکے تھے اور ان کی تعیناتی گلگت میں تھی۔ انہوں نے مجھے وہاں بلا لیا۔ پہلی بار میں نے آسمان کو چھوتے برف پوش پہاڑ دیکھے تھے۔

ان کے حسن، رعب اور بلندی نے مجھے مسحور کرلیا تھا۔ دو مہینے میں نے خواب کی سرزمین پر گزارے۔ بھائی مجھے سیاچن بھی لے گئے جہاں پاکستان اور بھارت کی فوجوں کے درمیان جنگ زور وشور سے جاری تھی۔ ان گرمیوں میں مجھے ہائیکنگ کا شوق ہوا اور میں شجاع بھائی سے ہائیکنگ کی تربیت لیتا رہا اور جب میں نے بہت کچھ سیکھ لیا تو میری واپسی کا وقت آ گیا۔ چند دن حویلی میں رک کر میں واپس کالج آ گیا۔

سردیوں میں کالج پندرہ دن کے لئے بند ہوا تو میں جیسے ہی حویلی پہنچا، بابا نے مجھے طلب کر لیا۔

''برخوردار! امتحان ہوتے ہی آرمی کے لئے ٹیسٹ کی تیاری کرو۔''

''مگر کیوں بابا...... کیا ضروری ہے، شجاع بھائی اور شاہد بھائی کی طرح میں بھی آرمی میں جاؤں۔'' میں نے دبی زبان میں کہا تھا اور بابا کا پارا چڑھ گیا۔

''ہاں، بہت ضروری ہے۔ ہمارے خاندان نے ہمیشہ فوج کی نوکری کی ہے اور تمہیں کیا اعتراض ہے؟''

''میرا اس طرف رجحان نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''رجحان!'' بابا حقارت سے بولے۔ ''یہ تم نوجوانوں میں رجحان بڑا پایا جاتا ہے۔ اگر فوج میں نہیں جانا تو برخوردار، پھر کیا کرنا ہے؟''

''میں نے ابھی سوچا نہیں۔'' میں پھر دبی زبان میں بولا۔

بابا کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ ''خوب...... اپنے مستقبل کی اتنی فکر ہے کہ اس کے بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں ہے اور جو باپ سوچ رہا ہے وہ قبول نہیں ہے؟''

''بابا، میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے التجا کی۔

''کاکول میں تمہیں پڑھائیں گے، ڈنڈا لے کر پی ٹی نہیں کرائیں گے۔ بس، میں نے کہہ دیا امتحان دے کر آؤ اور فوج کے امتحان کی تیاری کرو۔'' بابا کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ اس قسم کے لہجے کے بعد ان سے کوئی اختلاف کی جرأت نہیں کرتا تھا مگر اس روز میرے اندر سے اختلاف ابھرا تھا۔ میں نے صاف جواب دے دیا۔

''بابا، میں فوج میں نہیں جانا چاہتا۔''

اس کے بعد ایک طوفان اٹھا۔ بابا نے چھڑی اٹھالی تھی اور میں خاموشی سے پٹتا رہا۔ حتیٰ کہ ماں جی نے آ کر مجھے ان کے سامنے سے ہٹا لیا ورنہ شاید بابا مجھے مار ہی ڈالتے۔ اس روز ان کو ایسا ہی غصہ آیا تھا۔ اپنے کمرے میں لا کر ماں جی نے مجھے بٹھایا اور خود ملک صاحب کو ٹھنڈا کرنے چلی گئیں۔ صغراں آپا نے آ کر میرے زخم دیکھے۔ شمی باہر سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی ورنہ وہ رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتی۔ ماں جی بابا کو چپ کرا کے آئیں پھر انہوں نے صغراں آپا کے ساتھ مل کر میرے زخموں پر مرہم لگایا تھا۔ بابا نے مارتے ہوئے نہیں دیکھا تھا کہ مجھے چوٹ کہاں لگ رہی تھی۔ ایک بار چھڑی میرے چہرے پر لگی تھی اور اس کی نوک نے میرے ہونٹ کے ذرا نیچے جلد پھاڑ دی تھی۔ اس کا نشان آج تک میرے ہونٹ پر ہے۔

''تو کیوں ملک صاحب کے حکم سے انکاری ہے؟'' ماں جی نے نم لہجے میں کہا۔ ''وہ تیرے بھلے کو کہتے ہیں۔''

میں چپ رہا۔ صغراں آپا میری پشت کے زخموں پر ہلدی لگا رہی تھیں انہوں نے کہا۔ ''شوبی تیرے بھائی

بھی تو آرمی میں ہیں پھر تُو کیوں انکار کر رہا ہے؟''

''بس آپا! میں فوج میں نہیں جانا چاہتا۔ اگر بڑے بھائی آرمی میں گئے ہیں تو ضروری ہے کہ میں بھی آرمی میں ہی جاؤں؟''

''پر تیرے بابا نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔'' ماں جی نے فکرمندی سے کہا۔

''اگر ان کی انا اولاد کی خواہش پوری کرنے کی اجازت نہیں دیتی، تو میں کیوں ان کی بات مانوں؟''

میری بدقسمتی کہ یہ جملہ باہر سے گزرتے بابا نے سن لیا۔ ایک بار پھر طوفان آ گیا تھا۔ وہ دھاڑتے ہوئے اندر آئے اور مجھ پر پل پڑے تھے۔ رہی سہی کسر انہوں نے اس بار پوری کر دی۔ ماں جی اور آپا مجھے بچانے کی کوشش میں بابا سے پٹ گئیں۔ ایک بار بابا نے درمیان میں آتی آپا کو دھکا دیا تو ان کا سر دیوار سے جا لگا تھا۔ ان کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ ماں جی نے دیکھ کر چیخ ماری تھی۔

''یہ کیا، کیا ملک صاحب!''

صغراں آپا اکلوتی بیٹی تھیں اور بابا ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان کے سر سے بہتے خون نے بابا کا غصہ آن واحد میں ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ گھبرا کر اپنے شملے سے آپا کا خون روکنے لگے پھر انہیں سہارا دے کر باہر لے گئے۔ بابا کے لمبے چوڑے ہاتھوں نے مجھے پھر سے لہولہان کر دیا تھا۔ خاص طور سے ماتھے پر پڑنے والے مکے نے دو جگہ سے کھال پھاڑ دی تھی۔ بابا کی نقشین انگوٹھی چھپ کر رہ گئی تھی۔ ماں جی کبھی میری طرف دوڑ رہی تھیں اور کبھی بھاگ کر آپا کے پاس جاتی تھیں۔ بابا ان کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ بابا کا غصہ تو سرد ہو گیا تھا لیکن انہوں نے مجھ سے بات کرنا ترک کر دی۔ بلکہ دیکھتے تک نہیں تھے۔ کبھی اتفاق سے نظر پڑ جاتی تو منہ پھیر لیا کرتے تھے۔ میں پندرہ دن مکمل ہونے سے پہلے ہی گھر سے چلا گیا تھا۔

ایف ایس سی میں، میں نے بہت جان ماری تھی۔ دن رات پڑھتا تھا۔ رات گئے تک جاگتا رہتا تھا۔ جیسے خود سے انتقام لے رہا ہوں۔ جب امتحان ہوئے تو پیپرز اتنے شاندار ہوئے تھے کہ مجھے یقین ہونے لگا، پورے کیڈٹ اسکول میں اوّل پوزیشن میری آئے گی۔ اسکول کا ہاسٹل بند ہونے والا تھا اور ویسے بھی یہاں کی حد تک میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ اب مجھے بابا کے حکم کے مطابق کاکول جانا تھا یا اپنی خواہش کے مطابق کسی اور جگہ داخلہ لینا تھا۔ میں حویلی واپس آیا تو میرے لئے بابا کا غصہ برقرار تھا۔ البتہ حویلی میں ایک فرد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ سویرا تھی، بابا کے ایک کزن کی بیٹی۔ ان کی کینسر کے مرض میں وفات ہو گئی تھی اور انہوں نے سویرا کو بابا کے حوالے کر کے انہیں سویرا کا سرپرست بنا دیا تھا جب تک کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے فیصلے خود کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔ شفقت ملک کی خاصی زمین اور دیگر جائیداد و دولت تھی جسے انہوں نے ٹرسٹ کی صورت میں سویرا کے لئے محفوظ کر دیا تھا۔ ان کے بھائی اور دوسرے افراد لالچی تھے۔ ان سے خدشہ تھا کہ وہ سویرا کو اس دولت اور زمین کے حصول کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کریں گے لہٰذا شفقت ملک نے بابا کو قانونی طور پر سویرا کا محافظ مقرر کر دیا تھا۔ وہ تیرہ برس کی تھی اور ان دنوں آٹھویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ بے حد دبو اور خوف زدہ سی رہنے والی لڑکی تھی۔ میرے سامنے آنے سے کتراتی تھی اس لئے میں نے بھی اسے نظر انداز کر دیا۔

بابا کچھ عرصے تو چپ رہے تھے پھر پہلے امی اور صغراں آپا کے توسط سے مجھے حکم پہنچایا کہ میں ٹیسٹ کی

تیاری کروں۔ جب میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا تو بابا نے مجھے طلب کر لیا۔
''تمہیں...... تمہاری ماں اور بہن نے میرا حکم نہیں پہنچایا؟'' انہوں نے مجھے کڑی نظروں سے دیکھا تھا۔
''جی پہنچایا۔''
''پھر...... تم نے اب تک تیاری کیوں شروع نہیں کی؟'' خلافِ توقع بابا کا لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔
''بابا! میں نے اب تک اسے قبول نہیں کیا ہے۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔ ''آپ کیوں مجھے زبردستی فوج میں بھیجنا چاہتے ہیں؟ کیا ہمارے ملک میں اور شعبے نہیں ہیں؟''
''یہ سب میں نہیں جانتا...... مجھے واضح جواب دو۔'' بابا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
''میں فوج میں نہیں جانا چاہتا۔'' میں نے دل کڑا کر کے کہہ دیا۔
''تب اس حویلی میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ اپنا سامان لو اور یہاں سے جاؤ۔''
میں نے بے یقینی سے بابا کی طرف دیکھا۔ ''آپ مجھے حویلی سے نکال رہے ہیں؟''
''تو میں نے اور کیا کہا ہے۔ اپنی صورت لے کر دفع ہو جاؤ اور جو کرنا چاہتے ہو، کرو۔''
''اچھا...... آپ چاہتے ہیں تو ایسا ہی سہی۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''میں ابھی جا رہا ہوں۔''
ماں جی اور صغراں آپا کو پتا چلا تو وہ دوڑی آئی تھیں۔ ''شوبی! یہ کیا کر رہا ہے؟'' صغراں آپا نے میرے ہاتھ سے بیگ چھین لیا۔
''یہ بات آپ بابا سے پوچھیں۔ انہوں نے مجھے حویلی سے نکل جانے کا حکم دیا ہے۔ اب کیا میں یہ بات سن کر بھی بیٹھا رہوں؟''
''جھلا نہ بن...... وہ تیرے باپ ہیں۔'' ماں جی نے کہا۔ ''اور ملک صاحب سے میں ابھی بات کرتی ہوں، کیا گھر کے سارے فیصلے وہی کریں گے؟''
''تو اور کون کرتا ہے؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''کیا ہم نہیں کر سکتے، اپنی زندگی کے فیصلے...... اس سے تو بہتر ہے آدمی کہیں اور جا کر رہے۔'' میں نے الماری کھول کر اپنے کپڑے نکالنا شروع کر دیئے۔
''باپ تو غصے میں ایسی باتیں کر جاتے ہیں۔'' صغراں آپا نے کپڑے واپس رکھنا شروع کر دیئے۔
''انہوں نے غصے میں کہا ہے لیکن انہیں معلوم تھا، وہ کیا کہہ رہے ہیں۔'' میں نے بستر کے نیچے سے جوتے نکالے۔
''تم فکر نہ کرو، ماں جی انہیں سمجھا لیں گی۔''
''بابا کبھی نہیں مانیں گے اور مان بھی گئے تب بھی اپنی شرط پر مانیں گے اور مجھے آرمی میں نہیں جانا۔''
''بھائی آرمی میں کیا خرابی ہے؟'' صغراں آپا نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''اتنا عزت والا پیشہ ہے۔ پھر وطن کے محافظ بنو گے۔''
''اس میں کوئی خرابی نہیں ہے آپا! بس مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ فوج میں پابندیاں ہوتی ہیں اور میں پابندی برداشت نہیں کر سکتا۔''
بہر حال ماں جی نے نہ جانے کیا جتن کر کے بابا سے میری گھر بدری کا فیصلہ واپس کرا دیا۔ رات میں

کھانے کے لئے بڑے کمرے میں نہیں گیا جہاں سب رات کا کھانا اکٹھے کھاتے تھے۔ ملازمہ بلانے آئی لیکن میں نے بھوک نہ ہونے کا بہانہ کر دیا۔ جوان گرم خون تھا اور میں اب تک اپنی بے عزتی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ کئی بار میرے دل میں آ چکا تھا کہ خاموشی سے حویلی سے نکل جاؤں مگر ماں جی، آپا اور شمی کا خیال کر کے بیٹھا رہا تھا۔ تیسری بار ملازمہ کے بجائے سویرا آئی تھی، اس نے کھانے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔

''ماں جی نے کھانا بھیجا ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے منہ دوسری طرف کر کے کہا۔

''ماں جی نے مجھے حکم دیا ہے، آپ کو کھانا کھلا کر آؤں۔'' اس نے ٹرے میز پر رکھ دی اور میری طرف دیکھا۔ ''کھالیں ورنہ مجھے ماں جی کے سامنے شرمندگی ہوگی۔ پتا ہے، وہ بھی کھانا نہیں کھا رہی ہیں، آپ کھائیں گے تو وہ کھائیں گی۔''

مجبوراً میں نے ہاتھ بڑھا کر روٹی توڑی۔ چند نوالے کھانے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ ''بس اب لے جاؤ۔''

''مجھے معلوم ہے، آپ تین روٹی کھاتے ہیں، آپ نے آدھی بھی نہیں کھائی ہے۔'' اس نے ٹرے کا جائزہ لیا اور میں نے اس کا۔ آج وہ پہلی بار مجھ سے اتنا سارا اور بے تکلف ہو کر بول رہی تھی۔ جبکہ اس سے پہلے اس نے سلام دعا اور چند الفاظ سے زیادہ گفتگو نہیں کی تھی۔ میں نے ایک بار پھر کھانا شروع کر دیا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا، میں تین روٹی کھاتا ہوں؟''

''مجھے تو یہ بھی پتا ہے، آپ کو مچھلی اچھی لگتی ہے۔ آپ گڑ والے چاول شوق سے کھاتے ہیں۔ برسات میں آم کے سوا کچھ نہیں کھاتے۔''

''ابھی برسات کہاں آئی ہے۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''آپ کو پتلون قمیص اچھی لگتی ہے۔ سردیوں میں کوٹ پہنتے ہیں۔ پچھلے سال پہاڑوں پر گئے تھے اور آپ کو چپ رہنا اور ویرانوں میں پھرنا پسند ہے۔'' اس کا لہجہ شوخ سا ہو گیا تھا۔

میں نے سر ہلایا۔ ''تمہیں سب ماں جی نے بتایا ہوگا۔'' مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا۔''

وہ ہنسی۔ ''تو اور کون بتائے گا۔ ماں جی آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔''

میں نے بغور اسے دیکھا۔ سرخ و سفید رنگت، چھوٹی سی سرخ ناک، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور سیاہ بال۔ چھریرا جسم، میرے یوں دیکھنے پر وہ شرما گئی تھی، خود میں سمٹنے لگی۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟''

میں چونکا اور خفیف سا ہو گیا۔ ''میں دیکھ رہا تھا، آج تم میں کیا تبدیلی آئی ہے، اس سے پہلے کبھی تم نے مجھ سے اس طرح بات نہیں کی؟''

''آج ماں جی بہت پریشان ہیں، میں انہیں پریشان نہیں دیکھ سکتی اسی لئے ہمت کر کے آپ سے بات کرنے چلی آئی۔''

''تمہیں مجھ سے ڈر لگتا ہے؟''

''پہلے لگتا تھا، جب یہاں آئی تو آپا نے بتایا تھا، آپ مختلف آدمی ہو، زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتے ہو اس لئے ڈر کر آپ کے سامنے چپ ہو جاتی تھی۔''

ایریا بھی کہہ سکتے ہیں اور اس طرف دو دروازے اور دو کھڑکیاں کھل رہی تھیں۔ میں دیوار پر چڑھا اور بے آواز اندر کود گیا۔ اندر کیونکہ فرش اونچا تھا اس لیے بلندی صرف چھ فٹ تھی اور مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ نیچے کودتے ہی میں جھک گیا کیونکہ ایک کھڑکی کھلی تھی اور اگر کوئی دوسری طرف کمرے میں موجود ہوتا تو میں اسے نظر آجاتا۔

میں کچھ دیر خاموشی سے سن گن لیتا رہا لیکن اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ سناٹا طاری تھا۔ شاید اس طرف کوئی نہیں تھا۔ پھر میں نے کھلی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ یہ ایک سادہ سا بیڈروم تھا جس میں ایک بیڈ اور ایک ڈریسنگ ٹیبل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ البتہ دوسرے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ کھلا ہوا تھا اور اس کی کھڑکی اندر سے بند تھی اس لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ اندر کوئی ہے یا نہیں ہے۔ اللہ کا نام لے کر میں نے دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ اس کمرے کو خالی پا کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ شاید فرشی نشست گاہ تھی یا کئی طرح سے استعمال ہونے والا کمرہ تھا کیونکہ یہاں پر ایک قالین بچھا ہوا تھا کمبل اور ساتھ میں تکیے پڑے تھے۔ ایک تکیے کے نیچے سے کالی سی دھاتی چیز جھانک رہی تھی میں نے اسے نکالا تو میرے شک کی تصدیق ہوگئی۔ یہ ماؤزر پستول تھا۔ اصل کی چینی نقل لیکن بہت اچھی قسم کی نقل تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے نوے فی صد یقین ہوگیا کہ اس مکان میں پروفیسر اپنے آدمیوں سمیت موجود ہے ورنہ اس پستول کا کیا جواز ہو سکتا تھا۔ پستول لوڈ تھا میں نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اندر کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر مجھے دوسری طرف سے کسی کے آہستہ سے بولنے کی آواز آئی۔ لیکن وہ آہستہ سے نہیں بول رہا تھا بلکہ بند کمرے میں اس کی آواز کم آرہی تھی۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیئے اور مجھے پروفیسر کی آواز شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

''شہلا تم اب تک پہنچیں کیوں نہیں؟''

وہ یقیناً فون پر بات کر رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... تم مجھے بتا تو سکتی تھیں...... نہیں مجھے تمہاری ضرورت ہے...... اوہ نہیں بابا ان معنوں میں نہیں...... ویسے بھی اب تم میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہاں مجھے کسی بڑے مکان کی فوری ضرورت ہے...... میں اس حرامزادے سے رابطہ کر رہا ہوں لیکن اس کا موبائل بند جا رہا ہے...... ٹھیک ہے ٹھیک ہے...... میں دیکھتا ہوں۔'' پروفیسر کا لہجہ بیزار ہوگیا تھا اور پھر اس نے فون بند کر کے کسی سے پوچھا۔ ''وہ آیا کہ نہیں؟''

''آنے والا ہے۔'' مجھے جان کی آواز آئی۔ پروفیسر کا روبوٹ نما باڈی گارڈ تھا۔ ''راستے میں ہے۔''

''اس نے شور تو نہیں مچایا۔ کیا نام ہے اس کا؟...... ہاں جیتو۔''

''نہیں سکون سے ہے۔'' جان نے جواب دیا۔

''ویسے میں اسے لانے کا مقصد نہیں سمجھ سکی۔'' اس بار دونیا کی آواز آئی۔ ''اصل آدمی تو شہباز ہے۔''

''ہاں لیکن وہ اس طرح سے قابو میں نہیں آئے گا اسے قابو کرنے کا سب سے آسان طریقہ ہے اس کے کسی ساتھی کو قابو کر لو اس کی خاطر وہ ہر بات ماننے کو تیار ہو جائے گا۔''

''کوٹھی سے تو وہ نکل بھاگنے میں کامیاب رہا اور اس نے چالاکی سے کام لے کر اپنے نشانات بھی صاف

شجاع بھائی کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ بابا کے فیصلے سے مطمئن ہیں اور بالآخر مجھے زبردستی کاکول بھیج دیا جائے گا۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے چپکے سے غائب ہو جانا چاہئے اور اس وقت سے پہلے حویلی والوں کے ہاتھ نہیں آنا چاہئے جب تک ٹیسٹ کی تاریخ نہیں گزر جاتی۔ لہٰذا جیسے ہی حویلی پر خاموشی چھائی، میں نے چند جوڑے کپڑے اور اپنا ضروری سامان بیگ میں رکھا۔ مزے کی بات ہے، یہ بیگ شاہد بھائی پہلی بار کاکول جاتے وقت لے کر گئے تھے بعد میں انہوں نے یہ بیگ مجھے گفٹ کر دیا تھا۔ رات بارہ بجے جب چاروں طرف ہُو کا عالم تھا، سب گھر والے اگلے صحن میں چارپائیاں ڈالے سو رہے تھے۔ میں واحد فرد تھا جو شدید گرمی میں بھی اندر سویا کرتا تھا۔ ماں جی فجر میں اٹھتی تھیں اور میرے کمرے میں لازماً آتی تھیں اور اس وقت میری گمشدگی کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ بہرحال چار گھنٹے میں، میں خاصی دور نکل جاتا۔

ملک وال سے نکل کر میں نے نہر کے کنارے کنارے سرگودھا کا رخ کیا۔ مجھے امید تھی، صبح تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔ سرگودھا سے مجھے کہیں بھی جانے کے لئے بس مل جاتی۔ راستے میں کبھی کبھی چند گھڑی ستانے کے لئے رک جاتا تھا۔ صبح تک کوئی بارہ تیرہ میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اس رات میں نے بہت سے تماشے دیکھے۔ ایسے تماشے جن کے بارے میں صرف سنا تھا، دیکھا نہیں تھا۔ اس رات دیکھ بھی لیا۔ نہر کے کنارے قطار در قطار درخت تھے۔ ایک ایسے ہی جھنڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے چوڑیاں کھنکنے اور نسوانی ہنسی کی آواز آئی۔ ایک لمحے کو میں ٹھٹک گیا تھا اور میرے ذہن میں چڑیلوں اور چھل پیریوں کے وہ سارے قصے گھوم گئے تھے جو میں بچپن سے سنتا آ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے جذبات میں ڈوبی مردانہ آواز نے سارا معاملہ آن واحد میں کھول کر رکھ دیا تھا۔ یہ محبت کا مارا کوئی جوڑا تھا جو رات کے اس پہر ماں باپ کی عزت قدموں تلے روند رہا تھا۔ ہنسی اور درختوں سے آنے والی حیوانی آوازوں نے بتایا کہ وہ ہر حد پار کر چکے تھے۔ میں چاہنے کے باوجود بے حیائی کا یہ تماشا نہ دیکھ سکا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ اس سے کوئی دو ڈھائی میل آگے جواریوں کی ایک ٹولی ملی، میری آہٹ محسوس کر کے وہ اتنے بدحواس ہوئے کہ تاش کے پتے اور رقم چھوڑ کر نہر میں کود گئے تھے۔ اس تماشے نے مجھے محظوظ کیا تھا اور میں ہنستے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔ ایک جگہ دو رسا گیر چوری کی بھینس کو نہر عبور کرنے پر آمادہ کر رہے تھے اور وہ تاریکی میں پانی میں اترنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ ایک اور مقام پر درختوں کے جھنڈ کے اندر سے مجھے چھن چھن کی آواز آئی اور کسی نے میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ میں نے جواب دینے یا رکنے کے بجائے رفتار تیز کر دی تھی۔ نام لینے والی میرے پیچھے آنے لگی۔ بلاشبہ یہ خوف کا مقام تھا مگر میں نے ذرا بھی خوف محسوس نہیں کیا تھا حالانکہ کچھ دیر پہلے چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ نسوانی ہنسی نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ آواز نے خاصی دیر تک میرا پیچھا کیا اور پھر چپ ہو گئی۔

قریبی مسجد میں اذان کی آواز سن کر نہر کے کنارے سوتا بوڑھا مزدور نہر سے وضو کر کے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ کسان اپنے کھیتوں کا رخ کر رہے تھے۔ جب صبح کی روشنی پوری طرح پھیلی تو چمکتے چہروں کے ساتھ بچے بستے سنبھالے اسکولوں کا رخ کر رہے تھے، رات بیت چکی تھی لیکن میں اسے آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ ایک جنگلی ہوٹل سے ناشتا کر کے میں نے بس اسٹینڈ کا رخ کیا۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ میں لاہور یا راولپنڈی کا رخ کروں۔ یہ دونوں بڑے شہر تھے، یہاں مجھے قدم جمانے کا کوئی نہ کوئی موقع مل جاتا مگر جب بس اسٹینڈ پر پہنچا

تو تم پہلی فرصت میں مجھے چھوڑ جاؤ۔''

دونیا بولی تو اس کی آواز میں شکست خوردگی تھی۔''جب اتنا جانتے ہو تو میری طلب کے لیے مجھے اتنا کیوں تڑپاتے ہو؟''

اس وقت میرا ذہن کسی اور قسم کی طلب کی طرف گیا تھا لیکن پروفیسر کے جواب نے معاملہ کلیئر کر دیا۔ ''ابھی احتیاط کی ضرورت ہے مجھے دوا بنانے میں کچھ وقت لگے گا اور اس کے لیے کسی پُرسکون جگہ کی ضرورت ہے۔ اسٹاک کم ہے اگر تم نے احتیاط نہیں کی تو خود مشکل میں پڑ جاؤ گی۔''

''میں خود...... پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا پلیز پوری نہیں تو آدھی گولی دے دو۔'' دونیا ملتجی لہجے میں بولی۔''میں مر رہی ہوں۔''

''اوکے۔'' پروفیسر نے کچھ دیر بعد کہا۔''میں ابھی آدھی گولی دوں گا لیکن تم کل سے پہلے پھر نہیں مانگو گی۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' دونیا نے جلدی سے کہا۔

مجھے یہ جان کر دکھ ہوا تھا کہ دونیا جیسی جوان اور بہ ظاہر پڑھی لکھی نظر آنے والی لڑکی کسی منشیات کی لت کی وجہ سے پروفیسر جیسے شخص کے آگے مجبور تھی اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ پروفیسر کی داشتہ بھی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ دیکھنے میں بالکل بھی کسی ایسے نشے کی عادی نہیں لگتی تھی۔ اس کے برعکس وہ تر و تازہ اور زندگی سے بھرپور نظر آتی تھی۔ انسان کو اپنا عادی بنا لینے والا ہر نشہ سب سے پہلے اس کی تازگی چھین لیتا ہے۔ پروفیسر شاید اس کمرے سے کہیں اور گیا تھا۔ دونیا اس کمرے کی طرف آئی جہاں میں موجود تھا۔ آہٹ سن کر میں نے دروازے کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی تھی۔ ہینڈز اَپ کرانے کا وقت نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ اندر آئی میں نے اس کی گردن پر ہاتھ مارا اور پھر اسے پکڑ لیا ورنہ وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے اسے ایک طرف اس طرح لٹا دیا جیسے وہ آرام کر رہی ہو اور اس کے سر کے نیچے ایک تکیہ بھی رکھ دیا۔

یہ مکان اندر سے گرم نہیں تھا پھر بھی یہاں سردی اتنی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے دونیا نے وہی مختصر سی ہلکے کپڑے کی شرٹ اور بہت چست جینز پہن رکھی تھی۔ میرا وار کاری تھا اور اس کے دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میرا ارادہ پروفیسر کے آنے کی صورت میں اسے بھی دونیا کے برابر میں لٹانے کا تھا۔ اس کے بعد میں بیتو کو لے کر یہاں سے نکل جاتا۔ اس لیے جب دروازے پر آہٹ ہوئی تو میں بالکل تیار تھا۔

مگر اس بار میرا اندازہ غلط نکلا وہ پروفیسر نہیں بلکہ جان تھا۔ وہ اندر آیا اور میں نے اس کی گردن پر وار کیا۔ وہ بلند قامت تھا اور اس کا قد کم سے کم بھی چھ فٹ چار انچ تھا اس لیے میرا وار اس کے شانے پر لگا اور وہ بے خبری کی وجہ سے ذرا سا لڑکھڑا کر آگے چلا گیا تھا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی میں نے پستول نکالا اور اسے جان کے مضبوط سر پر آزمانے کی کوشش کی۔ مگر اتنی دیر میں وہ ہوشیار ہو گیا تھا اس نے جھکائی دی اور پستول کا دستہ اس کے شانے پر لگا۔ اس نے اپنی بائیں کہنی پیچھے کی طرف اچھالی جو میرے سینے سے ٹکرائی اور مجھے لگا جیسے میرا سانس رک گیا ہو میں دروازے سے ٹکرایا اور دروازہ بند ہو گیا۔

میں نے سنبھل کر اسے لات ماری اور یہ میری غلطی تھی۔ اس نے میری ٹانگ پکڑ لی اور مجھے آگے کی

آواز میں آواز ملاتے ڈرائیور کے گرد جمع ہونے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ان کو کھانا کھانے کا موقع دیا جائے یا پیسے دلوائے جائیں۔ مگر ڈرائیور ان دونوں باتوں کو ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ جھگڑا بڑا اور مسافر ڈرائیور کو زبردستی اتار کر نیچے لے گئے۔ دو افراد تیس چالیس افراد کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ جھگڑا ہوٹل تک جا پہنچا تھا جب ہوٹل والے نے مسافروں کا مطالبہ سنا تو اس نے بھی انکار کر دیا۔ وہ کھانا دوبارہ کھلانے کو تیار تھا اور نہ پیسے واپس کرنے کو۔

میں ٹہلتا ہوا ایک طرف چلا گیا اور نصف گھنٹے بعد واپس آیا تو جھگڑا عروج پر پہنچنے کے بعد ختم ہو چکا تھا۔ مار پیٹ کی کارروائی میں زیادہ نقصان ہوٹل والے کا ہوا تھا، لوگوں نے نہ صرف اس کا خستہ حال فرنیچر توڑ پھوڑ دیا تھا بلکہ اس کے گلے سے اپنے کھانے کے پیسے نکال لئے تھے۔ مار اپیٹا الگ تھا۔ مرمت ڈرائیور اور کنڈیکٹر کی بھی ہوئی تھی مگر وہ اس قابل تھے کہ بس چلا سکتے تھے۔ میں واپس اپنی نشست پر بیٹھا تو سرمد علی بے حد خوش تھا اس نے مجھے سرگوشی میں بتایا۔ ''میں نے ہوٹل والے کے گلے سے دو سو روپے نکالے ہیں۔ کھانے کے پچیس روپے دیئے تھے۔''

''مزے کرو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''آپ کہاں جاؤ گے؟''

''ابھی سوچا نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا تو اس نے پیشکش کی۔

''میرے گاؤں چلو...... کاغان کی خوبصورت ترین جگہ ہے۔ میرے گھر رکنا...... جب دل چاہے، آگے چلے جانا۔ سچ کہتا ہوں، زمین پر جنت ہے میرا گاؤں۔''

مجھے کہیں رکنا تھا اور میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ ہوٹل وغیرہ کا خرچ برداشت کر سکتا اس لئے میں نے سرمد علی کی پیشکش قبول کر لی۔ وہ بھی مجھ سے کچھ نہ کچھ وصول کرتا مگر ہوٹل کے اخراجات سے کم ہی ہوتا۔ ''ٹھیک ہے سرمد علی! ممکن ہے ہفتہ، دن دس رک جاؤں۔''

سرمد علی خوش ہو گیا تھا۔ ''میں تم کو پورا کاغان گھماؤں گا۔ ادھر چکور اور مارخور کا شکار ملتا ہے۔ تم کو شکار کھلاؤں گا۔''

اس وقت مجھے شکار یا کسی بھی شے سے دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے ماں جی اور شمی یاد آ رہے تھے۔ نہ جانے میرے اس طرح خاموشی سے غائب ہونے پر ان دونوں کا کیا حال ہو گا؟ ماں جی اور شمی کے بارے میں سوچتے سوچتے دو سیاہ آنکھیں بھی سوچوں میں در آئیں جو میرے بارے میں بہت کچھ جانتی تھیں۔ کیا سویرا بھی اداس ہو گی۔ اس نے مجھے کیسے کھانا کھلایا تھا۔ دبی دبی اور چپ رہنے والی لڑکی کتنی ذہین نکلی تھی اور کتنی دلیر ہو گئی تھی۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اچانک کسی نے میرا شانہ ہلایا، یہ سرمد علی تھا۔ ''اٹھ جاؤ برادر...... ہمیں اترنا ہے۔''

ہمارے بس سے اترنے سے پہلے شام ان فلک بوس پہاڑوں میں اتر آئی تھی۔ جو چاروں طرف سر اٹھائے کھڑے تھے اور ان پر گھنے سبز جنگلوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ دور برف پوش چوٹیاں ڈھلتی دھوپ کا مزہ دے رہی تھیں۔ میں نے اپنا بیگ اتار لیا۔ سرمد علی کے پاس کوئی سامان نہیں تھا اس لئے اس نے اصرار کر کے مجھ سے

میرا بیگ لے لیا۔ ''برادر! اب تم میرے مہمان ہو اور ہم مہمان سے کوئی کام نہیں لیتے، اس کے سارے کام خود کرتے ہیں۔''

''اس عزت پر میں تمہارا شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں دوست!'' میں نے بے تکلفی سے کہا۔

''جیسا تم کہو برادر!'' سرمد علی نے سڑک سے نیچے جاتی ایک پتلی سی پگڈنڈی پر اترنا شروع کر دیا تھا۔ دور تک صرف پہاڑ تھے۔ سرمد علی کا گاؤں نہ جانے کہاں تھا؟ یہ جگہ انتہائی سرسبز تھی۔ اونچے اور موٹے تنوں والے درخت تھے۔ ان کے دامن میں جھاڑیاں پھیلی تھیں۔ ایک جگہ اسٹرابیری جیسی جھاڑیوں پر اسٹرابیری جیسا پھل تھا، میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن سرمد علی نے روک دیا۔ ''نہیں برادر! اسے مت کھانا۔''

میں سمجھا کہ شاید زہریلا پھل ہے اس لئے سرمد علی منع کر رہا ہے۔ سرمد علی مجھے اپنے گاؤں کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کی بلندی چھ ہزار سات سوفٹ تھی اور اس کے اردگرد کی پہاڑی ڈھلانوں پر کسان چاول، گندم اور جو کاشت کرتے تھے۔ انگور کی بیلیں تھیں۔ جب انگور اترتا تھا تو گاؤں کے بچے انہیں چھابڑی میں رکھ کر سڑک کے کنارے بیچا کرتے تھے۔ گزرنے والی گاڑیوں کے مسافر سستے داموں ان سے انگوروں خرید لیتے تھے۔ کاشت کاری کے بعد دوسرا پیشہ مویشی پالنا تھا۔ گاؤں کے بعض افراد محنت مزدوری کرنے شہروں کو جاتے تھے اور بعض اسکردو اور گلگت جا کر پورٹر کا کام کرتے تھے۔ گاؤں کی آبادی تین ہزار کے قریب تھی۔ شروع نومبر سے وسط مارچ تک برف باری ہوئی تھی اور ہر شے برف کا سفید لبادہ اوڑھ لیتی تھی۔ ان پانچ مہینوں میں گاؤں والے اپنے گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جاتے تھے اور سوائے اشد ضرورت کے گھر سے نہیں نکلتے تھے۔ ان پانچ مہینوں کے لئے ضروریاتِ زندگی اور جانوروں کی خوراک وہ پہلے ہی ذخیرہ کر لیا کرتے تھے۔ ان پانچ مہینوں میں وہ کم خوراک کھاتے اور زیادہ تر سوتے تھے۔

وسط مارچ کے بعد جب برف پگھلنا شروع ہوتی تو وہ سب سے پہلے اپنے گھروں کی مرمت کیا کرتے تھے۔ جنہیں برف باری اور سرمائی طوفانوں سے نقصان ہوا کرتا تھا۔ اپریل کے آغاز میں درخت پودے برف جھٹک کر نئے پتوں کی چادر اوڑھ لیا کرتے تھے۔ کسان اپنے کھیتوں کی مرمت اور درستگی میں لگ جاتے۔ مویشی چرانے والے مویشی لے کر نچلی چراگاہوں کا رخ کرتے جہاں برف پہلے ہی پگھل جاتی تھی اور تازہ چارہ مویشیوں کے لئے وافر مقدار میں دستیاب ہوتا تھا۔ جب اوپر بھی بہار آتی تو مویشی والے اپنے جانور لے کر واپس آ جاتے۔ وادی بھرپور طور پر جاگ جاتی تھی۔ انگور کی خشک شاخوں میں نئے پتے آنے لگتے تھے۔ سیڑھی نما کھیتوں میں چاول اور گندم کے پودے سر اٹھانے لگتے تھے۔ وسط جون تک کھیت سبز ہو جاتے تھے۔ اس سبزے میں کہیں کہیں پھولوں کے رنگ نمایاں ہوتے تھے۔ جولائی کے آخر میں خوشے پکنا شروع ہوتے تو سبزہ بتدریج سنہرے رنگ میں بدلنے لگتا۔ اس وقت کسانوں کی بھرپور کوشش کے باوجود پھول بھی سر اٹھاتے تھے اور کھیت رنگوں کا مجموعہ بن جاتے تھے۔ جس سال کھیتوں کی سنہری فصل پر یہ رنگ غالب آ جاتے، اس سال کسان مایوس ہوتے تھے۔ کیونکہ فصل کم ہوتی تھی اور جس سال سنہری رنگ غالب رہا کرتا تھا، کسانوں کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بیج نکالنے کے بعد باقی فصل کاٹ کر اور خشک کر کے آنے والی سردیوں میں جانوروں کی خوراک کے طور پر محفوظ کر لی جاتی تھی۔ سرمد علی الفاظ کے استعمال کے ہنر سے واقف تھا۔ وہ اتنے دل چسپ

انداز میں اپنے علاقے کے بارے میں بتا رہا تھا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات میں دلچسپی لینے پر مجبور تھا۔ میں خود دیہی معاشرے کی پیداوار تھا، کھیت کھلیان اور جانور میرے لئے نئی چیز نہیں تھے۔

پگڈنڈی اب بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ راستے میں کئی افراد ملے تھے۔ جب کوئی آدمی سامنے سے آتا، سرمد علی داستان گوئی روک کر اس سے معانقہ کرتا، اس کے خاندان اور جانوروں تک کا حال احوال دریافت کرتا، میرا تعارف کراتا اور رکنے والا آدمی مجھ سے گلے مل کر آگے بڑھتا، تب ہم سفر شروع کرتے۔ سرمد علی مقامی زبان میں بات کرتا تھا اس لئے میں صرف اندازہ لگا سکتا تھا۔ مجھے خدشہ محسوس ہونے لگا کہ ہم اس طرح علیک سلیک کرتے آگے بڑھتے رہے تو اگلی صبح ہی سرمد علی کے گاؤں تک پہنچ سکیں گے مگر جیسے ہی پگڈنڈی بلندی پر پہنچ کر مائل بہ نشیب ہوئی۔ سامنے سے ایک حسین وادی بتدریج ابھرنے لگی۔ پہلے سبز کھیت نظر آئے، جن کے درمیان بے شمار رنگوں والے بے شمار پھول کھلے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم کھیتوں کے درمیان سے گزرتے وادی کے وسط میں واقع گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ سورج کی آخری کرنوں میں سارا منظر واضح تھا۔ گاؤں کے تمام مکان لکڑی اور مٹی کی مدد سے بنائے گئے تھے، یہ نیم زمین دوز مکان تھے۔ جن کی ڈھلان چھتوں پر انگور کی بیلیں پھیلی تھیں۔ جہاں انگور کی بیلیں نہیں تھیں وہاں پھولدار بیلیں تھیں۔ لوگوں نے ننھی ننھی کیاریاں بنا کر ان میں بھی پھولدار پودے لگا رکھے تھے۔ سوائے گلیوں کے اور کہیں بھی مٹی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وادی میں چاروں طرف پہاڑ جیسے جھکے پڑ رہے تھے۔ ہوا میں ایسی مہک تھی جسے پوری شدت سے محسوس کیا جا سکتا تھا لیکن بیان کرنا دشوار تھا۔ یہ پھولوں، پودوں اور اس وادی کی ملی جلی خوشبو تھی۔

وادی میں داخل ہوتے ہی علیک سلیک کرنے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔ کسان اپنے بیل نما جانور (زوہ کہلانے والا یہ جانور دراصل گائے اور یاک کا کراس ہوتا ہے کیونکہ گائے کو زیادہ بلندی پر تکلیف ہوتی ہے اور یاک نیچے آ کر بے کار ہو جاتا ہے لہٰذا ان دونوں کے ملاپ سے زوہ وجود میں لایا گیا تھا۔ جیسے گھوڑے اور گدھے کی ملاپ سے زیادہ خصوصیات والا خچر وجود میں آتا ہے مگر خچر کے برعکس زوہ تولیدی صلاحیت رکھتا ہے اور درمیانی بلندی پر خوب کام کرتا ہے) چھوڑ کر سرمد علی سے معانقہ کر رہے تھے۔ وہ بھی بلا تکلف مٹی اور کیچڑ میں سنے ان کسانوں سے گلے مل رہا تھا۔ البتہ میں نے صرف مصافحے پر اکتفا کیا۔ ان میں سے کئی افراد اردو جانتے تھے اور بڑی محبت سے میرا حال احوال دریافت کر رہے تھے۔

گاؤں کے نزدیک آتے ہی بچوں کے ایک غول نے ہمیں گھیر لیا۔ سرخ و سفید رنگت اور سنہرے بھورے بالوں والے یہ بچے جتنے خوبصورت تھے، اتنے ہی میلے کچیلے اور گندے بھی ہو رہے تھے۔ بیشتر نے پورے کپڑے بھی نہیں پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں گھیرا تو سرمد علی ڈانٹ کر انہیں دور بھگانے لگا۔ وہ کچھ دور جاتے اور دوبارہ ہمارے اردگرد چلنے لگتے۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہوتے ان بچوں کی تعداد سوڈیڑھ سو تک جا پہنچی تھی۔ سرمد علی انہیں ڈانٹتے ہوئے مجھ سے معذرت کر رہا تھا۔ میں ہنسنے لگا۔ ''اگر تم میرے گاؤں آؤ تو بالکل ایسا ہی ایک غول تم کو بھی گھیر لے گا۔''

''لیکن یہ کچھ زیادہ ہی ڈھیٹ ہیں۔'' سرمد علی نے بچوں کو غصے سے دیکھا اور اپنی زبان میں ان سے باالفاظ دیگر خطاب کیا تھا مگر بچے سن کر بے لطف نہیں ہوئے تھے بلکہ ان میں سے بعض قہقہہ مار کر ہنسے تھے۔ ہم

اس پروٹوکول کے ساتھ سرمد علی کے گھر تک آئے۔ اس نے مجھے باہر بچھی وسیع وعریض چارپائی پر بٹھایا اور میرا بیگ بھی وہیں رکھ کر اندر چلا گیا۔ مجھے ان علاقوں کا رواج پتا تھا اس لئے میں نے باہر بٹھائے جانے کو محسوس نہیں کیا۔ بچے اب بھی وہاں جمع تھے اگر چہ ان کی تعداد میں کمی ہوگئی تھی۔ ایک گھنٹے تک پیدل چل کر میں تھکن محسوس کر رہا تھا اس لئے بلاتکلف چارپائی پر دراز ہوگیا۔ آرمی کے ٹیسٹ ہونے میں ابھی ایک مہینا باقی تھا۔ اس لئے مجھے ایک مہینے سے پہلے گھر کا رخ نہیں کرنا تھا اور یہ جگہ دوتین ہفتے گزارنے کے لحاظ سے بری نہیں لگ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اندر سے ایک بچہ مٹی کا بڑا سا پیالہ لایا جس میں سفید گاڑھا دہی تھا۔ بچے نے پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ وہ یہ گاڑھا دہی پینے کی دعوت دے رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ اس علاقے کی لسی تھی۔ صبح کا ناشتا کیا ہضم ہو چکا تھا اور میں بھوک محسوس کر رہا تھا اس لئے پیالے کی لسی پی گیا۔ اس کا ذائقہ میٹھا اور مزے کا تھا۔ لسی پیتے ہی میں تروتازہ ہوگیا تھا اور سفر کی ساری تھکن لمحوں میں دور ہوگئی تھی۔ تاریکی چھا رہی تھی۔ پہاڑوں سے مویشی چرانے والے اپنے جانور لے کر اتر رہے تھے۔ ان میں کئی عورتیں اور لڑکیاں بھی تھیں۔ کسان بھی اپنے بیل اور اوزار سمیٹ کر واپس آرہے تھے۔ شاید خالی کھیتوں میں جوار اگایا جا رہا تھا۔ بچے کھچے بچے بھی اپنے گھروں کو سدھارے تو میں نے سکون محسوس کیا تھا۔ سرمد علی ایک گھنٹے بعد اندر سے نکلا۔ ان کا رواج تھا کہ مہمان کو اس کی مرضی پر چھوڑتے تھے۔ چوبیس گھنٹے اس کے سر پر سوار نہیں رہا کرتے تھے۔ سرمد علی کپڑے بدل کر آیا تھا۔

''برادر! اندر آؤ......ادھر کچھ دیر میں سردی بہت ہوجائے گی۔''

اس نے میرا بیگ اٹھالیا تھا۔ سورج ڈوبتے ہی خنکی میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا اور ہلکے کپڑوں میں مجھے سردی لگ رہی تھی۔ سرمد علی کا مکان بھی زمین دوز تھا۔ اندر جاتے ہی اس کے مفلوج باپ سے ملاقات ہوئی جو چارپائی پر پڑا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس نے رسمی سے انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور دوبارہ حقہ گڑگڑانے میں لگ گیا۔ اس کے پاس سے تمباکو کی تیز بو آ رہی تھی۔ شاید اس کا دن رات کا مشغلہ یہی تھا۔ سرمد علی نے بتایا۔ ''میرے باپ کے دونوں پاؤں اوپر سے گرنے کی وجہ سے ٹوٹ گئے تھے تب سے بستر پر پڑا ہے، کبھی کبھی بیساکھی کا سہارا لے کر باہر چارپائی تک چلا جاتا ہے، اس کا سارا کام اس کی دوسری بیوی کرتی ہے۔''

''تمہارے کتنے بہن بھائی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

سرمد علی نے انگلیوں پر حساب لگایا۔ ''تین بیویوں سے میرے باپ کے گیارہ بچے ہیں۔''

میں دنگ رہ گیا۔ ''تمہارے باپ نے تین شادیاں کی ہیں۔''

سرمد علی مسکرایا۔ ''ادھر مرد عام طور سے شرعی کوٹا پورا کرتے ہیں۔ میرے باپ کو افسوس ہے کہ وہ چوتھی شادی کیوں نہیں کرسکا۔''

میں نے دل میں بڑے میاں کی بلند خیالی کی داد دی اور سرمد علی کے ساتھ اندر جانے لگا تو ایک طرف سے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی نکلی، وہ ایک چمٹے میں انگارے لے کر جا رہی تھی۔ شاید اپنے باپ کے حقے کے لئے۔ سرمد علی مجھے عقبی حصے میں ایک چھوٹی سی لیکن صاف ستھری کوٹھری تک لایا۔ ''یہ میرا کمرا ہے۔''

وہاں ایک صندوق تھا اور فرش پر خوش رنگ قالین بچھا ہوا تھا۔ میں جوتے اتار کر اس پر ہی بیٹھ گیا۔ میرا

بیگ سرمد علی نے ایک جانب کھونٹے سے ٹانگ دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب سرمد علی سے حساب کتاب کر لیا جائے۔ ''دوست! یہ بتاؤ کہ مجھے طعام و قیام کا کیا دینا پڑے گا؟''

''کیا......!'' پہلے تو سرمد علی کا منہ کھل گیا تھا پھر وہ خفا نظر آنے لگا۔ ''میں نے تمہیں مہمان کہا ہے، کیا تم ہمیں اتنا بے غیرت سمجھتے ہو کہ مہمان سے خرچہ لیں؟ خدا کی قسم، تم ساری عمر بھی رہو تب بھی مہمان رہو گے۔''

سرمد کو غصہ آ گیا تھا۔ میں نے معذرت کر کے بمشکل اسے ٹھنڈا کیا تھا۔ ''بھائی، مجھ سے غلطی ہوئی۔''

''شکر کرو، تم نے یہ بات میرے باپ کے سامنے نہیں کی ورنہ وہ اپنے پاس بھری بندوق رکھتا ہے۔'' نہ جانے سرمد علی نے مجھے دھمکایا تھا یا مذاق کیا تھا۔ مہمان کو گولی مارنے کا رواج دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ سرمد علی مجھے وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ باہر سے کبھی کبھی عورتوں اور بچوں کی آواز آتی تھی، میں نے محسوس کیا کہ باہر سے مختصر نظر آنے کے باوجود یہ مکان اندر سے خاصا وسیع تھا۔ میٹھے دہی کی لسی پی کر مجھ پر خمار طاری ہو رہا تھا اس لئے میں پھر دراز ہو گیا مگر چند منٹ بعد ہی سرمد علی ایک تسلا اور لوٹے میں پانی لے کر آ گیا۔ اس نے میرا منہ ہاتھ دھلایا۔ اس کے چند منٹ بعد کھانا آ گیا۔ موٹی خمیری روٹیاں، بھنا گوشت اور اچار تھا۔ یہ کسی مقامی جڑی بوٹی کا اچار تھا۔ ہلکا سا ترش لیکن بے حد مزے دار تھا۔ کھانا اتنا لذیذ تھا کہ میں بھوک سے زیادہ ہی کھا گیا تھا۔ کھانے کے بعد الائچی والا سبز قہوہ آیا۔ اب مجھ پر شدت سے نیند سوار تھی اس لئے جیسے لیٹا، ویسے ہی سو گیا۔

صبح سویرے سرمد علی نے مجھے اٹھا دیا۔ ''برادر! رفع حاجت کے لئے یہی وقت ہے، دن میں تمہیں خاصا دور جانا پڑے گا، آ جاؤ۔''

میرے بیگ میں ایک ہلکی جیکٹ تھی، میں نے باہر جانے کے لئے نکالی تو سرمد علی نے اسے رکھ کر مجھے ایک گرم چادر پیش کر دی۔ ''یہ کام آئے گی۔'' اس نے کہا۔ ''پردے کا کام بھی کرے گی۔''

باہر بلا کی سردی اور تاریکی مسلط تھی، لگ ہی نہیں رہا تھا، یہ گرمی کا موسم ہے، جب گرمی کے موسم میں اتنی شدت کی سردی پڑتی ہے تو سردیوں میں کیا حال ہوتا ہوگا! واپسی پر سرمد علی نے مجھے بتایا۔ ''سردیوں کا مت پوچھو۔ رات کو باہر نکلنے کی ہمت کوئی نہیں کرتا، بے شک اس کا بچہ مر رہا ہو۔ دن میں بھی بہت ضرورت کی وجہ سے اچھی طرح پہن اوڑھ کر نکلتے ہیں ورنہ ہاتھ پیروں کو سردی کھا جاتی ہے۔ ہمارے گاؤں میں سب سے زیادہ موتیں سردی کی ہوتی ہیں، خاص طور سے بوڑھے اور بچے سردی کی شکار ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ طبی امداد نہ ملنے سے مرتے ہیں۔''

''یہاں پاس کوئی اسپتال یا ڈاکٹر نہیں ہے؟''

''قریب ترین اسپتال بھی یہاں سے کوئی چالیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے، گرمیوں میں بھی کوئی بیمار پڑ جائے تو اسے اتنی دور لے جانا مسئلہ ہوتا ہے۔ سردیوں میں تو کسی کو اسپتال تک لے جانا ناممکن ہوتا ہے۔ سارے راستے بند ہوتے ہیں، سردی اتنی شدید ہوتی ہے کہ جسے اسپتال لے جایا جا رہا ہو۔ وہ بعض اوقات سردی سے مر جاتا ہے۔''

ملک وال میں بھی عام آدمی کے لئے حالات اچھے نہیں تھے۔ گاؤں میں ایک ڈسپنسری تھی، جس میں کام کرنے والا کمپاؤنڈر ہی مریضوں کا علاج کرتا تھا۔ کوئی بیمار پڑ جاتا تو اسے حسبِ توفیق ریڑھے، تانگے پر ڈال کر

اسپتال لے جایا جاتا تھا لیکن سرمد علی کے اس گاؤں میں صورتِ حال حد درجے خراب تھی۔ یہاں بیمار پڑنے والا خودلوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جائے تو ہو جائے ورنہ ملک الموت ہی آ کر اسے تکلیف سے نجات دلاتے تھے۔ یہ جگہ جتنی خوبصورت تھی، یہاں کے لوگ غربت میں جکڑے ہوئے اتنی ہی بدصورت زندگی جی رہے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

''سرمد علی! تم نے مجھے اپنے گاؤں کا نام تو بتایا ہی نہیں ہے؟''

''گلار نام ہے اس کا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بدقسمت لوگوں کا خوبصورت گاؤں...... ہمارے ہاں شرح پیدائش اور شرح اموات دونوں زیادہ ہیں۔ پچھلے دس سال میں بمشکل دو سو افراد کا اضافہ ہوا ہے۔ درحقیقت آبادی کم ہوتی ہے۔ کئی افراد اپنے کنبوں سمیت بیرون گاؤں جا چکے ہیں۔''

ہم ایک اخروٹ کے باغ کے گرد چند فٹ اونچی پتھروں سے بنی چار دیواری پر بیٹھ گئے، ابھی آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ ہوا سرد لیکن تازگی لئے ہوئے تھی۔ یوں لگتا جیسے میں ہوا کے بجائے خنکی کے سمندر میں سانس لے رہا ہوں۔ کچھ دیر بعد ہم اندر آئے۔ میں پھر سو گیا۔ سرمد علی نہ جانے کیا کرنے لگا۔ میری آنکھ کھلی تو کوٹھری بدستور تاریک تھی مگر کلائی میں بندھی گھڑی دس بجا رہی تھی۔ سرمد علی کو آواز دینے پر ایک بچہ اشارے سے باہر لے گیا۔ سرمد علی کا باپ اپنی چارپائی پر پڑا تھا اور کل والی لڑکی اس کے پیروں پر کسی تیل سے مالش کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ سرمد علی کے گھر کی کوئی اور عورت نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے معلوم تھا، ان علاقوں میں پردے کا رواج نہیں ہوتا ہے مگر مرد اور عورت کا میل جول ان کی روایت نہیں ہے ورنہ عورتیں یہاں معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں میں برابر کا حصہ لیتی ہیں، وہ کھیتوں اور باغوں میں کام کرتی ہیں۔ مویشی چراتی ہیں اور بھیڑوں سے حاصل ہونے والا اون کاتتی ہیں۔ خالی اون کے مقابلے میں دھاگے کی زیادہ قیمت ملتی ہے۔ جن خاندانوں کے مرد نہیں تھے یا کام کے غرض سے شہروں کو گئے تھے، وہاں عورتیں سارا کام خود کرتی تھیں۔ سرمد علی نے مجھے بتایا کہ اس کی دو بڑی مائیں اور تین بہنیں کھیتوں میں کام کرنے کے ساتھ مویشی چراتی ہیں اور تیسری ماں گھر کا کام کاج کرتی ہے۔ بچے نے مجھے گھر سے باہر ایک کیاری میں منہ ہاتھ دھلوایا۔ دانت صاف کرنے کے لئے مجھے ایک عدد مسواک دی جو کسی مقامی درخت کی شاخ تھی۔ بہرحال اس سے دانت صاف ہو گئے تھے۔ سرمد علی اندر کے بجائے باہر سے آتا نظر آیا تھا۔ اس نے آتے ہی بچے کو کوئی حکم دیا اور وہ اندر بھاگ گیا۔ کچھ دیر بعد ناشتا آ گیا۔ دیسی گھی میں بنے پراٹھے اور تلے ہوئے انڈے تھے۔

''ناشتا کر لو پھر میں تمہیں راجا صاحب سے ملوانے لے جاؤں گا، اس علاقے کے مشہور آدمی ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں فوج میں شامل تھے۔ بڑا شاندار گھر بنایا ہے، اس کے باغ میں دنیا بھر کے درخت اور پودے ہیں۔''

''پر یار! وہ راجا صاحب مجھ سے کیوں ملیں گے؟''

''ضرور ملیں گے، اس علاقے میں باہر سے آنے والے ہر فرد سے مل کر وہ خوش ہوتے ہیں۔ ان کا حکم ہے کہ باہر سے کسی کے ہاں کوئی فرد آئے، وہ اسے راجا صاحب سے ملوانے ضرور لائے۔ دراصل لوگوں سے ملنا اور ان سے باتیں کرنا ہی راجا صاحب کی تفریح رہ گئی ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ایک بڑا نواب تھا، اس نے

پورے علاقے پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ یہ راجا صاحب اس کی اولاد میں سے ہیں۔ راجا صاحب کا آبائی محل ایک زلزلے میں تباہ ہو گیا تھا، اب تو اس کے کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں مگر ان کا موجودہ محل بھی کم نہیں ہے۔ بے شمار نوادرات ہیں۔ خاص طور سے تصاویر والی گیلری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ راجا صاحب اپنے مہمانوں کو یہ سب دکھا کر خوش ہوتے ہیں۔''

''میں ضرور چلوں گا۔'' میں نے کہا۔

''بس تو پھر تیار رہو۔ کپڑے بدلنا ہے تو بدل لو۔'' سرمد علی رومال سے ہاتھ صاف کرتا اندر چلا گیا۔ میں بھی سیر ہو چکا تھا۔ ناشتے کے بعد پھر الائچی والا سبز قہوہ آیا۔ شاید ان کے یہاں دودھ والی چائے کا رواج نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد بچہ مجھے اندر لے گیا۔ ایک بار پھر وہی لڑکی سامنے آئی۔ اس بار وہ لوٹا لے کر سرمد علی کے باپ کے ہاتھ دھلا رہی تھی۔ مجھے اس کے چہرے پر عجیب سی بے رونقی اور سپاٹ پن نظر آیا تھا۔ میں کپڑے بدل کر آیا۔ اگر چہ یہ لوگ اچھے ہی لگ رہے تھے مگر میں نے اپنی رقم بیگ میں نہیں چھوڑی تھی۔ بیگ پر چھوٹا سا تالا لگا تھا جو بہ آسانی کھولا جا سکتا تھا۔

سورج نکلتے ہی گاؤں میں سرگرمیوں کا آغاز ہو جاتا تھا۔ لوگ اپنے کھیتوں، باغوں یا پھر مویشی لے کر چراگاہوں یک طرف روانہ ہو رہے تھے۔ انگور کی بیلیں خوشوں سے بھر گئی تھیں۔ خوشے بھی پکنے کے قریب تھے۔ اوپری ڈھلانوں پر سیب، خوبانی، آڑو اور آلو بخارے کے باغات تھے۔ تمام باغ پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ سرمد علی اندر سے آیا تو ہم راجا صاحب کے محل کی طرف روانہ ہوئے۔ اس بار ہم گاؤں کے مخالف سمت والے حصے سے گزرے تھے۔ اس کے بعد کھیتوں کا مرحلہ آیا۔ کھیت ختم ہوئے تو باغات شروع ہوئے۔ کہیں کہیں چیری کے درخت بھی تھے۔ جن پر چیریاں لٹک رہی تھیں۔ ایک جگہ وہ اسٹرابیری جیسا پھل نظر آیا جسے سرمد علی نے کھانے سے منع کیا تھا۔ اس بار میں نے پوچھ لیا۔ ''یہ پھل زہریلا ہوتا ہے؟''

''نہیں تو...... تم سے کس نے کہا!'' وہ حیرت سے بولا۔

''کل گاؤں کی طرف آتے ہوئے راستے میں اس کی جھاڑی نظر آئی تو تم نے کھانے سے منع کیا تھا۔''

''اوہ...... ہاں...... دراصل اسے خالی پیٹ نہیں کھاتے...... تکلیف کرتا ہے، دوسرے اسے کھانے کے بعد شدت کی پیاس لگتی ہے۔ وہاں راستے میں کہیں پانی نہیں ملتا۔''

''یعنی اب کھا سکتا ہوں۔''

''کیوں نہیں...... کچھ آگے چل کر پانی بھی مل جائے گا۔''

میں نے سرمد علی کے ساتھ مل کر جھاڑی پر بچے کھچے پھلوں کا صفایا کر دیا۔ سرمد علی کی بات درست نکلی۔ چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھے پیاس لگنے لگی اور دس منٹ بعد ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے کئی روز سے پانی نہیں پیا ہو۔ شکر ہے کہ کچھ دور جاتے ہی ٹھنڈے پانی کا چشمہ مل گیا، اس کے پانی سے میں نے اور سرمد علی نے پیاس بجھائی۔ مزے کی بات ہے چند گھونٹ پانی پیتے ہی تشنگی مٹ گئی تھی۔ اس وقت دو بچے جن میں سے ایک دس گیارہ سال کی لڑکی اور دوسرا اس کا ہم عمر لڑکا تھا، بھیڑیں دوڑاتے چشمے تک آئے تھے۔ سرمد علی نے کہا۔ ''یہ میرے بہن بھائی ہیں۔ بھائی بڑی ماں سے ہے جو میری ماں بھی ہے۔ بہن چھوٹی ماں سے ہے۔''

''اس سے بڑی بہن ہے جو گھر میں تمہارے باپ کی خدمت کرتی ہے؟'' میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

''ارے نہیں......'' اس نے جھینپ کر جواب دیا۔ یکدم سرمد علی شرمندہ سا نظر آنے لگا تھا۔ ''وہ میری بہن نہیں ہے۔ میرے باپ کی تیسری بیوی ہے۔''

میں دم بخود رہ گیا تھا۔ ''بیوی ہے...... مگر وہ تو بہت کم عمر ہے۔ مشکل سے چودہ پندرہ سال کی ہوگی۔''

''ہمارے ہاں، ایسا ہی رواج ہے۔ میرے باپ کے پاس رقم تھی۔ اس نے اپنے لئے بیوی خرید لی۔ لڑکی کے گھر والوں کو صرف رقم سے مطلب ہوتا ہے۔ وہ مرد کی عمر وغیرہ نہیں دیکھتے۔''

''لیکن یہ تو ظلم ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا تھا۔

''ہاں ظلم تو ہے لیکن یہ ہمارے معاشرے کی روایات میں سے ہے۔'' سرمد علی نے اعتراف کیا۔ ''نہ جانے کب سے ایسا ہوتا آ رہا ہے اور کب تک ایسا ہوتا رہے گا!''

''تم اسے غلط سمجھتے ہو۔''

''اگرچہ ہماری مذہبی اور معاشرتی روایات کے لحاظ سے غلط نہیں ہے لیکن عورت کو خریدنے اور بیچنے کو میں نے کبھی اچھا نہیں سمجھا۔''

مجھے سچ مچ شاک لگا تھا، میں جسے اس معذور شخص کی بیٹی سمجھ رہا تھا، وہ اس کی بیوی نکلی۔ سرمد علی کا باپ کم سے کم بھی پینتالیس برس کا تھا یعنی اس لڑکی سے تین گناہ سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ وہ معصوم پھول جیسی لڑکی اپنے باپ کے عمر کے شخص کی بیوی تھی جو معذور بھی تھا۔ اسے کسی بے زبان مویشی کی طرح خرید کر سرمد علی کے باپ نے اپنے باڑے میں ڈال لیا تھا۔ وہ سرمد علی سے بھی چار پانچ سال چھوٹی تھی۔ میں باقی راستے خاموش رہا۔ راجا عمر دراز کا محل وادی کے ایسے حصے میں تھا جو سرمد علی کے گاؤں گلار سے نظر نہیں آتا تھا۔ وادی آگے جا کر خم کھا رہی تھی اور راجا عمر دراز کا محل اس حصے میں تھا۔ یہاں پر درجن بھر گھروں پر مشتمل ایک آبادی اور تھی، ان گھروں میں بسنے والے راجا عمر دراز کے ملازم تھے۔ اس کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ یہاں وادی بلند ہونے کے باوجود زیادہ ہموار تھی اور راجا کی زمین کم سے کم پچاس ایکڑ تھی۔ اوپر کے باغات اس کے علاوہ تھے۔ وسیع و عریض، لکڑی اور پتھر سے بنا یہ محل مقامی طرزِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ اس کے گرد پتھر سے بنی دس فٹ سے زیادہ اونچی چار دیواری تھی۔ پھاٹک فولادی اور کوئی بارہ فٹ چوڑا تھا۔ ستونوں پر شیروں کے سر نقش تھے۔ ایک طرف تختی لگی تھی جس پر راجا عمر دراز کا نام اور اس مقام کی بلندی سات ہزار دو سو بائیس فٹ بلند درج تھا۔ پھاٹک پر مسلح دربان تھے۔ سرمد علی نے ان سے مقامی زبان میں کچھ کہا اور انہوں نے پھاٹک کھول دیا۔ اندر رنگ و خوشبو کی ایک دنیا تھی۔ روش کے دونوں جانب رنگا رنگ اور شاید ہزاروں اقسام کے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ یہ عام قسم کے پھول نہیں تھے بلکہ ان میں سے بیشتر میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

''راجا صاحب کا یہ باغ بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے۔'' سرمد علی نے کہا۔ ''غیر ملکی سیاح اسے دیکھنے آتے ہیں۔ ان میں سے بعض اقسام کے پھول اور پودے صرف دس ہزار فٹ بلندیوں پر اگتے ہیں لیکن راجا صاحب نے کسی ترکیب سے انہیں اپنے باغ میں اگا لیا ہے۔'' کوئی ایک ایکڑ کا رقبہ باغ کے لئے مخصوص تھا۔ راجا عمر دراز کا محل اس پتھریلی چار دیواری کے تقریباً وسط میں تھا۔ عمارت بہت بڑی نہیں تھی لیکن پُرشکوہ تھی اس کی اوپری

منزل لکڑی کی تھی جس پر نفاست سے نقاشی کا کام کیا گیا تھا۔ نچلی منزل کے سامنے ایک بڑا سا چبوترا تھا جس پر سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا تھا۔ راجا صاحب اس چبوترے پر ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ انہیں ہماری آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔

''خوش آمدید میرے نوجوان مہمان!'' انہوں نے ہاتھ ملایا۔ ''مجھے اس علاقے میں اتنے کم عمر پاکستانی کو دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔''

''راجا صاحب میں ایک عام سا نوجوان ہوں اور میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ آپ کے تعارف کے لئے یہ باغ کافی ہے۔'' میں نے اپنا تعارف کرایا۔

راجا عمر دراز خاصا عمر رسیدہ تھا۔ اس کی عمر کم سے کم بھی ستر برس تھی۔ سرخی مائل تانبے جیسی رنگت، متوسط قد و قامت اور سفید بالوں اور مونچھوں کے ساتھ راجا عمر دراز کسی اسپینش فلم کا کردار لگ رہا تھا۔ اس نے جینز کی پتلون اور کھلی سی سفید شرٹ پہنی تھی۔ ہاتھ میں گھڑ سواری والی مخصوص چھڑی تھی۔ وہ شاید کہیں سے گھڑ سواری کر کے آ رہا تھا۔ چبوترے پر میز کے گرد کرسیاں رکھی تھیں۔ راجا نے ہمیں ان پر بٹھایا اور اپنے ملازم سے کچھ کہا۔ پھر مجھ سے بولا۔

''شہباز احمد! تم نے میری شخصیت کے بارے میں ادھورا اندازہ لگایا ہے۔ یہ پھول میری زندگی کا صرف ایک حصہ ہیں۔''

''میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔''

راجا مجھ سے میری تعلیم اور مشاغل کے بارے میں پوچھتا رہا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ مایوس تھا۔ عمر دراز بہترین اردو بولتا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تم اس طرف کیوں آئے ہو۔ لڑکے تو اس عمر میں لاہور اور کراچی جانا پسند کرتے ہیں۔''

''مجھے بڑے شہروں اور ہجوم سے وحشت ہوتی ہے۔ میں تو اپنے گاؤں میں بھی گوشہ تنہائی تلاش کرتا ہوں۔ پچھلے سال میں بڑے بھائی کے پاس گلگت گیا تھا، تب سے یہ پہاڑ مجھے اچھے لگتے ہیں۔''

''پہاڑ اچھے لگتے ہیں۔'' راجا نے پہلی بار دلچسپی سے مجھے دیکھا۔ ''کس لحاظ سے اچھے لگتے ہیں؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے سوچ کر جواب دیا۔ ''بس اچھے لگتے ہیں۔ مجھے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اپنی طرف بلا رہے ہیں۔''

''خوش قسمت ہو نوجوان!'' راجا عمر دراز نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔ ''یہ کیفیت کوئی کوئی ہی محسوس کرتا ہے۔ پہاڑ ہر ایک کو نہیں بلاتے...... اسے ہی بلاتے ہیں جسے اپنا کوئی بھید بتانا ہو۔ شہباز احمد، میری بات یاد رکھنا۔ تمہارا مقدر پہاڑوں سے جڑا ہے۔'' عمر دراز کے لہجے میں کوئی ایسی کیفیت تھی کہ میں ان الفاظ کی سنسنی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے پھر کہا۔

''ممکن ہے ابھی تم یہاں سے چلے جاؤ اور ممکن ہے طویل عرصے تک نہیں آؤ لیکن جن لوگوں کو پہاڑ کشش کرتے ہیں، وہ ان سے زیادہ دیر دور نہیں رہ سکتے، بالآخر وہ ان کے پاس آتے ہیں۔''

''کیا آپ کو بھی پہاڑ کشش کرتے ہیں؟''

''ہاں...... بدقسمتی سے اس علاقے میں چند ایک ہی ملیں گے جنہیں پہاڑ اچھے لگتے ہیں۔ بیشتر لوگ ایسے ہی جو پہاڑوں سے بے زار ہیں۔ کیونکہ یہ انہیں روٹی نہیں دے سکتے۔ بس موسم کی سختیاں اور رکاوٹیں دیتے ہیں۔ انہیں وہ سہولت نہیں ملتی ہے جو میدانی علاقے کے لوگوں کو عام ملتی ہیں لہٰذا یہ پہاڑوں سے شکوہ کرتے ہیں، انہیں موردِ الزام ٹھہراتے ہیں حتیٰ کہ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو ان نامہربان پہاڑوں سے دور چلے جائیں۔''

''یہ لوگ اس طرح سوچتے ہیں؟'' میں حیران ہوا تھا۔ ''شہروں میں رہنے والے تو اس طرف آنے کے لئے ترستے ہیں۔''

''وہ دوسری بات ہے، انہیں دور سے پہاڑوں کی خوبصورتی متاثر کرتی ہے۔ وہ آتے ہیں شہروں جیسے ہوٹلز میں رکتے ہیں۔ شہروں جیسی دکانوں سے شاپنگ کرتے ہیں اور شہروں جیسی سڑکوں پر چلتے پھرتے واپس چلے جاتے ہیں۔ مگر ایسے سرپھرے بھی آتے ہیں جو صرف پہاڑوں کے لئے آتے ہیں۔ وہ ان کی دشوار گزار بلندیوں کے پاس جاتے ہیں۔ ناہموار راستوں پر پیدل سفر کرتے ہیں۔ راتوں کو کھلے آسمان تلے سوتے ہیں، یہی اصل میں پہاڑوں کے شیدائی کہلانے کے مستحق ہیں۔ باہر سے آنے والے شیدائی زیادہ ہوتے ہیں۔ دنیا کے کونوں کھدروں سے ان پہاڑوں کے عاشق چلے آتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسے عاشق کم پائے جاتے ہیں۔''

راجا عمر دراز کو بولنے کا فن آتا تھا۔ اس عمر میں آ کر آدمی باتونی ہو جاتا ہے لیکن راجا کے انداز میں ایک چاشنی تھی۔ سننے والا بور نہیں ہوتا تھا۔ شاید اس نے میرے بارے میں جو کہا تھا وہ اپنی باتوں کو دلچسپ بنانے کے لئے کہا تھا ورنہ ان الفاظ کے خاص معنی نہیں تھے۔ پھر بھی میں ان الفاظ کی سنسنی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ کچھ دیر میں راجا کا ملازم چیری کا تھال لے کر آیا تھا۔ یہ پھل بلندی پر ہی ملتا ہے۔ اب اسے نیچے بھی کاشت کیا جانے لگا ہے لیکن جو لذت بلندی پر اُگنے والی چیری میں پائی جاتی ہے، وہ نیچے اگنے والی چیری میں نہیں پائی جاتی۔ بلندی سے نیچے لائے جانے پر یہ اتنی جلدی گل سڑ کر ختم ہو جاتا ہے کہ اسے میدانی منڈیوں تک رسائی کا موقع ہی نہیں ملتا ہے۔ چیری کے بعد خشک میوہ آیا اور آخر میں خوشبودار قہوہ، جو اس علاقے کی رواج بھی ہے اور ضرورت بھی۔

خاطر تواضع کے بعد راجا عمر دراز نے ہمیں اپنے محل کو اندر سے دیکھنے کی دعوت دی۔ چبوترے پر سے چند سیڑھیاں مزید چڑھ کر ہم صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اس طرف ایک گیلری تھی۔ جس کے دائیں بائیں کوئی نصف درجن دروازے تھے۔ گیلری کوئی پچاس فٹ لمبی تھی اور آگے جا کر دائیں بائیں دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ دیواروں کے ساتھ اخروٹ کی لکڑی سے بنی منقش میزیں تھیں جن پر مجسمے رکھے تھے، پتھر سے بنے یہ مجسمے شاید اس علاقے کی کسی پرانی تہذیب سے نکالے گئے تھے۔ ان کا انداز گندھارا تہذیب سے ملتا جلتا تھا۔ دیواروں پر روغنی تصاویر لگی تھیں۔ مجھے اگرچہ مصوری سے خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن راجا عمر دراز کا دل رکھنے کے لئے میں ان میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ہر تصویر کے سامنے کچھ دیر رکتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ مگر ایک تصویر نے مجھے بیچ بچ روک لیا۔ یہ عجیب وغریب سی تصویر تھی۔ اس میں مصور نے تخیلاتی جانوروں کو دکھایا تھا۔ دو بائی ڈھائی کے کینوس میں اوپر بادلوں سے سورج کی کرنیں نکل کر نیچے ایک اہرام نما سنہری عمارت پر گر رہی تھیں۔ اس عمارت کے دائیں جانب وہ دیومالائی مخلوق تھی جس کا جسم گھوڑے کا اور اوپری حصہ انسان جیسا تھا، اس کے ہاتھ

میں تیر کمان تھا۔ ایک طرف انسانی جسم اور شیر جیسے چہرے والی مخلوق تھی۔ سامنے والے حصے میں دو سفید گھوڑا، گھوڑی آپس میں اٹکھیلیاں کر رہے تھے اور ان کے ماتھے پر سینگ سے تھے۔ اس وقت مجھے ان سب باتوں کے بارے میں خاص علم نہیں تھا کیونکہ یہ سب مغربی دیومالائی تاثر تھا۔ بہرحال تصویر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

راجا عمر دراز بغور میری دلچسپی دیکھ رہا تھا۔ اس نے اچانک پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں یہ سب فرضی ہے؟''

''ظاہر ہے، اس قسم کے جانور ہماری دنیا میں کہاں پائے جاتے ہیں؟''

''برخوردار! بہت کچھ جو اس دنیا میں نہیں پایا جاتا، فرضی نہیں ہوتا ہے۔ ہر تخیل کے پسِ پشت کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور پائی جاتی ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے یہ جانور بھی حقیقت ہیں۔ دنیا میں کہیں پائے جاتے ہیں؟''

راجا عمر دراز مسکرایا تھا۔ ''تجربہ سننے سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے، تمہیں کبھی نہ کبھی ایسا تجربہ ہوگا۔ تب تم اس کی صداقت پر ایمان لاؤ گے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے لئے ہمارے ظاہری حواس ناکافی ہیں، بہت ساری چیزیں ہمیں اپنی اندر کی آنکھ سے دیکھنی پڑتی ہیں۔ بہت ساری آوازیں ہم ان ظاہری کانوں سے نہیں سن سکتے۔ انہیں ہمارے اندر کے کان سنتے ہیں۔ بہت ساری چیزوں کو ہمارا شعور نہیں جانتا ہے لیکن لاشعور جانتا ہے۔''

اس کی فلسفیانہ گفتگو ہمیں مرعوب کر رہی تھی۔ ظاہر ہے یہ گفتگو اٹھارہ انیس سال کے لڑکوں کی ذہنی سطح سے خاصی بلندی تھی۔ راجا عمر دراز ہمیں اندر لے گیا۔ ایک کمرا پتھروں کے لئے مخصوص تھا۔ وہ انوکھی ساخت کے اور قیمتی پتھر تھے۔ شیشے کے شوکیسوں میں محفوظ ان پتھروں میں کئی کلوگرام وزنی ناتراشیدہ زمرد تھا۔

''یہ دنیا کا سب سے بڑا زمرد ہے جو پاکستان کی ایک کان سے نکلا ہے۔'' عمر دراز نے بتایا۔ ''ممکن ہے اس کی قیمت کئی لاکھ ڈالرز ہو۔''

''میرے خدا!'' میرے منہ سے نکلا تھا۔ ''تب آپ نے اسے فروخت کیوں نہیں کر دیا؟''

''میرے لئے یہ نادر ہے۔'' عمر دراز بولا۔ ''اس کی قیمت میرے لئے بے کار ہے۔ میرا اعزاز تو یہ ہے، دنیا کا سب بڑا زمرد میرے پاس ہے۔ آؤ میں ایک چیز اور دکھاؤں۔''

ایک شوکیس پر کپڑا پڑا تھا۔ راجا عمر داز نے اس پر سے کپڑا ہٹایا تو اندر ایک طشتری میں شتر مرغ کے انڈے کے سائز کا بالکل سیاہ پتھر تھا۔ اس کا رنگ اس قدر کالا تھا کہ اسے دیکھنے کے لئے بھی غور کرنا پڑتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ پتھر روشنی جذب کر رہا ہو۔ ''یہ کیا چیز ہے راجا صاحب!'' سرمد علی بولا۔

''یہ بات میں بھی نہیں جانتا۔ میں نے چند ماہرین کو بھی دکھایا ہے لیکن وہ بھی اس کی ماہیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس کی عجیب خاصیت تم ابھی دیکھو گے۔ اس وجہ سے اس کے شوکیس پر کپڑا پڑا رہتا ہے۔''

راجا عمر دراز کے اس محل میں بجلی تھی جو ظاہر ہے، جنریٹر سے پیدا کی جا رہی تھی کیونکہ اس پورے علاقے میں میلوں تک بجلی کا نام و نشان نہیں تھا۔ راجا نے شوکیس کے اوپر لگا بلب جلا دیا، اب سیاہ پتھر پر تیز روشنی پڑ رہی

تھی۔ کئی منٹ گزر گئے اور ہم ساکت کھڑے پتھر کو گھور رہے تھے۔ مجھے بے چینی ہونے لگی اور مزید کئی منٹ گزرنے کے بعد میں گلا صاف کر کے راجا عمر دراز سے اس پتھر کی عجیب خاصیت کے بارے میں پوچھنے جا رہا تھا کہ مجھے کچھ محسوس ہوا۔ پتھر میں کوئی تبدیلی آئی تھی۔ یہ میرا وہم تھا سچ مچ اس کی سیاہی کم ہو رہی تھی، ناقابل یقین...... پتھر سچ مچ رنگ بدل رہا تھا۔ میں نے سرمد علی کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بھی وہی کچھ دیکھ رہا ہے جو میں دیکھ رہا تھا۔ پتر کی سیاہی کم ہو رہی تھی اور کہیں کہیں سفید لہری نمودار ہو کر غائب ہو جاتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان سفید لہروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اب پتھر پر تربوز جیسی دھاریاں بن کر کٹ رہی تھیں۔ پھر سیاہی کم ہونے لگی اور سفیدی اس پر غالب آ گئی۔ اندر رہ کر سفید لہریں اٹھ رہی تھی تب مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ یہ پتھر نہیں کسی شفاف مادے سے بنا خول تھا جس میں کوئی سیال بھرا تھا۔ مشکل سے پندرہ منٹ کے اندر اس کی ساری سیاہی ختم ہو گئی تھی اور سفید چمک دار پانی یا مائع صاف نظر آ رہا تھا اور اس کی سفیدی بتدریج بڑھ رہی تھی۔ اچانک عمر دراز نے دیوار پر لگا ایک سوئچ دبایا اور کمرے کے تمام بلب بجھ گئے تھے مگر روشنی تھی۔ یہ روشنی اس پتھر نما خول والی شے کے سیال سے نکل رہی تھی اور اتنی تیز تھی کہ ہم ایک دوسرے کے چہرے واضح طور پر دیکھ سکتے تھے۔ مارے حیرت کے میں اور سرمد علی گنگ تھے۔ ہم اس کے بارے میں پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔ چند منٹ تک تو اس گولے کی روشنی برقرار رہی لیکن پھر رفتہ رفتہ مدھم پڑنے لگی۔ اب اس کی سفیدی پر سیاہی پھر سے چھا رہی تھی۔ حتیٰ کہ روشنی اتنی کم ہو گئی کہ گولے کے آس پاس ہی محدود ہو گئی۔ چٹ کی آواز کے ساتھ کمرے میں روشنی ہو گئی تھی۔ راجا عمر دراز نے بھاری مخملیں کپڑا دوبارہ شوکیس پر ڈال دیا۔

"یہ کچھ بھی نہیں ہے، اگر اسے سورج کی روشنی دو تو یہ رات کئی گھنٹے تک چمکتا رہتا ہے اور جب اس کی چمک عروج پر ہو تو اسے دیکھنا بھی سورج کو دیکھنے کی طرح مشکل ہو جاتا ہے۔"

"اس کے اندر سیال بھرا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں...... کئی بار میں نے سوچا کہ اس کا خول توڑ کر اسے دیکھوں...... لیکن اس خیال سے رک جاتا ہوں کہ کہیں یہ عجوبہ شے ضائع نہ ہو جائے۔"

"آپ اس کے مالک ہیں لیکن ہمارے لئے اس کا دیدار ہی کسی عجوبے سے کم نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"میں سرمد علی کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے آپ سے ملوایا۔"

"نوجوان! تم جب تک یہاں ہو، روز مجھ سے ملنے آ سکتے ہو۔ اگر سرمد علی تمہیں اپنا مہمان نہ بنا چکا ہوتا تو میں تمہیں مہمان بنا کر خوشی محسوس کرتا۔ مجھے پہاڑوں سے محبت کرنے والے لوگ اچھے لگتے ہیں۔"

راجا عمر دراز نے ہمیں باقی محل دکھایا لیکن اور کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ ہم واپس چبوترے پر آ گئے۔ راجا عمر دراز نے کھانے پر رکنے کے لئے کہا لیکن سرمد علی نے انکار کر دیا۔ "راجا صاحب! مجھے اپنے دوست کو وادی کے اور حصے بھی دکھانے ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... لیکن کل دوپہر کا کھانا تم دونوں میرے ساتھ کھاؤ گے۔"

"منظور ہے۔" سرمد علی بولا۔ "اب ہمیں اجازت دیں راجا صاحب!"

راجا عمر دراز نے ہاتھ ملا کر ہمیں چبوترے سے ہی رخصت کر دیا تھا۔ پھاٹک کی طرف آتے ہوئے میں

نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ مسلح دربانوں نے پھاٹک کھولا۔

''لگتا ہے راجا صاحب اپنے نوادرات کی وجہ سے خاص حفاظت کرتے ہیں۔''

''نہیں یہ تو روایت ہے۔'' سرمد علی بولا۔ ''یہاں کون چرانے آئے گا۔ وادی کے برے لوگ بھی راجا صاحب کا احترام کرتے ہیں۔''

''باہر سے آ کر کوئی چرا سکتا ہے۔ اگر راجا صاحب ہر اجنبی کو اپنے نوادرات دکھا دیتے ہیں تو یہ خطرے والی بات ہے۔''

''اوّل تو تم اجنبی نہیں ہو، میں تمہیں لے کر گیا تھا۔ راجا صاحب مجھ پر اعتماد کرتے ہیں کہ میں کسی غلط آدمی کو لے کر نہیں آ سکتا۔ دوسرے وہ ہر کسی کو اپنے نوادرات نہیں دکھاتے۔ نہ جانے کیوں وہ تم پر اتنے مہربان ہو گئے ہیں۔ میں کتنی ہی بار راجا صاحب کے نوادرات والے کمرے میں جا چکا ہوں اور آج پہلی بار اس پتھر کو دیکھا ہے۔''

''راجا صاحب تم پر بھی مہربان ہیں۔''

''وہ میرے محسن ہیں۔ مجھے انہوں نے ہی تعلیم دلائی ہے۔ میرے تعلیم کے تمام اخراجات وہی برداشت کر رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ وادی کے بچوں کے لئے اسکول قائم کریں۔ میرے علاوہ اور بھی کئی لڑکوں کی تعلیم کا ذمہ راجا صاحب نے اٹھا رکھا ہے، جو اپنی تعلیم مکمل کر کے یہاں پر بچوں کو پڑھائیں گے۔''

''راجا صاحب سچ مچ بڑے آدمی ہیں۔''

''ہاں...... لیکن لوگ انہیں دھوکا دے جاتے ہیں۔ وادی کے ایک لڑکے کو راجا صاحب نے اپنے خرچ پر میڈیکل کی تعلیم دلوائی اور جب اس نے تعلیم مکمل کر لی تو وادی میں آ کر لوگوں کا علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ یہاں ڈاکٹر کی اشد ضرورت ہے۔ وقتِ ضرورت راجا صاحب لوگوں کو قرض بھی دیتے ہیں۔ وہ لوگوں کی اضافی فصلیں بھی خرید لیتے ہیں کیونکہ ان کی فصلیں ٹرکوں کے ذریعے شہروں کی طرف جاتی ہیں۔''

یعنی راجا صاحب نیک نامی بھی کما رہے تھے اور دولت بھی۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اس طرح وادی کے لوگوں کو اپنا احسان مند بنا کر اپنا کام نکال رہے تھے لیکن سرمد علی کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک طرف وادی کے لوگوں کے کام آتے تھے تو دوسری طرف ان سے فائدہ بھی اٹھا رہے تھے۔ سرمد علی مجھے مزید بلندی کی طرف لے جا رہا تھا۔ اب پہاڑی ڈھلانوں پر گھنے جنگلات تھے۔ پانچ فٹ قطر کے ستر اسی اور بعض اوقات سو فٹ سے زیادہ بلند دیودار اور چیڑ کے درخت تھے۔ بلندی پر سفید برف بھی تھا۔ جن کے سفید سرے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ بعض افراد درختوں سے شاخیں کاٹ کر رہے تھے۔

''حکومت نے اس علاقے میں درخت کاٹنے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ دس سال پہلے سرکاری ٹھیکے دار آ کر درخت کاٹ کر لے جاتے تھے۔ اس سے جنگلات کو بہت نقصان ہوتا تھا۔ پھر پابندی لگ گئی تو جنگلات دوبارہ بڑھ گئے۔ وادی کے لوگ نئے درخت لگاتے ہیں اور پرانے درختوں سے صرف شاخیں کاٹتے ہیں۔ یہ لکڑی جلانے اور معمولی مرمت کے کاموں میں استعمال ہوتی ہے۔''

''اور تعمیراتی کاموں کے لئے لکڑی کہاں سے آتی ہے؟''

''اکثر لوگوں نے اپنی نجی زمینوں پر درخت لگا رکھے ہیں۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو ان درختوں سے لکڑی لیتے ہیں۔''

بلندی پر لکڑہاروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ جس میں درجن بھر گھر تھے۔ جب برف باری شروع ہوتی تو یہ اپنے گھر چھوڑ کر نیچے وادی میں چلے جاتے تھے اور جب برف پگھلتی تو یہ واپس آ جاتے اور لکڑی کاٹ کر گزارہ کرتے تھے، نیچے وادی میں انہوں نے ایک بڑا سا مشترکہ گھر بنا رکھا تھا۔ یہ ایک ہی خاندان کے لوگ تھے اس لئے مل جل کر رہتے تھے۔ لکڑی کاٹ کر بیچنا اور گھر بنانا ان کے روزگار کا ذریعہ تھا لیکن یہ بڑھئی نہیں تھے۔ سرمد علی نے مجھے ان کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا، گھروں کے قریب جا کر اس نے کرم نامی کسی شخص کو آواز دی۔ ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا باہر آیا تھا۔ وہ گرم جوشی سے مقامی زبان میں کچھ کہتا سرمد علی کے گلے لگ گیا خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد سرمد علی نے ہمارا تعارف کرایا۔ لڑکے نے پھر مقامی زبان میں کچھ کہہ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور بھاگ کر ایک چارپائی لے آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس بلندی پر ہوا میں خنکی تھی لیکن ساتھ ہی دھوپ بھی تیز تھی۔ میں نے دیکھا، کرم کی جلد جگہ جگہ سے جھلسی ہوئی تھی۔ یہ دھوپ میں زیادہ دیر رہنے کا نتیجہ تھا پھر وہ ہمارے لئے وہی گاڑھا دہی لے آیا جو اصل میں مقامی لسی تھی۔ اسے پی کر حسبِ معمول میں نے تازگی اور فرحت محسوس کی تھی۔ کرم اردو زبان سے نابلد تھا اس لئے سرمد علی مترجم کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ لڑکا میرے بارے میں متجسس تھا اور سرمد علی اس کی تشفی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ہمارے لئے روٹی اور مختلف سبزیوں کا ایک مجموعہ لایا، جس میں ابلے گوشت کے ٹکڑے تھے۔ ترکاری پھیکی تھی لیکن بھوک کی وجہ سے مزہ آیا تھا۔ بلندی کی وجہ سے ہر شے ادھ گلی تھی کیونکہ بلندی پر کم دباؤ کی وجہ سے پانی سو ورجے سینٹی گریڈ سے کم پر کھول جاتا ہے اس لئے ابال کر بنائی جانے والی اشیاء ادھ گلی رہ جاتی ہیں۔ بہرحال چل چل کر میری بھوک چمک گئی تھی اس لئے میں نے سیر ہو کر کھایا۔

کرم نامی یہ لڑکا سرمد کا بچپن کا دوست تھا اور سرمد علی جب آتا تھا، اس سے ملنے ضرور آتا۔ جب ہم اس کے پاس سے چلنے لگے تو وہ بھاگا ہوا اندر گیا اور اس نے سرمد علی کو شہد سے بھری ایک بڑے سائز کی بوتل دی۔ یہ شہد اس نے خود چھتے سے اتارا تھا۔ اس دوران میں کوئی درجن بھر مکھیوں نے اسے اپنے ڈنک سے نوازا تھا۔ اس نے ہمیں نشانات بھی دکھائے تھے۔ سرمد علی نے راستے میں بتایا۔ ''کرم نے اس میں سے آدھا شہد تمہیں دیا ہے۔ وہ معذرت کر رہا تھا کہ اس کے پاس مزید شہد نہیں ہے ورنہ تمہیں الگ سے دیتا۔''

''میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کرنا اور میرے حصے کا شہد بھی تم رکھو...... میں کہاں لے کر جاؤں گا۔''

''اپنے گھر اور کہاں!'' سرمد علی نے ذرا تعجب سے کہا تھا۔

''میں فی الحال وہاں نہیں جا سکتا۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا تھا۔ ''اور ممکن ہے مجھے واپسی کی اجازت بھی نہ ملے۔''

''کیوں...... وہ تمہارا گھر ہے؟''

مجھے لگا کہ اگر میں نے کسی کو نہ بتایا تو شاید میرے دل کا بوجھ بڑھتا جائے گا۔ میں ایک درخت تلے رک

گیا اور رفتہ رفتہ سرمد علی کو اپنی کہانی سنا دی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کر لی تو وہ دوبارہ چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا اور ہم وادی میں اترنے لگے۔ اگرچہ سرمد علی نے میری داستان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کوئی بات کی تھی لیکن میں اندر کی بات کہہ کر ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ راجا عمر دراز کے محل کے پاس سے گزرے تو اندر سے ملی جلی خوشبوئیں باہر تک محسوس کی جا سکتی تھیں۔ راجا عمر دراز بھی اپنی طرح کا انوکھا انسان تھا جیسے اس کے محل میں انوکھے نوادرات موجود تھے۔ اس نے محل کے پھاٹک کے دونوں طرف شاہ بلوط کے درخت لگوائے تھے۔ جب ہم نیچے پہنچے تو سایہ وادی پر چھا چکا تھا اور سورج کی روشنی صرف بلند چوٹیوں پر رہ گئی تھی۔ مویشی چرانے والے اپنے جانور اور کسان ہل بیل لے کر گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ مکانوں کی چمنیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ یعنی رات کے کھانے کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔

دھوپ رخصت ہوتے ہی خنکی میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ سرمد علی مجھے اندر لے گیا۔ اندر باورچی خانے سے اٹھنے والا دھواں بھرا تھا۔ سرمد علی کا باپ بھی حسبِ معمول حقہ گڑگڑا رہا تھا اور اس نے میرے سلام کا جواب بھی حقے کی گڑگڑاہٹ سے دیا تھا۔ وہ بے حد گھٹیا درجے کا تمباکو یا سڑا ہوا خمیر استعمال کرتا تھا کیونکہ حقے سے بے حد ناگوار بو اٹھ رہی تھی۔ یہ پورا گھر بند اور گھٹا ہوا تھا۔ ایک تو ان لوگوں کا طرزِ تعمیر ایسا تھا۔ پورے گھر میں آمدورفت کے لئے ایک دروازہ تھا۔ دوسرا واحد راستہ چمنی کا تھا جس سے چولہے کا دھواں باہر جاتا تھا۔ اندر کی فضا کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ کچھ بچت اور کچھ موسم کی خنکی کو روکنے کے لئے یہ لوگ مکانات میں کھڑکیاں اور روشن دان نہیں بناتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وادی کے اکثر باشندے کمزور صحت رکھتے تھے۔ ان کے چہروں پر بے رونقی اور آنکھیں اندر دھنسی تھیں۔ اس کا سبب غربت نہیں بلکہ یہ تنگ و تاریک مکانات تھے۔ گرمیوں میں بھی وہ بارہ گھنٹے اندر رہتے تھے اور سردیوں کے پانچ مہینے تو شاذ و نادر ہی ان مکانوں سے باہر آتے تھے۔ لکڑی جلنے سے پیدا ہونے والا زہریلا دھواں اندر بھر جاتا تھا اور یہ ایسی زہریلی فضا میں سانس لیتے تھے حالانکہ ذرا سی کوشش سے وہ اپنے گھروں میں تازہ ہوا کی آمدورفت کا انتظام کر سکتے تھے۔ مگر شعور کی کمی اور جہالت کی وجہ سے وہ اپنے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ جب ڈیڑھ درجن کے قریب افراد اس بند جگہ سانس لیتے ہوں گے تو گھٹن کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سارا دن کھلی فضا میں گزارنے کے بعد سرمد علی کے تنگ مکان میں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ ملک وال میں ہماری حویلی کے کمرے کھلے اور کشادہ تھے۔ ہر کمرے میں دروازوں کے ساتھ کھڑکیاں بھی تھیں۔ مجھے پہلی بار کسی ایسی جگہ رہنے کا تجربہ ہو رہا تھا جو بند در بند اندر تھی۔ یہ سوچ کر کہ مجھے ابھی کئی دن یہاں رہنا ہے، ابھی سے مجھے کچھ ہونے لگا تھا۔ رات کا کھانا یہ لوگ بھی جلدی کھا لیتے تھے یعنی سات بجے تک۔ اندر آتے ہی کچھ دیر بعد کھانا آ گیا۔ اس بار بھی میں نے کھل کر کھایا تھا۔ شاید یہ پہاڑوں پر چڑھنے اترنے کی مشق کا نتیجہ تھا کہ کھایا پیا فوراً ہضم ہو جاتا تھا یا شاید پھر اس وادی کے معدنی پانی کا کرشمہ تھا جو معدے کو لکڑ ہضم پتھر ہضم بنا دیا تھا۔ کھانے کے بعد قہوہ آیا اور پھر میں نے سرمد علی سے باہر چلنے کی فرمائش کی۔

''اس وقت......؟'' وہ حیران ہوا تھا۔ ''باہر خاصی سردی ہوگی۔''

''کوئی بات نہیں یار! مجھے اندر گھٹن ہو رہی ہے۔''

''اچھا......لیکن گرم چادر لے لو۔ ورنہ سردی لگ جائے گی۔''

اوڑھ لپیٹ کر ہم باہر نکلے۔ سرمد علی کا باپ حیران ضرور نظر آ رہا تھا لیکن اس نے ہم سے کوئی سوال نہیں کیا۔ باہر واقعی سردی تھی۔ جیسی سردی ہمارے علاقے میں آخر نومبر میں پڑتی تھی یہ ویسی ہی قابل برداشت قسم کی سردی تھی۔ میں نے باہر کی کھلی فضا میں چند سانس لئے تو سینہ کشادہ ہو گیا تھا۔ میں نے سرمد علی سے کہا۔ ''یار! کیا میں رات کو باہر نہیں سو سکتا؟''

''صبح تک نمونیا ہو جائے گا۔'' وہ ہنسا۔ ''اسے معمولی سردی مت سمجھنا۔ ویسے بھی تم نیچے علاقے کے رہنے والے ہو، مقامی لوگ تو برداشت کر سکتے ہیں، تم نہیں کر سکتے۔''

''مجھے اندر وحشت ہو رہی ہے۔ کل رات تو میں تھکن کی وجہ سے سو گیا تھا لیکن آج...... ہرگز نہیں، تم مجھے ادھر ہی چارپائی ڈال دو۔ میں جیکٹ پہن کر اور گرم چادر اوڑھ کر سو جاؤں گا۔''

میرا اصرار سن کر سرمد علی سوچ میں پڑ گیا تھا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ایک کام ہو سکتا ہے۔ ذرا اوپر ہمارا باغ ہے، اس میں ایک چھوٹی سی کوٹھری ہے۔ میں وہاں قالین اور بستر بچھا دیتا ہوں۔ تم وہاں سو سکتے ہو اور سردی سے بھی بچ جاؤ گے لیکن یار! مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ میں اپنے مہمان کو وہاں ٹھہراؤں۔''

''تم بالکل فکر نہ کرو۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''بلکہ میں اس کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں گا۔''

''اچھا تم رکو، میں قالین اور بستر لاتا ہوں۔ تم کہو تو انگیٹھی بھی لے آؤں، رات کو سردی لگے تو جلا لینا؟''

''اس کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن تمہیں کوئی مسئلہ نہ ہو تو لے آؤ۔''

''نہیں، مجھے کیا مسئلہ ہو گا!'' سرمد علی اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کوئی لڑکی دروازے سے نکلی۔ ایک برتن لے کر مکان کے عقبی حصے میں چلی گئی۔ میں نے اس پر غور نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد وہ برتن میں کچھ لئے اندر جانے لگی تب میں نے اسے پہچانا، وہ سرمد علی کی کی تیسرے نمبر کی ماں تھی۔ ویسے میں نے سرمد علی کی پہلی اور دوسری ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اندر ہی رہا کرتی تھیں۔ سرمد علی کے بعد تین بہنیں تھیں اور ان میں سے ایک کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ دو ابھی شادی کے قابل ہوئی تھیں اور سرمد علی کا باپ جلد از جلد ان کے دام بھی کھرے کر لینا چاہتا تھا۔ یہ سب مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد سرمد علی اندر سے برآمد ہوا، اس نے قالین اور تہ کیا ہوا بستر مع ایک کمبل کے اٹھا رکھا تھا۔ میں نے اس سے کمبل اور بستر لے لیا۔ باغ مکان سے کوئی دس میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس کے گرد بھی پتھروں سے بنی چار دیواری تھی۔ اندر اخروٹ، خوبانی اور آڑو کے درخت لگے تھے۔ ایک آدھ سیب اور آلو بخارے کا بھی تھا۔

سرمد علی نے پہلے وہاں رکھا مٹی کے تیل کا لیمپ جلایا اور پھر کوٹھری کی صفائی کرنے لگا۔ کوٹھری کا فرش کچا تھا جس پر لکڑی کے تختے رکھ دیئے گئے تھے۔ دیواریں کچی مٹی سے اٹھائی گئی تھیں اور چھت پر بھی لکڑی کے تختے لگا کر مٹی سے ڈھلوان چھت بنائی گئی تھی۔ کوٹھری میں اوزار اور سامان رکھا جاتا تھا۔ مگر فی الحال وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ صفائی کر کے سرمد علی نے قالین بچھایا اور اس پر بستر بچھا دیا۔ پھر جا کر لوہے سے بنی انگیٹھی لایا اور اس میں لکڑی کا کوئلہ بھر دیا۔ مٹی کے تیل کی بوتل اور ماچس پاس رکھ دی تھی۔

''اگرچہ یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن تم دروازہ بند کر لینا۔ کبھی کبھی پہاڑوں سے بھیڑیے اور ریچھ بھی

اس طرف آ جاتے ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں دروازہ بند کرلوں گا۔"

سارا دن مٹرگشت کے بعد ہم دونوں ہی تھک گئے تھے۔ سرمد علی کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ مگر چند منٹ بعد آ کر پانی کی بوتل اور گلاس دے گیا۔ مجھے نیند آ رہی تھی۔ باہر کی خنک ہوا دروازے سے بتدریج اندر آ کر کوٹھری کو بھی ٹھنڈا کر رہی تھی۔ مگر مجھے یہ بھی اچھی لگ رہی تھی۔ میرا دروازہ بند کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بستر میں گھس کر میں نے کمبل اوڑھ لیا تو سردی بالکل معمولی سی رہ گئی تھی لہٰذا میں اطمینان سے سو گیا۔ بغیر اس گمان کے کہ یہ میری زندگی کی ایک اور حیرت انگیز رات ثابت ہوگی جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا۔

گہری نیند کے باوجود رات کسی وقت مجھے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ خطرے کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ سرمد علی نے بھیڑیے اور ریچھ کا ذکر کیا تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر میرا خیال ان کی طرف گیا مگر بھیڑیا یا ریچھ کیروسین لیمپ نہیں بند کر سکتے۔ یہ کسی انسان کا کام تھا جو میرے نزدیک تھا اور میں اس کی گہری سانسوں کو صاف محسوس کر رہا تھا۔ میرے پیٹ کے قریب اس کا ہاتھ کمبل کے اوپر رینگ رہا تھا۔ میں نے تڑپ کر اسے پکڑ لیا اور پھر اتنا ہی تڑپ کر اسے چھوڑ دیا۔ میرے بازوؤں میں ایک نسوانی وجود آیا تھا۔ میں نے کمبل کو چھوڑ دیا تھا لیکن کمبل مجھ سے لپٹا جا رہا تھا۔ میں اسے دور کرنے کی جتنی کوشش کر رہا تھا، وہ اتنی ہی گھستی چلی آ رہی تھی۔ اس دوران میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی دبلی اور نازک اندام سی عورت بلکہ لڑکی تھی۔ اس کے جسمانی خدوخال لڑکیوں کے سے تھے۔

"کون..... کون ہو تم؟ یہ کیا حرکت ہے؟" میں اس سے زور آزمائی میں ہانپ گیا۔ ہانپنے کی وجہ کمزوری نہیں بلکہ اس کے وہ عزائم تھے جو اس تاریکی میں بھی بالکل واضح تھے۔ میرے اندر کا مرد کمزور پڑنے لگا تھا اور ممکن تھا میں اس کی خاموشی لیکن پُرعزم پیش قدمی کے آگے ہار مان جاتا مگر اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ میں شریف ماں، باپ کی اولاد تھا۔ بے شک میں ایک ضد کی وجہ سے گھر سے بھاگ آیا تھا لیکن اپنی شرافت پھینک نہیں آیا تھا، یہ عورت کیا مجھے لوٹ کا مال سمجھ رہی تھی؟ میں اس کی گناہ گار خواہش کے آگے جھک جاتا تو اپنے ماں باپ کے سامنے کیا منہ لے کر جاتا! میں نافرمان ضرور تھا لیکن خطا کار نہیں تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اسے پوری قوت سے دھکیل دیا تھا۔ پھر میں نے کمبل ایک طرف پھینک کر اندازے سے ماچس تلاش کی اور اس کی تیلی جلا کر عورت کی طرف دیکھا۔ جو الجھے الجھے انداز میں سانس لے رہی تھی۔ یہ سرمد علی کی تیسری ماں تھی، اس کے باپ کی کمسن بیوی جو رات کی اس تاریکی میں اپنے جذبات کی تسکین کے لئے بے باکی سے یہاں تک چلی آئی تھی۔ میں دم بخود سا اسے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ ماچس کی تیلی میری انگلیوں میں بجھ گئی۔ تاریکی ہوتے ہی اس نے ایک بار پھر میری طرف آنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے روک دیا۔ "دور رہو مجھ سے۔ میں شریف آدمی ہوں اور میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے۔"

مگر یا تو وہ اردو نہیں سمجھتی تھی یا پھر اپنے جذبات کی زبان کے آگے کچھ اور نہیں سننا چاہتی تھی بلکہ یہی بات تھی ورنہ میرے الفاظ نہ سہی لیکن جسمانی ردِّعمل اسے سمجھانے کے لئے کافی تھا۔ ممکن ہے وہ اس سے پہلے بھی کسی کے ساتھ یہی کھیل کھیل چکی ہو اور اسے اپنی قوتِ تسخیر پر یقین ہو۔ ممکن ہے مرد جلد یا بہ دیر اس کے سامنے ہتھیار

ڈال دیتے ہوں۔ مگر اول تو میں ان مردوں میں سے نہیں تھا دوسرے اس کی صورت دیکھنے کے بعد یہ ناممکن تھا۔ سرمد علی کی ماں ہونے کے ناتے وہ میرے لئے قابلِ احترام تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ کسی صورت قابو میں نہیں آ رہی ہے تو میں نے اسے ایک طرف دھکیلا اور باہر نکل گیا۔ جب تک وہ اٹھ کر باہر آتی، میں درختوں میں روپوش ہو گیا تھا۔ وہ باہر آ کر پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگی اور دبی دبی زبان میں میرا نام لے رہی تھی۔

''شہباز......شہباز! تو م کدرا ے؟''

اس کے انداز سے لگ رہا تھا وہ کسی حد تک اردو جانتی تھی۔ یعنی میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا تو وہ میری بات بھی سمجھ رہی تھی۔ میں درختوں میں دم سادھے کھڑا تھا۔ وہ چند لمحے چکراتی رہی پھر مکان کی طرف چلی گئی تھی۔ آسمان پر شاید نویں دسویں کا چاند تھا اور ستارے بھی بے حد چمک دار تھے۔ وہ مجھے اس وقت تک نظر آئی جب تک نشیب میں اپنے مکان کے دروازے کی طرف نہیں چلی گئی۔ اس کے غائب ہونے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ باہر کتنی شدت کی ٹھنڈ تھی۔ میں کوٹھری کی طرف لپکا اور دروازہ اس بار اندر سے بند کر لیا۔ ماچس میرے پاس تھی۔ میں نے پہلے کیروسین لیمپ جلایا۔ کھلے دروازے سے سرمد علی کی سوتیلی اور کمسن ماں ہی نہیں بلکہ یخ ہوا بھی اندر گھس آئی تھی۔ میں نے مٹی کا تیل چھڑک کر انگیٹھی میں رکھے کوئلوں کو آگ دکھا دی۔ چند لمحے بعد اندر دھواں بھرا تو میں نے انگیٹھی باہر رکھ دی۔ جب شعلے بجھ گئے اور کوئلے انگاروں میں بدل گئے تو میں انگیٹھی واپس کوٹھری میں لے آیا۔

اس واقعے نے میرے ہوش اُڑا دیئے تھے۔ ابتدائی ردِعمل کے بعد جب میں نے ذرا سنبھل کر اس پر غور شروع کیا تو خاصی سردی میں بھی مجھے پسینے آنے لگے تھے۔ شکر ہے کسی نے اس کو آتے یا جاتے نہیں دیکھا ورنہ اب تک شور مچ چکا ہوتا۔ اس قسم کے معاشرے میں معمول سے ہٹ کر کوئی بات نظر انداز نہیں کی جاتی ہے۔ بلکہ اسے فوری طور پر الم نشرح کر دیا جاتا ہے۔ میری خوش قسمتی کہ کسی نے اسے آتے یا جاتے نہیں دیکھا۔ لیکن ابھی میں یہیں تھا اور وہ دوبارہ کوشش کر سکتی تھی یا مجھ سے اپنی ناکامی کا انتقام لینے کے لئے کوئی اوچھی حرکت کر سکتی تھی۔ گویا میں مستقل خطرے میں تھا۔ اگر میں کسی چکر میں آ جاتا تو گلوخلاصی مشکل تھی۔ یہ لوگ عزت وغیرت کے معاملات میں ہم میاں والیوں سے کم نہیں تھے۔ بچپن سے ایسے واقعات پر میں نے قتل و خون ہی ہوتے دیکھے ہیں۔ بے شک میں بے قصور بھی ہوتا تب بھی مارا جاتا۔ مرد پر صرف الزام لگنا بھی کافی ہوتا ہے اس کے بعد انصاف کی کارروائی پبلک اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ شہر ہو تو مبینہ مجرم کی ہڈی پسلی ضرور ایک کر دی جاتی ہے جبکہ دیہی علاقے میں پولیس کی آمد سے پہلے خاتمہ بالخیر کیا جا چکا ہوتا ہے۔ میں نے خود سے کہا۔

''بیٹے شہباز ملک! اس سے پہلے کہ خاتون ٹرائی، ٹرائی اگین کے فارمولے پر عمل کرے تم اپنا بوریا بستر گول کر لو اور صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔''

سرمد علی سے بہانہ کیا جا سکتا تھا مثلاً مجھے ماں باپ یاد آ رہے تھے اور میں ان سے معافی مانگنے کے لئے فوری طور پر جا رہا ہوں یا میں نے آرمی جوائن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگرچہ دونوں باتیں سرمد علی کے لئے یوٹرن ہوتیں لیکن وہ مجھے روک نہیں سکتا تھا۔ فیصلہ کر کے میں مطمئن ہو گیا تھا اور انگیٹھی سے کوٹھری خاصی گرم ہو گئی تھی اس لئے میں کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ صبح جب سو کر اٹھا تو گلا جکڑا ہوا تھا اور سر میں درد ہو رہا تھا۔ درد کی شدت

سے جیسے سر میں ڈھول بج رہے تھے لیکن جب مجھے صبح سے جاگ آئی تو اندازہ ہوا کہ کوئی کوٹھری کا دروازہ بجا رہا تھا۔ بمشکل کمبل سے نکلا تو اندازہ ہوا صرف سر میں ہی نہیں، سارے جسم میں... ہے۔ گویا رات کی ٹھنڈ اثر کر گئی تھی۔ میں کوئی پندرہ منٹ تک کوٹھری سے باہر یخ فضا میں رہا تھا۔ معمولی کپڑوں کی وجہ سے ٹھنڈ جسم میں سرایت کر گئی تھی۔ اس وقت تو اندازہ نہیں ہوا لیکن اب پتا چل رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سرمد علی میری صورت دیکھتے ہی بھانپ گیا تھا۔

''تم رات کو باہر نکلے تھے؟'' اس نے میرا ماتھا چھوا۔ ''دیکھا، سردی لگ گئی ناں......اب پتا چلا، یہاں کے لوگ ایسے تنگ و تاریک مکانوں میں کیوں رہتے ہیں؟''

''بس یار! رفع حاجت کے لئے نکلا تھا اور ایسی خاص سردی بھی نہیں تھی۔'' میں نے مسکرا کر قدم آگے بڑھایا تو زمین اور آسمان گھوم کر رہ گئے۔ اگر سرمد علی نے مجھے نہ تھام لیا ہوتا تو نیچے گر جاتا۔ وہ مجھے سہارا دے کر باہر لایا اور آسمان تلے پڑی چارپائی پر لٹا دیا۔

''یہاں کی ٹھنڈ محسوس نہیں ہوتی لیکن چپکے سے جسم میں اتر جاتی ہے۔'' اس نے اندر سے مجھے کمبل لا کر اوڑھا دیا۔ ''ابھی اٹھنا مت، تمہیں باقاعدہ علاج کی ضرورت ہے۔ بلندی پر بعض اوقات معمولی سی بیماری جان لیوا ہوتی ہے۔''

سرمد علی چلا گیا اور میں ایک بار پھر غنودگی میں چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کس وقت گاؤں کے طبیب کو بلا لایا تھا۔ طبیب نے آکر میرا معائنہ کیا اور سینے میں ٹھنڈ تشخیص کی جسے سنگل نمونیا بھی کہتے ہیں۔ اس نے ایک مرہم نکال کر میرے سینے پر مالش کیا اور ایک محلول پلانے کو دیا۔ کھانے میں مجھے صرف دنبے کے گوشت کی یخنی اور دلیہ تجویز کیا۔ مالش کرنے سے میری حالت بہتر ہوئی تھی۔ مجھے ہوش آیا تو سرمد علی چمچے سے میرے حلق میں یخنی ٹپکا رہا تھا۔ بھوک لگ رہی تھی اس لئے میں نے بے تابی سے یہ سوپ پیا۔ اس کی گرمائش اور غذائیت سے میری جان میں جان آئی تھی۔ اس کے بعد سرمد علی نے نمکین دلیہ کھلایا جو بمشکل میرے حلق سے اترا تھا۔ اس نے نہ جانے کیسے فٹافٹ سب بنوالیا تھا۔ اس کھانے کے بعد اس نے نیم کی طرح کڑوا محلول مجھے پلایا۔ اس کی بو سے طبیعت مالش کرنے لگی تھی لیکن اسے پیتے ہی جسم میں گرمی کی لہر سی دوڑ گئی تھی اور درد کم ہونے لگا تھا۔ ذرا دیر بعد میں گہری نیند سو چکا تھا۔ دوسری بار میری آنکھ کھلی تو سورج مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا اور میں اپنے جسم میں تازگی اور توانائی محسوس کر رہا تھا، اس کڑوے محلول کی ایک خوراک نے کام کر دکھایا یا سارے دن سورج کی حرارت بخش کرنوں نے میرے جسم سے سردی کا اثر زائل کر دیا تھا۔ میں انگڑائی لے کر کھڑا ہو گیا۔ صبح میری جو حالت ہو رہی تھی، اس کے پیشِ نظر مجھے امید نہیں تھی کہ میں اتنی جلدی بہتری محسوس کروں گا۔

''اے اٹھو مت...... لیٹ جاؤ۔'' اچانک مجھے سرمد علی کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔

''میں اب بہتر محسوس کر رہا ہوں۔''

''یہ حکیم کی دوا کا اثر ہے۔ ابھی تمہاری صحت پوری طرح بحال نہیں ہوئی ہے۔ اگر بے احتیاطی کی تو پھر سے خراب ہو جائے گی۔'' اس نے زبردستی مجھے چارپائی پر لٹا دیا۔ ''ابھی تمہارا کھانا آ رہا ہے۔''

''کھانا میں کھا لوں گا۔ دلیہ بھی کسی نہ کسی طرح حلق سے اتار لوں گا لیکن حکیم کی وہ دوا ہرگز نہیں پیوں

گا۔''

میں نے اسے خبردار کیا تو وہ مسکراتا رہا۔ سب سے پہلے سوپ آیا جس میں اس بار بوٹیوں کا ریشہ تیر رہا تھا اور ساتھ میں مشروم کے ٹکڑے تھے۔ سوپ بلاشبہ لذیذ تھا۔ اس کے بعد آنے والا دلیہ اتنا ہی بدمزہ تھا۔ اس کے بعد کڑوی کسیلی دوا کی باری آئی تو میرا احتجاج بے کار گیا۔ سرمد علی زبردستی کے موڈ میں تھا۔ اس نے دھمکی دی کہ میں نے دوا نہ پی تو وہ مدد کے لئے ان بچوں کو بلا لے گا جو باغ کی چاردیواری کے باہر کھڑے دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ دوائی پینے کے بعد مجھے نیند آنے لگی تھی۔ شام کی دھوپ تیزی سے رخصت ہو رہی تھی۔ اس لئے سرمد علی نے مجھے کوٹھری میں منتقل کر دیا۔

''ویسے تو مجھے تم کو گھر کے اندر لے جانا چاہئے تھا لیکن حکیم نے کہا ہے، تمہیں تازہ ہوا کی ضرورت ہے اس لئے تم یہیں سوؤ گے اور رات کو میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔''

میں نے سکون کا سانس لیا تھا ورنہ کوٹھری میں اکیلے رات گزارنے کا تصور پریشان کن تھا۔ مجھے یقین تھا، سرمد علی کی سوتیلی ماں پھر آ دھمکتی۔ کمسن ہونے کے باوجود وہ تریاہٹ میں کسی پکی عمر کی عورت سے کم نہیں تھی۔ سرمد علی میرے پاس ہوتا تو میں اس سے محفوظ رہتا مگر اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر چالاک نکلے گی۔ کوٹھری میں آنے کے کچھ دیر بعد میں سو گیا تھا۔ سونے کے دوران میں ہی سرمد علی نے میرے سینے پر مرہم لگا دیا تھا۔ اگلی بار میری آنکھ کھلی تو رات کے نو بج رہے تھے۔ سرمد علی میرے پاس ہی قالین پر بیٹھا دیوار سے ٹیک لگائے لیمپ کی روشنی میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی۔

''سرمد علی! پانی پلاؤ۔'' میں نے کہا تو وہ چونک گیا۔ اس نے جلدی سے بوتل سے پانی نکال کر مجھے دیا۔

''بھوک لگ رہی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''زبردست قسم کی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''صبح سے بیماروں والی غذائیں کھا رہا ہوں۔''

''بیمار جو ہو۔'' وہ ہنسا۔ ''میں ابھی کھانے کا کہہ کر آتا ہوں۔ بوٹیاں مل جائیں گی لیکن ابھی روٹی نہیں کھا سکتے۔'' سرمد علی کہہ کر باہر نکل گیا۔ کوٹھری میں انگیٹھی جل رہی تھی اور فرحت بخش حرارت رچی ہوئی تھی۔ کوٹھری کا دروازہ سرمد علی نے ہلکا سا کھول رکھا تھا اس لئے تازہ ہوا کی آمدورفت بھی جاری تھی اور اندر ذرا بھی گھٹن نہیں تھی۔ میں نے کتاب اٹھائی جو سرمد علی پڑھ رہا تھا۔ یہ قدرت اللہ شہاب کا ''شہاب نامہ'' تھا، میں کئی بار پڑھ چکا تھا۔ وقت گزاری کے لئے پھر اٹھا لی۔ سرمد علی کوئی نصف گھنٹے بعد آیا۔ اس نے لوٹا اور تسلا اٹھا رکھا تھا۔ نیم گرم پانی سے میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ دانت صاف کر کے کلی کی۔

''کھانا آ رہا ہے ابھی۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے، بھوک کا اتنا کچا نہیں ہوں۔'' میں مسکرایا۔ ''ویسے یار! یہ تمہارا حکیم ہے زبردست آدمی۔ صبح مجھے لگ رہا تھا کہ میں تین چار دن بستر سے نہیں اٹھ سکوں گا اور اس وقت میں گھوڑے سے ریس لگا سکتا ہوں۔ کل صبح میں واپس جا رہا ہوں۔''

میرا اچانک جملہ سرمد علی کے سر سے گزر گیا اور جب اس کی سمجھ میں آیا تو اس نے زور شور سے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہرگز نہیں۔ تم ابھی دو دن نہیں جا سکتے۔ حکیم نے منع کیا ہے اور یہ تمہیں اچانک جانے کی کیا سوجھی ہے؟''

''بس یار! امی اور گھر والے یاد آ رہے ہیں۔ میں نے انہیں پریشان کر دیا ہے۔ اب میں واپس جا کر ان سے معافی مانگوں گا۔'' میں نے پہلے سے سوچا ہوا بہانہ اس کے سامنے پیش کر دیا۔

''پھر بھی تمہیں کم سے کم دو دن رکنا ہوگا۔ کل بھی اور پرسوں بھی تم سفر نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد حکیم کے خیال میں تمہاری طبیعت اس قابل ہوئی تو جا سکو گے۔''

''تمہارے حکیم صاحب گئے بھاڑ میں۔'' میں نے دل میں سوچا۔ ''اگر تمہاری سوتیلی ماں کا کھلایا گل سامنے آ گیا، وہ مجھے زہر دینے میں پیش پیش ہوں گے۔''

دروازے پر آہٹ ہوئی، میرا خیال تھا کہ سرمد علی کا چھوٹا بھائی کھانا لے کر آیا ہوگا مگر وہ اس کی سوتیلی ماں تھی۔ اس نے برتن اٹھا رکھے تھے۔ اسے دیکھ کر سرمد علی تیزی سے اٹھا اور اس کے ہاتھ سے برتن لیتے ہوئے تیز لہجے میں کچھ کہا۔ شاید وہ اس کے میرے سامنے آنے پر ناگواری کا اظہار کر رہا تھا۔ جواب میں اس کی سوتیلی ماں نے بھی ویسا ہی تیز لہجہ اختیار کیا۔ دونوں کچھ دیر اسی طرح تیز انداز میں بات کرتے رہے پھر سرمد علی کی سوتیلی ماں پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔ میں بالکل چپ رہا، کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور نہ سرمد علی سے اس بارے میں کچھ پوچھا۔ اس نے برتن نیچے رکھے۔ کھانے میں روٹی اور سالن بھی تھا جو سرمد علی کے لئے تھا۔ میرے لئے یقیناً سوپ اور دلیہ تھا۔ سوپ دوپہر کی نسبت ذرا بھاری تھا اور اس میں بوٹیوں کے ریشے کے علاوہ انڈا بھی ابال کر اور توڑ کر ڈالا گیا تھا۔ دلیہ میں بھی نمک مرچ نظر آ رہا تھا اس لئے خوش ذائقہ سوپ کے بعد میں نے اسے بھی حلق سے اتار لیا تھا۔ دلیہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ پیٹ میں تھوڑی غذا جائے ورنہ میں مارے بھوک کے ساری رات کروٹیں بدلتا رہتا۔ سرمد علی غصے میں تھا، اس نے بالکل خاموشی سے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے رضا کارانہ طور پر کڑوی دوا لی۔ برتن سرمد علی لے گیا تھا اور میں کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا تھا۔ مجھے لگا کہ کڑوی دوا میں کوئی خواب آور شے بھی شامل تھی کیونکہ اسے پیتے ہی مجھے نیند آنے لگی تھی۔ اس بار یہ ہوا کہ غنودگی کی کیفیت ضرور ہوئی مگر نیند نہیں آئی شاید اس لئے کہ صبح سے سو ہی رہا تھا اور نیند ضرورت سے زیادہ لے چکا تھا۔ کچھ دیر بعد سرمد علی آیا اور مجھے سوتا سمجھ کر اس نے انگیٹھی میں چند کوئلے ڈالے اور شہاب نامہ لے کر پڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ سر جھٹک کر جماہی لیتا تھا پھر اس نے کتاب رکھ دی اور لیمپ کی روشنی مدھم کر کے لیٹ گیا۔ چند منٹ کے اندر اس کے ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دینے لگے تھے۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا اور اسے پورا کھلنے سے روکنے کے لئے سرمد نے آگے ایک چھوٹا سا پتھر رکھ دیا تھا۔

سرمد علی کی سوتیلی ماں پہلے بھی کئی بار میرے سامنے آ چکی تھی لیکن سرمد نے پہلی بار اتنا شدید ردِعمل ظاہر کیا تھا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ وہ اپنی سوتیلی ماں کی مجھ میں دلچسپی بھانپ گیا تھا۔ میرے ساتھ اس کا رویہ اچھا بلکہ بہترین تھا۔ اس نے صبح سے اب تک جس طرح میرا خیال رکھا اس سے اس کا دلی خلوص جھلکتا تھا۔ کیا سرمد علی اپنی ماں کی آوارہ مزاجی سے واقف تھا؟ کیا وہ پہلے بھی اسے کسی مرد میں دلچسپی لیتے دیکھ چکا تھا۔ سرمد علی خود بھی خوبرو اور صحت مند نوجوان تھا، کیا سوتیلی ماں نے اس کی طرف بھی التفات ظاہر کیا تھا، اس قسم کے سوالات میرے غنودہ ذہن میں چکرا رہے تھے۔ اچانک کوٹھری کا دروازہ ہلکا سا ہلا اور میرا دھیان پھر ریچھ یا بھیڑیے کی طرف گیا اور سرمد علی کی سوتیلی کمسن ماں کو دیکھ کر میں گزشتہ رات سے زیادہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ پتھر ایک طرف کر

کے دروازہ دھکیلتی اندر آئی اور پھرتی سے دروازہ بند کرلیا۔ میں نے بمشکل کہا تھا۔ ''تم......؟''

''ام اے۔'' اس نے سینے پر ہاتھ مارا۔ اس نے آواز دبانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''جاؤ یہاں سے......ابھی سرمد علی جاگ جائے گا اور تمہارے ساتھ میں بلاوجہ مارا جاؤں گا۔'' میں نے فریاد کی۔

اسے اس طرح سرمد علی کی موجودگی میں سامنے پا کر میری حالت غیر ہوگئی تھی۔ بے شک وہ گہری نیند سو رہا تھا مگر کسی وقت بھی جاگ سکتا تھا۔ سوتیلی ماں نے اس کی طرف دیکھا اور اطمینان سے بولی۔ ''توم بے فکر رہو۔ یہ ابھی نہیں جاگے گا۔''

''کیوں نہیں جاگے گا؟'' میں نے سرمد علی کی طرف دیکھا۔

''نئیں جاگے گا، یہ دیکھو۔'' اس نے سرمد علی کا ایک بازو پکڑ کر ہلایا اور وہ بدستور خراٹے لیتا رہا۔ میرے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی تھی۔

''تم نے اس کے ساتھ کیا، کیا ہے؟''

چودہ پندرہ سالہ لڑکی فاتحانہ انداز میں مسکرائی تھی۔ ''ام نے اسے کھانے میں ایک بُوٹی دیا اے۔ جو آدمی کو......سلا دیتی اے۔ اب یہ صوبا تک سوتا رہے گا۔ تم فکر مت کرو۔''

''تم یہاں سے چلی جاؤ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے اپنے گرد کمبل لپیٹ لیا۔

''ام ٹیک کردے گا۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا اور اپنی قمیص اتارنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے راست اقدام نہ کیا تو یہ عورت حد سے گزر جائے گی۔ میں نے کمبل پھینک دیا اور اس کا نازک سا گلا دبوچ لیا۔

''تمہارا دماغ درست ہے، تم ایک شخص کی بیوی ہو جس کے تم سے بڑے بچے ہیں۔''

''ام......اس خبیث سے نفرت کرتا اے۔'' اس نے رک رک کر کہا۔ ''وہ نامرد اے۔''

''وہ نامرد ہے یا تمہارے آوارہ جذبات اس سے تسکین نہیں پاتے؟'' میں نے نفرت سے کہا۔ ''تم اس پر الزام لگاتے ہوئے بھول رہی ہو کہ اس کے گیارہ بچے ہیں اور اس کی دو پہلی بیویاں تمہاری طرح بدکار نہیں ہوں گی۔ شاید تم پہلے بھی دوسرے لوگوں کے پاس جا کر اس کی امانت میں خیانت کرتی رہی ہو لیکن اس بار تم غلط آدمی کے پاس آ گئی ہو۔ میں تمہیں قتل کر کے تمہاری لاش لے جا کر کسی کھیت میں پھینک دوں گا۔ صبح جب تمہاری لاش ملے گی تو کوئی مجھ پر شک نہیں کرے گا کیونکہ آج دن میں سارے گاؤں نے دیکھا تھا کہ میری طبیعت کتنی خراب تھی۔ تم بہت نازک ہو، جلدی مر جاؤ گی۔'' میں نے کوشش کی کہ آواز اور چہرے کے تاثرات سے اپنے ڈرامے میں رنگ بھروں۔

وہ سچ مچ دہشت زدہ نظر آنے لگی کیونکہ میں نے ہاتھوں کا دباؤ اس حد تک بڑھا دیا تھا کہ اس کی سانس رکنے لگی۔ اب وہ مچلنے اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے کچھ دیر دباؤ برقرار رکھا تا کہ وہ اچھی طرح ڈر جائے۔ پھر میں نے کراہ کر اس کا گلا چھوڑا اور اپنا سر تھام لیا۔ جیسے میرے سر میں شدید درد اٹھا ہو۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تو اس نے لپک کر کوٹھری کا دروازہ کھولا اور یوں بھاگی جیسے اس کے پیچھے بھوت لگے ہوں۔ میں نے

ذرا زور سے کہا۔ ''اے کہاں جاتی ہو، رک جاؤ ورنہ ماردوں گا۔''

اس کے بعد اس کی رفتار میں اضافہ ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ باغ سے نکل کر تاریکی میں غائب ہوگئی۔ آج آسمان پر گھرے بادل تھے اور شاید بارش کا امکان بھی تھا۔ میں نے کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کیا اور خدا کا شکر ادا کرتا گرم کمبل میں گھس گیا کہ جس نے اتنی بڑی آفت سے اتنی آسانی سے نجات دلا دی۔ اس کی دیدہ دلیری نے میری عقل خبط کر کے رکھ دی تھی۔ وہ تو مجھے بروقت ترکیب سوجھ گئی اور وہ بھی اپنی ناتجربے کاری کی وجہ سے میرے جھانسے میں آگئی کیونکہ میں کوئی پیشہ وار اداکار تو تھا نہیں۔ ممکن ہے اس کی جگہ کوئی بڑی عمر کی تجربہ کار عورت ہوتی تو میری اداکاری بھانپ جاتی۔ کچھ دیر بعد میں سکون سے سو گیا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ سکون بدستور عارضی ہے اور اس سے بڑی آفت کل مجھ پر نازل ہونے والی تھی۔

صبح میری اور سرمد علی دونوں کی آنکھ تاخیر سے کھلی تھی۔ مجھ پر دوا کا خمار تھا تو سرمد علی پر اس بُوٹی کا جو اس کی سوتیلی ماں نے اسے کھانے میں شامل کر کے دی تھی۔ اس بُوٹی کے زیر اثر وہ صبح تک بے خبر سوتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے بھائی نے آ کر کوٹھری کا دروازہ بجایا تھا تو بمشکل ہماری آنکھ کھلی تھی۔ سرمد علی سخت متعجب تھا کہ وہ اتنی دیر تک کیسے سوتا رہا کیونکہ صبح سویرے اس کی آنکھ از خود کھل جاتی تھی۔ چاہے کتنی گہری نیند میں کیوں نہ ہو۔ کاش کہ میں اسے بتا سکتا کہ اس کی اس خود فراموشانہ نیند کی کیا وجوہات تھیں مگر اس معاملے میں زبان سے ایک لفظ نکالنے کا مطلب اپنی درگت خود بنوانا تھا۔ بیدار ہونے کے بعد وہی معمول کا کھانا پینا اور پھر دوا لینے کا عمل دہرایا۔ اس کے بعد میں باغ میں پڑی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ دوا کے اثر سے کچھ دیر بعد غنودگی چھانے لگی تھی اور نہ جانے کب میں سو گیا۔ سوتے ہوئے اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی مجھے آواز دے رہا ہے۔ پھر کسی نے مجھے جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ چارپائی کو چاروں طرف سے کوئی نصف درجن افراد نے گھیر رکھا تھا۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں اور انہوں نے راجا عمر دراز کے محافظوں کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے آوازیں دینے اور جھنجھوڑنے والا سرمد علی تھا وہ صورت سے اتنا وحشت زدہ نظر آ رہا تھا کہ مجھے ہوش و حواس میں آئے بغیر گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔

''کیا...... کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ سرمد علی کی سوتیلی ماں نے کوئی گل کھلایا ہے۔ ''آپ لوگ اس طرح کیوں جمع ہیں؟''

''شہباز! یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' سرمد علی کی صورت ہی نہیں آواز بھی وحشت زدہ ہو رہی تھی۔

''تم پیچھے ہٹو۔'' راجا عمر دراز کے ایک دربان نے سرمد علی کو درشتی سے پیچھے دھکیل دیا۔ ''ہم خود اس سے معلوم کریں گے۔ چلو ہمارے ساتھ۔'' آخری جملہ اس نے مجھ سے کہا تھا۔

''کہاں...... کیوں...... کون ہو تم لوگ؟''

''یہ راجا صاحب کے محافظ ہیں۔'' سرمد علی کی آواز لرز رہی تھی۔ ''یہ کہہ رہے ہیں......''

''لڑکے چپ رہو اور تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔'' محافظ نے اسے ڈانٹ دیا۔

میں کھڑا ہو گیا۔ حالات کی سنگینی محسوس کرتے ہوئے میری رہی سہی غنودگی بھی ہوا ہو گئی تھی۔ میرے کھڑے ہوتے ہی محافظوں نے مجھ پر رائفلیں تان لی تھیں۔ جیسے میں ابھی ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر

فرار ہو جاؤں گا یا کہیں سے توپ نکال کر ان پر داغ دوں گا۔ میں نے سرمد علی کی طرف دیکھا۔

''تم نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ راجا صاحب وادی میں آنے والوں کو اس طرح بھی طلب کرتے ہیں؟''

''ادب سے نام لو راجا صاحب کا۔'' ایک محافظ غرایا۔

''بات کیا ہے؟'' اس بار میں جھنجلا گیا تھا۔

''چلو...... تمہیں اور اسے راجا صاحب نے بلایا ہے۔'' محافظ نے سرمد علی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اگر تم نہ چلے یا بھاگنے کی کوشش کی تو ہم گولی مار دیں گے۔''

''گولی مار دو گے......'' میں نے چلا کر کہا تھا۔ ''کیوں، ہم نے کیا جرم کیا ہے؟''

''یہ تو راجا صاحب ہی بتائیں گے۔'' محافظ بولا۔

''شہباز! ہمیں چلنا ہوگا۔'' سرمد علی نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے راجا صاحب کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ وہ ہم پر بہت مہربان تھے۔''

راجا عمر دراز کے محافظ ہمیں مجرموں کی طرح گرفتار کر کے لے جانے لگے تو ساری وادی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ میرا جو حال تھا سو تھا، سرمد علی کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا، زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ کچھ دیر گاؤں کے فارغ لوگوں نے مصاحبت کی تھی لیکن پھر قافلہ رفتہ رفتہ چھٹتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ جب ہم کھیت عبور کر کے باغوں سے گزرنے لگے تو صرف دو افراد تھے اور ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وفاداری میں وہ راجا عمر دراز کے زرخرید محافظوں سے کم نہیں تھے۔ مسلسل آرام، سادہ غذا اور دوا سے میری حالت اتنی بہتر ہوئی تھی کہ میں بغیر کسی وقت کے دشوار راستے پر چل رہا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ البتہ سرمد علی پریشان تھا۔ میں نے اس سے سرگوشی میں کہا۔ ''راجا، کس حیثیت سے ہمیں اس طرح بلا رہا ہے؟''

''راجا صاحب ایک طرح سے وادی کے حکمران ہیں۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''اگر وہ کوئی ایسا کام کرتے ہیں تو کوئی بھی اعتراض نہیں کر سکتا ہے۔''

گویا راجا عمر دراز اس وادی کا جاگیردار یا وڈیرا تھا۔ اس کا کہا اور کیا قانون تھا۔ نصف گھنٹے بعد ہم اس کے شاندار محل کے احاطے میں داخل ہو رہے تھے جو رنگا رنگ پھولوں سے مہک رہا تھا۔ راجا عمر دراز چبوترے پر تنا کھڑا تھا اور اس کے انداز میں نرمی کے بجائے خشونت نظر آ رہی تھی۔ اس کے محافظوں نے ہمیں اوپر جانے سے روک دیا۔ ''ادھر ہی رکو اور راجا صاحب جو پوچھیں اس کا صحیح صحیح جواب دو۔''

میں نے راجا عمر دراز کی طرف دیکھا تھا۔ ''راجا صاحب! ہمیں مجرموں کی طرح گرفتار کر کے کیوں لایا گیا ہے؟''

''اس لئے کہ تم مجرم ہو۔ تم نے چوری کی ہے۔''

''چوری......؟'' میں چلایا۔ ''راجا صاحب! خدا کی قسم ہم یہاں سے ایک پھول تک نہیں لے کر گئے تھے۔''

''اُس روز نہیں لے کر گئے تھے لیکن پرسوں رات آئے اور میرے نوادر چوری کر کے لے گئے۔ سچ سچ بتاؤ انہیں کہاں چھپایا ہے، ورنہ کھال گرا دی جائے گی۔''

''راجا صاحب! ہم دوبارہ اس طرف نہیں آئے اور پرسوں رات کو میں سوتا رہا تھا۔''

''تم دونوں نہیں...... صرف تم!'' راجا نے میری طرف انگلی اٹھائی۔ ''میرے ایک محافظ نے خود تمہیں محل کے پاس دیکھا تھا۔''

''یہ غلط ہے۔ آپ کا محافظ جھوٹ بولتا ہے۔ پرسوں رات میں صرف چند منٹ کے لئے کوٹھری سے نکلا تھا اور مجھے سردی لگ گئی تھی، صبح تک مجھے بخار ہو گیا تھا۔''

راجا عمر دراز معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''یعنی تم اعتراف کرتے ہو کہ تم رات کو باہر نکلے تھے؟''

''ہاں...... لیکن نہ تو میں آپ کے محل کی طرف آیا تھا اور نہ ہی میں نے یہاں سے کچھ چرایا ہے۔''

''ابھی پتا چل جائے گا۔'' راجا نے کہا اور مقامی زبان میں اپنے ساتھ کھڑے شخص سے کچھ بولا۔ وہ شاید راجا کا سیکرٹری تھا۔ میری سمجھ میں صرف ایک نام فتح خان آیا تھا۔ چند منٹ بعد ایک پستہ قد ادھیڑ عمر اور رائفل سے مسلح شخص ہماری طرف آیا۔ اس نے بھی محافظوں والی وردی پہن رکھی تھی۔ اس کے نقوش مقامی اور آنکھوں کے نیچے گوشت لٹک رہا تھا وہ صورت سے خرانٹ اور عیار نظر آنے والا شخص تھا۔ وہ آ کر راجا کے سامنے ذرا جھکا اور مؤدبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ راجا نے اس سے بھی مقامی زبان میں کچھ کہا تو اس نے میری طرف دیکھا اور جلدی سے سر ہلایا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ وہ وہی محافظ تھا جس نے چوری کی رات یعنی پرسوں مجھے محل کی چار دیواری کے آس پاس دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ فوراً ہی اس کی تصدیق ہو گئی۔ راجا عمر دراز نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''فتح خان کہتا ہے، اس نے تمہیں محل کی چار دیواری کے پاس دیکھا تھا۔ کیا تم نے پرسوں رات نیلی شلوار قمیص نہیں پہنی تھی؟''

''یہ درست ہے لیکن باقی سب جھوٹ ہے۔ مجھے نہیں معلوم یہ کس وجہ سے مجھ پر الزام لگا رہا ہے لیکن خدا گواہ ہے، میں اس طرف نہیں آیا اور نہ ہی چوری کی ہے۔''

''میرا محافظ بلاوجہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اب تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ میری چیزیں واپس کر دو، میں تمہیں واپس جانے دوں گا۔''

میں نے محسوس کیا کہ سرمد علی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا ہے، اس کے انداز میں شک بھی تھا اور دکھ بھی۔ شاید محافظ کی گواہی میرے کپڑوں کے رنگ اور رات اکیلے کوٹھری میں گزارنے سے وہ بھی قائل ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لی، ''راجا صاحب، جو چیزیں میں نے لی ہی نہیں ہیں، وہ میں واپس کیسے کروں؟''

''تو تم اس طرح نہیں مانو گے؟'' راجا عمر دراز کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے غرا کر محافظوں سے کچھ کہا اور دو محافظ مجھے بازوؤں سے تھام کر راجا کے پیچھے چلنے لگے تھے۔ باقی افراد وہیں رک گئے تھے۔ راجا مجھے محل کے اندر لے گیا تھا۔ سب سے پہلے وہ تصاویر والی گیلری میں اس جگہ جا کھڑا ہوا، جہاں تخیلاتی تصویر لگی تھی۔ اس میں عجیب الخلقت جانور دکھائے گئے تھے۔ وہ تصویر نکال لی گئی تھی۔ یعنی تصویر چرا لی گئی تھی اور راجا کا شبہ مجھ پر تھا کیونکہ اس روز میں نے تصویر کو دیر تک دیکھا تھا۔ راجا عمر راز بغور میرا ردِعمل دیکھ رہا تھا۔

''یہ تصویر اور نوادرات والے ہال سے وہ سیاہ پتھر غائب ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''شہباز احمد! تم ابھی بچے

ہو اور مجھے تم پر رحم آ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں اپنے جلاد صفت محافظوں کے حوالے کروں، یہ دونوں چیزیں مجھے واپس کر دو۔"

"راجا صاحب! میں کیسے یقین دلاؤں کہ وہ میرے پاس نہیں ہیں۔" راجا عمر دراز کی دھمکی نے مجھے سچ مچ دہلا دیا تھا۔ میں اپنے پیاروں سے دور اجنبی وادی میں راجا عمر دراز کے رحم و کرم پر تھا اور اس کے عتاب سے مجھے سوائے خدا کے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

"تمہارے پاس نہیں ہیں تو پھر کس کے پاس ہیں؟ تمہارے اور ساتھی بھی ہیں۔ مجھے ان کے بارے میں بتاؤ، میں ان سے نکلوالوں گا۔" راجا کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"میرا کوئی ساتھی نہیں ہے اور اس وادی تک بھی اتفاقاً آیا تھا، آپ سرمد علی سے پوچھ سکتے ہیں۔ میں اکیلا آیا ہوں۔"

راجا عمر دراز کچھ دیر سوچتا رہا تھا پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "ٹھیک ہے میں تمہارے بیان کی تصدیق کرالیتا ہوں۔ اس وقت تک تم میرے پاس رہو گے۔"

"یعنی آپ مجھے قید رکھیں گے؟"

"قید نہیں...... تم میرے مہمان ہو گے۔" راجا عمر دراز مسکرایا تھا۔

اس کے محافظوں نے مجھے محل کے نیچے بنے تہ خانے میں لا کر ایک کمرے میں دھکیل دیا جو شاید قید خانے کے طور پر ہی استعمال ہوتا تھا۔ اس میں سوائے ایک بستر اور ایک کمبل کے کچھ نہیں تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنے گھر سے نکل کر میں اتنی مشکلات میں پھنس جاؤں گا ورنہ شاید میں فوج میں ہی چلا جاتا۔ حرکت کرنے اور چلنے سے میں کمزوری محسوس کرنے لگا تھا یعنی ابھی میں مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ راجا عمر دراز کے الزام اور اس کی جانب سے متوقع تشدد کے خیال نے میرے ہوش اڑا دیئے اور میں شدت سے پچھتا رہا تھا کہ یہاں آیا ہی کیوں؟ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ باہر شاید شام ہو چکی تھی۔ کمرے میں ایک دیا جل رہا تھا اور اس کی کمزور سی روشنی تاریکی سے لڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ عمر دراز کا انداز بتا رہا تھا کہ محافظ کی گواہی کے بعد اسے مجھ پر پورا شک ہے اور وہ مجھ سے تصویر اور سیاہ پتھر حاصل کرنے کے لئے تشدد کا حربہ بھی استعمال کر گزرے گا۔

میں نے فرار کے بارے میں سوچا لیکن یہ ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ راجا عمر دراز کے محل سے نکلنا ہی ایک مسئلہ تھا۔ اس کے بعد وادی سے باہر جانا بھی کم مشکل نہیں تھا۔ سرمد علی مجھے جن پُر پیچ راستوں سے یہاں تک لایا تھا وہ میرے ذہن سے بڑی حد تک محو ہو چکے تھے اور سب سے بڑھ کر اس بیماری کے عالم میں کیسے سفر کرتا؟ لہٰذا میں نے فرار کے امکان کو رد کر دیا اور اپنے بچاؤ کے متبادل طریقوں پر غور کرنے لگا۔ اچانک مجھے محافظ کا خیال آیا۔ اس نے جھوٹی گواہی دی تھی پھر بھی اسے کیسے علم ہوا کہ پرسوں رات میں نے نیوی بلو کلر کی شلوار قمیص پہنی رکھی تھی۔ بے شک پرسوں رات چاندنی تھی لیکن چاند کی روشنی میں نیوی بلو اور سیاہ رنگ میں تمیز کرنا دشوار ہوتا ہے اور اس فرق کو بے حد نزدیک سے ہی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ مزید غور و فکر سے ایک سوال اور سامنے آیا۔ کیا محافظ اس چوری میں ملوث تھا اور اپنی گردن بچانے کے لئے اس کا شبہ مجھ پر ڈال رہا تھا؟ آخر اسے بلا ضرورت جھوٹ

بولنے اور میرا ہی نام لینے کی کیا ضرورت تھی؟

رات کے دس بج چکے تھے اور میں سردی محسوس کر رہا تھا۔ کمبل لپیٹ کر مجھے ذرا سکون ملا۔ حالانکہ اس میں سے ایک ناگوارسی بو آ رہی تھی۔ دوپہر اور رات کو کھانا نہ کھانے کے باوجود مجھے بھوک نہیں تھی شاید فکر نے بھوک اڑادی تھی۔ سوا دس بجے کے قریب قید خانے کا بھاری لکڑی سے بنا دروازہ کھلا اور ایک محافظ نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ تہ خانے کے ایک حصے میں پہنچا جہاں راجا عمر دراز ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھا اور اس کے پاس دو تنومند افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے صرف شلوار پہن رکھی تھی اور اس کا اوپری جسم عریاں تھا۔ مشعلوں کی تیز روشنی میں اس کے مضبوط جسم کے پٹھے نمایاں تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ تہ خانے کے اس حصے میں آلات تشدد پڑے تھے۔ کوڑے تھے، بید کی چھڑیاں تھیں۔ ایک ٹکٹکی تھی جس پر باندھ کر آدمی کو مارا جاتا تھا۔ انگیٹھی اور داغنے والی سلاخوں کا انتظام بھی تھا۔ ایک طرف میز پر آلات جراحی کی طرح کے اوزار سجے تھے۔ جن میں ایک زنبور اور ایک پلاس نمایاں تھے۔ شاید ان سے ناخن اور دانت کھینچنے کا کام لیا جاتا تھا۔ بلاشبہ اس ماحول اور ان سب اشیاء نے مجھے ڈرا دیا تھا اور میں اپنے جسم کی لرزش محسوس کر سکتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس قسم کے حالات سے واسطہ پڑا تھا اور یہ سب بے حد خوف ناک لگ رہا تھا۔

''شہباز! اب بھی وقت ہے۔'' عمر دراز نے گونجیلی آواز میں کہا تھا۔ ''تم مار کھا کر اور اپنا نقصان کر کے پھر بتاؤ گے تو مجھے افسوس ہوگا۔''

''آپ یقین کریں راجا صاحب!''

''اگر تمہارا ایک ناخن یا ایک دانت نکال لیا گیا تو یہ ساری دنیا کی دولت دے کر بھی تم انہیں واپس حاصل نہیں کر سکتے۔'' راجا عمر دراز نے دانت پیس کر کہا۔

''راجا صاحب! ایک منٹ کے لئے میری بات سن لیں۔ اس کے بعد بھی آپ کو شبہ ہو تو جو سزا آپ مجھے دیں، مجھے قبول ہوگی۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' راجا عمر دراز نے غور سے مجھے دیکھا۔

''راجا صاحب! بقول فتح خان کے اس نے مجھے رات میں دیکھا تھا تو اسے میرے کپڑوں کا رنگ کیسے نظر آ گیا؟ میں نے نیوی بلو رنگ کے کپڑے پہنے تھے جو اتنی آسانی سے نظر نہیں آتا۔ بے شک چودھویں کا چاند ہو۔ پھر وہ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتا ہے؟''

راجا عمر دراز کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن مجھے محسوس ہوا جیسے میری بات نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''راجا صاحب! میں پہلی بار اس علاقے میں آیا ہوں، میں نے سرمد علی سے پہلی بار آپ کا نام سنا۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ آپ کے محل میں ایک عجیب سی تصویر اور وہ انوکھا سیاہ پتھر ہے جو روشنی پڑنے پر رنگ بدل لیتا ہے۔ دیکھنے کے بعد بھی میں نے ان میں وقتی دلچسپی لی تھی۔ مجھے انوکھی اور عجیب اشیاء کا کوئی شوق نہیں ہے۔ پھر میں ان چیزوں کو کیوں چرانے لگا؟ مجھ جیسا معمولی آدمی آپ کے محافظوں کو دھوکا دے کر اندر سے یہ چیزیں چرا لے جائے، یہ کس طرح ممکن ہے؟''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ آپ فتح خان سے پوچھیں۔فرض کریں میں نے تصویر اور پتھر نہیں چرایا ہے، اس کا مطلب ہوا فتح خان جھوٹ بول رہا ہے۔ یا تو وہ اپنی نااہلی چھپانے کے لئے جھوٹ بول رہا ہے لیکن یہ بات خود مجھے بھی درست نہیں لگتی۔ اسے میرے کپڑوں کا رنگ کیسے پتا چلا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ فتح خان خود بھی اس چوری میں ملوث ہے۔ وہ چوروں سے ملا ہوا ہے اور خود کو شبہے سے بالاتر رکھنے یا دونوں چیزیں وادی سے باہر لے جانے کی مہلت حاصل کرنے کے لئے اس نے میرا نام لگا دیا، اب آپ کی ساری توجہ مجھ پر ہے۔''

''تم تقریر اچھی کر لیتے ہو لیکن شبینا کا بیان بھی تمہارے خلاف ہے۔''

''شبینا کون؟'' میں چونکا۔

''سرمد علی کے باپ صورت علی کی تیسری بیوی شبینا...... اس نے تمہیں پرسوں رات کوٹھری سے نکل کر اوپر باغات کی طرف جاتے دیکھا تھا۔''

''جھوٹ ہے یہ سب...... وہ مجھ سے بدلہ لے رہی ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''کیسا بدلہ؟'' راجا عمر دراز نے مجھے گھورا تھا۔

''کک...... کچھ نہیں۔'' میں گھبرا گیا تھا، انجانے میں یہ بات منہ سے نکل گئی۔

''صحیح صحیح بتاؤ، کیا بات ہے؟ شبینا تم سے کس لئے...... بدلہ لینا چاہتی ہے؟''

میں چپ رہا۔ معاملات مزید بگاڑ کی طرف جا رہے تھے۔ میں شبینا کے بارے میں زبان کھولتا تو راجا عمر دراز کبھی میری بات کا یقین نہ کرتا بلکہ ممکن ہے شبینا کا لگایا ہوا الزام درست تسلیم کیا جاتا اور میرے جرائم میں ایک ''عفت مآب'' خاتون پر الزام لگانے کا جرم بھی شامل ہو جاتا۔

''اسے باندھ دو۔'' میری خاموشی سے تنگ آ کر راجا عمر دراز نے اپنے محافظوں کو حکم دیا۔ وہ جیسے منتظر تھے۔ بے قمیص کا گینڈا میری طرف لپکا اور بازو سے پکڑ کر ٹکٹکی سے میرے دونوں ہاتھ باندھ دیئے۔ میں نے مزاحمت کی کوشش کی تھی لیکن وہ بے پناہ طاقتور شخص تھا۔ اس کے سامنے میری مزاحمت بے کار تھی۔ مجھے باندھ کر اس نے مقامی زبان میں راجا عمر دراز سے کچھ کہا۔ اس نے جواب دیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''شہباز! مجھے تم پر رحم آ رہا ہے، آخری موقع پر بتا دو...... ورنہ یہ خود اگلوا دے گا۔''

میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''راجا صاحب! آپ میری بات پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو میں کیا کروں؟''

''اسے مارو۔ اس وقت تک جب تک یہ میری چیزوں چرانے کا اقرار نہ کر لے۔'' راجا نے جلاد کو حکم دیا اور اس نے ایک چمڑے کا کوڑا ا' یا تھا۔

☆======☆======☆

''اٹھ جائیں جناب! کیا یہیں رات گزارنے کا ارادہ ہے؟'' مونا نے میرا شانہ ہلایا تو میں چونک گیا تھا اور پھر خفیف ہو گیا۔ میں انہیں جلدی چلنے کو کہہ رہا تھا اور خود نہ جانے کب سو گیا۔ مونا اور سفیر ہنس رہے تھے۔

''دانت اندر کر و اور یہ بتاؤ کہ مجھے دو گھنٹے تک اٹھایا کیوں نہیں...... کیا کر رہے تھے تم دونوں؟''

مونا جھینپ گئی تھی۔ سفیر نے دانت نکالے۔ ''شرفا سے ہر بات نہیں پوچھا کرتے۔''

''شرفا کے بچے!'' میں اٹھا تو وہ دونوں بھی جلدی سے کھڑے ہو گئے۔

''او کے سینز فائر!'' سفیر بولا۔ ''اب چلو۔ ڈنر مری سے کر کے واپس چلیں گے۔''

''راستہ لمبا ہو جائے گا۔'' مونا بولی۔ ''میری مانو......''

''مانو تمہارے فراق میں مر نہیں جائے گی۔'' سفیر بھنا کر بولا۔ ''مجھے دیکھ لو۔''

مونا اس بار لال پیلی ہو کر خود چل پڑی تھی اور سفیر سامان اٹھاتا اس کے پیچھے لپکا تھا۔ ''ارے سنو تو...... بابا...... سوری، بس منہ سے نکل گیا تھا۔''

میں نے مسکراتے ہوئے باقی ماندہ سامان اٹھایا اور ان کے پیچھے جانے لگا۔ میں نے رفتار جان بوجھ کر کم رکھی، جب اوپر جیپ کے پاس پہنچا تو مونا کے چہرے پر قوس قزح جیسی مسکراہٹ تھی۔ دھوم دھڑکے سے بارش کے بعد مطلع صاف ہو گیا تھا۔ یعنی ان میں صلح صفائی ہو چکی تھی۔ مونا جانتی تھی کہ میں ان کے تعلق کی تمام تر باریکیوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس کے باوجود اسے سفیر کا رومانٹک جملہ برا لگا تھا۔ وہ اتنی ہی حساس لڑکی تھی۔ نہ جانے یہ دونوں کب تک اپنی انا کے دام میں گرفتار رہتے۔

''کیا بات ہے، چلنا نہیں ہے؟'' میں نے سامان عقبی حصے میں رکھ کر پوچھا۔ ''یا کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہو گے؟'' انہوں نے جان بوجھ کر میری بات کا جواب نہیں دیا اس لئے میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔ ''اچھا اللہ حافظ! پھر ملیں گے۔ راولپنڈی آنا ہو تو اس خادم کے گھر ضرور آنا۔''

دونوں پھرتی سے جیپ میں سوار ہوئے تھے جیسے میں سچ مچ انہیں چھوڑ جاؤں گا۔ میں ہنس دیا تھا۔ واپسی کا راستہ ذرا طویل پڑتا اس لیے مری میں رک کر ڈنر کا ارادہ تھا اور پھر آگے سفر کرتے۔ مری ہائی وے کو اتنا اچھا بنا دیا گیا ہے کہ اس پر رات میں بھی سفر کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ رفتار ذرا کم رکھی جائے۔ مونا نے واک مین کا ہیڈ فون لگا لیا اور میوزک سننے میں لگ گئی۔ جبکہ سفیر موبائل پر گیم کھیلنے لگا اور میں پوری توجہ سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔ اس قسم کے راستوں پر میری توجہ ہمیشہ ڈرائیونگ پر ہوتی تھی کیونکہ برسوں کے مشاہدے سے میں نے جان لیا تھا، پہاڑی سڑکوں پر کوئی بھی غلطی نوے فی صد مواقعوں پر آخری غلطی ثابت ہوتی ہے۔ یہ بات مونا اور سفیر بھی جانتے تھے اس لئے باتیں کرنے کے بجائے انہوں نے اپنی اپنی دلچسپیاں تلاش کر لی تھیں۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور پہاڑوں پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ رات آٹھ بجے ہم بارونق مال روڈ پر داخل ہوئے۔ جیپ پارک کرنے کے لئے بمشکل ایک جگہ تلاش کی اور خاصا دور تک پیدل چل کر مطلوبہ ریستوران تک پہنچے۔ مری میں سیزن عروج پر تھا اور چاروں طرف بے پناہ رش تھا۔ رات گزارنے کے لئے کھلے میں لگائے جانے والے خیمے تک بک ہو چکے تھے اور اس وقت کوئی جگہ تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ ہم ریستوران کے پاس پہنچے تھے کہ ایک لگژری قسم کی فور وہیل ڈرائیو زن سے ہمارے پاس سے گزری اور ذرا آگے جا کر سڑک کے کنارے ترچھی ہو کر رک گئی۔ جیپ کے اس طرح رکنے سے اب سڑک پر اتنی گنجائش رہ گئی تھی کہ ایک وقت میں ایک گاڑی گزر سکے۔

''یہ کون جاہل ہے؟'' مونا غصے سے بولی، جیپ اسے تقریباً چھوتی ہوئی گزری، اس کے ساتھ ہمیں بھی غصہ آ رہا تھا۔ اول تو اتنے پُر رش بازار میں اس طرح تیز رفتاری سے گاڑی چلانا درست نہیں تھا۔ دوسرے مونا کے بالکل پاس سے گاڑی جان بوجھ کر گزری تھی کیونکہ ہم کنارے چل رہے تھے اور سڑک پر خاصی جگہ تھی۔ جیپ

سے تین نوجوان اترے۔ ان کا حلیہ اور انداز بتا رہا تھا کہ وہ بڑے گھرانوں کے اوباش فطرت لڑکے ہیں۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھ کر بلند آواز سے مشترکہ قہقہہ لگایا تھا۔ سفیر بے قابو ہو کر ان کی طرف جانے لگا تو مونا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''چھوڑ دو، ایسوں کے منہ کیا لگنا!''

''مونا صحیح کہہ رہی ہے، ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اور یہ موقع بھی مناسب نہیں ہے۔''

''ان لوگوں کی بے ہودگی دیکھو۔'' سفیر غصے سے بے تاب ہو رہا تھا۔ ''ان کو سزا دینی ہوگی۔''

''یار! چل کر پہلے کھانا کھا لو...... پھر سزا بھی دے دیں گے۔'' میں نے مونا کے ساتھ مل کر اسے کھینچا۔

''اے صاحب!'' اچانک ایک دس بارہ سال کا لڑکا معصوم اور میلے سے کپڑوں میں پاس آیا تھا۔ ''بات سنو۔''

''ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔'' میں نے رکے بغیر کہا۔

''صاحب ہم کچھ بیچتا نہیں ہے۔'' لڑکے نے کہا۔ ''اگر ہم ان تینوں کو سزا دے تو ہم کو کیا دے گا؟''

اس کی بات نے ہم سب کو رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ''کیا مطلب تم کیا سزا دو گے؟''

''بس صاحب، دیکھ لینا۔ ایسی بے عزتی ہوگی کہ سب لوگ ہنسیں گے۔ پر صاحب، ہمیں کیا دو گے؟''

''جو تم مانگو گے۔'' مونا بولی۔

''کوئی ضرورت نہیں۔ ہم خود ان سے نمٹ سکتے ہیں۔'' سفیر بدستور غصے میں تھا۔

''یار، میں تمہارے جذبات سمجھ رہا ہوں لیکن ان سے الجھ کر بات بڑھانے کا فائدہ نہیں ہے۔ میں نے ان کے ڈرائیور کو مسلح دیکھا ہے اور ممکن ہے ان کے پاس بھی اسلحہ ہو۔ ہم خالی ہاتھ ہیں اور ہمارے ساتھ مونا ہے، بات بڑھی تو یہ بھی لپیٹ میں آ جائے گی۔''

سفیر نے غور کیا۔ ''اوکے...... لیکن چھوٹے، تم کیا کرو گے؟''

''صاحب، جب کرے گا تو دیکھ لینا۔'' لڑکا پٹھان نہ ہوتے ہوئے بھی پٹھانوں کے سے لہجے میں بول رہا تھا۔ ''پر انعام کا وعدہ کرو۔ اگر مزہ نہ آئے تو انعام مت دینا۔''

''ٹھیک ہے، تمہیں دو سو ملیں گے۔'' سفیر بولا۔

''صرف دو سو صاحب!'' لڑکا بولا۔ ''پکڑا گیا تو یہ میری ہڈیاں توڑ دیں گے۔''

''اچھا بابا! تین سو...... اس سے ایک روپیا بھی اوپر نہیں۔'' سفیر بولا۔

''آپ کی جیب دیکھی ہے میں نے کام کر کے ادھر ملے گا۔''

وہ اوباش امیر زادے سامنے والے ریستوران میں گئے تھے جبکہ ہم روڈ پار دوسرے ریستوران میں گئے تھے۔ زبردست قسم کی بھوک لگ رہی تھی۔ سفیر اور میں نے اپنے لئے بروسٹ منگوایا جبکہ مونا نے چکن کارن سوپ اور ویجی ٹیبل رائس منگوائے تھے۔ وزن بڑھنے کے خیال سے وہ چکنائی والی چیزوں سے پرہیز بھی کرتی تھی۔ کھانے کے دوران میں بار بار سڑک کے پار ریستوران کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد کھانا آ گیا۔ کھانا ختم بھی ہو گیا مگر وہ تینوں اوباش باہر نہیں آئے تھے۔ ہم نے وقت گزاری کے لئے چائے منگوائی اور ابھی چائے آئی بھی نہیں تھی کہ وہ تینوں باہر آتے نظر آئے۔ میں نے جلدی سے بل کی رقم میز پر رکھی۔ ''باہر چلو، تماشے کا

وقت آ گیا ہے۔ دیکھیں یہ چھوٹو کیا کرتا ہے؟''

بیرا ہماری طرف لپکا تھا لیکن پھر میز پر بل کی رقم دیکھ کر رک گیا۔ ''صاحب، چائے آ رہی ہے۔''

''پھر سہی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بل میں سے جو بچا وہ تمہارا ہوگا۔''

بیرے کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ میں نے ہزار کا نوٹ رکھا تھا اور بل سات آٹھ سو سے زیادہ کا نہیں تھا۔ تینوں اوباش امیرزادے چہل قدمی کے انداز میں اپنی جیپ کی طرف آ رہے تھے۔ میں نے چاروں کی طرف دیکھا لیکن وہ بچہ نظر نہیں آیا تھا۔ ''لگتا ہے ہمارے ساتھ مذاق کر کے گیا ہے۔'' مونا بولی۔

''نہیں، وہ مذاق کرنے والا نہیں ہے۔ تین سو روپے اس کے لئے بہت بڑی رقم ہے۔ وہ یہیں کہیں ہے لیکن چھپا ہے۔'' سفیر نے وثوق سے کہا تھا۔

لڑکے کی تلاش میں ہم ان تین اوباشوں کے ساتھ ہونے والی کارروائی درست طور سے نہیں دیکھ سکے تھے اور دھاڑ نما گالی نے ہمیں چونکا دیا تھا۔ ان تینوں میں سے ایک اس حال میں کھڑا تھا کہ اس کے سر سے کیچڑ بہہ بہہ کر اس کے کپڑوں پر گر رہا تھا۔ پھر نہ جانے کہاں سے یکے بعد دیگرے پلاسٹک کی دو تھیلیاں آ کر دوسرے دونوں اوباشوں پر گریں اور پھٹ گئیں۔ ان میں بھرا کیچڑ ان کے کپڑوں پر لگ گیا تھا۔ چند لمحوں میں وہ ہنسنا اور لطف اندوزی بھول کر دیوانہ وار گالیاں دینے اور کیچڑ پھینکنے والے کی ماں بہن ایک کرنے لگے تھے۔ وہ ہر طرف اس طرح بھاگ دوڑ کر رہے تھے جیسے ہوش و حواس گنوا چکے ہوں۔ پورا بازار ان کی طرف متوجہ تھا اور پھر جو قہقہے لگنے شروع ہوئے تو وہ کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچتے جیپ میں جا گھسے۔ ان کا ڈرائیور اور محافظ بدحواسی کے عالم میں جیپ اسٹارٹ کر کے بھاگا تھا لیکن چند گز دور جاتے ہی جیپ کے دونوں ٹائر دھماکے سے پھٹے اور جیپ عملاً بیٹھ گئی تھی۔ غصے سے پاگل اوباش نوجوانوں نے اپنے ڈرائیور کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ بے چارہ دہائیاں دے رہا تھا۔ تماشا ضرورت سے زیادہ تسلی بخش ہو گیا تھا اس لئے ہم ریستوران میں واپس آئے اور آرڈر کردہ چائے طلب کر لی۔

''مزہ آ گیا۔'' مونا چہکی۔ ''چھوٹو نے زبردست کام کر دکھایا ہے۔''

''ہاں، وہ انعام کا مستحق ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بلکہ خصوصی انعام کا۔''

''چائے پی کر چلتے ہیں۔ داد اور انعام ایک ساتھ دیں گے۔'' سفیر بولا، وہ خوش نظر آ رہا تھا۔

شاندار ڈنر، بہترین چائے اور بہترین تماشا دیکھنے کے بعد ہم ایک آسودگی بھری کیفیت میں اپنی جیپ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ رات دس بجے بھی مال روڈ کی رونق کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی تھی۔ ہوا میں خنکی اور نمی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہلکی سی بوندا باندی شروع ہو گئی اور یار لوگ اس سے بھی لطف اٹھانے لگے۔ ہم بھی ٹہلتے ہوئے جیپ تک پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ لڑکا بے تابی سے ہمارا منتظر ہوگا لیکن وہاں اس کا نام و نشان نہیں تھا۔ ''یہ کہاں رہ گیا؟'' سفیر نے چاروں طرف دیکھا اور جیپ کے نیچے بھی جھانک لیا کہ لڑکا وہاں نہ چھپا بیٹھا ہو۔

''یار! وہ پکڑا تو نہیں گیا؟'' مجھے فکر ہونے لگی۔ ''اگر ان بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ اس کا حشر کر دیں گے۔ ممکن ہے مار ہی ڈالیں۔''

مونا نے اسے آوازیں دیں۔ مال روڈ کے اس حصے میں نسبتاً ویرانی تھی۔ آس پاس لوگ کم تھے کیونکہ ایک شاپنگ سینٹر زیرِ تعمیر تھا۔ بوندا باندی تیز ہوئی تو ہم جیپ میں جا بیٹھے۔ مونا کا اصرار تھا کہ لڑکے کو انعام دے کر ہی جانا ہے۔ ہمارا بھی یہی خیال تھا لیکن ایک حد سے زیادہ انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دس منٹ گزر گئے، میں نے جیپ اسٹارٹ کی لیکن مونا نے اصرار کیا کہ ساڑھے دس بجے تک انتظار کر لیا جائے۔ میں نے جیپ کا انجن بند کر دیا۔ ''اوکے...... لیکن ساڑھے دس بجے تک، اس سے زیادہ نہیں۔''

''وہ ضرور کسی چکر میں پھنس گیا ہے ورنہ پیسے لینے ضرور آتا۔'' مونا کے لہجے میں فکرمندی تھی۔ ''اتنی دیر نہ کرتا۔ ممکن ہے ادھر آ رہا ہو اور ہم نہ ملے تو اسے مایوسی ہو گی۔''

''مونا بی بی! شام سے تم ہی سب سے زیادہ واپسی کا شور مچا رہی تھیں اور اب......''

''ٹیک اٹ ایزی!'' سفیر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''اب ساڑھے دس بجے تک انتظار تو کرنا ہے۔''

انتظار کی کیفیت میں گھڑی کی رفتار بھی سُست ہو جاتی ہے۔ خدا خدا کر کے یہ تیس منٹ بھی گزر گئے اور میں نے جیپ اسٹارٹ کر کے ذرا آگے بڑھائی تھی کہ مونا چلائی۔ ''رکو۔''

میں نے بھنا کر بریک لگائے۔ ''اب کیا گیارہ بجے تک انتظار کرنا ہے یا ساری رات اسی جگہ رکے رہنا ہے؟''

''نہیں، وہ کوئی آ رہا ہے۔'' مونا نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں تاریکی میں کوئی ہماری طرف سُست روی سے آ رہا تھا پھر لڑکے کی آواز سنائی دی۔

''رکنا صاحب! جانا مت، میں آ رہا ہوں۔''

لڑکا لنگڑا رہا تھا۔ میں نے انجن بند کیا۔ مونا نیچے اتر گئی تھی اور اب لڑکے کو ڈانٹ رہی تھی۔ ''کہاں تھے، اب تک ہم نے کتنا انتظار کیا۔''

''میرے ساتھ حادثہ ہو گیا تھا۔'' لڑکا بولنے لگا۔ ''اپنا کام کر کے بھاگا تو سیڑھیوں سے گر گیا تھا۔ بہت چوٹ آئی۔ گھر گیا تو ماں نے روک لیا۔ زبردستی مرہم پٹی کرنے لگی۔ اس سے پیچھا چھڑا کر یہاں آیا ہوں۔ شکر ہے تم گئے نہیں، میرا انعام......؟''

''صبر صبر...... انعام کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔'' سفیر اسے پکڑ کر ایک طرف روشنی میں لے گیا۔ ''تم اس جگہ رہتے ہو؟'' اس نے لڑکے کے زخموں کا معائنہ کیا۔ لڑکا خاصا زخمی تھا۔ خاص طور سے کہنی کے پاس بازو کا گوشت پھول گیا تھا اور جلد کی رنگت نیلی پڑ رہی تھی۔ مونا نے بھی اس کا معائنہ کیا۔

''تم ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے۔''

''ہم کدھر سے جائے۔ ادھر ڈاکٹر بہت فیس لیتا ہے۔ دوا مہنگی ہے۔ بس گھر میں ہلدی سے علاج کر لیا ہے۔''

مونا نے میری طرف دیکھا۔ ''اسے ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے۔''

مجھے بھی اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی اس لئے اس کے منع کرنے کے باوجود ہم اسے لے کر ایک

دیر تک کھلنے والے کلینک میں لے آئے۔ ڈاکٹر فارغ بیٹھا تھا۔ اس نے لڑکے کی مرہم پٹی کی۔ ڈاکٹر نے اتفاق سے معائنے اور دوا کے تین سو روپے لئے تھے جو مونا نے دے دیئے۔ کلینک سے باہر آ کر میں نے اسے اس کے گھر تک چھوڑنے کی پیش کش کی۔ اس نے انکار کر دیا۔ صاحب! ادھر تک تمہاری جیپ نہیں جا سکتی۔ نیچے مکان ہے ہمارا، بس ادھر اتار دو جدھر سے لایا تھا۔ ہماری ماں انتظار کر رہی ہوگی۔''

''تمہاری بس ماں ہے؟'' مونا نے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''ادھر صاحب لوگوں کے بنگلوں میں کام کرتی ہے۔ سردیوں میں کام نہیں ملتا ہے۔ مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔''

''تم نے پڑھا نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا تو لڑکا تلخی سے مسکرایا تھا۔

''کدھر سے پڑھتا صاحب! ماں نے بڑی مشکل سے ہم کو کھلا پلا کر پالا۔ ادھر بازار میں بچپن سے کام کرتا ہے یا آپ جیسے صاحبوں کے کام آتا ہے تو کچھ پیسا مل جاتا ہے۔''

''تم اس قسم کی چکر بازیاں کر کے کماتے ہو؟'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ مارا۔ ''لگ کر کام کیوں نہیں کرتے۔ تمہاری عمر کے لڑکے یہاں پر ہوٹلوں میں نوکریاں کرتے ہیں۔''

''ہم نے بھی کیا تھا لیکن اس میں دھوکا ہے، بے ایمانی ہے۔ لڑکے چوریاں کرتے تھے، ہم نے مالک کو بتایا تو الٹا ہمیں مار کر نکال دیا۔ اس کے بعد سے ہم نے نوکری نہیں دیکھا۔ ہماری ماں نے ہمیں رزقِ حلال پر پالا ہے، ہم کیسے حرام کمائے؟''

''اور یہ جو تم نے آج حرکت کی ہے۔ یہ صحیح کام ہے؟'' سفیر نے اسے گھورا۔

''انہوں نے بی بی صاحب کے ساتھ برا کیا تھا، ہم کو غصہ آ گیا تھا اس لئے ان کو سزا دیا اور آپ سے انعام لے لیا۔ انعام تو صحیح ہوتا ہے، ہم نے ناجائز نہیں کیا۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' مونا نے پوچھا۔

''نام تو شاکر ہے پر ماں شاکی کہتی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اب میں جاتا ہوں۔''

''اپنا انعام تو لیتے جاؤ۔'' سفیر نے پرس سے تین سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''نہیں صاحب، آپ نے ڈاکٹر کی فیس دے دی۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ تو ہم نے خود دی ہے۔''

''نہیں صاحب، ہمارا انعام تین سو روپے تھا وہ آپ لوگوں نے دے دیا۔ ہم اپنے حق سے زیادہ نہیں لیتا۔''

اچانک مجھے خیال آیا۔ مجھے اپنے دفتر میں ایک آفس بوائے کی ضرورت تھی۔ ''نوکری کرو گے، تنخواہ کے علاوہ کھانا اور رہائش بھی ملے گی۔''

''نوکری ضرور کرے گا صاحب!'' وہ خوش ہو گیا۔ ''پر کہاں پر صاحب؟''

''راولپنڈی میں...... وہاں میرا دفتر ہے۔ مجھے اوپر کا کام کرنے والے لڑکے کی ضرورت ہے۔''

اس نے انکار کیا۔ ''ہم اپنی ماں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا ہے۔''

''اگر تمہاری ماں کو بھی وہاں نوکری مل جائے؟'' مونا نے پوچھا۔ ''مجھے بھی گھر میں ایک کام کرنے والی چاہئے۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''ماں سے پوچھے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ میرا کارڈ رکھ لو۔'' میں نے اپنا بزنس کارڈ دیا۔ ''اس نمبر پر کال کر لینا۔ میں تمہیں راستہ سمجھا دوں گا۔ یہاں پر تمہارا اپنا مکان ہے؟''

''ہاں، دو کمرے ہیں۔ گرمیوں میں ایک کمرا کرائے پر دے دیتے ہیں۔ اس سے کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔''

''وہاں بھی رہائش مل جائے گی۔'' سفیر نے تین سو روپے زبردستی اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ ''علاج اس لئے کرایا کہ ہمارا کام کرتے ہوئے تمہیں چوٹ آئی تھی اس لئے ہمارا فرض بنتا تھا کہ تمہارا علاج بھی کراتے۔''

اس نے ممنونیت سے کہا۔ ''صاحب آپ اچھے لوگ ہو۔'' اس نے مونا کی طرف دیکھا اور شرمایا۔ ''بی بی صاحب بھی بہت اچھی ہیں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں ہے۔'' سفیر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''یہ بہت اچھی ہیں۔''

مونا جھینپ گئی۔ ''بس فضول بلوا لو تم سے۔ اب چلنا نہیں ہے کیا؟''

''آپ نے ہی روکا ہوا تھا میڈم!'' میں جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ ''شاکر کارڈ سنبھال کر رکھنا، بس مجھے ایک کال کر دینا۔''

شاکر کے جانے کے بعد ہم بھی روانہ ہوئے۔ مری جی پی او کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے اوباش امیرزادوں کی جیپ دیکھی۔ جیسے ہی میں اس کے قریب سے گزرا وہ حرکت میں آئی اور میری جیپ کے پیچھے آنے لگی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ سفیر بھی چونکا تھا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ''یہ وہی حرام زادے ہیں۔'' پھر خفیف ہو کر مونا کی طرف دیکھا۔ ''سوری!''

مونا نے مڑ کر دیکھا۔ ''شوبی! سفیر! وہ بالکل پیچھے آ رہے ہیں۔''

''فکر نہ کرو۔ اگر کوئی شرارت کی تو بھگتیں گے۔ اس سڑک پر...... وہ مجھ سے بہتر ڈرائیونگ نہیں کر سکتے۔''

میں نے جیپ کی رفتار بڑھائی۔ دوسری جیپ کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔ بارہ بجے کے قریب سڑک تقریباً سنسان تھی۔ کبھی کبھی سپلائی والے ٹرک ملتے تھے۔ دس پندرہ منٹ تک میں فاصلہ بڑھانے کی کوشش کرتا رہا مگر دوسری جیپ کا ڈرائیور بھی کم ماہر نہیں تھا۔ سفیر نے بتایا۔

''ڈرائیور نہیں ہے، ان میں سے ایک ڈرائیو کر رہا ہے۔''

''لگتا ہے، اس بے چارے کو وہیں فارغ کر دیا ہے۔''

مونا بولی۔ ''اور شاید ان کو پتا چل گیا ہے کہ ان کی بے عزتی ہم نے کرائی تھی۔''

''شوبی! ہم نہتے ہیں، ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' سفیر پریشان ہو گیا تھا۔ ''اگر انہوں نے ہمیں روک لیا

تو......؟''

''فکر نہ کرو۔'' میں نے ایک تنگ موڑ تیز رفتاری سے کاٹا۔ جیپ کے پہیے سڑک کے کنارے تک چلے گئے تھے۔ ''میں انہیں قریب نہیں آنے دوں گا۔''

سفیر بزدل نہیں تھا، وہ مونا کی وجہ سے پریشان تھا۔ اتفاق سے مجھے بھی یہی فکر تھی۔ ہم مرد تھے لیکن مونا عورت ہونے کے ناتے زیادہ خطرے میں تھی اور مجھے اس قسم کے اوباشوں کا اچھی طرح پتا تھا، دولت اور اثر رسوخ کے نشے میں یہ ماورائے قانون حرکت بے دھڑک کر گزرتے تھے۔ ہمارا معاشرہ ایسے اوباش درندوں کی شکارگاہ بنتا جارہا ہے۔ جیپ کی رفتار تیں پینتیس کلومیٹر فی گھنٹا تھی اور ان سڑکوں پر دن میں بھی یہ رفتار زیادہ تھی۔ رات کو کوئی اس رفتار سے گاڑی نہیں چلاتا تھا۔ راستے میں مجھے جتنی گاڑیاں ملیں، ان میں سے کسی کی رفتار بیس کلو میٹر فی گھنٹہ سے اوپر نہیں تھی اور وہ پوری رفتار سے ہمارے پیچھے آرہے تھے۔ اگر ان کے عزائم درست ہوتے تو وہ کبھی اس رفتار سے ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ میں اس حد سے اوپر نہیں جاسکتا تھا۔ ذرا سی غلطی مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔

اچانک پچھلی جیپ کی رفتار میں تیزی آئی اور وہ ہمارے نزدیک آنے لگے۔ ''وہ لوگ قریب آرہے ہیں۔'' سفیر نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ ''شوبی! رفتار تیز کرو۔''

میری جیپ اچھی حالت میں تھی۔ اگرچہ پرانی تھی۔ البتہ اس کے ٹائر کافی گھس گئے تھے اور میں کچھ عرصے سے انہیں تبدیل کرانے کا کام ٹالتا آرہا تھا اور اس وقت مجھے پچھتاوا ہورہا تھا کہ کاش میں جیپ کے ٹائر بدلوالیتا۔ ان ٹائروں کے ساتھ رفتار زیادہ کرتا تو جیپ کے پھسلنے کا خطرہ تھا۔ اس جگہ بھی ہلکی سی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ جبکہ عقب میں آنے والی جیپ نہ صرف نئی تھی بلکہ اس کے ٹائر بھی اس طرح کے تھے کہ روڈ کو بہتر طریقے سے گرپ کررہے تھے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''کم سے کم اس حصے میں رفتار نہیں بڑھا سکتا۔ جیپ کے ٹائر پرانے ہیں، سلپ کر جائیں گے۔ سڑک بارش کی وجہ سے نم ہے۔''

مونا بار بار پلٹ کر دیکھ رہی تھی اور آگاہ کررہی تھی کہ تعاقب کرنے والے کتنی دور ہیں۔ ''شوبی! وہ بیس گز پیچھے ہیں۔ اب دس گز...... اب پانچ گز......''

میں جھنجلا گیا تھا۔ ''چپ رہو، مجھے ڈرائیونگ کرنے دو۔ اس جگہ سے نکل جائیں تو ان کا باپ بھی ہمارے قریب نہیں آسکتا۔''

''تم ہر بار یہی کہتے ہو۔'' مونا کے لہجے میں طنز تھا۔ ''لیکن یہ تو نزدیک آتے جارہے ہیں۔''

''مونا...... پلیز، شوبی کو اس کا کام کرنے دو، ڈسٹرب مت کرو۔''

جیپ خطرناک حد تک قریب آگئی تھی۔ جب میں کسی موڑ پر رفتار کم کرنے پر مجبور ہوتا تو پچھلی جیپ کا بمپر میری جیپ کو چھو جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر انہوں نے اچانک ہماری جیپ کو ٹکر ماری۔ میں نے بمشکل بے قابو ہوتی جیپ کو قابو میں کیا ورنہ سڑک تلے کھائی میں اتر چکے ہوتے۔ مونا نے چیخ ماری تھی۔ ان کے عزائم کھل کر سامنے آگئے تھے۔ وہ ہمیں روکنے کے بجائے جیپ کو حادثے سے دوچار کرکے جسمانی ضرر پہنچانا

چاہتے تھے۔''شوبی! رفتار تیز کرو۔'' مونا نے چلا کر کہا۔

''اس سے زیادہ تیز کروں گا تو ان کی کوشش کے بغیر ہم حادثے کا شکار ہو جائیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔ عقبی جیپ ایک بار پھر تیزی سے قریب آئی تھی۔ میں نے رفتار تیز کرتے ہوئے جیپ کو پہاڑ کی طرف دبایا۔ اس لئے تصادم سے جیپ بے قابو نہیں ہوئی تھی لیکن ہم اچھل کر رہ گئے تھے۔ میں نے رفتار تیز کی، اب جیپ چالیس کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے جا رہی تھی۔ اوپر سے بوندا باندی میں تیزی آ رہی تھی اور مجھے وائپر چلانے پڑے۔ بارش میں تیزی سے سڑک پر پھسلن بھی بڑھ جاتی۔ میں دل ہی دل میں عقبی جیپ والوں کو بے نقط سناتے ہوئے منتظر تھا کہ وہ اگلا وار کب کرتے ہیں۔ وہ ہمارے نزدیک آنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ سفیر غصے سے بے قابو ہو کر انہیں گالیاں دے رہا تھا اور مونا زیر لب دعا مانگ رہی تھی۔

تیسری بار بھی اللہ نے بچا لیا ورنہ ان لوگوں نے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ایک کھائی کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اچانک ہی ٹکر ماری تھی۔ ان بدمعاشوں نے اپنی جیپ کی روشنیاں بجھا دی تھیں اس لئے ان کے نزدیک آنے کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ جیپ نے ٹکر کھا کر کھائی کے ساتھ کی ریلنگ سے رگڑ کھائی تھی۔ معجزانہ طور پر جیپ ریلنگ توڑ کر کھائی میں گرنے سے محفوظ رہی تھی۔ میں نے زبردست جدوجہد کے بعد اسے سڑک پر سیدھا کر لیا تھا۔ میں نے چلا کر سفیر سے کہا۔''کچھ کر...... ان حرامیوں کی جیپ پر کچھ دے کر مار...... ورنہ یہ ہمیں کسی کھائی میں گرا کر دم لیں گے۔''

سفیر عقبی نشست سے ہوتا جیپ کے پچھلے حصے میں جا پہنچا۔ اس نے سامان ٹٹولنا شروع کر دیا۔ میں نے عقبی حصے کی لائٹ جلا دی تھی۔ اس دوران میں دوسری جیپ بالکل چپک کر چل رہی تھی۔ مجھے بالکل موقع نہیں مل رہا تھا کہ آگے نکل سکوں۔ سفیر نے سامان سے ایک ہائیکنگ میں کام آنے والی ہتھوڑی نکالی لیکن جب اس نے جیپ کا پچھلا دروازہ کھولنا چاہا تو وہ کھلا نہیں کیونکہ دوسری جیپ بالکل چپک کر چل رہی تھی۔ سفیر نے چلا کر پوچھا۔

''اب کیا کروں؟''

''شیشہ توڑ دے۔'' میں نے کہا۔ اسی لمحے میری نظر تیزی سے نزدیک آتے ایک تنگ موڑ پر پڑی۔ عقب سے دوسری جیپ فیصلہ کن ٹکر کے ارادے سے آگے آ رہی تھی۔

تنگ موڑ مشکل سے تیس گز دور تھا اور اس رفتار سے یہ فاصلہ پلک جھپکتے میں گزر جاتا ہے۔ میں نے پلک جھپکنے میں فیصلہ کیا تھا۔ زندگی میں شاید ہی کبھی میں نے اتنا اچانک اور خطرناک فیصلہ کیا ہو۔ سفیر نے ہتھوڑی مار کر عقبی شیشہ توڑ دیا اور دوسرے ہی لمحے ہتھوڑی غراتی اور چڑھی آتی دوسری جیپ کی ونڈ اسکرین پر دے ماری۔ اسی لمحے میں نے جیپ کا ایکسی لیٹر دبایا اور بے حد خطرناک رفتار کے ساتھ پوری قوت سے اسٹیئرنگ کاٹا۔ جیپ بری طرح لہرائی، مونا نے چیخ ماری اور پھر ہذیانی انداز میں چیختی چلی گئی۔ مجھے لگا جیسے جیپ موڑ پر سڑک سے اتر گئی ہو۔ میرے ہاتھ سختی سے اسٹیئرنگ پر جمے تھے، جو سیدھا ہونے کے لئے زور لگا رہے تھے۔ بارش سے تر سڑک پر ٹائر پھسل رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ انجن کی غراہٹ، مونا کی چیخیں اور ٹائروں کے رگڑنے کی آواز جیپ کے اندر ایک پُرشور ماحول تخلیق کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے یقین تھا، جیپ ابھی کھائی میں جا گرے گی اور میں آخری آواز ایک دھماکے کی سنوں گا، جس کے بعد دنیا میرے بلکہ ہم تینوں کے لئے بے معنی ہو جائے گی۔

مگر نہ تو جیپ کھائی میں گری اور نہ ہی دھما کا ہوا۔ ہم بچ گئے تھے۔ بعض واقعات انسان ہوتے دیکھتا۔ لیکن اس کا منطقی شعور اس واقعے کی وضاحت کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ہم اُس روز کس طرح بچ گئے تھے؟ بارش سے بھیگی سڑک پر کوئی چالیس کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے پچاس درجے زاویے کا موڑ کاٹا اور کھائی میں گرنے سے محفوظ رہے، میں جس دھماکے کا منتظر تھا وہ چند لمحے بعد سنائی دیا۔ سفیر عقب سے کچھ کہہ رہا تھا مگر مونا کی چیخوں اور انجن کی غراہٹ اور بریکوں کے شور میں اس کی بات سنائی نہیں دی تھی۔ جیپ دس بارہ گز پھسلنے کے بعد رک گئی تھی۔ میں نے انجن بند کیا اور مڑ کر مونا پر دھاڑا۔ ”چپ ہو جاؤ۔“

مونا نے اپنا منہ دبا لیا، وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ میں بھی لرز رہا تھا، میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”شوبی! وہ حرام زادے کھائی میں گر گئے ہیں۔“ سفیر نے اطلاع دی۔

میں نے گہری سانس لی۔ میں نے جو جوا کھیلا تھا اس کا ایک انجام یہ بھی تھا۔ دوسری جیپ ٹکر مارنے والی پوزیشن میں تھی اور اس کے ڈرائیور نے موڑ کا خیال بھی نہیں رکھا۔ میرے رفتار بڑھانے سے وہ مجھے چھونے میں ناکام رہی تھی اور تیز رفتاری کے باعث سڑک سے نیچے کھائی میں اتر گئی تھی۔ میں، سفیر اور مونا جیپ سے اتر کر کھائی کے کنارے تک آئے۔ جیپ کوئی تیس چالیس گز نیچے پڑی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس اور اندر کی روشنی ابھی تک جلی تھی، اس کی وجہ سے ہمیں نظر بھی آ گئی۔ جیپ کے اندر سے ان لوگوں کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔ آوازوں اور گالیوں کے وزن سے اندازہ ہوتا تھا، وہ کسی جان لیوا چوٹ سے محفوظ رہے تھے۔ سفیر سامان سے طاقتور سرچ لائٹ نکال لایا تھا، اس کی مدد سے ہم نے جیپ سواروں کا معائنہ کیا۔ جیپ ایک خاصے تناور درخت سے ٹکرا کر رک گئی تھی ورنہ اس کے سواروں کو عشق کے کئی امتحانوں سے مزید گزرنا پڑتا۔ درخت نے انہیں بچا لیا تھا۔

”کیا خیال ہے نیچے چل کر انہیں جیپ سے نکالیں؟“ میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”ہرگز نہیں، تم بھول رہے ہو...... وہ مسلح ہیں۔“ مونا بولی۔

”درست کہا...... اور میں زخمی سانپ کی مدد کا قائل نہیں ہوں، وہ ڈستا ضرور ہے۔“ سفیر نے بھی مونا کی تائید کی لہٰذا میں نے بھی اتفاقِ رائے کیا۔

”تب چلا جائے، ان کو اپنی حرکتوں کا مزہ لینے دو۔“ میں نے جیپ کا رخ کیا۔

سفیر اور مونا کچھ دیر میں آ گئے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ سفیر نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ ”کیا ساری رات یہیں مراقبہ کرنے کا ارادہ ہے؟“

”نہیں یار، میں سوچ رہا ہوں، کتنے ہی برے سہی، ہیں تو انسان...... انہیں اس طرح بے یار و مددگار چھوڑنا صحیح نہیں ہے۔ پتا نہیں کوئی شدید زخمی ہو اور اسے طبی امداد کی ضرورت ہو۔“

”تو جناب کیا کریں گے؟“ سفیر بھنا گیا تھا۔ ”اس کا علاج کریں گے؟“

”یار اسے کسی اسپتال تک تو لے جا سکتے ہیں۔“ میں جیپ سے اتر آیا۔ ”چلو میرے ساتھ۔“

”معاف کیجئے گا، مجھے کمینوں کی مدد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ سفیر نے صاف انکار کر دیا۔

''اچھا......ایک ٹارچ اور ہتھوڑی دو۔''

''ذرا دور سے بات کرنا، ایسوں کا کوئی بھروسا نہیں ہے، مدد کے لئے آنے والے کو گولی مار دیں۔'' مونا نے مشورہ دیا۔

''زرہ بکتر پہن کر نہ چلا جاؤں؟'' میں نے بھنا کر کہا اور سفیر سے ٹارچ اور ہتھوڑی لے کر نیچے اتر گیا۔

بارش رک گئی تھی، زمین پر پھسلن تھی۔ شکر ہے جگہ جگہ پتھر تھے جن پر پاؤں جما کر اترنا آسان تھا ورنہ خالی مٹی ہوتی تو صحیح سلامت نیچے پہنچنا ایک مسئلہ بن جاتا۔ ٹارچ کی روشنی میں راستہ دیکھنا آسان تھا، میں قدم جماتا جیپ کے پاس جا پہنچا۔ وہ کسی قدر ترچھی کھڑی تھی۔ ونڈ شیلڈ چکنا چور ہو گئی تھی۔ اگلے دروازوں کی کھڑکیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں۔ البتہ عقبی دروازوں کے شیشے سلامت تھے۔ ایک درخت کی آڑ سے میں نے ٹارچ کی روشنی میں جیپ کے اندر دیکھا۔ فرنٹ والی سیٹوں پر دو افراد پھنسے بیٹھے تھے۔ یوں کہ دروازے کھلنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ عقبی نشست پر بھی ایک شخص تھا۔ روشنی پڑتے ہی وہ سب مدد کے لئے چلانے لگے۔ ''ہمیں یہاں سے نکالو، ہمیں بچاؤ۔''

''...... خدا کے لئے ہمیں یہاں سے نکالو'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص چلایا۔ کچھ دیر پہلے یہی فرشتۂ اجل بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ فرنٹ سیٹ والوں کی حالت بری تھی۔ ونڈ شیلڈ کے ذرّے بندوق کے چھروں کی طرح لگے تھے اور ان کے چہرے لہولہان تھے بلکہ ڈرائیور کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ اس کی آنکھیں بھی زخمی تھیں۔ اس کے ساتھ بیٹھے شخص کی کلائی ٹوٹ گئی تھی اور وہ اسے اپنی والدہ و ہمشیرہ سے منسوب کر کے بار بار سیدھا کر رہا تھا۔ اس طرح وہ صرف اپنی تکلیف میں اضافہ کر رہا تھا۔ تیسرا عقبی نشست پر خاموشی سے پڑا تھا۔ پہلے مجھے شبہ ہوا کہ وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکا ہے لیکن ٹارچ کی روشنی میں اس کا ہلتا سینہ اور کھلتے بند ہوتے دیدے نظر آئے تھے۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری کمر میں جھٹکا آیا ہے، مجھ سے ہلا نہیں جا رہا۔'' اس نے بے بسی سے کہا تھا۔

''تب تم آرام کرو۔'' میں نے کہا اور اگلے ٹیڑھے ہو جانے والے دروازے میں ہتھوڑی کی نوک پھنسا کر اسے کھینچا تو ذرا سی زور آزمائی سے دروازہ نکل گیا تھا۔ کلائی کو رونے والا فوراً باہر آ گیا اور چیخ مار کر نیچے گر گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں بھی چوٹ آئی تھی۔ اسے ایک طرف ٹکا کر میں نے نکلے دروازے سے ہی ڈرائیور کو بھی باہر نکال لیا۔ اس کی آنکھیں سچ مچ زخمی تھیں اور اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے احتیاط کی تھی کہ وہ میری صورت نہ دیکھنے پائیں۔ اسے ایک مناسب جگہ بٹھا کر میں نے حادثے کے بارے میں دریافت کیا۔ ''تم لوگوں نے جیپ کھائی میں کیسے اتار دی؟''

''یہ سب ایک حرام زادے کا قصور ہے۔'' اس نے مجھے اجنبی جان کر سفید جھوٹ بولا۔ ''وہ مری سے ہمارے پیچھے لگا تھا۔ ہائے...... پہلے کسی لفنگے سے کیچڑ بھرے تھیلے پھنکوا کر ہمارے کپڑے خراب کئے اور پھر پیچھے سے ٹکر مار کر کھائی میں گرا دیا۔ وہ تو قسمت نے بچا لیا...... ہائے۔''

''تم لوگوں کی حرکتوں کے لحاظ سے خاصی کم سزا ملی ہے۔'' میں نے دل میں کہا۔
''یہاں سے نکل جائیں...... پھر اس...... کو بھی دیکھ لیں گے۔'' ٹوٹی کلائی والے نے بلبلاتے ہوئے کہا۔ ایک لمحے کو میرا دل چاہا کہ انہیں چھوڑ جاؤں، یہ ذلیل لوگ الٹا مجھے ہی قصوروار ٹھہرا رہے تھے۔ مگر اپنے اندر کے انسان کی وجہ سے میں رک گیا۔ ''تم لوگ اوپر میری گاڑی تک کیسے آؤ گے؟''
''آ جائیں گے جناب! آپ ہمیں اسپتال تک پہنچا دیں۔'' ڈرائیور بولا۔
''سب سے پہلے اس کے خلاف رپورٹ کرانی ہے۔ اس کی جیپ کا نمبر مجھے یاد ہے۔'' ٹوٹی کلائی والا بولا تو میں اپنے ارادے پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ہم مدد کر کے پھنس جاتے۔ ''تم لوگ آرام سے بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اوپر آ کر جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ سفیر طنزیہ انداز میں بولا۔
''جناب کو پتا چل گیا ناں...... اپنی عقلمندی کا...... یہ کتے کی دُم جیسے لوگ ہیں۔''
''تم ہماری باتیں سن رہے تھے؟'' میں نے جھینپ کر کہا۔
''لعنت بھیجو اور کوئی پولیس والا آئے تو ان لوگوں کو پہچاننے سے بھی انکار کر دینا۔'' مونا بولی۔
میں نے ایک بار پھر جمہوری فارمولے کے تحت اکثریت سے اتفاقِ رائے کیا۔ ان دونوں کو ان کے گھروں پر اتار کر میں صبح چار بجے کے قریب گھر پہنچا تھا۔ مجھے ٹوٹی کلائی والے کی بات نے متفکر کر دیا تھا، اس کے عزائم خطرناک تھے۔ وہ کینہ پرور نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ جیپ کے نمبر کی مدد سے میرا سراغ لگانا بے حد آسان تھا کیونکہ میں نے جیپ اپنے نام پر کرائی تھی اور رجسٹریشن آفس سے میرا پتا بھی بہ آسانی مل سکتا تھا۔ یہ ایک نئی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ اگرچہ میں اتنا بھی کمزور نہیں تھا لیکن پھر بھی ایک کاروباری آدمی تھا اور اس قسم کے بکھیڑوں میں نہیں پڑ سکتا تھا۔ بہرحال میں اس معاملے میں قصوروار نہیں تھا اور نہ ہی ان سے الجھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اپنی خباثت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے خلاف کوئی کارروائی کرنا چاہتے تو میں مقابلہ کرنے پر مجبور ہوتا۔
رات سونے کے لئے گھر جانے کے بجائے میں نے آفس میں رکنے کا فیصلہ کیا۔ صبح بے شمار کام تھے۔ میں نے چوکیدار سیّد گل سے کہا۔
''مجھے صبح گیارہ بجے اٹھا دینا۔''
مگر اس نے گیارہ بجے کے بجائے نو بجے ہی اٹھا دیا۔ میں جھنجلا گیا۔ ''کیا بات ہے سیّد گل!''
وہ گھبرایا ہوا تھا۔ ''صاحب، باہر پولیس آئی ہے، آپ کا پوچھتی ہے۔''

☆======☆======☆

''سائیں!'' کی آواز کے ساتھ پہلی ضرب میری کمر پر لگی تو باوجود ضبط کے میرے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ راجا عمر دراز کے جلّاد نے پوری قوت سے چمڑے کا بل کھایا کوڑا مارا تھا۔ ضرب کی شدت سے میرا جسم بل کھا کر رہ گیا تھا۔ دوسری ضرب پہلی سے زیادہ شدید تھی اور میری چیخ بھی بلند تھی۔ ''راجا صاحب! میں نہیں جا...... جانتا...... میں بے...... قصور ہوں۔'' مارے تکلیف کے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر میرے منہ سے نکل رہے تھے۔ ''خدا کے لئے...... اسے روکیں۔''
''یہ صرف ایک صورت میں رکے گا، جب تم نوادرات کا پتا بتا دو گے۔'' راجا عمر دراز نے سرد لہجے میں

کہا۔ ''میں جا رہا ہوں، میرے پاس اس صورت میں آنا جب یہ کچھ بتانے پر آمادہ ہو ورنہ زحمت مت کرنا۔'' راجا عمر دراز کہتا ہوا چلا گیا۔

''راجا صاحب! میری بات......'' میں چلایا۔ تیسری ضرب سے میری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ مارنے والا ظالم اور سفاک شخص تھا، اسے کسی پر ظلم کرتے ہوئے مزہ آتا تھا کیونکہ کوڑا مارتے ہوئے اس کی لذت اندوز سسکاریاں میں نے خود سنی تھیں۔ تیسری ضرب کے بعد اس نے گلابی اردو میں کہا تھا۔

''لڑکا......اب بی وقت اے......بتا دو......ورنہ ام چمڑی......اتار دے گا۔''

تیسری ضرب سے سچ مچ میری کھال اتر گئی تھی۔ مجھے اپنی کمر پر سرسراتا خون صاف محسوس ہو رہا تھا۔

''میں بے قصور ہوں......فتح خان جھوٹ کہتا ہے، میں رات کو سو رہا تھا۔''

''یہ سب راجا صاحب کو بولنا......ام کو ٹیک جواب دو......ہاں یا ناں؟''

میں چپ رہا تو اس نے پھر کوڑا اٹھا لیا تھا۔ تکلیف سے توجہ ہٹانے کے لئے میں ضربیں گننے لگا مگر گنتی ہی بھول گیا۔ چند ضربوں کے بعد درد کی شدت نے ایسا بے حال کیا کہ میں سوچنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھا تھا۔ شاید میں جانور کی طرح چلا رہا تھا اور اس طرح چلاتے چلاتے نہ جانے کب ہوش سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ یہ بے ہوشی نامعلوم مدت تک جاری رہی۔ رفتہ رفتہ مجھے ہوش آنے لگا اور شعور کا پہلا احساس ہی تکلیف کا تھا مگر نہیں، تکلیف نہیں...... بلکہ یہ تکلیف کی یاد تھی۔ درحقیقت مجھے اپنی پشت میں ہلکی سی سوزش ہو رہی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ میں ایک نرم بچھونے پر اوندھے منہ پڑا تھا اور میری پشت پر ہلکا کمبل تھا۔ میں منتظر رہا کہ ابھی درد کی لہریں اٹھ کر مجھے جھنجھوڑ دیں گی مگر بس وہی ہلکی سی سوزش رہی۔ اس کا مطلب تھا کہ بے ہوشی کے دوران میں میری پشت پر کوئی زود اثر مرہم لگایا گیا تھا جس نے سارا درد کھینچ لیا تھا۔ میرے جسم پر صرف شلوار تھی۔ قمیص ویسے ہی پھٹ چکی تھی۔ اس کے باوجود مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے سر گھما کر دوسری طرف دیکھا۔ دیوار کے ساتھ انگیٹھی رکھی تھی جس میں انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی وجہ سے کمرے میں حرارت تھی۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں پہلے مجھے قید رکھا گیا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو پشت سے ٹیسیں اٹھی تھیں۔ مگر میں اٹھ گیا۔ میں نے کوشش کر کے ہاتھ پشت پر رکھا۔ میری انگلیوں سے کوئی نرم سی شے لگی۔ یہ کالی اور لیس دار تھی۔ شاید کوئی مقامی دوا تھی جسے میری پشت کے زخموں پر لگایا گیا تھا۔ بہر حال دوا حیرت انگیز حد تک زود اثر تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ میں سات آٹھ گھنٹے سے زیادہ بے ہوش نہیں رہا تھا۔ اتنی دیر میں کوئی بھی دوا یا پین کلر درد کو اتنی جلدی نہیں دبا سکتی ہے۔ مارفین سے درد دب جاتا ہے لیکن انسان بھی غنودگی میں رہتا ہے جب کہ میرا ذہن مکمل طور پر چاق و چوبند تھا۔ دروازہ باہر سے بند لگتا تھا۔ چیک کرنے پر بھی بند ہی ثابت ہوا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر بستر پر واپس آ بیٹھا۔ کچھ دیر تو اس جگہ آنے پر پچھتاتا رہا پھر حالات پر غور کرنے لگا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے راجا عمر دراز کے جلاد کے ہاتھ سے بدترین عذاب سے گزر رہا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو صاف ستھرا پایا تھا۔ یعنی درمیان میں کوئی ایسی بات ہوئی تھی جس کی وجہ سے راجا عمر دراز کے رویے میں تبدیلی آئی تھی۔ ممکن ہے اس کے نوادرات کا کوئی سراغ ملا ہو۔ میرے دل میں امید پیدا ہو گئی تھی۔ بہر حال کوئی تبدیلی آئی بھی تھی تو اس حد تک نہیں کہ راجا عمر دراز میری بے گناہی کا یقین کر لیتا۔ بند کمرا ظاہر کرتا

تھا کہ ابھی مجھ سے شک ہٹا نہیں ہے۔ میں سوچوں میں گم تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک محافظ اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ٹرے میں دو پیالے تھے۔ محافظ نے ٹرے میرے سامنے رکھی اور بولا۔

''ناشتا کرو۔''

یعنی یہ صبح کا وقت تھا۔ ایک بڑے پیالے میں سبزیوں اور گوشت کا سوپ اور دوسرے میں چائے۔ اس وقت مجھے شدت سے چائے کی طلب ہو رہی تھی لیکن پہلے کھانا ضروری تھا۔ پیالے کے ساتھ لکڑی کا چمچ بھی تھا۔ میں نے سوپ پینا شروع کیا تو مجھے پتا چلا میں کس قدر بھوکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں نے پیالہ ختم کر دیا تھا۔ محافظ جا چکا تھا۔ سوپ کے بعد چائے پی اور ذہن پر چھائی غنودگی سے لڑتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب میں سو چکا تھا۔ اس سوپ میں یقیناً کوئی خواب آور دوا تھی یا ممکن ہے وہی بوٹی ہو جو شینا نے سرمد علی کے کھانے میں ملائی تھی۔ بہرحال میں بے ہوشی کی نیند سوتا رہا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کب محافظ آ کر ٹرے واپس لے گیا اور کب کوئی آ کر مجھے پھر سے مرہم لگا گیا۔

اگلی بار میری آنکھ کھلی تو میں قید خانے کے بجائے ایک معقول قسم کے کمرے میں مسہری بچھے بستر پر لیٹا تھا۔ کچھ دیر تو مجھے یقین نہیں آیا شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کمرے میں منتقلی کا مطلب تھا کہ راجا عمر دراز کو میری بے گناہی کا یقین آ چکا تھا۔ ورنہ میں اب تک قید خانے میں پڑا ہوتا۔ میری پشت میں ہلکی سی تکلیف تھی جو فی الحال قابلِ برداشت بھی تھی۔ بیدار ہونے کے کوئی ایک گھنٹے بعد ایک لڑکی کمرے میں آئی تھی۔ اس نے مقامی طرز کا لباس پہن رکھا تھا اور حلیئے سے ملازمہ لگتی تھی۔ ویسے اس کی خوبصورتی میں کوئی کلام نہیں تھا۔

''راجا صاحب...... آپ کو بلاتا۔'' اس نے معصومانہ انداز اور آواز میں کہا۔

''کدھر...... اور میری قمیص کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

لڑکی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایک طرف میرا بیگ رکھا تھا جس میں کپڑے اور دوسرا سامان تھا۔ ''ام ابی آتا اے۔'' لڑکی بول کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اتنی دیر میں کپڑے بدل لوں۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر کے بیگ سے ایک لباس نکال کر پہنا۔ قمیص پہننے کے دوران میں میرا ہاتھ پشت کی طرف گیا۔ مجھے توقع تھی کہ پھر میری انگلیوں پر وہ لیس دار مرہم لگے گا مگر میری انگلیاں جلد سے ٹکرائی تھیں۔ کیا میرے زخم اتنی جلدی بھر گئے تھے؟ کمرے میں ایک طرف ڈریسنگ ٹیبل رکھی تھی۔ میں نے اس کے آئینے میں اپنی پشت دیکھی۔ زخم حیرت انگیز طور پر بھر گئے تھے۔ بس چند لکیریں باقی رہ گئی تھیں۔ میں اپنی پشت کا معائنہ کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے جلدی سے قمیص پہنی۔ نہ جانے کس قسم کا مرہم تھا جس نے اتنی جلدی زخم بھر دیئے تھے۔ باہر لڑکی تھی، میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

اب تک میرا ذہن اس معاملے میں سُن تھا۔ میں کسی قسم کے جذبات محسوس نہیں کر رہا تھا لیکن شاندار سے ڈائننگ ہال کی لمبی سی میز کے ایک سرے پر بیٹھے راجا عمر دراز کو دیکھ کر میرے اندر ابال سا اٹھا تھا۔ اس شخص نے مجھے بے گناہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور اب شاید اپنے ظلم کی تلافی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس صحت مند بڈھے کی گردن پکڑ کر اس وقت تک دباتا رہوں جب تک اس کی آخری سانس بھی نہ نکل جائے۔ وہ

بغور مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ''تمہاری خواہش بے جا نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اس کے بعد اس قسم کے خیالات آنا فطری ہے۔''

میں دم بخود رہ گیا تھا۔ اتنا زیادہ کہ اپنا غصہ بھی بھول گیا تھا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا...... کیا آپ نے میری سوچیں پڑھ لی ہیں؟''

راجا عمر دراز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ انسان کا ذہن پڑھ سکتا ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ انسان کی سوچیں اللہ نے سوائے اپنے سب سے چھپا رکھی ہیں۔ تم اسے قیافہ شناسی کہہ سکتے ہو۔ مجھے معلوم ہے اس وقت تمہارے دل میں میرے لئے شدید جذبات ہیں، کچھ تمہارے تاثرات نے بتایا تھا اور میں نے درست اندازہ لگایا۔ میں اس سلسلے میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ اگر تمہیں معلوم ہو کہ وہ تصویر اور پتھر میرے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے تو تم مجھے معاف کر دو گے۔''

''شاید ان دونوں چیزوں کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ آپ نے بلا تکلف میری کھال اتروا دی۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں، بات قیمت کی نہیں ہے۔ وہ میرے لئے کسی کی نشانی تھی۔ میں ساری دنیا کی دولت کے بدلے بھی ان سے دستبردار ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ تم سوچو ان کے غائب ہونے پر میری کیا حالت ہو گی؟''

''وہ بے شک آپ کے لئے قیمتی ہیں لیکن کسی انسان سے زیادہ نہیں ہو سکتیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو نوجوان...... لیکن ان چیزوں کے معاملے میں...... میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔'' راجا عمر دراز کا لہجہ دردناک ہو گیا تھا۔ ''عمر کے اس آخری حصے میں، میں ان کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔''

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ''ان چیزوں کی کسی کے نزدیک کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟ وہ پتھر شاید اپنی حیرت انگیز خصوصیت کی وجہ سے قیمت رکھتا ہو لیکن جہاں تک تصویر کا تعلق ہے، کوئی بھی اچھا مصور اس سے بھی اچھی تصویر بنا سکتا ہے۔''

''ایسا مت کہو...... اصل اہمیت اسی تصویر کی ہے۔ یہ اس ہستی نے مجھے بنا کر دی ہے جسے میں ہمیشہ سب سے زیادہ چاہتا رہوں گا۔ پتھر بھی اسی کا تحفہ ہے لیکن گزشتہ نصف صدی میں ان چیزوں کو میرے پاس سے چرانے کی کتنی کوششیں کی جا چکی ہیں، میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ وہ ان چیزوں کے پیچھے پاگل ہیں۔ اپنی جان پر بھی کھیل کر انہیں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

''نصف صدی سے...... آخر وہ ہیں کون...... کوئی ایک فرد تو نہیں ہو سکتا۔'' میں نے تعجب سے کہا۔

راجا عمر دراز نے مجھے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ ''بلاشبہ تم ذہین ہو، تمہارا اندازہ درست ہے۔ وہ ایک فرد نہیں بلکہ پورا خاندان ہے نسل در نسل ان چیزوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ارے تم اب تک کھڑے ہو، بیٹھ جاؤ۔''

میں ایک کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ ''راجا صاحب، میرا دل ابھی صاف نہیں ہوا ہے۔''

''ہو جائے گا۔'' راجا عمر دراز نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ پہلے ناشتا کرو۔''

"راجا صاحب! پہلے مجھے بتائیں، کیا آپ نے مجھے بے گناہ تسلیم کرلیا ہے، آپ کی چیزیں مل گئی ہیں؟"

"حیرت ہے، تم اب بھی نہیں سمجھے۔ میں نے تم سے معافی مانگی ہے، اس کا مطلب یہی ہوا ناں کہ میرا دل اب تمہاری طرف سے صاف ہے اور ہاں، مجھے تصویر اور پتھر مل گیا ہے۔"

"کہاں سے؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"پہلے ناشتا کرو، پھر سب بتاتا ہوں۔ یہ سب جاننا تمہارا حق ہے۔"

میرا خیال تھا کہ میں صحیح سے کھا نہیں سکوں گا اس لئے بادل نخواستہ ناشتے کی طرف متوجہ ہوا لیکن جب ناشتا شروع کیا تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے کتنی شدت کی بھوک لگی ہے، میں کھاتا ہی چلا گیا تھا حالانکہ بے ہوشی کی دوا ملا سوپ بھی خاصا مقوی تھا، اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے پیٹ میں جن بیٹھ گیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں نے بیشتر اشیاء کا صفایا کر دیا۔ راجا عمر دراز مسکرا رہا تھا، میں جھینپ گیا۔

"سوری راجا صاحب! شاید آپ کے جلاد کے کوڑوں نے میرے معدے کو بھی ایڑھ لگادی ہے۔"

وہ سنجیدہ بلکہ کسی حد تک مغموم ہوگیا۔ "نوجوان! بار بار اس کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ مت کرو اور اصل میں تمہاری پشت کے زخم جلدی اچھے کرنے کے لئے جو مرہم لگایا گیا تھا، اس کی وجہ سے تمہیں بھوک لگ رہی ہے۔ جسم کی تعمیر کے کام میں بہت زیادہ توانائی لگتی ہے اور یہ مرہم زیادہ توانائی چاہتا ہے، اسی وجہ سے گہرے سے گہرا زخم چوبیس گھنٹے میں بھر دیتا ہے۔"

"راجا صاحب، آپ کی اور چیزوں کی طرح یہ مرہم بھی حیرت انگیز ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں ہفتے بھر پشت کے بل لیٹ نہیں سکوں گا۔"

"اب بھی احتیاطاً دو دن پشت کے بل مت لیٹنا کیونکہ زخم پر کھال آئی ہے۔ اندر سے ابھی کچے ہیں۔ اندر کے زخم بھرنے میں دو دن لگیں گے۔"

"مرہم کسی جڑی بوٹی سے بنتا ہے؟" میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

"نہیں...... بلکہ ایک قسم کے پتھر کو جلا کر اس کی راکھ چند مقامی بوٹیوں میں ملا کر یہ مرہم بنایا گیا ہے۔ اگر اسے گولی کے زخم پر لگا دو تو جسم کے اندر موجود گولی خود بخود باہر آ جاتی ہے۔ بشرطیکہ گولی گوشت میں ہو۔ ہڈی یا اعضائے رئیسہ میں سے کسی عضو میں نہ پھنسی ہو۔"

راجا عمر دراز کچھ دیر مجھے اس مرہم کے معجزاتی اثرات کے بارے میں بتا تا رہا تھا۔ اگر میں خود اس کا براہِ راست مشاہدہ نہ کر چکا ہوتا تو راجا عمر دراز کے باقی دعووں کو گپ سے زیادہ اہمیت نہ دیتا۔ میں نے پوچھا۔ "وہ پتھر کہاں سے ملتا ہے، جس کی راکھ اس مرہم میں شامل کی جاتی ہے؟"

"وہ بھی کسی کا تحفہ ہے۔" راجا عمر دراز بولا۔ عجیب بات تھی، وہ عمر میں مجھ سے چار گنا بڑا تھا لیکن میں اس سے بے تکلفانہ انداز میں بات کر رہا تھا اور مجھے اس کی بزرگی کا خیال تک نہیں تھا۔

"لگتا ہے آپ کو کسی کے تحفے کچھ زیادہ ہی ملے ہیں؟"

"ہاں۔" وہ مسکرایا پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "کیا تمہیں پتا ہے، مجھے تصویر اور سیاہ پتھر کہاں سے ملے؟"

"ظاہر ہے، نہیں...... میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ چور کون ہیں؟"

"یہ دو مقامی باشندے ہیں، اسی وادی میں رہتے ہیں۔ فطرتاً چور ہیں مگر انہوں نے یہ کام اپنے لئے نہیں بلکہ کسی اور کے لئے کیا ہے۔ میرے محافظ ان سے حقیقت اگلوا رہے ہیں، آؤ میرے ساتھ۔"

باہر سے بظاہر چھوٹا نظر آنے والا محل اندر سے خاصا وسیع تھا۔ ہم کئی راہ داریوں سے گزر کر اس تہ خانے تک آئے۔ جس میں مجھے بھی قید رکھا گیا تھا اور وہیں راجا عمر دراز نے اپنے معتوبین کو سزا دینے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اب وہاں پر ایک کے بجائے دو افراد بندھے تھے اور جلاّد باری باری ان کی کمروں پر کوڑے مار رہا تھا۔ دونوں صورت شکل سے مقامی اور مجرمانہ فطرت والے لگتے تھے۔ مار کھا کر وہ ذبح کئے جانے والے بکرے کی طرح بلبلا رہے تھے۔ راجا عمر دراز نے مقامی زبان میں کچھ کہا تو وہ دونوں افراد چلانے لگے تھے۔ غالباً وہ اقرارِ جرم کرنا چاہ رہے تھے۔ راجا عمر دراز نے اشارے سے جلاّد کو روک دیا اور ان کی سننے لگا۔ دونوں باری باری اور جلدی سے بول رہے تھے جیسے خدشہ ہو کہ ایک لمحے کی تاخیر سے جلاّد پھر سے کوڑے برسانا شروع کر دے گا۔ راجا عمر دراز کوئی دس پندرہ منٹ ان سے بات کرتا رہا۔ درمیان میں وہ سوال بھی کر رہا تھا۔ آخر میں اس نے اپنے سیکرٹری کو ہدایات دیں اور جلاّد سے کچھ کہتا ہوا تہ خانے سے باہر آ گیا۔ میں بے تابی سے منتظر تھا کہ وہ مجھے ان چوروں سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں کچھ بتاتا لیکن راجا عمر دراز سوچوں میں گم محل کی راہ داریوں سے گزرتا باہر نکل آیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ چبوترے سے اتر کر وہ باغ میں آیا اور پھولدار پودوں کے تختوں کے درمیان ٹہلنے کے انداز میں گھومنے لگا۔ شاید اسے کوئی خاص بات چوروں سے معلوم ہوئی تھی اور وہ متفکر نظر آ رہا تھا۔

ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد مجھ میں توانائی آ گئی تھی اور چلنا پھرنا مشکل نہیں لگ رہا تھا البتہ راجا عمر دراز کی پُر اسرار چپ سے بوریت ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ میں بھی پھولوں میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اپنی حویلی میں بھی میں نے گلاب کی بے شمار اقسام لگوائی تھیں، ماں جی کو موتیا اور رات کی رانی پسند تھی۔ رات کے وقت حویلی کا صحن ان پھولوں کی خوشبوؤں سے مہک جاتا تھا لیکن راجا عمر دراز کے باغ میں ان نادر اور نایاب اقسام کے پھولوں کی ایسی مہک تھی جو میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ان میں سے اکثر پھول میں نے نہ تو براہِ راست اور نہ ہی تصویر یا ٹی وی پر دیکھے تھے۔ ایک چھوٹے سے نیلی پنکھڑیوں والے پھول سے جیسے ہلکی سی روشنی نکل رہی تھی۔ مجھے شبہ ہوا اور میں نے جھک کر دیکھا، واقعی اس کے کناروں سے نیلگوں روشنی پھوٹ رہی تھی اور دن کے وقت جب کہ سورج نکلا تھا پھر بھی یہ روشنی نمایاں تھی۔

"شہباز! اسے رات کو دیکھنا۔ یہ پوری کیاری روشن ہو جاتی ہے۔" عقب سے راجا عمر دراز نے کہا۔

"حیرت انگیز...... میں نے روشنی دینے والے پودوں کے بارے میں سنا ضرور ہے لیکن کسی پھول کے بارے میں نہیں سنا کہ اس سے روشنی نکلتی ہو۔"

"سمندر میں روشنی دینے والے خاصے پھولدار پودے ہوتے ہیں لیکن خشکی پر یہ واحد پھول ہے جس سے روشنی نکلتی ہے۔" وہ بولا پھر اس نے جھک کر ایک پھول توڑا۔ "اس کی ایک حیرت انگیز خاصیت ہے، اسے سونگھو......" اس نے پھول میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے لے کر سونگھا۔

''اس میں ذرا بھی خوشبو نہیں ہے۔''

''اب اسے اپنی ہتھیلی پر اچھی طرح مسل لو'' اس نے کہا تو میں نے ایسا ہی کیا اور جب اپنی ہتھیلی سونگھی تو اس سے ایسی انوکھی خوشبو آئی جس کا مجھے پہلے تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گلاب اور خس کی خوشبوؤں کو آپس میں ملا دیا ہو۔ میں بے اختیار بولا۔

''حیرت انگیز......راجا صاحب!''

میری دلچسپی محسوس کر کے راجا عمر دراز نصف گھنٹے تک مجھے ان پھولوں کے بارے میں لیکچر دیتا رہا تھا۔ اس سے بات کرنے کے دوران میرے ذہن سے چوروں کا خیال نکلا نہیں تھا اور جب میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تو میں نے راجا عمر دراز کو ٹوک دیا۔ ''معذرت کے ساتھ راجا صاحب! بے شک آپ کا باغ انوکھا ہے اور اس میں نایاب اقسام کے پھول ہیں لیکن فی الوقت مجھے ان دو افراد سے زیادہ دلچسپی ہے جن کی وجہ سے میری درگت بنی تھی۔''

''اوہ......معاف کرنا۔'' وہ ہنسا۔ ''بعض معاملات میں، میں سچ مچ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنی کہتا رہتا ہوں، آؤ میرے ساتھ۔''

ہم چبوترے پر رکھی کرسیوں پر آ بیٹھے تھے۔ راجا عمر دراز نے وہاں موجود خادم کو کوئی حکم دیا تو وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ''ان دونوں نے اصل بات بتا دی ہے۔ ان کی خدمات ایک سفید فام نے حاصل کی تھیں۔''

''کسی سفید فام کو ان سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

''تم نہیں سمجھو گے۔ جو لوگ ان چیزوں کی اصلیت جانتے ہیں، وہ انہیں ہر قیمت پر مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔''

''تب آپ نے ان چیزوں کو ایسے کھلا کیوں رکھا ہے؟ آپ انہیں زیادہ حفاظت سے کسی تجوری میں رکھ سکتے ہیں۔''

''میں نے ان کی حفاظت کا بندوبست کر رکھا ہے۔ ایسے انتظامات ہیں جو بظاہر کسی کو نظر نہیں آتے لیکن جیسے ہی ان چیزوں کو چھیڑا جاتا ہے، مجھے پتا چل جاتا ہے؟''

''اس کے باوجود چور انہیں آپ کے محل سے لے اُڑے اور آپ کو پتا بھی نہیں چلا۔''

''اسی سے تو مجھے شبہ ہوا کہ یہ کام ان معمولی اچکوں کا نہیں ہو سکتا ہے۔ انہیں پوری طرح سمجھا کر بھیجا گیا تھا۔'' راجا عمر دراز بولتے بولتے سوچ میں پڑ گیا۔

''راجا صاحب! اگر باہر کے کسی شخص نے چوروں کو اتنی مکمل معلومات فراہم کی ہیں کہ وہ بے خبری میں بھی چیزیں چرا کر لے گئے تو لازمی طور پر محل کا کوئی فرد ان سے ملا ہوا ہے۔''

راجا عمر دراز مسکرایا۔ ''تم واقعی ذہین ہو۔ میرے آدمی فتح خان کو تلاش کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ پہرا دینے والے دو محافظوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ چوروں کے بارے میں سنتے ہی فتح خان فرار ہو گیا تھا مگر وہ وادی سے باہر نہیں جا سکتا۔ میرے آدمی چپے چپے پر ہیں، جلد وہ پکڑا جائے گا۔''

''راجا صاحب صرف فتح خان ہی نہیں بلکہ وادی میں بھی ان کا کوئی آلہ کار ہے جس نے فتح خان کو بتایا کہ میں اس رات اس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔''

''تم نے درست کہا۔ میرے جاسوس اس معاملے کو دیکھ رہے ہیں۔ جلد وہ اس شخص کا سراغ بھی لگا لیں گے۔''

مجھے اب اس معاملے سے خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ راجا عمر دراز کی چیزیں اور انہیں چرانے والے افراد مل گئے تھے اور میں یہاں سے جانا چاہتا تھا۔

''راجا صاحب، کیا اب میں آزاد ہوں؟''

اس نے تعجب سے مجھے دیکھا۔ ''تم نے یہ سوال کیوں کیا؟ اب تم میرے معزز ترین مہمان ہو۔ تم پر کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں ہے۔''

''راجا صاحب، میں اب جانا چاہتا ہوں۔''

''برخوردار! میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں اور میری خواہش ہے تم کچھ دن اور میرے ساتھ رہو۔ شاید میرے کئے کی تلافی ہو سکے۔''

''راجا صاحب! آپ کے حسن سلوک نے تلافی کر دی ہے اور یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے ورنہ لوگ اب اپنے کئے پر شرمندہ نہیں ہوتے ہیں۔ آپ اگر مجھے اسی حالت میں اپنے محل سے نکال دیتے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ لیکن آپ نے اپنے عمل اور الفاظ سے اپنی ندامت ظاہر کر دی ہے۔ پلیز اب دوبارہ معذرت کے الفاظ مت دہرائیے گا مجھے خود شرمندگی ہوتی ہے۔ جہاں تک جانے کی بات ہے تو مجھے جانا تو ہے۔''

''ہاں...... لیکن پھر بھی تم اس بوڑھے کی بات مان لو اور کچھ دن اور رک جاؤ۔ مجھے بہت عرصے بعد کوئی ایسا شخص ملا ہے، جس سے میں بات کر سکتا ہوں اور وہ میری بات سمجھتا ہے۔ شہباز، کم عمری کے باوجود تمہاری معلومات وسیع ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے تم ہر شے کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہو۔''

''بس راجا صاحب! کم عمری سے مجھے مطالعے کا شوق رہا ہے اور میں نے کتابوں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''جو لوگ کم عمری میں کتاب کو اپنا ساتھی بنا لیں وہ زندگی میں کسی نہ کسی منفرد مقام پر پہنچتے ہیں۔ تم ذہنی لحاظ سے بھی مضبوط ہو ورنہ میں نے کسی کو اتنی تیزی سے خود کو سنبھالتے اور نارمل ہوتے نہیں دیکھا۔ یہ بتاؤ کہ پیرا سائیکلوجی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔

میں نے سوچ کر جواب دیا۔ ''یہی کہ اس دنیا میں بہت کچھ ایسا بھی ہوتا ہے جس کا جواب ہمارے مادی اور طبعی علوم نہیں دے پاتے۔ ایسے میں پیرا سائیکلوجی کی ضرورت پڑتی ہے۔''

''شاندار!'' اس نے تحسین آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''کسی اٹھارہ سالہ نوجوان سے اس جواب کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایک سوال اور ہے...... اگر ہمارے مشاہدے یا تجربے میں ایسا کچھ آئے جو عام زندگی میں نہیں ہوتا تو اسے ہم کیا کہیں گے؟''

راجا عمر دراز کا یہ سوال زیادہ مشکل اور میرے علم کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ ''راجا صاحب! آپ نے بڑا

مشکل سوال کیا ہے پھر بھی میں جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اللہ نے دنیا کو ایک نظام کے تحت بنایا ہے۔ اسے آپ فزکس یا مادے کے اصول بھی کہہ سکتے ہیں۔ ماہرین ان اصولوں کو جانتے ہیں جیسے ایٹم کی ساخت جو مادہ بناتی ہے۔ یا کشش ثقل جس نے پوری کائنات کو باندھ کر رکھا ہے۔ عناصر کے ملاپ سے تشکیل پانے والی اشیاء ہمیشہ ایک جیسی ہوتی ہیں۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن ملنے سے پانی بنتا ہے لیکن کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو مادے کے ان اصولوں سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ ہم موجود اصولوں کے تحت ان کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کر سکتے گویا ایسے تجربات اور مشاہدات اصولوں کے محتاج نہیں ہوتے یا ہم ابھی تک ان اصولوں کو دریافت نہیں کر پاتے ہیں۔"

"گویا تم ماورائی اشیاء اور واقعات کو مانتے ہو؟"

"ایک حد تک۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "لیکن ہو سکتا ہے، ہم جسے معمول سے ہٹ کر سمجھ رہے ہوں، وہ دراصل ایک عام سی بات ہو لیکن ہم اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

راجا عمر دراز خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ اس دوران میں سبز قہوہ آ گیا جس سے الائچی کی خوشبو اٹھ رہی تھی، خادم نے قہوے کو سلیقے سے سرو کیا۔ ساتھ میں ایک ڈش میں کلیجے نما چھوٹی چھوٹی ٹکیاں تھیں۔ ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد میں ایک بار پھر بھوک محسوس کر رہا تھا۔ لہٰذا میں نے ان سے بھی انصاف کیا۔ ان کا ذائقہ بھی کلیجے سے ملتا جلتا تھا۔ راجا عمر دراز نے برائے نام چکھا تھا۔ قہوے کے بعد اس نے منہ صاف کرتے ہوئے اپنے خادمِ خاص سے کچھ کہا پھر میری طرف دیکھا۔ "شہباز! تمہاری دوا لگانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اپنے کمرے میں جاؤ، وہاں طبیب موجود ہوگا۔"

میں خادمِ خاص کے ساتھ اندر آ گیا۔ خادمِ خاص چھوٹے سے قد کا چینی نقوش والا شخص تھا۔ اس کی عمر شاید راجا عمر دراز کے لگ بھگ تھی لیکن وہ سچ مچ بوڑھا لگتا تھا۔ بے پناہ جھریوں والا چہرہ اور نحیف و نزار جسم مگر چال اور حرکات میں پھرتی پائی جاتی تھی۔ وہ مجھے مہمان خانے میں میرے کمرے تک لایا۔ محل کا نچلا حصہ مہمانوں، کئی طرح کی نشست گاہوں اور وسیع و عریض ڈائننگ ہال کے لئے مخصوص تھا۔ راجا عمر دراز اور اس کے اعزا کی خواب گاہیں اوپری منزل پر تھیں۔ کمرے میں طبیب میرا منتظر تھا۔ یہ بھی معمر لیکن صحت مند شخص تھا۔ سیاہ چغے میں وہ سچ مچ کوئی شاہی طبیب لگ رہا تھا۔ وہ اردو سے نابلد تھا اس لئے اپنی زبان میں کچھ کہا مگر بے اثر پا کر اس نے اشارے سے مجھے قمیص اتار کر اوندھے منہ قالین پر لیٹنے کو کہا۔ میں نے تعمیل کی، اس نے اپنی صندوقچی سے ایک جار نکالا جس میں گہرا سبزی مائل چٹنی جیسا گاڑھا مادہ بھرا تھا۔ اس نے لکڑی کا ایک چمچہ لیا اور اس سے مادہ میری پشت پر لیپ کرنے لگا۔ مرہم پشت پر ہلکی سی جلن کر رہا تھا پھر یہ جلن بڑھنے لگی۔ مجھے پہلی بار ہوش میں اس کا تجربہ ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ جلن اس حد تک بڑھی کہ میں کراہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"میرے خدا...... کیا مجھے پھر سے بے ہوش نہیں کیا جا سکتا؟"

شاہی طبیب شاید میری بات کا مفہوم سمجھ گیا اس نے دانت نکالے تھے۔ پھر اس نے ایک ڈبیا نکالی اور اس میں بکری کی مینگنی کے رنگ اور سائز کی دو عدد گولیاں نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔ میں نے لے کر سونگھا تو

اس میں سے بو بھی مینگنی جیسی آ رہی تھی، میں نے گولیاں واپس کر دیں۔ ”میں یہ بکری کی مینگنیاں نہیں کھا سکتا۔“

اس پر شاہی حکیم نے ایک لمبی چوڑی تقریر کی۔ وہ یقیناً ان مینگنیوں کی افادیت پر روشنی ڈال رہا تھا اور ان کے معجزاتی اثرات بیان کر رہا تھا مگر اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ شاہی حکیم کو اس کا احساس کچھ دیر بعد ہوا۔ اس نے منہ بند کر کے کمرے میں ایک طرف لٹکی رسی کھینچی اور ایک منٹ کے اندر ایک خادم جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ شاہی حکیم نے اسے کچھ کہا اور وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”جناب! آپ یہ دوائی کھالیں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے آج تک بکری کی مینگنی نہیں کھائی۔“

خادم نے جو کہا اس پر شاہی حکیم نے آتش زیر پا ہو کر ایک اور لمبی تقریر کی تھی۔ جس کا مرکزی خیال بلکہ خلاصہ خادم نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ مذکورہ گولیاں کسی طرح سے بھی بکری کی مینگنی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ہیں اور میری پشت پر لگے مرہم سے جو تکلیف ہو رہی ہے اس کا علاج یہی گولیاں ہیں۔ لہٰذا بادل ناخواستہ میں نے وہ گولیاں پانی سے نگل لیں۔ شاہی حکیم نے مزید ہدایات جاری کیں کہ مرہم کم سے کم تین گھنٹے پشت پر لگا رہے۔ اس کے بعد میں اسے صاف کروا سکتا ہوں۔ وہ چلا گیا تو میں نے خادم سے کہا۔

”تین گھنٹے بعد آ کر میری پشت سے یہ لیس دار شے صاف کر دینا۔“

”آپ فکر نہ کریں جناب!“ خادم نے نستعلیق لہجے میں کہا۔ ”تین گھنٹے بعد میں آپ کے لئے چوزے کی یخنی اور خوبانی کا سوپ لاؤں گا۔“

خادم کے جانے کے بعد میں اوندھے منہ لیٹ گیا تھا۔ نہ جانے یہ گولیوں کی تاثیر تھی یا مجھے غنودگی آ گئی تھی۔ میں حالاتِ حاضرہ پر غور کرتے کرتے سو گیا تھا۔ تکلیف میں مینگنی نما گولیاں کھاتے ہی کمی آنے لگی تھی۔ تین گھنٹے گزرنے کے بعد خادم نے آ کر مجھے بیدار کیا۔ اس نے پہلے روئی سے میری پشت پر لگا مرہم صاف کیا اور پھر غسل خانے تک رہنمائی کی۔ مہمان خانے میں اٹیچ باتھ نہیں تھے، جب تک میں نے غسل کر کے لباس بدلا، وہ یخنی اور خوبانی کا سوپ لے آیا تھا۔ یہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ شمالی علاقے میں جہاں بھی خوبانی پیدا ہوتی ہے یہ لوگوں کی عام غذا میں شامل ہے اور اسے طاقت اور درازی عمر کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ قابلِ غور بات ہے کہ ہنزہ، گلگت، کاغان اور چترال کی طرف جہاں یہ سوپ باقاعدگی سے پایا جاتا ہے، صحت کی عمومی صورتِ حال بہتر نہ ہونے کے باوجود لوگوں میں لمبی عمر پانے کی اوسط دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے بھی زیادہ ہے۔ حد یہ کہ میں نے گلگت میں ایک ایسی پولو ٹیم بھی دیکھی ہے جس کا ہر کھلاڑی سو سال سے زیادہ عمر رکھتا ہے۔

یخنی اور سوپ سے انصاف کر کے میں نے تازگی محسوس کی تھی اور رسّی کھینچ کر خادم کو طلب کیا۔ ”میں باہر سیر کے لئے جانا چاہتا ہوں۔“

”پیدل جائیں گے یا گھوڑے پر؟“ اس نے پوچھا۔

مجھے گھڑ سواری آتی تھی لیکن اس کا ماہر نہیں تھا اور وادی کے اونچے نیچے راستوں پر یہی امید تھی کہ گھوڑا مجھے گرا دے گا لہٰذا میں نے پیدل چلنے کو ترجیح دی۔ ویسے بھی زخم اندر سے کچا تھا اور جھٹکوں سے مجھے نقصان ہو سکتا تھا۔ خادم نے شاہی حکیم کی خاص ہدایات جو مجھ تک پہنچائی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ میری پشت کے زخم پر

کسی طرح کا بوجھ نہ پڑے یعنی مجھے مشکل راستوں پر جانے سے گریز کرنا تھا۔ میں راجا عمر دراز کے محل سے باہر آیا تھا۔ دوپہر کے دو بجے وادی تیز دھوپ میں نہا رہی تھی، اس کے باوجود موسم خنک تھا۔ اوپر سے پوری وادی کا منظر بے حد واضح تھا۔ میں درختوں کے درمیان سے گزرتا نیچے آنے لگا۔ میرا ارادہ سرمد علی سے ملنے کا تھا لیکن اس کے لئے مجھے نیچے نہیں جانا پڑا۔ مجھے نیچے سے چند افراد اوپر کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ مجھے شبہ ہوا کہ ان میں ایک سرمد علی بھی ہے۔ میں رک گیا۔ جب وہ لوگ نظر کی حد میں آئے تو میں شینا کو پہچان کر حیران رہ گیا۔ ایک لحیم شحیم عورت نے اس کا بازو یوں تھام رکھا تھا جیسے اسے گرفتار کر کے لے جا رہی ہو۔ سرمد علی کے علاوہ ایک راجا عمر دراز کا محافظ بھی تھا۔ سرمد علی اور شینا کے چہروں سے فکرمندی جھلک رہی تھی لیکن شینا کے انداز میں خوف بھی تھا، وہ بار بار اپنے ساتھ کی عورت سے کچھ کہہ رہی تھی اور وہ اسے دھکے دے کر آگے بڑھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں نے ان کے سامنے آنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شینا اور سرمد علی کو راجا عمر دراز نے طلب کیا ہے۔ وہ لوگ میرے نزدیک سے گزر کر راجا عمر دراز کے محل کی طرف چلے گئے۔ ممکن ہے ان کی طلبی راجا نے ابھی کی ہو ورنہ صبح اس نے مجھے اشارتاً بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ میں اتنا اہم کب سے ہو گیا کہ راجا عمر دراز مجھے اپنے معاملات میں شریک کرنے لگا تھا۔ میں ان کے تعاقب میں جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کوئی سرد سی اور سخت شے میری گردن پر آ کر ٹک گئی۔

''یہ پستول اے۔'' کسی نے مقامی لہجے میں کہا۔ ''ذرا بھی بات...... یا حرکت کی تو ام گولی مار دے گا۔''

میں ساکت ہو گیا تھا۔ مجھے دھمکانے والا عقب میں تھا اور مجھے اس کی آواز جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

''کون ہو تم۔ مجھے اس طرح کیوں روکا ہے؟''

وہ شخص گھوم کر سامنے آیا تو میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ راجا عمر دراز کا مفرور محافظ فتح خان تھا۔ ''تم نے دیکا...... وہ شینا کو پکڑ کر لے گیا اے...... اب ام اسے چوڑائے گا۔''

مجھے دوسرا جھٹکا لگا تھا اور اچانک ہی سارا معاملہ میرے سامنے روشن ہو گیا تھا۔ شینا اور فتح خان آپس میں ملے ہوئے تھے۔ ممکن ہے فتح خان بھی شینا کا عاشق ہو۔ اس نے جس طرح مجھ پر پیش قدمی کی کوشش کی تھی اس سے لگ رہا تھا کہ یہ کھیل اس کے لئے نیا نہیں ہے۔ فتح خان پرانا کھلاڑی تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ''شینا سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ وہ سرمد علی کے باپ کی تیسری بیوی ہے۔''

''امارا شینا سے مرد عورت والا تعلق اے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ابی ادر سے چلو۔'' اس نے پستول سے ایک طرف اشارہ کیا، میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔

''تم مجھے کیوں اور کہاں لے جانا چاہتے ہو؟''

''سوال مت کرو۔ ابی جیسا ام بولتا اے...... وہ کرو...... ورنہ گولی مار کر ادرای چوڑ دے گا۔'' اس نے خطرناک انداز میں کہا تو میں حرکت میں آنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کر گزرے گا۔ وہ مجھے بلندی پر واقع جنگلات کی طرف لے جا رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی۔ راجا عمر دراز کے محافظ اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے اور وہ دن دیہاڑے اتنی دیدہ دلیری سے گھوم رہا تھا، یہی نہیں بلکہ راجا عمر دراز کے

ایک مہمان کو اغوا کر کے بھی لے جا رہا تھا۔ جلد ہم وادی کے اوپری حصے میں تھے، یہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کی وجہ سے باقاعدہ راستے بھی نہیں تھے اور پتھروں پر سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ ایک جگہ روک کر اس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے لے جانے لگا۔ پھر ہم جھاڑیوں سے گزرتے ہوئے کسی تنگ سی جگہ آ گئے۔ فتح خان نے ایک جھٹکے سے میری آنکھوں سے پٹی کھینچ لی۔ یہ ایک کچا پکا کمرہ تھا اور شاید زمین دوز تھا وہاں دیوار پر لگی مشعلیں جل رہی تھیں۔ جن سے عجیب سی بو اٹھ رہی تھی۔ فتح خان نے زمین سے ایک زنجیر اٹھا کر اس کے سرے پر لگا کڑا میرے پاؤں میں ڈال کر لاک کر دیا۔ زنجیر کا دوسرا سرا زمین میں دبا تھا۔ مجھے باندھ کر فتح خان مسکرایا۔

"اب ام راجا سے شینا کو لے گا...... وہ تو مارے بدلے شینا کو دے گا۔"

"فتح خان، راجا عمر دراز کے آدمی تمہیں تلاش کر رہے ہیں اور وہ جلد تمہارا سراغ لگا لیں گے۔ بہتر ہے اس سے پہلے اس وادی سے فرار ہو جاؤ۔"

"ام بزدل نئیں اے۔" وہ حقارت سے بولا۔ "راجا ام کو نئیں جانتا۔ ام اسے بھی مار سکتا اے۔"

فتح خان مجھے چھوڑ کر اس تاریک کمرے کے ایک طرف چلا گیا۔ درحقیقت یہ کمرا نہیں تھا بلکہ دو طرفہ سرنگ کے درمیان میں ایک چوڑی سی جگہ تھی۔ میں ایک نئی افتاد میں پھنس گیا تھا۔ اس وادی میں آنا میرے لئے نیک فال ثابت نہیں ہوا تھا۔ پہلے سرمد علی کی سوتیلی ماں نے اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کی اور شاید میری طرف سے مایوس ہو کر مجھے فتح خان کی مدد سے راجا عمر دراز کے نزدیک چور بنا دیا۔ یہ افتاد بھی مجھ پر شینا کی وجہ سے پڑی تھی اور اب بھی شینا کی وجہ سے میں فتح خان کا قیدی تھا۔ یہ خاتون شروع سے میرے لئے خطرے کا نشان تھی۔ میں زنجیر سمیت کر دیوار سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد فتح خان آیا تو اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر سفید فام تھا۔ اس کی عمر تقریباً پچپن سال تھی اور صورت سے وہ کسی اعلیٰ گھرانے کا چشم و چراغ لگتا تھا۔ مگر اس کے بشرے سے ایک خاص نوع کی مکاری اور عیاری بھی جھلکتی تھی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے انگریزی میں فتح خان سے کچھ کہا، اس نے جواب دیا۔ ان دونوں کی گفتگو کچھ دیر جاری رہی۔ میں نے اپنی ساری سماعتیں اس طرف مرکوز کر رکھی تھیں اس کے باوجود میں ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی سننے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میرا اندازہ تھا، سفید فام مجھے اس جگہ لانے پر فتح خان سے ناراض ہو رہا تھا اور فتح خان اپنے فیصلے کا دفاع کر رہا تھا۔ سفید فام ناگواری کے تاثرات لئے جس طرف سے آیا تھا اسی طرف چلا گیا۔ میں نے فتح خان سے پوچھا۔

"یہ وہی شخص ہے...... جس نے راجا عمر دراز کے محل میں چوری کرائی تھی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ دونوں خنزیر کا بچہ پکڑا گیا، ام نے اس گورا بندر سے کہا تھا، ان پر یقین نہ کرے پر یہ مانا نئیں۔"

"کیا مطلب......" میں چونکا۔ "کیا وہ تم لوگوں کو بھی دھوکا دے کر فرار ہو رہے تھے؟"

"اسی وجہ سے تو پکڑا گیا۔" فتح خان نے سر ہلایا۔

"اس تصویر اور پتھر میں ایسی کیا خاص بات ہے جو یہ گورا انہیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

''یہ گوراجانے...... یاراجاصاحب! ام کو پیسے سے مطلب اے۔'' فتح خان نے شانے اچکائے۔

''تصویر اور پتھر تو واپس راجا کے پاس چلا گیا ہے۔ اب یہ گورا کیا کرے گا؟''

فتح خان مسکرایا۔ ''وہ ای جو پہلے کیا...... فیر چورائے گا۔ اس بار ام کام کرے گا۔''

میں نے اسے خبردار کیا۔ ''تم راجا عمر دراز کے محل کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتے......اس نے حفاظت سخت کردی ہے۔''

''تم ابی فکر مت کرو۔ یہ امارا کام اے......ام جانتا اے......کس طریقے سے کام کرنا اے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے۔ راجا میرے بدلے شینا کو تمہارے حوالے کردے گا۔''

''ضرور کرے گا۔ اگر اس کے مائی مان (مہمان) کو تکلیف ہوا تو اس کا بدنامی اوگا۔''

''کک......کیا مطلب......تم مجھے تکلیف دو گے؟''

''تو اور کیا......'' وہ عیاری سے مسکرایا۔ ''اگر راجا صاب نے امارا بات نہ مانا تو ام تمارا انگلی کاٹ کر اسے بیجے گا۔ فیر بی نہ مانا تو ساری انگلی کاٹ کر بیجے گا۔''

مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔ قطعی سنجیدہ تھا۔ فتح خان جیسے لوگوں میں حسِ مزاح نام کی کوئی شے پائی ہی نہیں جاتی ہے۔ اگر راجا عمر دراز شینا کو اس کے حوالے کرنے سے انکار کرتا تو وہ ایسا ہی کرتا جیسا کہ کہہ رہا تھا۔ جو شخص راجا عمر دراز جیسے طاقتور شخص کی ناک تلے رہ کر اس کے مہمان کو اغوا کرے، اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ یہ جگہ راجا کے محل سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی اور وہ پوری بے خوفی سے یہاں چھپا تھا۔ میں نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ''چلو، ایسا کر کے بھی دیکھ لو۔ مجھے نہیں یقین ہے کہ راجا عمر دراز تمہارا مطالبہ مانے گا......اور ہاں، تم اسے کیسے بتاؤ گے کہ میں تمہارے پاس ہوں۔''

اس نے غور کیا اور آگے بڑھ کر میری ایک آستین نوچ لی۔ ''یہ دیکھ کر وہ مانے گا......کہ تمیں مانے گا۔''

فتح خان چلا گیا تھا اور میں دیوار سے ٹک کر اپنے انجام پر غور کرنے لگا جو خاصا عبرت ناک نظر آ رہا تھا۔ میں ایک بار پھر جی جان سے پچھتایا تھا کہ کاش میں بابا جان کی بات مان لیتا تو اس مصیبت میں نہ پھنستا۔ فتح خان صرف انگلیوں کی قطع برید تک محدود نہ رہتا۔ اس کے عزائم خاصے خوف ناک تھے۔ کاش راجا عمر دراز کو کسی طرح اطلاع ہو جائے کہ اس کا مہمان اس کے محل سے کچھ فاصلے پر اس کے دشمنوں کی قید میں ہے۔ میں سوچوں میں غلطاں تھا کہ مجھے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ سحر اس کی بڑی بادامی آنکھوں میں تھا یا حسین ترین ناک نقشے میں یا پھر اس کے نازک سے سراپا میں، میں کتنی ہی دیر اسے سحر زدہ سا دیکھتا رہا تھا۔ وہ غیر ملکی اور سفید فام ہی تھی۔ اس نے گھٹنوں تک اسکرٹ اور اس سے نیچے چمڑے کے لانگ شوز پہن رکھے تھے۔ بلاؤز کی حد پتلی سی کمر سے ذرا اوپر ہی ختم ہو رہی تھی۔ اخروٹی رنگ کے بال اس کے شانوں پر بکھرے تھے۔ اس کے سراپا نے اس جگہ کو جیسے رنگوں سے بھر دیا تھا، میں اسے دیکھ کر عارضی طور پر ان خطرات کو بھول گیا تھا جو مجھے فتح خان سے لاحق تھے۔

''کون ہو تم؟'' اس نے انگریزی میں پوچھا تھا۔ آواز میں نغمگی تھی۔

میں سنبھل گیا۔ ''پہلے بتاؤ، تم کون ہو؟''

''میں ایمن شا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم انگریز ہو۔'' میں کھڑا ہو گیا تھا۔ مجھے بیڑی سے بندھا دیکھ کر بھی وہ ذرا ہراساں نہیں ہوئی تھی۔

''ہاں...... میرا تعلق انگلینڈ سے ہے۔''

''ابھی کچھ دیر پہلے ایک بوڑھا انگریز آیا تھا......''

وہ میرے ڈیڈی ہیں۔'' ایمن بات کاٹ کر بولی۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کے انداز میں سوائے معصومیت کے کچھ نہیں تھا اور وہ کسی طرح سے ان جرائم پیشہ افراد میں سے نہیں لگ رہی تھی۔ میں غیر محسوس طور پر اس کے قریب ہونے لگا۔ میں اسے پکڑ کر خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرنا چاہتا تھا لیکن جیسے ہی میں نے لپک کر اسے پکڑنے کی کوشش کی، وہ شاخ گل کی طرح لچک کر مجھے جھکائی دے گئی اور میں دیوار سے ٹکرا گیا۔ وہ ذرا فاصلے پر کھڑی ہنس رہی تھی۔

''کتنے افسوس کی بات ہے، ایک لڑکی کے ساتھ اس طرح دھوکا کرنا؟''

''دھوکے کی بچی!'' میں نے دوبارہ اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ میرے ہاتھ میں آئی بھی تھی لیکن نہ جانے کیسے چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر نکل گئی۔ وہ پھر ہنس رہی تھی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ کیوں اتنے اعتماد سے میرے پاس چلی آئی تھی۔ میں دوبارہ دیوار سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ ''اوکے۔ اب ہم زبان سے بات کریں، پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں علم ہے...... تمہارا باپ یہاں کچھ چرانے آیا ہے؟''

''چرانے نہیں...... اپنی چیزیں واپس لینے آیا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''راجا عمر دراز کے پاس جو ہے وہ اصل میں ہمارے خاندان کا ہے۔ راجا نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اپنی چیز واپس لینا چرانا نہیں کہلاتا۔''

''تم لوگوں نے مجرمانہ طریقے اختیار کئے۔ دو پیشہ ور چوروں کی خدمات حاصل کیں۔ ہمارے ملک کے قانون کے لحاظ سے یہ جرم ہے اگر مذکورہ اشیاء تمہاری تھیں تو تم نے راجا عمر دراز کے خلاف رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی۔؟''

وہ ذرا لاجواب نظر آنے لگی تھی۔ ''شاید میرے ڈیڈی نے مناسب نہیں سمجھا۔''

''دوسرے تمہارے ڈیڈی کے ہرکارے فتح خان نے اس چوری کا الزام مجھ پر عائد کیا اور نتیجے میں کوڑوں سے میری پشت ادھیڑ دی گئی۔''

''میں اس کے لئے سوری کرتی ہوں۔''

''تمہاری سوری کا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ فتح خان نے مجھے لا کر یہاں اس لئے باندھا ہے کہ راجا عمر دراز سے اپنی محبوبہ کو چھڑا سکے جو کسی اور شخص کی بیوی ہے۔ اس کا ارادہ ہے اگر راجا عمر دراز نے اس کا مطالبہ نہ مانا تو وہ میرے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں کاٹ کر راجا عمر داز کو ارسال کرے گا۔''

''اوہ نہیں۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''اس پر بھی راجا عمر دراز نے اس کی محبوبہ کو رہا نہ کیا تو وہ مجھے قتل کر کے میری لاش کے ٹکڑے راجا عمر دراز

کو بھیج دے گا۔"

وہ چند لمحے اپنی بلوری آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ "میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ یہ وحشیانہ عمل ہے۔"

"غیر قانونی کام کرنے والے وحشت اور انسانیت کی پروا کب کرتے ہیں!"

"میں...... میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں؟" وہ سچ مچ پریشان ہو گئی تھی۔

"میری زنجیر کھول دو۔"

"اس کی چابی میرے پاس نہیں ہے۔ فتے کھان (فتح خان) کے پاس ہے۔"

"تب مجھے فتح خان کے ہاتھوں مر جانے دو۔"

میرا حربہ کامیاب رہا تھا۔ ایمن پریشان نظر آنے لگی تھی۔ "میں ڈیڈی سے بات کرتی ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میرے معاملے میں وہ فتح خان کے حامی ہیں۔"

"پتا نہیں ڈیڈی کیوں ان چیزوں کے پیچھے اتنے دیوانے ہو رہے ہیں جو گرینڈ پا سے غائب ہو گئی تھیں۔"

"یہ گرینڈ پا کہاں سے آ گئے؟"

"میرے گرینڈ پا ولیم شا ہندوستان میں برطانوی فوج میں شامل تھے اور دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں کے خلاف لڑے تھے۔ راجا اومر ڈراز گرینڈ پا کے ساتھ فوج میں تھا اور یہ چیزیں اصل میں گرینڈ پا کو ملی تھیں لیکن راجا نے چرا لیں۔"

"اچھا تو راجا عمر دراز تمہارے دادا کے ساتھ فوج میں تھا۔" میں نے غور کیا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ تمہارے گرینڈ پا کو یہ چیزیں کہاں سے ملیں اور راجا عمر دراز نے انہیں کیوں چرایا جبکہ ان کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں ہے۔ راجا عمر دراز کا کہنا ہے کہ یہ چیزیں اس کے لئے کسی کا تحفہ ہیں اور وہ ان سے جذباتی وابستگی رکھتا ہے ورنہ ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ راجا کو کسی نے یہ چیزیں تحفے میں دی ہیں تو وہ بکواس کرتا ہے۔ وہ میرے گرینڈ پا کے ساتھ جنگ کے بعد ہمالیہ کی طرف کسی مہم میں گیا تھا اور مہم کے بعد چپکے سے فرار ہو کر اپنے علاقے میں آ گیا، جب گرینڈ پا کو پتا چلا تو دیر ہو چکی تھی۔ ہندوستان کا بٹوارا ہو چکا تھا اور گرینڈ پا راجا کے خلاف چوری کی رپورٹ بھی نہیں کرا سکتے تھے۔ ادھر انگلینڈ میں گرینڈ پا کا بھائیوں سے جاگیر پر تنازع تھا۔ وہ واپس انگلینڈ آ کر کئی سال تک اپنی جاگیر کے حصول کی کوششیں کرتے رہے اور ان کی صحت خراب ہو گئی، جب گرینڈ پا کا انتقال ہوا تو اس وقت ڈیڈی اسکول میں تھے۔ گرینڈ پا نے اپنی جاگیر واپس لے لی تھی لیکن اس کا انتظام نہ لے سکے تھے۔ یہ کام ڈیڈی نے کیا۔ کئی برس تک وہ معاشی طور پر خوش حال ہونے کی کوشش کرتے رہے تب کہیں جا کر اس قابل ہوئے کہ اپنے پاپا کی وصیت پوری کر سکیں۔"

"یعنی یہاں آ کر راجا عمر دراز سے وہ تصویر اور پتھر لے سکیں!"

"ہاں یہی بات ہے۔" اس نے سر ہلایا اور پھر ملتجی لہجے میں بولی۔ "پلیز ہماری مدد کرو۔ ڈیڈی فتے خان

کھان پر بہت اعتماد کرتے ہیں اور وہ مجھے بہت خطرناک لگتا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اوّل تو میں مان نہیں سکتا کہ راجا نے تصویر اور پتھر چرایا ہے۔ وہ اس قسم کا آدمی نہیں ہے۔ دوسرے یہ بات مان بھی لوں تو تمہاری مدد کیسے کرسکتا ہوں؟"

"کرسکتے ہو۔" وہ زور دے کر بولی۔ "اور اگر میں تمہیں ثبوت دے دوں کہ راجا نے یہ چیزیں اصل میں میرے گرینڈ پا کے پاس سے چرائی تھیں تو کیا پھر میری مدد کرو گے؟"

میں نے غور کیا اور مجھے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ اگر لڑکی میری مدد حاصل کرنا چاہتی تھی تو لامحالہ اسے مجھے آزاد کرنا پڑے گا۔ میں نے سوچ کر جواب دیا۔ "ٹھیک ہے...... لیکن پہلے تم ثبوت دو...... یہ سب چیزیں تمہارے گرینڈ پا کی ملکیت تھیں۔"

"میں ابھی آئی۔" وہ تیزی سے سرنگ کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک البم تھی۔ "لو اسے دیکھو...... اس میں میرے گرینڈ پا کے ہندوستان کے زمانے کی تصویریں ہیں۔ اس میں ایک تصویر میں وہ تصویر اور پتھر گرینڈ پا کے پاس ہوں گے۔ ان تصویروں میں تمہیں راجا بھی نظر آئے گا۔"

سیاہ مخملی جلد والے اس البم کا سائز دس بائی چھ تھا۔ اندر تصویروں کا سائز بھی یہی تھا۔ ابتدائی چند تصویریں عام سی تھیں۔ ولیم شا جو اکہرے جسم کا اور مخصوص برطانوی جنٹل مین لگتا تھا، کہیں کلب میں، کہیں رائڈنگ کرتے ہوئے اور کہیں دوستوں کی محفل کے درمیان تھا، ایک تصویر میں ولیم شا ایک ائیر گروپ کے ہمراہ اپنے طیارے کے سامنے ائیر فورس کی وردی میں نمایاں تھا۔ پیچھے پرانے طرز کا بڑا سا جنگی طیارہ کھڑا تھا۔ اس طرح کی تصاویر آگے بھی تھیں۔ پھر وہ تصویر سامنے آئی جس میں ولیم شا ایک ہاتھ میں تصویر اور دوسرے ہاتھ میں سیاہ پتھر لئے ہوئے تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ راجا عمر دراز اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ میں نے بغور دیکھا، وہ راجا عمر دراز ہی تھا۔ وقت نے اس کے نقوش پر اثر ڈالا تھا لیکن ناک کے اوپر سیاہ رنگ کا مسہ ویسے ہی نمایاں تھا۔ تصویر بہت واضح تھی اور اس میں تخیلاتی تصویر اور پتھر صاف نظر آرہے تھے۔ روشنی میں آنے پر پتھر کی سیاہی کم ہو رہی تھی اور اس میں سفید لکیریں نظر آنے لگی تھیں۔

"یہ دیکھو...... یہ دونوں چیزیں میرے گرینڈ پا کے پاس ہیں۔ ویسے بھی وہ اس مہم کے سربراہ تھے جو ہمالیہ کی طرف گئی تھی۔" ایمن نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... وہ دونوں چیزیں تمہارے گرینڈ پا کے ہاتھ میں نظر آرہی ہیں لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ یہ تصویر اور پتھر اسی کا ہے، ممکن ہے راجا عمر دراز نے اسے تصویر لینے کے لئے دیا ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم اس بات کو نہیں سمجھ رہے ہو۔ کسی بھی مہم سے واپسی پر مہم جو اپنی حاصل کی ہوئی شے کے ساتھ تصویر کھنچواتے ہیں، کوئی اپنی شے کسی دوسرے کو نہیں دیتا ہے۔ یہی اشیاء کی ملکیت کا ثبوت بھی ہوتا ہے۔"

"ممکن ہے، بعد میں ولیم شا نے یہ چیزیں راجا عمر دراز کے حوالے کردی ہوں اور بعد میں اسے پچھتاوا ہوا ہو اور اس نے ان چیزوں کو واپس حاصل کرنے کی وصیت کی ہو۔"

''راجا نے دھوکے سے یہ اشیاء چرائی تھیں۔ گرینڈ پا نے ان کو پیک کر کے بحفاظت لندن بھجوانے کی ذمے داری اسے سونپی تھی اور اس نے بدنیتی سے انہیں چرا لیا۔ اس کے غائب ہونے کے بعد گرینڈ پا کو علم ہوا۔ تصویر اور پتھر لندن پہنچے ہی نہیں تھے۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں...... لیکن میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

ایمن کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ وہ میرے قریب کھسک آئی۔ ''تم چاہو تو مدد کرسکتے ہو۔'' اس نے اپنا ہاتھ میری آستین کے نیچے بازو پر رکھا تو میں سنسنی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اس کے بدن کی گرمی اور مہک میں ذرا فاصلے سے بھی محسوس کر رہا تھا۔ یہ عمر ایسی ہوتی ہے جس میں اس قسم کی حسیات تیز ہو جاتی ہیں۔ میں ذرا دور سرک گیا۔

''یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کس طرح؟''

''سنو...... تمہیں یہاں سے نکالنا میری ذمے داری ہے...... راجا تم پر اعتماد کرتا ہے۔ تم اس کے مہمان ہو اور آزادی سے اس محل میں حرکت کرسکتے ہو۔ تمہارے لئے تصویر اور پتھر نکال کر لانا مسئلہ نہیں ہے۔''

''چلو، میں نے یہ کام بھی کر دیا تب بھی راجا میرا دشمن ہو جائے گا، مجھے اس کے عتاب سے کون بچائے گا؟''

''ہم تمہیں بحفاظت وادی سے نکال لے جائیں گے بلکہ ڈیڈی تمہیں انعام بھی دیں گے۔''

''کیسا انعام...... کیش یا کسی اور صورت میں؟'' میں نے بغور اسے دیکھا تو وہ شرما گئی تھی۔

''تم بدتمیز آدمی ہو۔ ڈیڈی دس ہزار پاؤنڈز دیں گے۔''

دس ہزار پاؤنڈز اس وقت بھی خاصی بڑی رقم تھی۔ میں نے ہونٹ سکیڑ لئے تھے۔ ''لگتا ہے تمہارے ڈیڈی خاصے دولت مند آدمی ہیں؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ڈیڈی نے یہ دولت بڑی محنت سے کمائی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔''

''سچ......!'' اس نے خوش ہو کر کہا اور اچانک میرا منہ چوم لیا۔ اس نے جس معاشرے میں پرورش پائی تھی، وہاں یہ عام سی بات تھی۔ لڑکیاں، باپ اور بھائی کے سامنے اپنے بوائے فرینڈز سے بوس و کنار کیا کرتی ہیں مگر ہمارے معاشرے میں اس کا تصور بھی محال ہے، یہاں تو میاں بیوی بھی سب کے سامنے ایک خاص حد میں رہتے ہیں اور سب کے سامنے ایک دوسرے کو چھونا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ چہ جائیکہ اس طرح سے پیار کرنا۔ میں بھونچکا رہ گیا تھا۔ اسے بھی ذرا تاخیر سے احساس ہوا تو وہ شرما گئی تھی۔ جلدی سے مجھ سے دور ہوگئی۔

''شاہ باز اگر تم نے یہ کام کر دیا تو ہم پر تمہارا احسان ہوگا۔''

''معاوضہ دینے کے بعد بھی تم احسان مانو گی؟''

''ہاں، کیونکہ یہ گرینڈ پا کی وصیت کا معاملہ ہے۔ ڈیڈی کو اس کام کے لئے اپنی ساری دولت بھی خرچ کرنا پڑے تو وہ کر دیں گے۔''

میں نے اپنے پاؤں میں پڑے کڑے کی طرف دیکھا۔ ''اسے تو کھلواؤ۔''

''ایک منٹ میں......ابھی آئی۔'' ایمن کہہ کر چلی گئی مگر ایک منٹ پورا ہوا ہی نہیں، ایک گھنٹا گزر گیا۔ دوسرا اور تیسرا گھنٹا بھی گزر گیا۔ تب میں مایوس ہونے لگا۔ کیا ایمن نے مجھ سے کسی قسم کا مذاق کیا تھا؟ وہ صرف دل بہلا رہی تھی۔ اتنی دیر تک جب وہ واپس نہیں آئی تو مجھے یقین ہونے لگا، وہ مجھے بے وقوف بنا گئی تھی۔ بہر حال میں خسارے میں نہیں رہا تھا۔ ایک نرم اور گرم سا احساس ابھی تک میرے ہونٹوں پر موجود تھا۔ میں دیوار سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ میرے پیٹ میں بھوک نے انگڑائی لے لی تھی۔ عام طور سے ایسے حالات میں آدمی کی بھوک مر جاتی ہے لیکن شاید مرہم کی وجہ سے میری بھوک میں شدت آ گئی تھی۔ میری گھڑی شام کے سات بجا رہی تھی۔ اس زمین دوز غار میں مشعلوں کی روشنی تھی ورنہ قدرتی روشنی اندر آنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ فتح خان پھر نہیں آیا تھا اور نہ ہی ایمن کے ڈیڈی کی صورت دکھائی دی تھی۔ اس غار میں ان کے علاوہ اور لوگ بھی ہو سکتے تھے۔

اچانک غار کے داخلی حصے کی جانب سے آہٹیں سنائی دیں۔ میں چوکنا ہو گیا تھا۔ آنے والا فتح خان تھا۔ اس کے عقب میں ایک چادر پوش بھی تھا۔ وہ سامنے آیا بلکہ آئی تو میں چونک گیا تھا۔ فتح خان اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ راجا عمر دراز نے اس کا مطالبہ مانتے ہوئے شینا کو رہا کر دیا تھا اور وہ اس وقت میرے سامنے کھڑی سلگتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ فتح خان غرایا تھا۔ ''چھوڑ دے اسے۔''

میں نے ایک جھٹکے سے شینا کا ہاتھ چھوڑا تو وہ لڑکھڑا کر پیچھے گئی تھی۔ سنبھل کر دوبارہ میری طرف لپکی تھی کہ فتح خان نے اسے روک دیا۔ ''اس کا فکر مت کرو۔ اسے ام ٹیک کرے گا۔''

میں مسکرایا۔ ''اپنی محبوبہ سے یہ تو پوچھو کہ کس بات پر مجھ سے خار کھائے ہوئے ہے؟ اگر یہ نہ بتائے تو پھر کر مجھ سے پوچھنا۔''

''فتح خان! اس نے امارا عزت پر ہاتھ ڈالا۔'' شینا بولی۔

'' بکواس نہ کرو بے حیا...... کیا تمہاری کوئی عزت......'' میں نے غصے سے بے قابو ہو کر کہا۔ جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی فتح ان کا مکا میرے منہ پر لگا تھا۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ اپنے ہونٹ اور منہ میں خون کی نمکینی محسوس ہوئی تھی۔ ایک مکا مارنے کے بعد فتح خان نے دوبارہ ہاتھ اٹھایا۔ اسے میری طرف سے مزاحمت ذرا بھی خطرہ نہیں تھا اس لئے میں نے تڑپ کر اس کے زیر ناف لات رسید کی تو تکلیف کے ساتھ حیرت سے بھی اس کا منہ کھل گیا تھا۔ شینا نے چیخ ماری تھی اور فتح خان کے حلق سے دھاڑ نکلی تھی۔ وہ پیٹ دبائے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ شینا اسے سنبھال رہی تھی۔ چند لمحے بعد جب اس کی تکلیف کم ہوئی تو اس نے بپھر کر شینا کو ایک طرف دھکیل دیا اور میری طرف بڑھا تھا کہ ایمن کا ڈیڈی وہاں آ گیا۔ اس نے گرج کر پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''صاب، اس نے ام پر آملہ کیا۔'' فتح خان نے کہا۔ ''ام اسے چھوڑے گا نئیں۔''

''بکواس کرتا ہے یہ...... ان دونوں نے مجھے مارنے کی کوشش کی۔'' میں نے فتح خان اور شینا کی طرف اشارہ کیا۔

ایمن کے ڈیڈی نے بغور شینا کی طرف دیکھا اور پھر سرد لہجے میں فتح خان سے بولا۔ ''میرے سامنے

آؤ۔"

فتح خان مردہ چال کے ساتھ اس کے پیچھے چلا گیا۔ ورنہ اس کی دلی خواہش یہی تھی کہ میری صبح سے درگت بنائے۔ شینا جان بوجھ کر رکی رہی۔ جیسے ہی ایمن کا ڈیڈی اور فتح خان نظروں سے اوجھل ہوئے، وہ میرے قریب آ گئی۔ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "تم ام کو اچا لگتا اے۔"

"تم مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "تم کسی کتیا سے بھی گئی گزری ہو۔"

"دیکو، ام کیسا اے؟" اس نے مزید نزدیک آتے ہوئے اپنی قمیص سامنے سے پکڑی اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا، اس نے قمیص پھاڑ دی تھی۔ اس کا اوپری بدن عریاں ہو گیا تھا۔ قمیص پھاڑتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ "باچاؤ...... ام کو باچاؤ۔" اس نے چلا کر کہا اور پھر اپنی زبان میں شور کرنے لگی۔ میں نے خود کو اس سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ جونک کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔ پھر جیسے ہی سرنگ میں دوڑنے کی آواز آئی، وہ مجھ سے الگ ہو کر بھاگی اور اندر سے آتے فتح خان سے چمٹ گئی۔ اس نے پورا خیال رکھا تھا کہ فتح خان اس کی پھٹی قمیص دیکھ لے۔ فتح خان کی آنکھوں میں یہ منظر دیکھ کر خون اتر آیا تھا۔ ایک شخص نے اس کے ہوتے ہوئے اس کی محبوبہ سے دست درازی کی تھی، یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس نے شینا کو ایک طرف کرتے ہوئے اپنے لباس سے پستول نکال لیا تھا۔

☆======☆======☆

''سید گل...... کیا احمقانہ بات کر رہے ہو؟'' میں نے ناگواری سے کہا۔

''ام ٹھیک کہتا ہے صاحب!'' اس نے بدحواسی کے عالم میں کہا تھا۔ ''باہر پولیس آیا ہے۔''

میں بادل ناخواستہ اٹھ کر باہر آیا۔ بنگلے کے پورچ میں ایک انسپکٹر کھڑا تھا۔ گیٹ کے باہر پولیس موبائل موجود تھی۔ میں نے انسپکٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''انسپکٹر، کیسے آنا ہوا؟''

اس نے میرا ہاتھ نظر انداز کیا اور اپنے پاس موجود پرچی پر ایک نظر ڈالی۔ ''کیا ایل ایس دو ہزار چار سو پندرہ، تمہاری جیپ کا نمبر ہے؟''

''ہاں۔'' میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ ''اینی پرابلم مسٹر انسپکٹر؟''

''انگریزی مت جھاڑو۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا صورت سے سخت مزاج اور سفاک نظر آنے والا شخص تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس نے کانسٹیبل سے انسپکٹر تک کا سفر بے شمار لوگوں کی کھالیں اتار کر طے کیا ہے۔

''چلو، میں انگریزی نہیں جھاڑتا...... لیکن تم بھی خواہ مخواہ کا رعب مت دکھاؤ۔ یہ بتاؤ، کیوں آئے ہو؟ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔'' اس بار میں نے بھی لہجہ بدل لیا۔

اس نے سرد آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ''وقت تو آپ کو نکالنا پڑے گا۔''

''انسپکٹر، میں نے کہا ہے ناں...... کام کی بات کرو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''نادر علی عباسی نے رپورٹ کی ہے کہ کل رات اس نمبر کی جیپ نے ان کی گاڑی کو پیچھے سے ٹکر مار کر گاڑی کو کھائی میں دھکیل دیا۔ جس سے ان کی گاڑی تباہ ہوگئی اور وہ اپنے دو ساتھیوں پرویز علی اور شہاب الدین کے ساتھ شدید زخمی ہو گئے۔''

''یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟''

''رات ڈھائی بجے کے قریب، مری ہائی وے پر پنڈی پوائنٹ والے موڑ کے پاس۔''

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''اس وقت ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ ہماری پولیس کی کارکردگی واقعی اچھی ہوگئی ہے یا صرف اس معاملے میں مستعدی دکھائی ہے۔ صرف سات گھنٹے میں تم نے مطلوبہ نمبر کی گاڑی اور

اس کے مالک کو ڈھونڈ نکالا۔سنا ہے کوئی غریب غربا قتل ہو جائے تو اتنی دیر صرف جائے واردات پر پہنچنے میں لگا دیتے ہو۔"

انسپکٹر ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ملازمت کے تجربے نے اسے سمجھا دیا تھا کہ عزت اور پیسا آنی جانی شے ہیں، آدمی کو غیرت پروف ہونا چاہئے۔"جناب شہباز احمد ملک صاحب! میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دیں۔کیا یہ جیپ آپ کی ملکیت ہے؟"

"کیا تم میرے وارنٹ گرفتاری لائے ہو؟"میں نے جواب دینے سے گریز کیا۔

"وہ بھی آ جائیں گے ملک صاحب!"اس نے طنز کیا۔"اتنی جلدی کیا ہے ہماری میزبانی کی......"

"قانونی لحاظ سے میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں لیکن تم قانون کے نمائندے ہو اور میں قانون کا احترام کرنے والا شخص ہوں۔ہاں، اس نمبر کی جیپ میرے پاس ہے اور اگر تمہاری آنکھیں سلس بائی سکس ہیں تو تم نے سامنے کھڑی جیپ کی نمبر پلیٹ پڑھ لی ہوگی۔"

اس بار وہ جھینپ گیا۔"جناب! تصدیق بھی ضروری ہوتی ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔"بعض لوگ اتنے شکی ہوتے ہیں کہ ثبوت کے بغیر اپنی ولدیت پر بھی شبہ کرتے ہیں۔"

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اس نے غرا کر کہا۔"ملک صاحب، اتنا بولیں جس پر بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔" اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔"مجھے اس جیپ کا معائنہ کرنا ہے۔"

"شوق سے کرو لیکن اتنا بتا دوں...... میں کسی نادر علی عباسی کو نہیں جانتا اور نہ ہی کل رات میں نے مری ہائی وے پر کسی گاڑی کو ٹکر ماری تھی۔تم جیپ کا سامنے والا حصہ دیکھ سکتے ہو۔یہ بے داغ ہے، معمولی سی ٹکر بھی اس پر کچھ نہ کچھ خراش ڈالتی اور بقول تمہارے میں نے اس جیپ سے ٹکر مار کر ایک گاڑی کو مری کی ہائی وے پر کھائی میں گرا دیا۔"

"ہمیں تو جی رپورٹ ہوئی ہے، اس پر کارروائی کرنے آئے ہیں۔" انسپکٹر نے مایوسی سے جیپ کے اگلے حصے کا معائنہ کیا۔"ہماری کوئی ذاتی رنجش تو نہیں ہے۔"

"انسپکٹر میری ذاتی معلومات کے مطابق پولیس کے پاس گاڑیوں کی رجسٹریشن کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا اور پولیس کو بھی کسی گاڑی کے مالک اور اس کے پتے کے لئے متعلقہ دفتر سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔دفتر دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں کھلتا اور تم ساڑھے نو بجے آ گئے، کیسے؟"

"ہمارا کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے۔"اس نے ایک بار پھر ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔"آپ کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔"

"معاف کرنا، کیا میں صورت سے احمق نظر آتا ہوں۔ایک بار تھانے جانے کا مطلب ہے تم مجھ سے جو سلوک چاہے کرو۔اگر تمہارے پاس میری گرفتاری کا وارنٹ ہے تو لے چلو۔"

"پولیس شبہے میں بھی گرفتار کر سکتی ہے۔"وہ عیاری سے بولا۔"وارنٹ بھی بعد میں آتا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے، پہلے مجھے اپنے وکیل کو فون کرنے دو۔"

"فون تھانے میں ہے۔وہاں سے جتنے چاہو، فون کر لینا۔"

مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ صورت سے جلاّد نظر آنے و یہ انسپکٹر مجھے تھانے لے جانے پر کیوں مُصر تھا، اگر معاملہ طے کرنا تھا یعنی ''مک مکا'' کرنا تھا تو اس کے لئے یہ جگہ بہتر تھی۔ تھانے میں اسے اور بھی کئی حرام خوروں کو کھلانا پڑتا۔ کیا مجھے تھانے لے جانا نادر علی عباسی سے کسی ڈیل کا نتیجہ تھا؟ وہاں میرے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ ہماری پولیس تشدد کرنے کی ماہر ہے۔ یعنی مارتی ہے اور نشان بھی نہیں پڑنے دیتی اور مرضی نہ ہو تو مرنے بھی نہیں دیتی۔ میں نے سوچا اور کہا۔ ''او کے۔ میں اس طرح نہ کر آیا ہوں، مجھے منہ ہاتھ دھونے اور کپڑے بدلنے کا موقع تو دو۔''

''ٹھیک ہے...... لیکن جو کرنا ہے میرے سامنے کرو، ورنہ فرار ہو گئے تو......''

''سنو انسپکٹر، میں تم سے تعاون کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں مجبور ہوں۔ صوبائی اور دفاقی سطح پر ہر طرح سے میرے تعلقات ہیں۔ وکیل کے بجائے میں کسی اور کو فون کر دوں تو تمہیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' میں نے برہمی سے کہا تھا۔

وہ مسکرانے لگا۔ ''اوہ جناب! ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو وزیر، سفیر فرار ہو جاتے ہیں۔ سابق وزرائے اعظم ضمانت پر رہا ہو کر دوبارہ ملک کا رخ نہیں کرتے۔''

''واضح رہے، میں نہ تو کسی سطح کا سیاست دان ہوں اور نہ سرکاری انتظامیہ کا کرپٹ نمائندہ، اس لئے فرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور میں فرار کیوں ہوں گا۔ مجھ پر جو الزام لگایا گیا اس کی حقیقت بتانے کے لئے میری جیپ کافی ہے۔''

''کل آپ مری کی طرف گئے تھے؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ انکار کا کوئی فائدہ نہیں تھا جو اتنی جلدی میرے گھر کا پتا چلا سکتے تھے۔ وہ یہ بھی جان لیتے کہ کل میں سفیر اور مونا کے ساتھ مری گیا تھا۔

''آپ کے ساتھ اور کون کون تھا؟''

''کوئی بھی نہیں۔'' میں نے اس بار غلط بیانی سے کام لیا۔

''ہماری اطلاع کے مطابق آپ کے ساتھ جیپ میں ایک مرد اور ایک خاتون بھی تھی۔''

''ثابت کرنا آپ کا کام ہے، میں انکار کر چکا ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''سوچ لیں۔ چیک پوسٹ کی پولیس بھی اس کی تصدیق کر سکتی ہے۔''

''شوق سے کرے۔ اگر ان خاتون اور حضرت کے بارے میں علم ہو تو مجھے ضرور بتایئے گا۔''

میں بلا وجہ اس سے گفتگو کو طول نہیں دے رہا تھا۔ اندر میں سیّد گل سے کہہ کر آیا تھا کہ وہ میرے وکیل ندیم احمد کو فون کر دے اور اسے فوری طور پر آنے کو کہے۔ ندیم سیٹلائٹ ٹاؤن میں رہتا تھا اور اسے بیس پچیس منٹ میں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ اس وجہ سے میں وقت گزار رہا تھا۔ ندیم احمد بھٹی بڑا دھانسو قسم کا وکیل تھا اور ہر سال مع بیوی بچوں کے شمالی علاقے کے ٹور پر جاتا تھا۔ میری اس سے جان پہچان اسی توسط سے ہوئی تھی۔ پھر ایک بار ایک قانونی معاملے میں اس کی مدد لی تو وہ مستقل میرا وکیل بن گیا۔ یہ انسپکٹر جان کو آ گیا تھا اور اس سے ندیم ہی درست طریقے سے نمٹ سکتا تھا۔ میں اندر جانے لگا تو وہ میرے پیچھے تھا لیکن جو وہ کرنے جا رہا تھا، اا

میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اچانک میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی اور میں زمین پر گرنے سے پہلے ہوش گنوا چکا تھا۔

مجھے ہوش آیا تو ایسا لگا جیسے کوئی میرے چہرے پر بھیگے ہوئے تھپڑ مار رہا ہے۔ میرے حواس بحال ہوئے تو مجھے سب سے پہلے جوتوں کی ایک جوڑی نظر آئی اور مزے کی بات تھی، جوتے ٹانگوں سمیٹ الٹے تھے۔ چند لمحے بعد انکشاف ہوا جوتوں والا نہیں بلکہ میں ہی الٹا تھا۔ میں چھت سے الٹا لٹکا تھا اور میرے سامنے ایک شخص پولیس کی وردی میں ملبوس میرے چہرے پر مگے بھر بھر کر پانی پھینک رہا تھا تاکہ مجھے ہوش میں لایا جائے۔ مکمل ہوش مجھے انسپکٹر کی آواز سن کر آیا۔ وہ سپاہی سے کہہ رہا تھا۔ ''لگتا ہے اسے ہوش آ گیا ہے۔ تم نے بے چارے کو زیادہ ہی بھگو دیا ہے۔ اب ذرا اسے خشک کرو۔''

''دھونی دے کر سر جی!'' کانسٹیبل نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں ابھی لایا۔''

انسپکٹر چلتا ہوا میرے پاس آیا اور اس نے اچانک میرے بال مٹھی میں جکڑتے ہوئے میرا سر پیچھے کی طرف کھینچا۔ ''کیوں ملک صاحب! بڑا طنطنہ دکھا رہے تھے...... اب بولو۔''

سر پیچھے کھینچنے سے میرا گلا تن گیا تھا اور مجھے سانس لینا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ اس صورتِ حال میں کیا بولتا اور بولتا بھی تو میرے منہ سے انسپکٹر کے لئے ناگفتنی ہی نکلتی۔ اس کے عزائم واضح تھے۔ اس نے جھٹکے سے بال چھوڑے تو میری سانس بحال ہوئی تھی۔ میں نے چند گہرے سانس لے کر خود کو بحال کیا۔ الٹا لٹکنے کی وجہ سے...... خون دماغ کی طرف آ رہا تھا۔ مجھے اپنا سر بھاری لگنے لگا تھا۔ اس کا عقبی حصہ کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا لیکن خون سر کی طرف آنے سے اس کی تکلیف خاصی حد تک کم لگ رہی تھی۔

''انسپکٹر، تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟'' میں نے نزلہ زدہ آواز میں کہا۔

''یہ سوال تم خود سے کرو۔'' وہ بولا۔ ''تم ایک مجرم ہو۔''

''جھوٹ ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ مجرم تم ہو، نادر علی عباسی سے لی گئی رشوت اس طرح حلال کر رہے ہو۔''

''بھونکو مت کتے...... ابھی تمہاری ناک میں مرچوں کی دھونی دی جائے گی تو......'' آگے اس کی گفتگو فحاشی کا ایسا شاہکار تھی جسے سوچ کر انسان شرما جائے۔ وہ اپنی مخصوص غلیظ ذہنیت کا مظاہرہ کر رہا تھا اور عملی تشدد سے پہلے لفظوں کے ذریعے مجھے ذہنی اذیت دے رہا تھا۔ میں سننے پر مجبور تھا لہٰذا میں نے فرض کر لیا کہ ایک کتا میرے پاس کھڑا بھونک رہا ہے۔ مگر اس سے کام نہیں چلا۔ کتے کی آواز تو صرف سماعت پر گراں گزرتی ہے اس کے الفاظ روح میں نشتر کی طرح اترے جا رہے تھے۔ جب میرا ضبط جواب دے گیا تو میں اس پر اتنے ہی فحش الفاظ کی بوچھاڑ کرنے لگا حالانکہ اس کا ضمیر اس معاملے میں بے حس تھا۔ جیسے نالیاں صاف کرنے والا دن رات اس کام میں مشغول رہ کر بدبو اور غلاظت کا احساس ہی کھو دیتا ہے۔

کانسٹیبل ایک انگیٹھی کھینچتا ہوا لا رہا تھا جس میں کوئلے دہک رہے تھے۔ اسے دیکھ کر میری روح فنا ہونے لگی۔ میں نے اس تشدد کے بارے میں سنا تھا کہ بڑے بڑے سخت جان مجرم بھی اسے سہہ نہیں پاتے ہیں۔ میں ایک عام سا شخص ہوں۔ میں یہ سب کیسے برداشت کروں گا۔ میں مر جاؤں گا۔ اس تصور سے لرزنے لگا۔ مرچوں

کا دھواں میرے ناک، منہ کے راستے جسم میں اتر جائے گا۔ ''نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نے میرے پیروں پر چھڑی ماری تھی۔ ''ہم کر کے دکھائیں گے۔''

کانسٹیبل نے انگیٹھی لا کر میرے سر کے نیچے رکھ دی۔ دو فٹ کے فاصلے سے میں اس کی حدت محسوس کر رہا تھا۔ ہلکا سا دھواں اٹھ رہا تھا۔ چند لمحے کے اندر مجھے سر پر تیز آنچ لگنے لگی۔ میں نے مچل کر سر اوپر کیا اور شور کرنے لگا۔ انسپکٹر کو پہلے ہی اس کی توقع تھی۔ اس نے میرے شور کا بندوبست بھی کر رکھا تھا اس نے میرے منہ پر چوڑا ٹیپ چپکا دیا۔ اب میں ناک سے چند محدود سی آوازیں نکال سکتا تھا۔ سر کو انگیٹھی سے دور کرنے کی کوشش ناکام رہی تھی۔ تھک ہار کر مجھے سر نیچے کرنا پڑا تھا۔

''ابھی سے پریشان ہو گئے ملک صاحب!'' انسپکٹر نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ ''ابھی تو دھونی باقی ہے۔''

قادس ایک نوجوان اندر آیا۔ میں نے اسے ذرا دیر سے شناخت کیا تھا۔ وہ ان تین اوباشوں میں سے ایک تھا جو ہمیں مری میں ملے تھے اور اپنی حرکتوں کی وجہ سے حادثے کا شکار ہوئے تھے۔ یہ کلائی ٹوٹا شخص تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ پر پلاسٹر بندھا تھا۔ شاید یہی نادر علی عباسی تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا جب انسپکٹر نے اسے مخاطب کیا۔ ''عباسی صاحب، یہ رہا آپ کا مجرم۔''

نادر علی عباسی نے سلگتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''یہی ہے وہ حرام زادہ...... اس نے ٹکر مار کر ہماری جیپ کو نیچے گرایا تھا۔''

''اس نے ٹکر ماری تھی یا نہیں...... یہ سب چھوڑیں۔'' انسپکٹر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''یہ بتائیں کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے؟''

''اس کے دونوں ہاتھ توڑ دو اور اسے اتنا مارو کہ تین چار مہینے تک بستر سے نہ اٹھ سکے۔'' نادر علی عباسی یوں بول رہا تھا جیسے کوئی عام سی بات کر رہا ہو۔ ''ممکن ہو تو ایک ٹانگ بھی برابر کر دو۔ آئندہ یہ سیدھا کھڑا نہ ہو سکے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔'' انسپکٹر بولا۔ ''اس کا حال دیکھ کر آپ خوش ہو جائیں گے۔ ابھی آپ کے سامنے مرچوں کی دھونی سے آغاز کرنے والے ہیں۔''

''میں نہیں دیکھ سکتا۔'' نادر علی عباسی ناگواری سے بولا۔ ''مجھے مرچوں کی بو سے الرجی ہے۔ چھینکیں شروع ہو جاتی ہیں۔ دھونی چھوڑو...... اس کا ایک ہاتھ میرے سامنے توڑ دو۔ باقی کام بعد میں کرنا۔ ابھی مجھے جا کر آرام بھی کرنا ہے۔ اسپتال سے آ رہا ہوں۔''

''اچھا...... جیسی آپ کی مرضی۔'' انسپکٹر کو جیسے مایوسی ہوئی تھی۔ اس نے کانسٹیبل کی ماں، بہن ایک کرتے ہوئے اسے انگیٹھی لے جانے اور پائپ لانے کا حکم دیا تھا۔ وہ حکم کا غلام انگیٹھی اٹھا کر لے گیا۔ نادر علی میرے نزدیک آیا تھا۔ ''اس کتے سے پوچھو اس کا یار اور یار کی ماں کہاں ہے؟''

''ابھی تو یہ انکار کر رہا ہے...... لیکن بتائے گا۔''

''اکرم چشتی...... مجھے وہ لڑکی بہر صورت چاہیئے۔'' نادر علی کا لہجہ اس کی فطری خباثتوں کا آئینہ دار تھا۔

''ایسی خوبصورت لڑکیاں کم ہوتی ہیں۔''

''جب ملے گی تو ہم بھی دیکھیں گے...... عباسی صاحب!'' انسپکٹر اکرم چشتی معنی خیز انداز میں بولا۔

''کیوں نہیں، تمہیں بھی حصہ ملے گا۔'' نادر علی فراخ دلی سے بولا۔ ''یہ بتاؤ، اسے لانے میں دشواری تو نہیں ہوئی۔''

''نہیں جناب، اکرم چشتی کے لئے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ بس اس کا سر بجانا پڑا تھا۔ ہم اٹھا لے آئے۔''

''یاد رہے، اس کے ساتھ جو بھی ہو آف دی ریکارڈ ہو۔'' نادر علی نے اکرم چشتی کو وارننگ دی تھی۔ ''میرا نام کسی صورت نہیں آنا چاہئے۔ الیکشن آنے والے ہیں اور بھائی جی کوئی اسکینڈل پسند نہیں کریں گے۔''

نادر علی کی بات نے مجھے چونکایا تھا۔ مقامی سطح پر عباسی خاندان سیاست میں خاصا معروف تھا۔ راولپنڈی سے ایک دو صوبائی اور قومی اسمبلی کی نشستیں ہمیشہ عباس خاندان کو جاتی تھیں۔ میری معلومات کے مطابق مرشد علی اس خاندان کا سربراہ تھا اور ان دنوں وہ رکن صوبائی اسمبلی تھا۔ اس نے قومی اسمبلی کا انتخاب بھی لڑا تھا لیکن ہار گیا تھا۔ لوگ، گدی نشین پس منظر رکھنے والے اس خاندان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ ان کی اوباشی اور عیاشی کے قصے عام تھے۔ خاص طور سے گرلز کالج سے اغوا کی جانے والی تین لڑکیوں کی عباسی ہاؤس سے برآمدگی بہت مشہور ہوئی تھی۔ لڑکیوں کو ایک صوبائی وزیر کے اثر رسوخ کی وجہ سے بروقت برآمد کر لیا گیا تھا۔ اگرچہ سرکاری طور پر اس واقعے کو دبا دیا گیا تھا اور عباسی خاندان نے اسے مخالفین کی طرف سے اچھالا جانے والا کیچڑ قرار دیا تھا لیکن عوام میں اس خاندان کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ اگر نادر علی عباسی اس خاندان کا چشم و چراغ تھا تو اس کے عزائم پر میں قطعی متعجب نہیں تھا۔

اسی اثنا میں سپاہی ایک فولادی پائپ لے کر اندر آیا۔ اکرم چشتی جو بڑے اسٹائل سے سگریٹ نوشی کر رہا تھا، اس نے سگریٹ اچانک میری گردن پر مسل دیا۔ ضبط کے باوجود میں تڑپ گیا تھا۔ نادر علی نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا تھا۔ اکرم چشتی نے پائپ لے کر سپاہی کو حکم دیا۔ ''اس کا ہاتھ سیدھا کر کے پکڑو۔'' سپاہی نے میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تو میں نے نیچے سے اس کی رانوں کے درمیان مکا مارا۔ سپاہی کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور وہ پیٹ تھام کر رکوع والی پوزیشن میں چلا گیا تھا۔ اگلا مکا میں نے اس کے منہ پر مارا اور وہ پیچھے جا گرا۔ اکرم چشتی ہنستے ہوئے سپاہی کو فحش گالیوں سے نواز رہا تھا۔

''ماں کے یار...... صحیح سے پکڑ......''

سپاہی نے مشتعل ہو کر میرے سر پر گھٹنا مارا تھا اور ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑ کر سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ نادر علی اضطراب کے عالم میں ہمارے اردگرد ناچ رہا تھا۔ اکرم چشتی اب دھاڑتے ہوئے سپاہی کو بے نقط سنا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر دروازے کی طرف گئی اور وہ چپ ہو گیا تھا جیسے بجلی سے چلنے والے کھلونے کی بجلی بند کر دی جائے۔ اکرم چشتی چپ ہوا تو سپاہی نے بھی دروازے کی طرف دیکھا اور بوکھلا کر میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اکرم چشتی اور سپاہی نے بیک وقت سلیوٹ کیا تھا۔ دروازے پر ڈی ایس پی کی وردی میں ملبوس شخص کھڑا اکرم چشتی کو گھور رہا تھا۔ پھر اس نے دھاڑ کر پوچھا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟ یہ شخص کون ہے؟''

''سر، یہ ایک مجرم ہے۔ عباسی کی جیپ کو ٹکر مار کر کھائی میں گرا دیا تھا۔'' اکرم چشتی جلدی سے بولا۔ ''یہ اپنے ساتھیوں کا نام پتا بتانے کے لئے تیار نہیں ہے۔''

''لہٰذا تم اسے الٹا لٹکا کر ان کا پتا پوچھ رہے ہو۔ اتارو اسے...... باہر اس کا وکیل آیا ہے اور پتا ہے، اس کا وکیل کون ہے......؟ ندیم احمد بھٹی...... وہ سب کی وردیاں اتروا دے گا۔''

اکرم چشتی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس نے مردہ سے لہجے میں کہا۔ ''اب کیا حکم ہے سر؟''

''اسے لے کر آؤ اور ہاں، یہ کون ہے؟'' اس نے نادر علی کی طرف دیکھا۔

''سر...... یہ مرشد علی عباسی...... کے چھوٹے بھائی نادر علی عباسی ہیں۔''

''ان لوگوں نے بھی ناک میں دم کر رکھا ہے۔'' ڈی ایس پی بیزاری سے بولا۔ ''منہ کیا دیکھ رہے ہو، اتارو اسے۔''

ڈی ایس پی کے جانے کے بعد اکرم چشتی نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا اور غصہ سپاہی پر اتارتے ہوئے اسے حکم دیا۔ ''نیچے اتارو...... اپنی ماں کے......''

نادر علی عباسی مایوس نظر آ رہا تھا۔ ''چشتی صاحب، یہ تو کچھ نہیں ہوا؟''

اکرم چشتی نے روکھا لہجہ اختیار کیا۔ ''عباسی صاحب، فی الحال آپ ٹھنڈے گھر جائیں یہ معاملہ بعد میں دیکھا جائے گا۔''

''بعد میں نہیں، ابھی دیکھا جائے گا۔'' نادر علی انسپکٹر کو ایک طرف لے گیا اور دونوں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ اس دوران میں سپاہی نے رسی ڈھیلی کر کے مجھے نیچے اتارا۔ سیدھا ہوا تو دورانِ خون کی سر سے واپسی کی وجہ سے مجھے چکر آنے لگے تھے لیکن چند گہرے سانس لے کر میں نے اپنا ذہن صاف کر لیا تھا۔ سپاہی نے میرے پاؤں کھولے اور میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ میری قمیص غائب تھی۔ سپاہی نے نہ جانے کس کی گندی سی قمیص لا کر مجھے دے دی۔ ''یہ میری قمیص نہیں ہے۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''اوہ شہزادے، اپنی کھال سلامت لے کر جا رہے ہو...... یہ کافی ہے۔'' انسپکٹر اکرم چشتی نے طنز کیا تھا۔ پھر سپاہی سے بولا۔ ''اسے ڈی ایس پی صاحب کے پاس لے جاؤ۔ میرا پوچھیں تو کہنا طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ڈاکٹر کے پاس گیا ہوں۔''

''جی سر!'' سپاہی نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''چلیں جی۔''

''چھوڑو مجھے۔'' میں نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا لیا اور نادر علی عباسی کی طرف دیکھا۔

''تم انتہا درجے کے جھوٹے شخص ہو۔ تم نے میری جیپ کو ٹکر مار کر کھائی میں گرانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں خود کھائی میں جا گرے اور اس کا الزام بھی مجھ پر لگا دیا۔''

''مری میں جو ہمارے ساتھ ہوا اس کا حساب ابھی باقی ہے۔ وہ تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا حرامی پن تھا۔''

''ہم نے کچھ نہیں کیا تھا، یہ سب تمہاری اپنی ذہنی خباثت ہے۔''

''ابھی تو تم بچ گئے ہو لیکن کبھی نہ کبھی میرے ہاتھ آؤ گے۔'' نادر علی کے لہجے میں دھمکی تھی۔ ''اس وقت حساب برابر ہوگا اور وہ لڑکی......''

''اس کا نام لیا تو تمہارا دوسرا ہاتھ بھی گردن سے لٹکا ہوگا۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''تمہاری تو......'' نادر علی نے بے قابو ہو کر میری طرف بڑھنا چاہا لیکن اکرم چشتی نے اسے روک دیا۔

''عباسی صاحب! آپ کس کے منہ لگ رہے ہیں۔ اس سے بعد میں دوسری زبان میں بات کریں گے۔'' اکرم چشتی اسے دھکیلتا ہوا اسی ٹارچر سیل میں لے گیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں ڈی ایس پی کے دفتر میں اپنے وکیل ندیم احمد بھٹی کو اپنے اوپر گزرنے والی روداد سنا رہا تھا۔ ندیم احمد خاصا طیش میں تھا۔ میرا بیان سن کر اس نے تلخ لہجے میں ڈی ایس پی سے کہا۔ ''جناب! اب میں اس شخص کو عدالت میں کھینچ لوں تو آپ اعتراض نہیں کر سکتے۔ اس نے ظلم کی انتہا کر دی ہے۔''

''بے شک بھٹی صاحب! آپ حق بجانب ہیں لیکن میرا بھی خیال کریں۔ میرا ماتحت عدالت میں جائے گا تو میری ساکھ پر اثر پڑے گا۔ اس پر مٹی ڈالیں، آپ کا بندہ آپ کو صحیح سالم مل گیا ہے۔''

''اور وہ جو دھمکیاں دے رہا ہے؟'' ندیم بولا۔

''اس کی ضمانت میں لیتا ہوں۔'' ڈی ایس پی اصغر نواز جلدی سے بولا۔ میز پر رکھی تختی پر اس کا نام یہی لکھا تھا۔ ''ان کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔''

''نواز صاحب! اگر میرے مؤکل کو ذرا بھی نقصان ہوا تو میں ان لوگوں اور آپ کے انسپکٹر ہی کو نہیں، آپ کو بھی عدالت میں کھینچ لوں گا۔ مجھے معلوم ہے ایس پی کے عہدے پر ترقی پانے والے افسران میں آپ کا نام بھی ہے۔ خیال رکھیں، کہیں لسٹ سے خارج نہ ہو جائیں۔ اپنے انسپکٹر کو پٹا ڈال کر رکھیں۔'' ندیم احمد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ڈی ایس پی کے چہرے کا رنگ بدلا تھا، اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''بھٹی صاحب، میں نے کہا ناں...... آپ بے فکر ہو جائیں۔''

''میں خود پر بھروسا کرنے والا شخص ہوں۔'' ندیم احمد رکھائی سے بولا اور میرے ساتھ ڈی ایس پی کے کمرے سے نکل گیا۔ پولیس اسٹیشن کے باہر اس کی شاندار ہنڈا اسوک کھڑی تھی۔ ندیم احمد ابھی تک غصے میں تھا، باہر آتے ہی اس کی توپوں کا رخ میری طرف ہو گیا۔ ''شہباز! اس صدی کے سب سے بڑے احمق، یہ تم نے کن لوگوں سے پنگا لیا ہے؟''

''میں نے نہیں لیا، وہ خود سر ہو گئے تھے۔''

''ابے اگر کوئی طاعون کا مریض تجھ سے چپٹے گا تو کیا تُو بھی اس سے چمٹ جائے گا یا جان چھڑا کر بھاگے گا۔ یہ لوگ طاعون سے زیادہ خطرناک ہیں۔''

''اگر آپ ایک منٹ کے لئے بکواس بند کریں تو میں کچھ عرض کروں؟''

''ضرور...... ارشاد فرمائیے۔'' ندیم نے کار سڑک پر نکالی۔

میں نے اسے تفصیل سے مری میں اور پھر اس کے بعد آنے والے واقعات کے بارے میں بتایا۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ ''اب بتا، اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''انہیں...... نہ سمجھ۔'' ندیم نے پولیس والوں کی سی روانی سے گالی دی۔ ویسے بھی اس کا واسطہ صبح شام پولیس والوں سے پڑتا تھا۔ ایسے میں صحبت کا اثر لازم آتا ہے۔ ''وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ کیچڑ تم لوگوں نے پھنکوایا ہوگا۔ اس وجہ سے وہ پیچھے لگے تھے۔''

''اتنی کمینگی...... آدمی شبے میں اتنا یقین بھی کر سکتا ہے؟''

''انہیں اپنی طرح کا انسان نہ سمجھ۔'' ندیم نے طنز کیا۔ ''یہ آج کے فرعون ہیں۔ اپنی سوچ کو درست سمجھنے والے، ممکن ہے ڈی ایس پی معاملہ ختم کرا دے لیکن اب تجھے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ عباسی خاندان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ کینہ پروری میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے اور جس کے پیچھے پڑ جائیں، اسے قبر تک پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ بلا کے موقع پرست اور عیار سیاست دان ہیں۔ ایک بھائی ایک پارٹی میں، دوسرا اس کی مخالفت پارٹی میں اور تیسرا غیر جانب دار رہ کر الیکشن لڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کوئی بھی ہو، یہ ہمیشہ اقتدار میں رہنے والے لوگ ہیں۔ بیوروکریسی اور پولیس میں ان کا خاصا اثر رسوخ ہے۔ شوبی! میرے بوڑھے بچے، ان سے ایسے بچ جیسے لوگ پاگل کتے سے بچتے ہیں۔''

''میں کیسے بچوں...... یہ خود ہوشیار کتے کی طرح مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''اس کا کوئی حل نکال، تجھے پتا ہے میں کاروباری آدمی ہوں، اس قسم کے چکروں میں نہیں پڑ سکتا۔''

''میرا مشورہ ہے، کچھ عرصے کے لئے کہیں چلا جا۔'' ندیم بولا۔ ''بلکہ ایسا کر، میرے گھر چل...... تیری بھابی نے آج خاص سری پائے پکائے ہیں۔''

''مجھے اپنے سری پایوں کی پڑی ہے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔ ''اور تجھے سری پائے کی سوجھ رہی ہے۔''

''چل...... اگر سری پائے نہ کھانے سے تیرے سری پائے بچ جاتے ہیں تو اچھی بات ہے۔ یہ بتا کہ تجھے کہاں پھینکوں؟''

''ظاہر ہے، میرے دفتر...... مجھے سیّد گل کی فکر ہے، پولیس نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی۔''

''زیادہ نہیں جب میں تیرے دفتر پہنچا تو وہ پورچ میں مدہوش پڑا تھا۔ اس کے ساتھ بھی تیرے جیسا سلوک کیا تھا اس حرامی انسپکٹر نے۔ اس نے ہوش میں آنے کے بعد بتایا کہ پولیس تجھے اغوا کر کے لے گئی ہے۔ ویسے یہ سیّد گل ہوشیار آدمی ہے۔ اس نے پولیس موبائل دیکھ لی تھی، اس سے پتا چل گیا کہ تیرے کس تھانے میں پائے جانے کے امکانات روشن ہیں ورنہ اب تک میں تجھے تھانوں میں ہی چھان رہا ہوتا اور تیری کھال اتر چکی ہوتی۔''

''وہ خبیث میرے ہاتھ پیر توڑنے کے چکر میں تھا۔''

''تیری خوش قسمتی کہ تھانے کا ایس ایچ او مجھ سے دبتا ہے اس لئے میرے وہاں پہنچتے ہی وہ تجھے نکال لایا، یہ بھی ایک نمبر کا بدمعاش ہے۔ اگر اس کی کچھ کمزوریاں میرے علم میں نہ ہوتیں تو وہ تیرے بارے میں صاف مکر جاتا اور میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔''

''یار! اس معاشرے میں اتنی لاقانونیت ہے؟''

''تُو اچھا خاصا کھاتا پیتا اور اثر رسوخ رکھنے کے باوجود ڈر رہا ہے۔'' ندیم احمد کے لہجے میں طنز تھا۔ ''ذرا

ان لوگوں کا سوچ جو پیسا کھلا کر بھی جان نہیں چھڑا سکتے ہیں۔ آئے دن پولیس مقابلوں میں یہی بے چارے نام وراشتہاری ملزمان کے نام پر قربان ہوتے ہیں، چل اب اتر جا......''

میرا دفتر آ گیا تھا۔''یار! اگر ان لوگوں نے مجھے قانونی طریقے پھانسنا سے چاہا تو......؟''

''سب سے پہلے یہ جیپ غائب کر دے...... بلکہ ایسا کر جیپ مجھے دے...... میری کار اپنے چوکیدار کے ہاتھ بھجوا دینا۔ میں کل تک اس کا پچھلا حصہ ٹھیک کرا دوں گا اور بہتر ہے تُو بھی کہیں غائب ہو جا۔ تُو نے ٹھیک کہا ہے، اب یہ تجھے قانونی طریقے سے پھانسنے کی کوشش کریں گے۔ اگر تُو اکرم چشتی کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ اگلی پچھلی ساری کسر نکال لے گا۔''

ندیم نے نیچے اتر کر چابی میرے حوالے کی اور مجھ سے جیپ کی چابی لے کر چلا گیا۔ میں نے اندر جا کر سید گل کی مزاج پُرسی کی اور اسے کہا کہ دفتر کا خیال رکھے۔''کوئی میرے بارے میں پوچھے تو کہنا کہ صاحب ٹمبکٹو یا چیچو کی ملیاں گئے ہیں۔'' اندر ریسپشنسٹ لڑکی صائمہ اور میرا نائب طاہر آ گئے تھے اور لوگوں سے نمٹ رہے تھے۔ میں نے طاہر کو بھی ہدایات دیں۔''میں کچھ دن دفتر نہیں آؤں گا۔ کوئی بھی میرے بارے میں یا میرے کسی جاننے والے کے بارے میں پوچھے تو تم لوگوں نے نفی میں جواب دینا ہے۔''

''میں سمجھ گیا لیکن کام کا......''

''بس یار! جیسے تیسے بھگتاتے رہو۔'' میں نے کہا اور اپنے تمام ضروری کاغذات سمیٹ کر ایک بیگ میں ڈالے، اپنے چند جوڑے بھی رکھے تھے۔ میں ندیم کی کار میں بروقت نکلا تھا کیونکہ مین روڈ کی طرف آتے ہوئے میں نے ایک پولیس موبائل اپنے دفتر کی طرف جاتے دیکھی تھی اور موبائل وین کی اگلی نشست پر انسپکٹر اکرم چشتی اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ براجمان تھا۔ اس کی نظر اچانک مجھ پر پڑی اور اس نے چیخ کر موبائل وین کے ڈرائیور سے کچھ کہا۔ یقیناً وہ مجھے روکنے یا میرا پیچھا کرنے کی ہدایت دے رہا تھا۔ میں نے ایکسی لریٹر دبایا اور کار چیتے کی طرح جست لگا کر بھاگی تھی۔ کچھ دور جا کر میں نے عقبی آئینے میں دیکھا، وین رکنے کے بعد مڑ رہی تھی۔

☆======☆======☆

فتح خان یقیناً بے حد عیار و مکار شخص تھا۔ جو شخص راجا عمر دراز کی ناک تلے چھپا ہو، اس کی چالاکی میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے لیکن اس وقت اس کی ذہانت ایک کمسن اور کمزور سی لڑکی کے ہاتھ میں کھیل رہی تھی۔ اس نے بالکل ٹھیک داؤ چل کر فتح خان کو میری جان کا گاہک بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے لباس سے پستول نکالتے ہوئے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ ظاہر ہے وہ میری مدح سرائی تو کرنے سے رہا تھا، گالیاں ہی دے رہا ہوگا۔ اس کے پیچھے شینا فاتحانہ انداز میں سینہ تانے کھڑی تھی اور اس وقت اسے اپنی برہنگی کی پروا بھی نہیں تھی۔ فتح خان کو پستول سیدھا کرتے دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یقینی موت سامنے کھڑی تھی اور میں خود میں اتنی ہمت نہیں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا سامنا کرتا۔ میرے کان دھماکے کے منتظر تھے، جس کے بعد میری زندگی کا چراغ گل ہو جاتا لیکن دھماکے کے بجائے عجیب سی آواز آئی جیسے کسی نے ریتلی زمین پر ڈنڈا مارا ہو۔ میں نے آنکھ کھول دی۔ ڈنڈا ہی مارا گیا تھا لیکن ریتلی زمین پر نہیں بلکہ فتح خان کی گدی پر اور ڈنڈا ایمن کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے آگے پیچھے ہوتے فتح خان کے سر پر دوسری ضرب لگائی اور وہ منہ کے بل زمین پر جا

گرا۔ اس سے پہلے شینا چیخ مار کر ایمن کی طرف لپکی تھی۔ جیسے ہی ایمن نے فتح خان کے سر پر دوسری ضرب لگائی شینا اس سے لپٹ گئی تھی اور خالص زنانہ انداز میں اسے نوچنے کھسوٹنے لگی۔ ایمن پھرتیلی تھی لیکن شینا اس سے اتنی بری طرح چمٹی ہوئی تھی کہ اسے موقع نہیں دے رہی تھی۔

میری نظر فتح خان کے بے ہوش جسم تلے دبے پستول پر تھی۔ مجھے اسلحہ خاص طور سے پستول اور ریوالور اچھی طرح چلانا آتا تھا۔ زنجیر اتنی لمبی نہیں تھی کہ میں فتح خان تک پہنچ سکتا اس لئے زمین پر گر کر میں نے فتح خان کو ایک طرف دھکیلا۔ پستول اس کے پیٹ تلے دبا تھا اور میری پہنچ سے باہر تھا۔ لہٰذا میں نے ایک بار پھر فتح خان کو پستول پر اوندھا کیا اور اسے قمیص سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ تو اس کے ساتھ اس کے جسم تلے دبا ہوا پستول بھی کھنچا چلا آیا تھا۔ میں نے فتح خان کو ایک طرف دھکیلا اور پستول پر قبضہ کر لیا۔ شینا اور ایمن ایک دوسرے سے وحشی بلیوں کی طرح لڑ رہی تھیں۔ شینا کی قمیص مکمل طور پر تار تار ہو کر اتر چکی تھی تو اس نے ایمن کا لباس بھی کئی جگہ سے پھاڑ دیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں ان لڑکیوں کی ''فری اسٹائل ریسلنگ'' سے ضرور محظوظ ہوتا۔ دونوں ہم عمر تھیں، ایمن ذرا بھرے جسم کی اور طویل قامت تھی جبکہ شینا دبلی اور گٹھے ہوئے جسم والی لڑکی نما عورت تھی۔ ایمن کی ناک سے خون ٹپک رہا تھا جواب میں اس نے شینا کے چہرے پر ناخنوں سے لکیریں کھینچ دی تھیں۔ میں نے پستول سیدھا کیا۔

''الگ ہو جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔''

ایمن ٹھٹکی تھی، شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اسے بھی دھمکی دے سکتا ہوں جبکہ اس نے کچھ دیر پہلے میری جان بچائی تھی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر شینا نے اس کے سینے پر ٹکر ماری اور اسے دھکیلتے ہوئے دیوار کی طرف لے گئی۔ پھر ایمن نے ایک حیرت انگیز کرتب دکھایا۔ وہ دیوار تک جانے سے پہلے ہی اچانک زمین پر گر گئی اور اس نے شینا کو پیروں کی مدد سے دیوار کی طرف اچھال دیا۔ شینا کا سر دیوار سے لگا تھا اور وہ کراہ کر زمین پر گری۔ ایمن نے قلابازی کھائی اور دونوں پاؤں شینا کے پیٹ پر مارے۔ اس نے چیخ ماری۔ رہی سہی کسر ایمن نے دوبارہ شینا کا سر زمین پر مار کر پوری کر دی پھر اٹھتے ہوئے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ میں اس کی پھرتی ملاحظہ کر رہا تھا، اس کے اٹھتے ہی میں نے چونک کر پستول سیدھا کر لیا۔ شینا سے ہاتھا پائی میں اس کا بلاؤز دو جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ میں نے ان جگہوں سے نظریں چراتے ہوئے اپنی بیڑی کھولنے کا حکم دیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''چابی میرے پاس نہیں ہے۔''

''فتح خان کے پاس ہوگی، اس کی جیب سے نکالو۔ جلدی...... میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے ہاتھوں سے مارا جائے لیکن کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو ضرور میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔''

''میں نے ابھی تمہاری جان بچائی ہے۔ اگر میں اسے ڈنڈا نہ مارتی تو اس کی جگہ تمہاری لاش پڑی ہوتی۔''

''میں اس کے لئے ساری عمر تمہارا شکر گزار رہوں گا مگر فی الحال جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو، اس کی جیب سے چابی نکالو۔''

بادل ناخواستہ ایمن نے فتح خان کے لباس کی تلاشی لی اور چابی نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے

ہمت کر بیڑی کا لاک کھول دیا۔ ''اب تم مجھے باہر لے چلوگی۔''

اس نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھے اور ضدی لہجے میں بولی۔ ''میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔''

میں نے آگے بڑھ کر پستول اس کے سر سے لگا دیا۔ ''مجھے یہاں سے نکالو ورنہ ......''

''گولی ماردوگے......تو ماردو...... مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں اس سے بچایا۔''

مجھے لگا اگر میں سچ مچ بھی گولی مارنے کا ارادہ رکھتا تب بھی وہ راضی نہ ہوتی۔ میں نے گہری سانس لے کر پستول نیچے کرلیا اور عاجزی سے بولا۔ ''پلیز! مجھے یہاں سے نکالو۔ نہ جانے میں کس چکر میں پھنس گیا ہوں، اس سے تو بہتر تھا، میں اپنے والد کا حکم مان کر فوج میں چلا جاتا۔''

میرے انداز پر اس کا موڈ بحال ہوگیا تھا۔ ''اچھا تو تم گھر سے بھاگے ہوئے ہو۔'' وہ لگاوٹ بھرے انداز میں قریب آئی۔ ''یہ بتاؤ کہ میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

''بہت اچھی کیوں کہ تم نے میری جان بچائی ہے۔'' میں نے کہا تو اسے مایوسی ہوئی تھی۔

''میں اس لئے اچھی لگتی ہوں۔''

''اور وجہ بھی ہیں......لیکن خدا کے لئے تم یہ بلاؤز درست کرلو۔ اگر تمہارے ڈیڈی آ گئے تو ہمیں اس طرح نزدیک دیکھ کر مجھے ضرور گولی ماردیں گے۔''

''تم فکر نہ کرو ڈیڈی یہاں نہیں ہیں، وہ ایک کام سے باہر گئے ہیں۔''

''تب مجھے ان کے آنے سے پہلے رخصت ہوجانا چاہئے۔''

''ڈرومت......ڈیڈی تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ جب فتح خان تمہیں لے کر آیا تو انہوں نے اسے ڈانٹا تھا لیکن اس کے سر پر اس حرافہ کا بھوت سوار تھا۔'' ایمن نے بے سدھ پڑی شینا کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ پھیلائے چت پڑی تھی اور اس کا یہ پوز ایمن کو اچھا نہیں لگا۔ وہ شاید اسے اوندھے منہ کرنے کے لئے جھکی تھی کہ شینا کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور ایمن کراہ کر پیچھے کی طرف جاگری۔ شینا نے ہاتھ میں دبا پتھر اس کے سر پر مارا تھا۔ وہ نہ جانے کب ہوش میں آ کر موقع کی منتظر تھی۔ ایمن کے گرتے ہی اس نے لپک کر دوبارہ اس کے سر پر پتھر مارنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش میں نے لات مار کر ناکام بنادی۔ ''کتیا!'' میں نے غصے سے اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا۔ اس بار وہ سچ مچ بے ہوش ہوگئی تھی۔ میں لپک کر ایمن کے قریب پہنچا، اس کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش تھی۔ شینا نے بہت سخت وار کیا تھا۔ میں نے اسے بازوؤں میں اٹھالیا اور سرنگ کے اس حصے کی طرف بڑھا جدھر سے شینا اور فتح خان آئے تھے۔ آگے جا کر سرنگ تنگ اور تاریک ہوگئی تھی۔ میں ٹھوکریں کھاتا اور پھر جھاڑیوں سے الجھتا ایمن کو لے کر بمشکل باہر نکلا تو رات کی تاریکی وادی پر پھیل چکی تھی۔ مجھے اس خفیہ غار سے نکلنے کی جلدی تھی۔ اوّل تو مجھے ایمن کے والد بزرگوار کے آنے کا خدشہ تھا۔ دوسرے بے ہوش ایمن کو تازہ ہوا میں لانا چاہتا تھا۔ غار میں ہوا کی آمدورفت نہ ہونے اور مشعلیں جلنے کی وجہ سے گھٹن تھی۔ باہر کی کھلی اور خشک فضا میں آنے سے ایمن پر اچھا اثر پڑا تھا اور اس نے میرے بازوؤں میں ہی کراہنا اور ہلنا شروع کردیا تھا۔ اسے ایک جگہ لٹا کر میں نے اس کے گال تھپتھپائے۔

''ایمن ہوش میں آؤ......ایمن!''

وہ کراہ کر اٹھ بیٹھی۔ اندھیرے میں نہ جانے کیا سمجھ کر اس نے مجھے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ ''
رہو...... پیچھے ہٹو۔'' اس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔
''ایمن، یہ میں ہوں۔'' میں نے کہا تو اس کی مزاحمت رک گئی تھی پھر وہ سہمے ہوئے انداز میں مجھ
لپٹ گئی۔
''یہ کہاں ہوں میں؟''
''شینا نے تمہارے سر پر پتھر مارا تھا۔ تم بے ہوش ہوگئی تھیں، میں تمہیں اٹھا کر یہاں لے آیا ہوں۔''
''ڈیڈی کہاں ہیں؟'' وہ پریشان لگنے لگی تھی۔
''پتا نہیں۔ تم نے ہی کہا تھا وہ باہر گئے ہیں۔'' میں نے اسے دوبارہ لٹا دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''ایمن
بہت اچھی لڑکی ہو، یہ کن چکروں میں پڑ گئی ہو۔ اپنے ملک واپس چلی جاؤ۔ یاد رکھو یہاں کے لوگ جتنے سا
ہیں، اتنے ہی سنگ دل بھی ہیں۔ اس سے پہلے تم کسی مصیبت میں پڑو، یہاں سے چلی جاؤ۔''
''مجھے ڈیڈی کی فکر ہے۔ میں ان کی وجہ سے یہاں آئی ہوں۔ وہ اس تصویر اور پتھر کے پیچھے پاگ
ہیں۔''
''تصویر اور پتھر اب کسی کو بھی نہیں مل سکتے۔'' میں نے صاف جھوٹ بولا۔ ''راجا عمر دراز نے انہیں ک
ایسی جگہ چھپا دیا ہے جو اس کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے۔''
''کاش، میں ڈیڈی کو سمجھا سکتی۔''
''ایمن...... تمہارے پاس دو گھنٹے ہیں۔ میں راجا عمر دراز کے پاس جا رہا ہوں۔ اس دوران میں تم ا
ڈیڈی کو لے کر یہاں سے چلی جاؤ۔ فتح خان اور شینا کو چھوڑ جانا...... وہ یہاں کے مجرم ہیں۔''
وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر گرم جوشی سے مجھ سے لپٹ گئی۔ ''شاہ باز! میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔
میں نے ایک بار پھر وہی نرم گرم سالس محسوس کیا تھا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب اس نے پستو
میرے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ میں چونکا تو وہ ہنس دی۔ ''ڈرو مت۔ یہ میں نے اپنی حفاظت کے لئے لیا ہے۔
سے جدا ہو کر مجھے ابھی ڈیڈی کو بھی تلاش کرنا ہے۔''
''تم شاید اسے جھوٹ سمجھو لیکن مجھے تم سے ذرا سا بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا ہے۔'' میں نے خلوص ۔
کہا۔ ''ایمن، میں بھی تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''
اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا اور درختوں کے درمیان تاریکی میں غائب ہوگئی۔ اس کے جا
کے بعد میں نے پہلے اس خفیہ غار کا محل وقوع ذہن نشین کیا اور پھر وادی کے اوپری حصے کی طرف جانے لگا۔ جس
طرف راجا عمر دراز کا محل تھا۔ مجھے ایمن کے طرزِ عمل پر حیرت تھی۔ آخر اس نے میری جان کیوں بچائی تھی۔ ایک
بات طے تھی کہ وہ اچھی لڑکی تھی۔ باپ کی محبت میں یہاں تک آ گئی تھی لیکن اس کا ضمیر ایک مجرمانہ فعل میں شریک
ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے دل سے دعا کی کہ اس کا باپ واپس جانے کے لئے تیار ہو جائے۔ وہ اس
کے بغیر نہیں جاتی اور اس کا باپ اپنی ہوس کی وجہ سے کسی مصیبت میں پھنستا تو وہ بھی لپیٹ میں آ جاتی۔ میں ۔
راجا عمر دراز کے پاس جانے سے پہلے اتنا وقت ضائع کر دیا کہ ایمن اپنے باپ کے ہمراہ اس جگہ سے دور نکل

جائے۔ میں اپنے اندازے کے مطابق ایک گھنٹا اِدھر اُدھر پھرتا رہا تھا کیونکہ فتح خان نے قید کرتے وقت مجھ سے گھڑی لے لی تھی۔ اس کے بعد میں راجا عمر دراز کے محل کی طرف چل پڑا تھا۔ دس پندرہ منٹ میں، میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ دربان مجھے دیکھ کر اچھل پڑے تھے اور مجھے ہاتھوں ہاتھ محل کے اندر پہنچایا گیا۔ سب سے پہلے مجھے راجا کے مختصر سے سیکرٹری کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

''جناب، آپ کہاں تھے؟'' اس نے نزلہ زدہ آواز میں کہا۔ ''راجا صاحب نے آپ کی تلاش میں پوری وادی چھان ماری۔''

''مجھے فتح خان اغوا کر کے لے گیا تھا۔''

''فتح خان......!'' مختصر سیکرٹری اچھلا۔ ''وہ کہاں سے آ گیا؟''

''آ نہیں گیا۔ وہ یہیں چھپا تھا۔ ایک خفیہ غار میں...... ممکن ہے ابھی تک وہاں بے ہوش پڑا ہو۔''

''بے ہوش۔'' سیکرٹری پھر اچھلا۔ ''کیسے...... کب......؟''

''یہ سب میں راجا صاحب کو بتاؤں گا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''راجا صاحب کو اطلاع کر دی ہے۔''

''میں صبح سے بھوکا ہوں، کچھ کھانے کو دو۔''

میری فرمائش پر سیکرٹری نے فوری طور پر چند چیزیں منگوائی تھیں جن سے میں نے معدے کی تسلی کی تھی۔ ...ا دیر بعد راجا نے مجھے طلب کر لیا، وہ میری کہانی سننے کے لئے بے تاب تھا لیکن میں نے کہا۔ ''پہلے آپ فتح خان کو پکڑنے کے لئے اپنے آدمی میرے ساتھ روانہ کریں وہ ایک خفیہ غار میں بے ہوش پڑا ہے، اسے ہوش آ گیا تو وہ شینا کو لے کر غائب ہو جائے گا۔''

راجا عمر دراز نے فوری طور پر اپنے محافظوں کا ایک دستہ میرے ساتھ کر دیا۔ میں انہیں لے کر غار کی ...رف روانہ ہوا۔ تاریکی کا بہانہ کر کے میں نے دو تین بار راستہ بھولنے کی اداکاری کی اور تاخیر کرتا رہا۔ مجھے فتح ...ان اور شینا سے کوئی غرض نہیں تھی، وہ بے شک دفع ہو جاتے۔ مجھے خطرہ ایمن اور اس کے باپ کا تھا۔ کہیں ...ہوں نے بھاگنے میں تاخیر کر دی ہو اور پکڑے جائیں۔ کوئی پون گھنٹے تک بھٹکنے کے بعد میں نے غار کا رخ کیا ...ان جھاڑیوں کے سامنے پہنچ کر راجا محافظوں سے کہا۔ ''ان جھاڑیوں سے راستہ جاتا ہے۔ میں اس جگہ سے ...ر ہوا تھا۔''

''آپ ادر ای رکو۔'' محافظوں کے انچارج نے مجھ سے کہا اور اپنے ساتھیوں سمیت جھاڑی میں گھس ...۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ باہر کھڑا رہ گیا۔ محافظ رائفلوں سے مسلح تھے اور اگر ایمن اور اس کا باپ موجود ...ئے اور مقابلے کی نوبت آئی تو وہ نصف درجن مسلح افراد کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن میرے خدشات محض ...ات ہی رہے۔ پندرہ منٹ بعد دو محافظ فتح خان اور شینا کو دھکیلتے ہوئے نمودار ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ ...ں سے بندھے ہوئے تھے۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس خفیہ غار میں سوائے ان دونوں کے اور کوئی نہیں تھا اور ... بندھے پڑے تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ فتح خان مجھے خونی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور شینا کی ...وں سے میرے لئے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے میری طرف دیکھ کر زمین پر تھوک دیا۔

''ام تم کو چوڑے گا نئیں۔قتل کرے گا۔'' فتح خان نے تلملاتے ہوئے کہا۔

''فتح خان! تم بھی کس عورت کی باتوں میں آ رہے ہو جو اپنے شوہر سے بے وفائی کر سکتی ہے وہ تمہاری وفادار کب سے ہونے لگی! میں کیا اتنا احمق ہوں کہ تمہاری قید میں ہونے کے باوجود اس پر دست درازی کرتا۔ اس نے مجھ سے انتقام لینے کے لئے اپنی قمیص خود پھاڑ لی تھی۔''

شینا نے اپنی زبان میں اس سے کچھ کہا، فتح خان بدستور مجھے خوں خوار نظروں سے گھورتا رہا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''دوسرے یہ کہ تم دونوں پر معاشرے اور مذہب کی حدود توڑنے پر مقدمہ چلے گا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

ذرا دیر بعد ہم سب راجا عمر دراز کے محل کی طرف جا رہے تھے۔ محل پہنچتے ہی فتح خان اور شینا کو زیرِ زمین قید خانے میں بھیج دیا گیا اور مجھے راجا نے طلب کر لیا۔ وہ واضح طور پر یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ میں کہاں تھا؟ اور مجھے فتح خان کے بارے میں کیسے پتا چلا؟ میں نے مناسب ردوبدل کے ساتھ اسے اپنے پکڑے جانے اور رہائی پانے کے بارے میں بتایا۔ ایمن کا ذکر میں نے گول کر دیا تھا اور صرف اتنا بتایا تھا کہ وہاں پر ایک سفید فام لڑکی بھی آئی تھی اور اس نے فتح خان سے میری جان بچائی تھی۔ راجا عمر دراز متحیر ہوا تھا۔ ''اس لڑکی کو تم سے کیا دلچسپی تھی؟''

''میں نہیں جانتا۔ وہ وہاں موجود سفید فام کو ڈیڈی کہہ رہی تھی۔ باقی آپ فتح خان اور شینا سے معلوم کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا اور شینا کے الزام کا معاملہ بھی چھپا لیا، وہ خود بتاتی یا مجھ پر مکرر الزام لگاتی تو اس کی مرضی تھی۔ راجا عمر دراز اس کی بات کا یقین نہ کرتا۔ اس کے بعد میں نے اس کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر سونے کے لئے چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا آج رات فتح خان اور شینا پر بھاری گزرے گی۔ راجا عمر دراز کے جلاّ دان سے اپنے انداز میں بات کریں گے۔ اگلی صبح میں تازہ دم اٹھا تھا۔ فتح خان کے پکڑے جانے کے بعد اب مجھے کسی سے خطرہ نہیں رہا تھا لیکن ابھی میرے مسائل ختم نہیں ہوئے تھے۔

شاہی حکیم نے صبح سویرے مجھے مرہم کا ایک اور لیپ کیا اور وہی بکری کی مینگنی نما گولیاں کھلائیں جن سے مرہم کی تکلیف دہ تاثیر دب جاتی تھی۔ دو گھنٹے بعد میں نے گرم پانی سے غسل کیا اور اس کے بعد راجا عمر دراز کے ساتھ محل کے طعام خانے میں پُرتکلف قسم کے ناشتے سے لطف اندوز ہوا تھا۔ راجا کھانے کے دوران میں چپ رہنے کا عادی تھا اس لئے میں اس سے فتح خان اور شینا کے بارے میں نہ پوچھ سکا۔ جیسے ہی ناشتا ختم ہوا اور راجا عمر دراز نے محل کے باغ کا رخ کیا، یہ بھی اس کا معمول تھا، ناشتے کے بعد وہ باغ میں چہل قدمی کرتا تھا میں نے موقع غنیمت جان کر فتح خان کے بارے میں پوچھا۔ ''اس نے کچھ بتایا جناب؟''

راجا عمر دراز نے مجھے دیکھا۔ ''وہ کیا بتا سکتا ہے؟''

''یہی کہ وہ انگریز کون ہے جو تصویر اور پتھر حاصل کرنا چاہتا ہے؟''

''میں جانتا ہوں، وہ کون ہے۔ یہ بات مجھے فتح خان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں دنگ رہ گیا تھا۔ ''آپ جانتے ہیں پھر آپ نے انہیں پکڑا کیوں نہیں؟''

''میں یہ جانتا ہوں کہ وہ کون ہیں، یہ نہیں جانتا کہ کہاں ہیں؟ بہرحال میرے آدمی وادی کے چپے چپے

انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ جلد یا بدیر پکڑے جائیں گے۔"

"وہ کون ہیں؟" میں نے اس اطلاع پر اپنا اضطراب چھپاتے ہوئے کہا۔

"میرے کمانڈنگ آفیسر ولیم شا کا بیٹا برٹ شا۔" راجا عمر دراز نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ "یہ چیزیں میری تھیں لیکن ولیم شا کی نیت ان پر خراب ہوگئی اور مجھے مجبوراً فرار ہونا پڑا ورنہ ولیم شا بزور یہ تصویر اور پتھر مجھ سے چھین لیتا۔ اس کے مرنے کے بعد اب اس کی اولاد مجھ سے یہ چیزیں ہتھیانے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"راجا صاحب! آپ نے انہیں کہاں سے حاصل کیا تھا؟" میں نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"برخوردار! یہ ایک طویل کہانی ہے، کسی فرصت کے وقت سناؤں گا۔" راجا عمر دراز نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "آؤ فتح خان کی خیریت پوچھیں...... اسے میں نے اپنے جرائم کا اعتراف کرنے کے لئے صبح تک کا وقت دیا تھا۔"

ہم تہ خانے میں واقع اس کمرے تک آئے جہاں چند دن پہلے میری پشت ادھیڑی گئی تھی۔ اب اس پوزیشن میں فتح خان تھا اور راجا عمر دراز کا جلاد اس پر کوڑے برسانے کے لئے بالکل تیار تھا۔ راجا عمر دراز نے فتح خان سے اردو میں ہی پوچھا۔ "کیا سوچا تم نے فتح خان!"

اس نے مقامی زبان میں جواب دیا۔ راجا عمر دراز میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "یہ ڈھیٹ شخص کہہ رہا ہے کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اس نے مجھ سے تو غداری کی ہے، اس نے وادی کے ایک شریف شخص کی بیوی کو ورغلانے اور اس کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنے کا سنگین جرم بھی کیا ہے، جس کی سزا یہ ہے کہ انہیں درخت کے تنے سے باندھ کر اس تنے کو بلندی سے لڑھکا دیا جائے۔"

فتح خان کے چہرے پر پہلی بار خوف کے آثار نظر آئے تھے، وہ چیخا۔ راجا عمر دراز نے ترجمہ کیا۔ "یہ اب بھی اپنی بے گناہی پر اصرار کر رہا ہے۔"

"یہ جھوٹا ہے، اس سے پوچھیں اگر اس کے شینا سے تعلقات نہیں ہیں تو اس نے اسے آپ کی قید سے کیوں آزاد کرایا۔ شینا کے جھوٹے الزام پر یہ مجھے قتل کرنے پر کیوں تل گیا تھا؟"

راجا عمر دراز چونکا۔ "کل تم نے یہ بات مجھے نہیں بتائی تھی۔"

"مجھے اس بے حیا کا الزام دہراتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔"

"ان سے اس کا حساب بھی لیا جائے گا۔" راجا عمر دراز نے کہا اور اپنے جلاد کو کچھ کہا۔ اس کا کوڑا حرکت میں آ گیا تھا۔ پہلی چند ضربیں تو وہ خاموشی سے برداشت کر گیا تھا اس کے بعد بلبلانے لگا تھا۔ راجا عمر دراز نے شینا کو وہاں لانے کا حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل ہوئی تھی۔ شینا اپنے محبوب کی حالت دیکھ کر چیخ اٹھی تھی۔ اس نے خود کو محافظ سے چھڑا کر فتح خان کی طرف لپکنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہی۔

"عورت، اس شخص سے کہہ...... یہ زبان کھول دے...... ورنہ اس کا ریشہ ریشہ ادھیڑ دیا جائے گا۔" راجا عمر دراز نے سرد لہجے میں شینا سے کہا۔ "مجھے بہر صورت انگریز آدمی چاہئے۔"

شینا نے لرزتے ہوئے مقامی زبان میں جواب دیا۔ اس پر راجا عمر دراز کا چہرہ درشت ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے مختصر سے سیکرٹری سے کہا۔ "اس کے شوہر اور علاقے کے معززوں کو بلاؤ۔ اس کا فیصلہ آج ہی ہوگا۔"

''نہیں۔'' شینا چیخی اور جلدی جلدی کچھ کہنے لگی مگر عمر دراز اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر باہر چلا گیا۔ شینا بری طرح بلک رہی تھی۔ اچانک اس نے خود کو محافظ سے چھڑا لیا اور میری طرف لپکی۔ میں چوکنا ہو گیا تھا۔ اس نے زمین پر گر کر میرے پاؤں پکڑ لئے۔ ''ام کو بچاؤ۔''

میں نے پاؤں چھڑانے کی کوشش کی۔ ''میں کیسے بچاؤں؟''

''تُوم بچا سکتا اے۔ راجا صیب تو ماری بات مانے گا۔''

میں نے ایک جھٹکے سے اپنے پاؤں چھڑا لئے۔ ''شینا! تم نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا، وہ میں معاف کر سکتا ہوں لیکن تم اپنے شوہر کے اعتماد کو دھوکا دیتی رہیں، وہ تمہیں معاف کرے گا؟ تم نے راجا صاحب کے محل میں چوری کرنے والوں کی مدد کی، وہ تمہیں معاف کرے گا؟''

''تُوم بولے گا تو وہ معاف کر دے گا۔'' اس نے دوبارہ میرے پیر پکڑنے کی کوشش کی۔

میں ہنسا۔ ''اس جلاد سے پوچھنا، چار دن پہلے اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ صرف اس لئے کہ تم نے اور فتح خان نے مجھے چوری کے الزام میں پھنسا دیا تھا۔ جب راجا صاحب ایک بے گناہ آدمی کی پشت صرف شبہے میں ادھڑوا سکتے ہیں تو تمہارے بارے میں تو انہیں یقین ہے، اپنے اس عاشق سے کہو، راجا صاحب کی بات مان لے اور جو وہ پوچھ رہے ہیں، وہ بتا دے۔ اس صورت میں تم دونوں کی بچت ممکن ہے۔ مجھ سے کسی قسم کی توقع مت رکھو۔''

وہ میری بات سمجھی نہیں یا اس میں ڈھٹائی زیادہ ہی تھی، وہ بدستور روتی چلاتی رہی۔ فتح خان اپنی تکلیف بھول کر اسے گھور رہا تھا۔ اچانک اس نے دھاڑ کر کچھ کہا۔ شینا بھی چلائی اور میں باہر نکل گیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی لہٰذا میں نے خادم کو تلاش کیا اور اس سے کھانے کو کچھ لانے کو کہا۔ وہ کھانا لے کر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''راجا صاحب کہاں ہیں؟''

''اپنے خاص کمرے میں۔'' خادم نے آگاہ کیا۔ ''وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''میں سرمد علی سے ملنا چاہتا ہوں، کیا اسے کسی طریقے سے بلایا جا سکتا ہے؟''

''منشی سے کہہ دیں، وہ بلوا لے گا۔''

''تم منشی کو بلاؤ۔'' میں نے کہا۔

چند لمحے بعد منشی یعنی راجا عمر دراز کا سیکرٹری میرے سامنے تھا۔ ''مجھے سرمد علی سے ملنا ہے۔''

''کون سرمد علی جناب؟''

''شینا کے شوہر کا سب سے بڑا لڑکا۔ وہ میرا اچھا دوست ہے۔''

''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا جناب!'' سیکرٹری نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ بھی اس معاملے میں ملوث ہیں اور ہم قبائلی اپنی عزت کے معاملے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ وہ لڑکا نہ جانے آپ سے کیا سلوک کرے، اس وقت آپ راجا صاحب کے مہمان ہیں اور آپ کی بے عزتی ان کی بے عزتی کے برابر ہیں۔''

''یعنی میں نہ تو کہیں آ جا سکتا ہوں اور نہ کسی سے مل سکتا ہوں؟''

''نہیں جناب، آپ جہاں چاہیں آ جا سکتے ہیں لیکن ایک دو محافظ ساتھ ہوں گے۔ پچھلی بار بھی آپ

اکیلے نکلے تھے اور غائب ہو گئے تھے۔ اس بار راجا صاحب نے آپ کی حفاظت کے لئے یہ پابندی لگا دی ہے، ہاں محل کے آس پاس آپ اکیلے جاسکتے ہیں۔"

گویا میں ایک طرح سے راجا عمر دراز کا قیدی تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ اس نے حفاظت کے نقطۂ نظر سے یہ پابندی لگائی ہو لیکن میرے اندر اور بھی کئی طرح کے خدشات سر ابھار رہے تھے۔ ایک تو یہ کہ راجا کو میری گمشدگی سے واپس آنے کے بعد والے بیان پر شک تھا اور وہ مجھے معزز قیدی بنا کر برٹ شا اور ایمن کو تلاش کروا رہا تھا۔ دوسرے شینا نے مجھ پر الزام لگایا تھا جب جرگہ بیٹھتا اور شینا وہاں پر بھی یہ الزام دہراتی تو مجھے بھی جرگے کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ سب خیالات میرے ذہن میں چکرا رہے تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ میں ایک دلدل میں اتر گیا ہوں اور رفتہ رفتہ اس میں دھنستا جا رہا ہوں۔ سیکرٹری غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"جناب! یہ پابندی آپ کے اپنے مفاد میں لگائی گی ہے۔ ابھی باہر کے حالات آپ کے لئے سازگار نہیں ہیں۔ فتح خان کے خاندان والے اس کی رہائی کے لئے زور ڈال رہے ہیں اور ممکن ہے انہیں پتا چل گیا ہو کہ فتح خان کی گرفتاری میں آپ کا ہاتھ ہے۔ اس وجہ سے باہر نکلنا آپ کے لئے مناسب نہیں ہے۔"

"اور اگر میں وادی سے باہر جانا چاہوں تو؟"

"یہ بھی ممکن نہیں ہے۔" سیکرٹری نے پھر صاف انکار کر دیا۔ "ابھی فتح خان اور شینا کے خلاف جرگہ بیٹھے گا، آپ کو ان کے خلاف گواہی دینی ہوگی۔"

"اور شینا نے مجھ پر الزام لگا دیا تو......؟"

"ایسا نہیں ہوگا، آپ بے فکر رہیں۔" سیکرٹری نے سنجیدگی سے جواب دیا لیکن میری تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔ جرگہ ایک طرح کی عدالت تھی اور اس میں ہر فریق کے الزام کو سنا جاتا اور دوسرے سے اپنی صفائی پیش کرنے کو کہا جاتا، میں نے سیکرٹری سے کہا۔

"یہ کس طرح ممکن ہے۔ جرگے میں سب کے سامنے تم کس طرح شینا کو اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور کرو گے؟"

"شہباز صاحب! آپ پریشان نہ ہوں، جب راجا صاحب نے ایک بات کہہ دی ہے تو وہ اس پر قائم رہیں گے۔ راجا صاحب اپنی زبان کا پاس رکھتے ہیں۔ اگر میری کسی خدمت کی ضرورت ہو تو مجھے دوبارہ طلب کر لیجئے گا۔"

سیکرٹری کے جانے کے بعد میری فکر کم نہیں ہوئی تھی۔ جو راجا ایک بار صرف شبہے میں میرے ساتھ برا سلوک کرسکتا تھا، دوسری بار اپنے مجرموں کو سزا دلوانے کے لئے مجھے بھی پھنسوا سکتا تھا۔ ایک طرف تو یہ خدشات تھے تو دوسری طرف میرے اندر سے کوئی مجھے راجا عمر دراز پر اعتماد کرنے کو کہہ رہا تھا۔ میں باہر باغ میں ٹہلتا رہا۔ تین بجے دوپہر کا کھانا ڈائننگ ہال میں اکیلے کھایا۔ راجا نہیں آیا تھا۔ وہ بدستور اپنے خاص کمرے میں محصور تھا۔ کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر سے محل کی سیر کرنے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے اندر باہر جانے سے کسی نے روکا ٹوکا نہیں تھا۔ ایک بات شدت سے محسوس ہوئی تھی، پورے محل میں راجا عمر دراز کے علاوہ صرف اس کے ملازمین اور محافظ تھے۔ مجھے اب تک اس کے کسی رشتے دار کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ اوپر کی منزل راجا

کے لئے مخصوص تھی اور وہاں اس کے اہلِ خانہ کی موجودگی عین ممکن تھی مگر نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اوپر بھی اکیلا راجا ہی ہوتا ہے۔ اس کے رشتے دار اور اہلِ خانہ تھے، تب بھی اس محل میں نہیں پائے جاتے تھے۔ شام کے قریب مجھے سیکرٹری بیرونی دروازے سے اندر کی طرف جاتا نظر آیا، میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ ''میں راجا صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''اخاہ...... شہباز صاحب! آج موسم کتنا اچھا ہے۔'' اس نے واضح طور پر مجھے ٹالا تھا۔

''موسم گیا جہنم میں، میری بات کا جواب دو۔''

اس نے میری طرف دیکھا۔ ''اس کا میرے پاس جواب نہیں ہے۔ راجا صاحب بدستور خاص کمرے میں ہیں اور وہاں کوئی نہیں جا سکتا۔''

''تم زبانی طور پر یا لکھ کر میری گزارش اندر بھیج سکتے ہو۔''

''کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے سوچ کر کہا۔ ''اور ہاں، اب آپ کے محل کے باہر جانے پر مکمل پابندی ہے۔ وادی کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ بعض شر پسند آپ کے خلاف افواہیں پھیلا رہے ہیں۔''

''کس قسم کی افواہیں؟''

''یہی کہ فتح خان اور شینا اس معاملے میں بے قصور ہیں اور راجا عمر دراز آپ کی وجہ سے انہیں قید کئے ہوئے ہیں۔''

''بکواس۔ کیا جرگے میں ان کے خلاف مقدمہ نہیں چلے گا؟''

''وہ تو جب چلے گا، تب چلے گا۔ جرگے کے دو معزز اراکین وادی سے باہر گئے ہیں۔ ان کی واپسی کل تک ہوگی۔ ان کے آنے کے بعد مقدمے کی کارروائی کا آغاز ہوگا۔''

''اور مقدمہ کتنے دن چلے گا؟''

''اس کا کیا پتا جناب! یہ بھی ہو سکتا ہے ایک دو دن میں فیصلہ ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہفتے لگ جائیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تب تک مجھے اسی جگہ قید رہنا ہوگا؟'' میں جھنجلا گیا تھا۔

''قید کیوں جناب! آپ راجا صاحب کے معزز مہمان ہیں اور جنہیں قید رکھنا ہو ان کے لئے مخصوص جگہ آپ دیکھ چکے ہیں اور جناب، اتنی خوبصورت جگہ آنے کے لئے لوگ آرزو کرتے ہیں۔ بس چند دن کی بات ہے پھر راجا صاحب آپ کو شکار پر بھی لے جائیں گے۔''

میں خود پر قابو پانے لگا۔ مجھے احساس تھا کہ جوش سے کام لے کر میں اپنے لئے مسائل کھڑے کروں گا اس لئے بہتر یہی ہے کہ صبر سے کام لوں اور انتظار کروں، کب مجھے یہاں سے چھٹکارا ملتا ہے۔ میں سیکرٹری سے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''میں بور ہوتا ہوں، آدمی کب تک پھول دیکھتا رہے یا سجے سجائے کمرے میں بیٹھا رہے؟''

''مجھے احساس ہے جناب! میں راجا صاحب تک آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔ ممکن ہے آج رات آپ کی شکایت دور ہو جائے۔''

سیکرٹری اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ تہ خانے کا ایک چکر لگا لوں۔ فتح خان اور

شینا کے بارے میں معلوم کروں گا کس حال میں تھے۔ تہ خانے میں بھی جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ دروازے پر موجود محافظ نے مجھے اندر جانے دیا تھا۔ فتح خان بدستور ٹکٹکی پر بندھا تھا اور اس کے دم خم میں کمی نظر آ رہی تھی۔ البتہ شینا وہاں نہیں تھی۔ جلاّ دکا کردار ادا کرنے والا شخص ایک طرف بیٹھا سستا رہا تھا۔ فتح خان کی شلوار جا بجا خون کے چھینٹوں سے سرخ تھی اور یہ چھینٹے پشت کی جانب زیادہ تھے۔ محافظ اردو نہیں جانتا تھا یا کم سے کم اس نے ظاہر یہی کیا تھا۔ میں فتح خان کے نزدیک گیا۔

''فتح خان، میرے ایک سوال کا جواب دو گے؟''

''پوچھو۔'' اس نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ام آدمی کو مارنے سے پہلے اس کے تمام سوالات کا جوابات دیتا اے۔ ام تم کو بتا کر مارے گا۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''تم میں ذرا بھی عقل ہوتی تو تم میرے بجائے اس عورت کو قتل کرتے جو بیک وقت تمہیں اور اپنے شوہر دونوں کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ بہر حال میں نے یہ پوچھنا ہے کہ انگریز اور اس کی لڑکی کب نکلے تھے؟''

''ام کو نئیں مالوم...... جب ام اوش میں آیا تو وہ جا چکا تھا۔ ام بندا پڑا تھا۔''

''تمہیں معلوم ہے، اب وہ کہاں ہیں؟''

وہ مسکرایا۔ ''اگر ام کو پتا اوتا تو ام راجا صیب کو بتا کر اپنا چمڑی نہ بچاتا۔ ام کو نئیں مالوم وہ کدر گیا اے۔ وہ بوت چالاک لوگ اے۔''

''تم کو پتا ہے وہ راجا صاحب کی تصویر اور پتھر کیوں چرانا چاہتے تھے؟''

اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''ام نے اس کے لئے کام کیا۔''

''اور اب سزا بھگتو گے؟'' میں نے طنز کیا۔

وہ مسکرایا۔ ''ام اکیلے نئیں بھگتے گا، تم بھی سزا پائے گا۔''

''بکواس مت کر۔ میں نے کیا، کیا ہے؟''

''جب ام راجا صیب اور جرگے کو بتائے گا کہ گورا صیب اور اس کا لڑکی سے ملنے تو م بی آتا تو تم کو بھی سزا ملے گا۔''

''کوئی تمہاری بات کا یقین نئیں کرے گا۔''

''کیوں نئیں کرے گا۔ اس کا لڑکی نے تو مارا جان بچایا۔ کیوں بچایا......؟ تو مارا چاچا کا لڑکی اے جو جان بچایا، امارے سر پر ڈنڈا مارا۔''

مجھے محسوس ہوا کہ وہ درست کہہ رہا تھا۔ یہ سوال سب کے ذہن میں آئے گا کہ ایمن نے مجھے فتح خان کے ہاتھوں مرنے سے کیوں بچایا۔ میں خود راجا عمر دراز کو بتا چکا تھا کہ ایک سفید فام لڑکی نے مجھے فتح خان کے ہاتھوں مرنے سے بچایا تھا۔ جب کہ میں اسے جانتا بھی نہیں تھا اور زندگی میں پہلی بار اس سے ملا تھا۔ میں نے سر جھٹکا، جب یہ سوال سامنے آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ مجھے فتح خان سے بات کر کے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ برٹ شا اور ایمن کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ کل سے اب تک وہ یقیناً اس علاقے سے دور جا چکے ہوں گے۔

میں نے جلاّد کی طرف دیکھا اور فتح خان سے بولا۔ ''کیا تمہیں خوف نہیں ہے کہ یہ تمہاری باتیں راجا صاحب کو بتا دے گا۔''

''یہ صرف اور کی زبان جانتا اے۔ اردو نئیں جانتا۔'' فتح خان بولا۔

''ممکن ہے، یہ تمہاری خوش فہمی ہو۔'' میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔

شبنا اسی تہ خانے میں کہیں تھی، میں نے اس کمرے کے دروازے کے اوپر بنی جالی سے اندر جھانکا، جہاں میں قید رہا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ وہاں شبنا تھی اور زمین پر پڑے بستر پر دراز تھی۔ اس کے ساتھ بلاشبہ زیادتی ہوئی تھی اور محض چودہ پندرہ سال کی عمر میں وہ اپنے سے تین گنا بڑے اور معذور شخص کی بیوی بنا دی گئی تھی جو شاید اس کی فطری خواہشات کی تسکین بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ بے راہ رو ہو گئی۔ اس نے فتح خان سے ناجائز تعلق قائم کر لیا اور مجھ پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس سنگین سزا کے بارے میں، میں سن چکا تھا جو اسے اور فتح خان کو ناجائز تعلقات قائم کرنے کے جرم میں دی جاتی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی دروازے کی جالی سے اسے دیکھ رہا ہے، وہ لپک کر پاس آئی تھی۔

''توم......!'' وہ خوشی سے بولی۔ ''توم کو امارا خیال آیا، تم ام کو چوری چوری دیک رہا اے۔''

''میں نے ایسے ہی اندر دیکھ لیا تھا۔'' میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

''اندر آ جاؤ......ام کو پاس سے دیکھو۔'' اس نے بے باکی سے دعوت دی۔ ''ام کو معلوم اے......ام کو مار دیا جائے گا۔ اگر تم ایک بار امارے پاس آ جاؤ تو ام خوشی سے مر جائے گا۔''

''تم پاگل ہو۔ موت کے سامنے کھڑے ہو کر ایسی باتیں کر رہی ہو؟''

''ام پاگل اے۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''دو سال سے ام ایک بڈھے کا خدمت کرتا۔ اس کا گو موت صاف کرتا اے......اور ام خود ایسے ای اے......ام عورت اے......ام کو مرد چاہئے۔''

''میں تمہیں سمجھانے آیا ہوں۔ فتح خان سے تعلق سے انکار کر دو۔ اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ۔ سارا الزام فتح ان پر ڈال دینا۔''

اس کی آنکھیں غصے سے دہک اٹھی تھیں۔ ''ام جوٹ نئیں بولے گا۔ ام فتح خان کا عورت اے۔ ام اس سے موبت کرتا اے۔ ام انکار نئیں کرے گا۔''

میں دنگ رہ گیا تھا۔ اس وقت مجھے عورتوں کا تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا لیکن بعد میں جب دنیا دیکھی تب بھی اتنی متضاد فطرت والی عورت میری نظر سے نہیں گزری۔ کہاں تو وہ میری قربت کے لئے مری جا رہی تھی اور کہاں فتح خان سے محبت کا یہ عالم کہ موت کا خوف بھی اسے فتح خان کی محبت سے انکار پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

''معاف کرنا، میرا خیال تھا تم اپنی زندگی سے محبت کرتی ہو۔''

''ام فتح خان سے محبت کرتا اے۔ اس پر ایسی ہزار جان قربان۔''

میں دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اس اثنا میں سامنے سے باہر والا محافظ اندر آیا۔ اس نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''ادھر کیا کر رہا تھا؟''

''کچھ نہیں۔ باہر جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور اس کے پاس سے ہو کر باہر کی طرف جانے لگا۔ محافظ نے

اپنا اطمینان کرنے کے لئے دروازے کی جالی سے شینا کی طرف دیکھا اور جب میں دروازے سے باہر نکل کر سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا تو وہ بدستور جالی سے اندر جھانک رہا تھا۔ میں مسکرا دیا۔ راجا عمر دراز کے محافظ بھی انسان تھے البتہ راجا کے خوف سے انہوں نے شینا کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا تھا جو عام طور سے قیدی عورتوں کے ساتھ طاقت اور اختیارات کے نشے میں بدمست محافظ کرتے ہیں۔

باہر شام اتر رہی تھی اور آسمان پر بادلوں کے سبب ابھی سے اندھیرا چھا گیا تھا۔ لگتا تھا کسی وقت بھی زوردار بارش شروع ہو سکتی تھی۔ اِدھر اُدھر پھرنے کے باوجود مجھے نہ تو راجا اور نہ ہی اس کا سیکرٹری نظر آئے تھے۔ وہ دونوں نہ جانے کہاں غائب تھے۔ راجا کے بارے میں مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ میرا سامنا کرنے کے بجائے اس نے اپنے خاص کمرے تک محدود رہنا پسند کیا۔ کیونکہ وہ مجھے زبردستی روکنے والا تاثر نہیں دینا چاہتا تھا، یہ کام اس نے اپنے سیکرٹری سے لیا تھا۔ میں بور ہوتا رہا اور محل کی راہداریوں میں چکر لگاتا رہا۔ دو بار میں نے قہوہ بنوا کر پیا اور ایک عدد قیمے کا رول کھایا۔ تصویروں والی گیلری سے وہ تخیلاتی تصویر غائب تھی اور نوادرات والا کمرا مقفل تھا۔ اس کے مضبوط دروازے پر موٹا سا چمکیلا تالا لگا تھا۔ رات کا کھانا میں نے اکیلے کھایا۔ ڈائننگ ہال کی کھڑکیوں سے رہ رہ کر چمکنے والی بجلی باغ کے ماحول کو منور کر رہی تھی اور اس دوران میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ کھانے کے بعد میں نے کمرے میں جا کر سونے کا ارادہ کیا لیکن نہ جانے کیوں ایک بار پھر میں نے تہ خانے کا رخ کیا تھا۔ تہ خانے کے دروازے پر تعینات محافظ اپنی جگہ سے غائب تھا۔ میں مسکرایا، وہ یقیناً شینا کے کمرے میں تاک جھانک کر رہا تھا۔ میں نے راہداری میں جھانکا۔ مگر وہ شینا کے کمرے کے دروازے کے سامنے نہیں تھا۔ اس کے بجائے مجھے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ میں بے ساختہ آگے آیا تو کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا پا کر چونکا تھا۔ دروازہ کیوں کھلا تھا؟ میں نے خاموشی اور احتیاط سے اندر جھانکا۔ شینا اپنے بستر پر کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔ اس کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا اور شینا کسی صورت اسے اندر سے نہیں کھول سکتی تھی۔ یہ کام دروازے والا محافظ ہی کر سکتا تھا لیکن وہ کہاں تھا؟ میں نے دروازہ کھولا۔ باقی کمرا خالی تھا۔ محافظ کہاں تھا اور شینا اتنی بے فکری سے کیوں سو رہی تھی، کیا اسے دروازہ کھلنے کا علم نہیں تھا؟ میں بنا آہٹ کئے اس کے سرہانے تک آیا اور آہستہ سے کمبل اس کے سر سے سرکایا لیکن اندر سے جو سر برآمد ہوا وہ شینا کا ہرگز نہیں تھا۔ شینا کے سر پر سرخی مائل سنہری بال تھے اور یہ سیاہ اور چھوٹے مردانہ بال تھے۔ میں نے ایک جھٹکے سے کمبل اس پر سے پورا ہٹا دیا۔ کمبل تلے دروازے کا محافظ ساکت پڑا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا تو اس کے سینے پر خون پھیلا نظر آیا اور یہ خون ایک سوراخ سے نکل کر مزید پھیل رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔

محافظ کی کھلی آنکھیں بے نور تھیں لیکن زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ میں نے چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ حالانکہ کمرے بلکہ راہداری میں بھی کوئی نہیں تھا۔ پہرے دار کی رائفل غائب تھی۔ مجھے یاد تھا کہ اس پر سنگین لگی تھی اور شاید یہی سنگین اس کے سینے میں اتاری گئی تھی۔ کس نے اتاری تھی، یہ سمجھنا بھی دشوار نہیں تھا۔ یہ یقیناً شینا کا کام تھا، اس نے کسی طریقے سے پہرے دار کو اندر بلا لیا تھا۔ وہ بے باک فطرت رکھتی تھی اس کے لئے کوئی بھی حربہ استعمال کرنا ممکن تھا۔ ممکن ہے اس نے خود کو بے باک انداز میں پہرے دار کو دکھایا ہو اور وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاتے ہوئے اندر چلا گیا ہو۔ موقع پا کر شینا نے اس

کی سنگین اس کے پہول میں اتار دی ہو۔

میں کمرے سے نکلا۔ پہلے میں نے اوپر جا کر شور مچانے کا سوچا لیکن پھر اندر کی طرف بڑھ گیا حالانکہ یہ حماقت تھی۔ میں نے اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اگر شینا نے محافظ کو مارا تھا تو وہ نہ صرف مسلح تھی بلکہ اس پر خون بھی سوار تھا۔ دوسرے وہ قید فتح خان کی طرف گئی تھی۔ اگر اس نے فتح خان کو بھی آزاد کرا لیا تو یہ سونے پر سہاگے والی بات ہو جاتی۔ وہ بھی میرا کم دشمن نہیں تھا۔ حسبِ توقع تفتیشی کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میرے اندر سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ اگر ایک احمقانہ سی مہم جوئی نے مجھے اسیر نہ کر رکھا ہوتا تو میں پلٹ کر اوپر کی جانب دوڑ لگا چکا ہوتا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے تفتیشی کمرے میں جھانکا۔ فتح خان جس جگہ بندھا تھا اسے خالی دیکھ کر مجھے دھچکا لگا تھا۔ شینا اپنا کام کر گئی تھی لیکن نہیں، مجھے ایک کرسی کے پیچھے سنہری مائل بالوں کی جھلک نظر آئی تھی۔ میں اندر آیا تو ایک کونے میں جلاد کو خونچکاں حالت میں دیوار کے ساتھ ڈھیر پایا۔ اس کے جسم پر کئی سوراخ تھے جن سے خون ابل رہا تھا۔ نہ جانے اسے سنگین ماری گئی تھی یا گولیاں کیونکہ میں نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی تھی۔ میرا اندیشہ درست نکلا۔ وہ شینا ہی تھی جو تڑی مڑی گڑیا کی طرح زمین پر پڑی تھی۔ اس کی گردن عجیب سے زاویے پر زیادہ ہی گھوم گئی تھی۔ عام طور سے گردن اتنا نہیں گھومتی ہے۔ وہ بھی مر چکی تھی۔ اگر جلاد کو شینا یا فتح خان نے مارا تھا تو شینا کو کس نے مارا تھا، فتح خان نے...... وہی ایک فرد تھا اس تہ خانے میں جس کی لاش نظر نہیں آئی تھی۔ معاً مجھے اپنے عقب سے کھٹکے کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے پر فتح خان کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل اور چہرے پر وحشیانہ قسم کے تاثرات تھے۔

☆======☆======☆

مین روڈ پر آنے کے بعد میں نے سیدھا چلنے کے بجائے گلیوں میں گھسنا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔ ایک تو سڑک پر بے پناہ رش تھا۔ میں پھنس جاتا، دوسرے سگنل تھے۔ ایک ریڈ سگنل مجھے پکڑوا دیتا۔ ندیم کا اندیشہ اتنی جلدی حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آ جائے گا، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مختلف گلیوں میں گھسنا اور تیز رفتاری سے ڈرائیو کرنا آسان نہیں تھا لیکن یہاں میں موبائل وین کو چکر دے سکتا تھا۔ ذرا آگے ایک پارک تھا اس کے گرد گھوم کر جاتا تو ایک راستہ پیر بدھائی کی طرف نکلتا تھا۔ لیکن پولیس وین کا ڈرائیور بھی کم ماہر نہیں تھا۔ اس نے اپنی گھٹارا سی وین کامیابی سے میرے پیچھے لگا رکھی تھی۔ اگرچہ گلیوں میں جلدی جلدی مڑنے کی وجہ سے درمیانی فاصلہ بڑھ رہا تھا۔ ہونڈا کارنئی اور طاقتور انجن سے لیس تھی۔ اس کے ریڈیل ٹائر سڑک اور زمین کو اچھی طرح گرپ کر رہے تھے۔ میں رفتار زیادہ کم کئے بغیر موڑ کاٹ رہا تھا جبکہ پولیس وین کو رفتار خاصی سُست کرنی پڑتی تھی۔ اس ترکیب سے میں وین سے فاصلہ اس حد تک بڑھا رہا تھا کہ ایک بار نظروں سے اوجھل ہو کر پیر بدھائی والے راستے کی طرف نکل جاؤں۔ دو تین بار برق رفتاری سے مختلف گلیوں کے چکر کاٹنے کے بعد عقبی آئینے میں پولیس وین غائب ہو گئی تھی۔ موقع غنیمت جان کر میں نے پارک کا چکر لگایا اور اس کے عقبی راستے سے پیر بدھائی کی طرف روانہ ہو گیا جو اس پورے علاقے میں روڈ ٹرانسپورٹ کا مرکز تھا۔ راستے میں، میں نے کہیں بھی ایکسی لریٹر سے پاؤں نہیں ہٹایا تھا اور جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ پولیس وین اب میرے پیچھے نہیں ہے تو میں ندیم کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ مری ہائی وے کے نزدیک ایک اسکیم میں رہتا تھا۔ اس نے ذاتی بنگلا لے

لیا تھا اور اسے شاندار پیمانے پر آراستہ کیا تھا۔ ملازمت اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بس شوقیہ کرتا تھا۔ پیچھے سے دولت مند خاندان سے تھا۔ اس کے بڑے بھائی کرنل عمیر شایان سے میری اچھی سلام دعا تھی وہ شجاع بھائی کے دوست بھی تھے۔ انہوں نے کاکول میں تقریباً ایک ہی وقت میں کورس کیا تھا۔

اس وقت سفیر دفتر میں ہوتا لیکن اس نے چوبیس گھنٹے کے لئے ایک ملازم رکھا تھا۔ جو نہ صرف کھانا بناتا تھا بلکہ گھر کے سارے کام کرتا تھا۔ سفیر اسے اپنے گاؤں سے لایا تھا۔ نام اس کا معصوم تھا اور صورت شکل سے بھی خاصا معصوم لگتا تھا۔ اس نے کال بیل کے جواب میں گیٹ کھولا تو میں کار اندر ہی لے گیا تھا۔ معصوم مجھے بے وقت دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ ''شوبی صاحب، آپ اس وقت......صاحب تو......''

''اسے گولی مارو اور مجھے اندر لے چلو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے وہ اپنے سرکاری بل میں گھسا ہوگا اور ہاں، کھانے کو کچھ نکالو۔ اگر اگلے پندرہ منٹ میں مجھے کچھ کھانے کو نہ ملا تو میری وفات کی ذمے داری تم پر ہو گی۔''

عقلمند معصوم نے پھر کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اندر آ کر میں صوفے پر گر گیا تھا۔ معصوم نے پہلے ٹھنڈا پانی پیش کیا اور چکن سینڈوچز کی نوید سنائی جو سینڈوچ میکر میں بن رہے تھے۔ پانی پی کر میں نے اس سے فون طلب کیا۔ ''کارڈلیس لا دو مجھے۔''

میں نے سب سے پہلے ندیم سے رابطہ کیا تھا، وہ گھر پہنچ چکا تھا۔ ''تو کہاں ہے مفرور؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''تیرے گھر کے نزدیک ہی ہوں، سفیر کے ہاں۔''

''وہیں رہنا...... میں تیری جیپ ٹھکانے لگا کر آ رہا ہوں۔'' اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں نے گالی دے کر دوبارہ نمبر ملایا۔

''اُلو کے پٹھے، دوسروں کی تو سن لیا کر۔ تیرے جاتے ہی وہ تیرے ہم پیشہ آ گئے تھے۔ پولیس وین میں، اکرم چشتی بہ نفس نفیس موجود تھا۔ ان سے چھٹکارا پانے کے لئے مجھے تیری کار بڑی بے دردی سے استعمال کرنا پڑی۔''

''کیا......؟'' وہ چلایا۔ ''تُو نے کہیں ماری تو نہیں؟''

''نہیں، ماری تو نہیں...... باقی دوڑائی خوب تھی۔''

''پھر خیر ہے، پولیس والوں نے یقیناً نمبر دیکھ لیا ہوگا۔ خیر، اب میں فوراً آ رہا ہوں، جیپ تیرے پاس چھوڑ کر کار لے جاؤں گا۔''

دوسرا نمبر میں نے سفیر کا ملایا۔ وہ دفتر میں ہی تھا۔ اسے صبح سے اب تک پیش آنے والے واقعات کی سمری سنا کر اسے فوری طور پر گھر آنے کو کہا۔

''ابھی نہیں آ سکتا۔'' وہ بولا۔ ''دس منٹ بعد میٹنگ ہے، میں ڈیڑھ گھنٹے بعد آؤں گا۔''

''تیری مرضی...... بھلے کل آ۔'' میں نے نمبر کاٹ کر اگلی کال مونا کو کی، وہ بھی دفتر میں تھی۔

''شوبی! کیا چکر ہے، میں نے تمہارے دفتر فون کیا تھا۔ وہ بتا رہے ہیں کہ تمہیں پولیس لے گئی تھی؟''

''ہاں اور اب میں باضابطہ مفرور ہوں۔ مجھ سے سفیر کے ہاں مل سکتی ہو۔''

''میں آ رہی ہوں۔'' مونا بولی۔

''ہاں آ جاؤ، سب مل کر ایک متفقہ بات طے کر سکیں گے تا کہ بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ میں ندیم کو بھی بلوا لوں گا۔'' میں نے کہا اور معصوم کو ٹرے لاتے دیکھ کر مونا کو خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ معصوم کے ہاتھ میں ذائقہ تھا جو چیز بناتا لاجواب بناتا تھا۔ ٹرے خالی ہوتے ہوتے پیٹ بھر گیا تھا لیکن نیت نہیں بھری تھی، ابھی میں معصوم کو مزید سینڈوچز کا آرڈر دینے کا سوچ رہا تھا کہ ندیم نازل ہو گیا۔ وہ بے حد عجلت میں تھا۔ ''چابی دے۔ مجھے فوراً جانا ہے۔ یہ اکرم چشتی ایک نمبر کا حرامی ہے۔ جیسے ہی اسے پتا چلے گا کہ کار میری ہے، وہ سیدھا میرے گھر کا رخ کرے گا۔ ابھی مجھے کار دھونی بھی ہے تُو نے اچھی طرح گندی کی ہے۔''

میں نے اسے چابی دی۔ ''میری پیاری جیپ کہاں ہے، تم نے اسے سلیقے سے استعمال کیا ہے؟''

''پیاری جیپ!'' ندیم نے قہقہہ مارا تھا۔ ''اس جیپ کے لئے لفظ پیاری ایسا ہی ہے جیسے کوئی گینڈے کو ہرن کہہ دے۔ اس ہاتھی کا کسی نے کیا بگاڑنا ہے اور ایک بات تُو بھول رہا ہے۔ جیپ سلیقے، طریقے سے استعمال کے لئے ایجاد نہیں ہوئی ہے اسے اندر کر لے...... ایسا نہ ہو کسی پولیس والے کی بدنظر پڑ جائے اور تجھ سے اگلی ملاقات حوالات میں ہو۔''

''وکیل ہے ناں...... غلطی سے بھی اچھی بات نہیں کرے گا۔'' میں نے اس کے ساتھ باہر جاتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی کار لی اور روانہ ہو گیا۔ میں نے جیپ اندر کی اور معصوم سے کہا کہ اس کا کور نکال کر اسے ڈھک دے، کہیں ندیم کی یہ بات بھی درست ثابت ہو اور کوئی پولیس والا سچ مچ جھانک جائے۔ منہ ہاتھ دھو کر میں نے پیروں پر رسّی سے پڑنے والی خراشوں پر مرہم لگایا اور نشست گاہ میں آ کر ٹی وی آن کر لیا۔ ریموٹ سے چینل گھمانے لگا۔ میرے اندر ایک اضطرابی کیفیت جاری تھی اور مجھے سفیر اور مونا کا انتظار تھا، پہلے مونا آئی۔ اس کی کار کا منفرد ہارن سن کر میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ وہ اپنی دلہن جیسی لال رنگ کی کار سے اتر رہی تھی۔ معصوم نے جا کر دروازہ کھولا اور وہ اس کی کسی بات پر ہنستی ہوئی اندر آئی۔ معصوم کے دانت بھی نکلے ہوئے تھے۔ میں نے دل میں کہا۔ ''بچے، خوب مسکرا لے...... یہی جب مالکن بن کر آئے گی تو ساری بتیسی اندر چلی جائے گی۔''

''شکر ہے، تم یہاں ہو۔'' مونا نے مسکرا کر کہا۔ ''ورنہ لگ رہا تھا جیل میں ملاقات ہو گی۔''

''ہوئے دوست تم جس کے...... دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

وہ ہنسی۔ ''ایک بار پولیس اسٹیشن کیا گئے شاعری کرنے لگے۔''

''پھر عرض کیا ہے، میں شاعر تو نہیں، مگر اے حسیں، جب سے دیکھا ہے تھانے کو، مجھ کو شاعری آ گئی۔''

''خدا خیر کرے...... کہیں ڈرائنگ روم سے تو نہیں ہو آئے؟''

''تقریباً......'' میں نے اعتراف کیا۔ ''جب مجھے ہوش آیا تو میں الٹا لٹکا تھا اور مرچوں کی دھونی کی تیاری کی جا رہی تھی۔ ندیم بروقت آیا تھا۔''

''جناب، بے ہوش کیسے ہوئے تھے؟''

مونا کے سوال پر میں نے ملاحظے کے لئے سر پیش کیا۔ ''یہ جو گومڑ آپ کو نظر آ رہا ہے، یہ پیدائشی نہیں ہے

بلکہ اس خبیث انسپکٹر کی دست درازی کا نتیجہ ہے جو میرا دشمن ہو رہا ہے۔ اس سے بچ کر اور ایک خطرناک کار چیزنگ کے بعد میں صحیح سالم یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہوں۔"

"کار کس کی تھی؟"

"ندیم کی...... ورنہ جیپ میں تو پکڑا جاتا۔ چھوٹی گلیوں میں چکر دینا پڑا تھا۔"

"لیکن باہر تو جیپ کھڑی ہے۔" مونا نے اعتراض کیا۔

"ندیم دے گیا ہے، اسے اپنی نئی نویلی کار کی فکر تھی۔"

مونا کچھ دیر چپ رہی پھر متفکر لہجے میں بولی۔ "شوبی مجھے پریشانی ہے۔ یہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ جس کے پیچھے پڑ جائیں اسے تباہ کر کے دم لیتے ہیں۔"

"وہ تو ہے لیکن یار، میں نے جان بوجھ کر تو ان سے پنگا نہیں لیا ہے۔"

"پولیس کے ذریعے اس حد تک جا کر غیر قانونی کارروائی کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ تمہارے لئے کتنے شدید جذبات رکھتے ہیں۔ شوبی میرا مشورہ ہے کچھ عرصے کے لئے سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

"اور اپنے بزنس کا بیڑا غرق کر لوں؟"

"بزنس زندگی سے زیادہ ضروری نہیں ہوتا ہے، اس دوران میں ندیم تم پر سے حادثے والا الزام ختم کرا دے گا ایک بار قانونی چکر ختم ہو تو پھر ان سے بات کی جا سکتی ہے۔"

"وہ بات سننے والے لوگ نہیں ہیں۔"

"یہ تو ہے لیکن الیکشن قریب ہیں اور اس دوران میں وہ اپنے خلاف کوئی اسکینڈل کھڑا کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

میں نے صوفے پر گر کر سر تھام لیا تھا۔ "میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ کل رات سے ایک بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں جو ختم ہی نہیں ہو رہا ہے۔"

مونا میرے پاس آ گئی۔ "فکر نہ کرو...... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ کسی بھی مشکل میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے تم جیسے اچھے دوست دیئے ہیں ورنہ میرے......" میں بولتے بولتے رک گیا تھا۔ خاندان والوں سے میں برسوں سے لاتعلق تھا۔ انہیں میرے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی اور نہ میں دوبارہ حویلی گیا تھا۔ اب مونا، سفیر اور ندیم ہی میرا خاندان تھے، میرے ہر دکھ سکھ میں یہی شریک ہوتے تھے۔ ندیم کی بیوی شازیہ بہت اچھی عورت تھی، ہم سب سے بڑی بہن کی طرح پیش آتی تھی۔ وہ مونا اور سفیر کے پیچھے پڑی رہتی تھی کہ اب وہ شادی کر لیں اور ضد کا بچگانہ کھیل بند کریں، وہ اسے ٹالتے رہا کرتے تھے۔ کھانے کے بعد خمار سا طاری ہو رہا تھا۔ رات کی نیند بھی پوری نہیں ہوئی تھی پھر صبح سے جن اعصاب شکن تجربات سے گزرا تھا، مجھے خود بخود نیند آ گئی۔ صوفے پر ہی سو گیا تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب مونا نے میرے جوتے اتار کر مجھے صوفے پر سیدھا کر دیا تھا۔ آنکھ کھلی تو تاریکی چھا چکی تھی۔ ڈرائنگ روم کی روشنیاں بند تھیں لیکن ڈائننگ روم سے روشنی آ رہی تھی اور ساتھ ہی سفیر اور مونا کے بات کرنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ میں نے انگڑائی لی اور معصوم کو آواز

دی۔

''کیابات ہے؟'' مونا چلی آئی تھی۔ ''معصوم بازار گیا ہے۔''

''میرے اندر ایک کپ چائے ڈالوتا کہ میں کام کا آدمی بن سکوں۔''

''چائے بن رہی ہے، تم منہ ہاتھ دھو کر آجاؤ۔''

سفیر نے آ کر روشنیاں جلائیں۔ ''یہ دیکھو، یہ مفرور یہاں چھپا ہے۔''

''اگر پولیس نے مجھے یہاں سے برآمد کرلیا تو، تو بھی اعانتِ مجرمانہ میں اندر ہوگا۔''

''مونا مجھے بتا چکی ہے لیکن میں ایک بار پھر تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔'' سفیر بولا۔

''ایک منٹ میں چائے لے کر آ رہی ہوں۔'' مونا کچن سے چلائی۔ ''اس وقت تک بولنا مت۔''

سفیر نے دانت نکالے۔ ''جذبہ دیکھو، حالانکہ سب تم سے سن چکی ہے۔''

مونا چائے لے کر آئی تو میں نے صبح سے اپنی کہانی کا آغاز کیا، جب اکرم چشتی کا زردے منحوس نظر آیا تھا، درمیان میں صرف مونا کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے رکا تھا جسے بات بات پر اعتراض ہوتا تھا کہ یہ بات تو میں نے بتائی نہیں تھی۔ میں نے بھنا کر کہا تھا۔ ''اب تم نے کچھ کہا تو میں سفیر کو لے کر چھت پر چلا جاؤں گا۔''

''میں وہاں پر بھی آجاؤں گی۔'' مونا بولی۔ ''اور احتجاج کرنا میرا حق ہے۔ تم نے آدھی باتیں بتائی ہی نہیں تھیں۔ کیا میں سفیر سے کم سمجھ ہوں۔ اگر یہ سترہ گریڈ کا ہے تو میں بھی اسی درجے کی افسر ہوں۔''

''خدا کے لئے...... اپنی افسری دفتر کے لئے اٹھا کر رکھو۔'' میں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔ ایسا نہ ہو کہ ندیم آئے تو مجھے پھر سے سنانی پڑے۔''

''وہ تو سنانی پڑے گی۔'' ندیم نے اندر داخل ہوتے ہوئے اعلان کیا۔ ''اور ان لوگوں کو سنانے سے فائدہ...... یہ کیا کر سکتے ہیں۔'' اس نے حقارت سے مونا اور سفیر کی طرف دیکھا۔ ''کسی کیس میں اندر ہو جائیں تو ضمانت بھی نہیں کرا سکتے۔''

''ندیم بھائی!'' مونا نے پُرزور احتجاج کیا۔ ''اب ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں۔''

''مجھے پتا ہے بی بی! ذرا کچن سے ایک کپ میرے لئے بھی لانا۔''

مونا خراب موڈ کے ساتھ واک آؤٹ کر گئی اور مجھے نئے سرے سے شروع کرنا پڑا۔ مونا چائے بنا کر لائی تو ماحول ذرا چہکا لیکن جلد معمول پر آگیا۔ میری داستان ختم ہوتے ہوتے وہ سب بے حد سنجیدہ ہوگئے تھے۔

''یار! تیرا مسئلہ خطرناک ہے۔'' ندیم نے کہا۔ ''اکرم چشتی تو سامنے کا بندہ ہے۔ اصل میں ایک ایس ایس پی ان لوگوں کی حمایت کر رہا ہے۔ الیکشن میں کامیابی کی صورت میں اسے ڈی آئی جی بنانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر تُو ان کے ہاتھ آگیا تو تجھ پر مزید کیس بن سکتے ہیں۔''

''ضمانت قبل از گرفتاری ہو سکتی ہے؟''

''مشکل ہے...... اس کے لئے تجھے عدالت تک جانا پڑے گا اور پولیس تیری تاک میں ہوگی۔ عدالت میں جانے سے پہلے تجھے دبوچ لے گی۔ تجھے کچھ عرصے کے لئے منظرِ عام سے غائب ہو جانا چاہئے۔''

''میں بھی یہی کہہ رہی تھی۔''

''میں اپنا بزنس......''

''اوہ، میرے چندا! بزنس بھی چلتا رہے گا۔'' ندیم نے پچکار کر کہا۔ ''ہم دیکھ بھال کر لیں گے۔ تیرا پولیس کی گرفت سے باہر رہنا ضروری ہے۔ تیری تلاش پوری سرگرمی سے جاری ہے۔''

''پولیس آئی تیرے گھر؟'' میں نے پوچھا۔

''آیا تو تھا وہ خبیث اکرم چشتی......اس وقت میں اپنی کار دھو رہا تھا۔ اس نے آتے ہی پہلا سوال کیا کہ میں کار کیوں دھو رہا ہوں؟ جواب میں، میں نے جو کہا وہ مونا بی بی کے سامنے نہیں کہہ سکتا کبھی بعد میں بتاؤں گا بہرحال وہ میرے سر ہو گیا کہ شہباز احمد نامی مجرم میری کار میں فرار ہوا تھا، میں نے کار کے چاروں دروازے اور ڈگی کھول دی کہ اس میں کہیں شہباز احمد ہے تو اسے برآمد کر لے۔ جب اس نے زیادہ بحث کی تو میں نے کہہ دیا ہم قانونی آدمی ہیں اور وہ کوئی وارنٹ لایا ہے تو پیش کرے ورنہ اپنی راہ لے۔''

''تجھے بھی دھمکا رہا تھا؟'' سفیر بولا۔

ندیم نے قہقہہ مارا ''پیارے، اپن کچی گولیاں نہیں کھیلے......اس نے ڈرایا تھا لیکن ہم نے بھی عدالتوں میں جھک نہیں ماری ہے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ جا کر میرے خلاف ایف آئی آر درج کرا دے۔ بلاثبوت بات کی تو عدالت میں کھینچ لوں گا۔''

''مجھے نہیں لگتا وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑے گا۔''

''اصل میں اسے اوپر سے ڈنڈا ہے، معذرت کے ساتھ۔'' ندیم نے مونا کی طرف دیکھا۔ ''وہ پوری کوشش کرے گا۔ شہباز، تو یہاں بھی محفوظ نہیں ہے۔ ایک زمانہ جانتا ہے تم دونوں دوست ہو۔ سفیر کا پتا تلاش کرنے میں اسے چند گھنٹے لگیں گے۔''

''تب یار......! میں کہاں جاؤں؟ اور تو کوئی جاننے والا نہیں ہے اور ہوٹل میں بھی نہیں ٹھہر سکتا پولیس وہاں بھی چیک کرے گی۔''

''کچھ فاصلے پر مری سے پہلے ایک کاٹیج ہے۔ مری ہائی وے سے ذرا اندر پڑتا ہے۔ میں نے چند مہینے پہلے تیری بھابی کے نام سے لیا تھا۔ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا، تو وہاں روپوش رہ سکتا ہے مگر وہاں بجلی، گیس نہیں ہے۔ پانی بھی چشمے سے لانا پڑتا ہے۔ سمجھ لے بالکل جنگلی کیبن ہے۔''

''وہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں وہاں کب تک روپوش رہوں گا؟''

''جب تک میں تیرے خلاف الزام ختم نہیں کرا دیتا۔'' ندیم نے جواب دیا۔ ''اس معاملے کو آسان نہ سمجھ۔ اگر مدعی بااثر ہو تو معمولی سا کیس بھی انسان کے گلے پڑ جاتا ہے۔ میں نے ایک گیراج والے سے بات کی ہے، تیری جیپ اس کے ریکارڈ میں ایک ہفتے تک زیرمرمت رہی ہے اور کل ہی تجھے ملی ہے۔ ساری رسیدیں بنوالے گا۔ جی دار آدمی ہے، پولیس کا مقابلہ بھی کر لے گا۔''

''تب ہمیں فوری طور پر روانہ ہو جانا چاہئے۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ پولیس سفیر کے گھر تک آئے اور یہ بھی چکر میں پڑ جائے اور ہاں، میں نے اکرم چشتی کے سامنے انکار کیا تھا کہ تم

دونوں یا کوئی بھی میرے ساتھ تھا لہٰذا خیال رکھنا اور سفیر، مونا کا خیال رکھنا۔ وہ حرام زادہ نادر علی اس کے بارے میں عزائم رکھتا ہے۔''

''ہم بھی چل رہے ہیں۔'' مونا بولی۔

''نہیں، تم ندیم کے ساتھ اس کے گھر جاؤ۔ سفیر یہاں رہے گا۔ یہ غائب ہوا تو اس پر بلاوجہ شک کیا جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''میں اپنی جیپ میں چلتا ہوں۔''

''پہلے ہم تجھے کیبن تک چھوڑیں گے۔'' ندیم نے کہا۔ ''ضروریات کا کچھ سامان بھی لینا ہے۔''

''مجھے ایک ساری رات کھلے رہنے والے اسٹور کا پتا ہے۔'' مونا بولی۔

''بی بی! مجھے بھی پتا ہے۔'' ندیم نے کہا۔ ''شہباز اپنی جیپ لے کر نکل، سات آٹھ کلومیٹر بعد دائیں طرف ایک سڑک اوپر کی طرف نکل رہی ہوگی، یہ راستہ آگے جا کر پھر ہائی وے سے مل جاتا ہے، اس کے ساتھ نیلے رنگ کا بورڈ ہوگا۔ اس سڑک پر ایک کلومیٹر اندر جا کر رک جانا، ہم پیچھے سے سامان لے کر آ رہے ہیں۔''

خطرے کے احساس کی وجہ سے ہم تیزی سے حرکت میں آئے تھے۔ اگر کیس معمول کے مطابق ہوتا تو شاید میں خود گرفتاری دے دیتا۔ میں نے ہمیشہ قانون کا احترام کیا تھا لیکن یہاں تو قانون کے رکھوالے مجرموں کے ساتھ مل کر میری ہڈیاں توڑنے کے درپے تھے۔ اگر میں گرفتاری دے دیتا تو میرے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا جاتا۔ اس کا ایک نمونہ دیکھتے دیکھتے رہ گیا تھا۔

رات دس بجے کے قریب ہم نکلے تھے، کھانا کسی نے بھی نہیں کھایا تھا۔ ندیم نے بتایا کہ کیبن میں خاصا سامان تھا اور انتہائی ضرورت کی چند اشیاء کے ساتھ صرف کھانے پینے کا سامان لے کر جانا تھا۔ میں جیپ مناسب رفتار سے چلاتا مطلوبہ مقام کی طرف روانہ ہوگیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر ندیم نے مجھے کاغذ پر نقشہ بھی بنا کر دے دیا تھا تاکہ میں راستہ نہ بھٹکوں۔ میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے حالات پر غور کرتا رہا۔ اچانک میرا سیل فون بجا۔ میں اسلام آباد کی حدود میں تھا اس لئے سگنل آ رہے تھے۔ جیپ ایک طرف روک کر میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ایک بھاری اور اجنبی آواز سنائی دی۔

''تم شہباز احمد ہو؟''

''ہاں......اور تم کون ہو؟''

''میرا نام مرشد علی عباسی ہے، میں......''

''میں جان گیا، تم میرے پیچھے پڑ گئے ہو بلاوجہ۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر تلخی سے کہا تھا۔

''بلاوجہ نہیں......تم نے میرے بھائی کی جیپ کو ٹکر ماری تھی، اس حادثے میں وہ مر بھی سکتا تھا۔''

''اگر تمہارے پاس آنکھ اور عقل ہے تو اس کی جیپ کا معائنہ کرلو۔ اس پر پیچھے کی جانب ایک خراش بھی نہیں ہوگی۔ تمہارا بھائی الٹا میری جیپ کو پیچھے سے ٹکر مار کر سڑک سے گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو میں مارا جاتا۔''

''اگر یہ بات ہے تو تم قانون سے بھاگ کیوں رہے ہو؟ خود کو قانون کے حوالے کر دو۔''

''میں قانون سے نہیں، تمہارے زرخرید کتوں سے بھاگ رہا ہوں جو مجھے تشدد کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔''

میں نے غصے سے کہا تھا۔

''شہباز احمد! تم بھاگ نہیں سکتے۔'' مرشد علی نے رعونت سے کہا۔''تم کاروباری آدمی ہو، اپنا کاروبار چھوڑ کر کہاں جاؤ گے۔ ایسا کرو، ایک بار مجھ سے ملاقات کرو۔ میں نادر کو تمہارے سامنے بٹھا کر تصفیہ کرا دیتا ہوں۔ اس طرح بھاگنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔''

''میں تمہاری اس آفر پر غور کروں گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ بلکہ موبائل آف کر دیا۔ مرشد علی سے گفتگو میں خاصا وقت ضائع ہوا تھا، دوسرا خدشہ مجھے یہ تھا کہ کہیں پولیس اس کال کی مدد سے مجھے ٹریس نہ کر لے۔ میں فوری طور پر روانہ ہو گیا اور اس بار میں نے خاصی تیز رفتاری سے جیپ چلائی۔ پونے گیارہ بجے میں مطلوبہ موڑ تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے کاغذی نقشے سے موازنہ کیا۔ اگرچہ تاریکی میں درست طور پر نظر نہیں آ رہا تھا پھر بھی مجھے یہی موڑ لگا جو ندیم کے کیبن تک جاتا تھا۔ موڑ کے ساتھ نیلے رنگ کا اشارے والا بورڈ بھی لگا تھا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے جیپ اسی راستے پر موڑ دی۔ سڑک خاصی ڈھلوان تھی اور مزید بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ میری جیپ کے ڈیش بورڈ میں ایک آلٹی میٹر بھی لگا تھا۔ اس وقت میں پانچ ہزار دو سو فٹ کی بلندی پر تھا لیکن ایک کلومیٹر دور جاتے جاتے میں پونے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر آ گیا تھا۔ احتیاطاً میں نے جیپ ایک کلومیٹر سے پہلے روک دی تھی۔ یہاں مجھے ندیم کا انتظار کرنا تھا۔ شاپنگ کر کے اسے اور مونا کو آدھا پون گھنٹے میں پہنچ جانا چاہئے تھا۔

یہ سڑک خاصی تنگ تھی۔ اس کے ایک طرف بلندی کی طرف جاتی ڈھلان تھی اور دوسری طرف نشیب کو جاتی ڈھلان۔ انہیں پہاڑ یا کھائی نہیں کہہ سکتے تھے۔ دونوں طرف چیڑ کے بلند و بالا درخت تھے۔ ان کے پھل پک کر جھڑ رہے تھے۔ مجھے فکر تھی کہ سامنے سے کوئی بڑی گاڑی نہ آ جائے۔ اس صورت میں مجھے وہاں تک جیپ پیچھے لے جانی پڑتی جہاں تک اتنی کشادہ سڑک نہیں آ جاتی، جس سے دونوں گاڑیاں برابر سے گزر سکیں۔ رات خنک تھی اور اس بلندی پر اچھی خاصی سردی ہو رہی تھی لیکن میں انتظار سے تنگ آ کر جیپ سے اتر آیا اور سڑک پر ٹہلنے لگا۔ مگر جلد مجھے اوس کی وجہ سے دوبارہ جیپ کے اندر جانا پڑا۔ اس جگہ سے اسلام آباد کی روشنیاں جھلک رہی تھیں۔

اچانک مجھے بے چینی سی ہونے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ کہیں سے چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ اردگرد تاریکی تھی اور اگر کوئی مجھے درختوں میں چھپ کر دیکھ بھی رہا تھا تو میرے لئے ناممکن تھا کہ میں اسے دیکھ لیتا۔ اچانک ہی کوئی سایہ سا تیزی سے سڑک سے گزرا۔ وہ بلندی سے نشیب والی سمت گیا تھا۔ میں کوشش کے باوجود اس کے بارے میں اندازہ نہیں لگا سکا۔ وہ انسان بھی ہو سکتا تھا اور کوئی جانور بھی۔ اس علاقے میں گیدڑ، لومڑی اور بندر عام ملتے تھے۔ کبھی کبھی بھیڑیے اور ریچھ بھی اس طرف آ نکلتے تھے۔ اگر یہ جانور تھا، ریچھ کے علاوہ تو میں جیپ میں ہی محفوظ تھا۔ لہٰذا میں نے جیپ سے نیچے اترنے کی کوشش نہیں کی، میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ندیم سے کوئی ہتھیار، کوئی پستول، مہیا کرنے کے لئے کہوں گا۔ میرے پاس پستول اور رائفل کا لائسنس تھا لیکن میں نے کبھی اسلحہ نہیں لیا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ پونے بارہ بج چکے تھے اور ندیم اب تک نہیں آیا تھا۔ میں نے سیل فون نکالا لیکن اس کے سگنل نہیں تھے۔ ویسے بھی یہ جگہ

آبادی سے خاصے فاصلے پر تھی۔ ناچار صبر کر کے بیٹھ گیا۔ کوئی بارہ بجے کے قریب نیچے سے روشنی لہرائی تھی۔ کوئی گاڑی اس سڑک کی طرف گھومی تھی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ کر کے عقبی روشنیاں جلالی تھیں۔ چند منٹ بعد ندیم کی کار میرے عقب میں آ کر رکی۔ میں پہلے ہی اتر چکا تھا۔

''بہت جلدی آ گئے؟'' میں نے بھنا کر کہا تھا۔ ''انتظار کرتے کرتے میرا حشر ہو گیا۔''

''صبر میرے چاند، صبر...... دیر کی وجہ بھی ہے۔ سامان اکٹھا کرتے کرتے وقت ہو گیا تھا، آ کر میرے ساتھ سامان نکلوا۔''

''دوبارہ سامان نکالنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ہی بار لے جائیں گے۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''ایک تو کیبن یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ دوسرے میری کار کیبن تک نہیں جا سکتی۔ اس کے لئے جیپ چاہئے۔ میں خود جب بیوی بچوں کے ساتھ پکنک منانے آتا ہوں تو اپنے سالے کی جیپ لے کر آتا ہوں۔''

''مونا کہاں ہے؟'' میں نے کار کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

''میں یہاں ہوں۔'' مونا نے کار کے اندر سے کہا۔ ''یہاں تو بہت سردی ہے۔ ہمیں ایک کمبل بھی لانا چاہئے تھا۔''

''کیبن میں کمبل بھی ہے اور آتش دان بھی، جلانے کے لئے لکڑیاں آس پاس سے بہت مل جائیں گی۔'' ندیم نے ایک بڑا سا شاپر کار کی ڈگی سے نکالا۔ میں نے جیپ کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

''کیا سارے مہینے کا راشن لے آئے ہو؟'' میں نے کہا۔

''نہیں، ضرورت کا سامان ہے۔''

چند منٹ میں کار سے شاپرز جیپ کے عقبی حصے میں منتقل کر دیئے گئے۔ سردی سے کانپتی مونا بھی عقبی نشست میں گھس گئی تھی۔ ''اب کہاں چلنا؟'' میں نے جیپ اسٹارٹ کی۔

''ذرا آگے بلندی پر ہے کیبن۔ ہم تجھے وہاں چھوڑ کر پیدل واپس آ جائیں گے۔''

''ہم نہیں صرف آپ۔'' پیچھے سے مونا بولی۔ ''میں اتنی سردی اور اندھیرے میں نہیں آ سکتی۔ آپ نیچے آ کر کار لے آیئے گا۔''

''بی بی! اتنے نخرے تو میں نے کبھی بیوی کے بھی نہیں سہے۔'' ندیم نے ہنس کر کہا۔ ''جیپ ادھر موڑ لے۔''

''ادھر کہاں، ان جھاڑیوں میں......؟'' میں نے خفگی سے کہا۔

''جھاڑیاں بڑھ گئی ہیں ورنہ یہ راستہ ہی ہے۔ کئی بار کیبن کے حرام خور رکھوالے سے کہہ چکا ہوں۔ اب لگتا ہے، پہلے مجھے اس کی طبیعت صاف کرنا پڑے گی۔ تب کہیں جا کر وہ جھاڑیاں صاف کرے گا۔''

ندیم کے اکسانے پر میں نے بادل ناخواستہ جیپ ان جھاڑیوں میں گھسا دی۔ ان کی شاخیں ونڈ اسکرین اور جیپ کی سائیڈوں سے ٹکرا کر عجیب سی آواز پیدا کر رہی تھیں۔ ندیم ہنسا۔ ''اس وجہ سے میں اپنی نازک اندام کار اس طرف نہیں لایا۔''

''میری جیپ بھی میری کم چہیتی نہیں ہے۔ یہ جھاڑیاں میں کل ہی صاف کردوں گا۔ کلہاڑی ہے کوئی؟''

''کیوں نہیں ہے، کئی طرح کی کلہاڑیاں مل جائیں گی۔''

خدا خدا کر کے ہم جھاڑیوں سے نکلے، اب سامنے ایک چھوٹا سا ہموار میدان تھا، جس پر سوکھے پتے بچھے تھے اور اس کے بعد درختوں کی چھاؤں تلے لکڑی سے بنا کیبن تھا۔ باہر سے یہ خاصا کھردرا اور بھدا لگتا تھا۔

''شوبی یہاں رہے گا؟'' مونا نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ تو بھوت بنگلا لگ رہا ہے۔''

''شوبی کو یہیں رہنا ہے۔'' ندیم فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''اگر یہ حوالات اور اس کے بعد ہڈی وارڈ میں نہیں رہنا چاہتا۔''

میں نے جیپ لے جا کر کیبن کے سامنے روک دی لیکن انجن بند نہیں کیا تا کہ روشنی برقرار رہے۔ ندیم نیچے اترا، اس نے کیبن کا تالا کھولا اور اندر جا کر روشنی کی۔ میں نے انجن بند کیا، گلوز کمپارٹمنٹ سے ٹارچ نکال لی اور مونا سے کہا۔ ''تم نیچے آؤ گی؟''

''جی نہیں، میں یہیں بھلی ہوں۔'' مونا نے صاف انکار کر دیا۔

''مرضی تمہاری۔ ویسے یہاں پر بھیڑیے اور ریچھ بھی پائے جاتے ہیں۔'' میں نے کہا تو مونا نہ صرف پھرتی سے نیچے اتر آئی بلکہ مجھ سے پہلے کیبن میں بھی پہنچ گئی۔ میں نے شاپرز نکالے اور باری باری کیبن میں پہنچا دیئے۔ ندیم جگہ جگہ لیمپ جلا رہا تھا۔ کیبن اندر سے خاصا بہتر اور صاف ستھرا تھا۔ گرد مٹی یہاں ویسے ہی نہیں ہوتی ہے۔ ایک رکھوالا آ کر ہفتے میں ایک بار صفائی بھی کر جاتا تھا۔ کیبن کا رقبہ بیس ضرب تیس فٹ تھا۔ عقب میں دو بیڈ رومز تھے۔ داخلی کمرا نشست گاہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ اس کے دائیں جانب کچن اور چھوٹا ڈائننگ ایریا تھا۔ دونوں بیڈ رومز کے ساتھ اٹیچ باتھ تھے۔ ندیم جب پکنک پر آتا تھا، اپنے ساتھ ڈیزل سے چلنے والا سکشن پمپ لاتا تھا۔ اس سکشن پمپ سے ذرا فاصلے پر موجود چشمے سے پانی کیبن کی ٹنکی میں بھر جاتا تھا۔ میں نے کچن کے سنک کا نلکا کھولا۔ اوپر سے صاف اور بے بو پانی آ رہا تھا۔ ندیم بولا۔ ''بے فکر رہ۔ دس دن پہلے میں آیا تھا تو جانے سے پہلے ٹنکی فل کر گیا تھا۔ بار بار پمپ لانا بھی عذاب ہے۔ بیس سیر سے کم نہیں ہے۔''

''یہاں بجلی نہیں ہے؟'' مونا نے پوچھا۔

''نزدیک ترین ٹرانسمیشن لائن کوئی دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور اس سے بجلی لینے میں اتنا خرچ آ رہا ہے کہ اس سے سستا مجھے کیبن ٹرانسمیشن لائن کے قریب لے جانا پڑے گا۔'' ندیم نے بتایا۔ ''ویسے میرا ارادہ ہے کہ اس کیبن کو درست کراؤں گا تب ڈیزل جنریٹر لے آؤں گا۔ بجلی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ باورچی خانے کے لئے بڑا والا ایل پی جی سلنڈر ہے۔ چار پانچ مہینے آرام سے گزارہ ہو جاتا ہے۔ آؤ، میں تمہیں بیڈ رومز دکھاؤں۔''

باقی کیبن کے مقابلے میں بیڈ رومز واقعی پُر آسائش تھے۔ ندیم نے اچھا فرنیچر ڈلوایا تھا۔ فرش پر دبیز اور آرام دہ قالین تھا۔ دونوں بیڈ رومز میں آتش دان تھا۔ اس موسم میں آتش دان جلانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن نومبر، دسمبر میں یقیناً یہاں آتش دان کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا ہوگا۔ مونا پوچھ رہی تھی۔ ''یہاں برف گرتی ہے؟''

''میں نے دیکھی نہیں ہے لیکن رکھوالا بتا رہا تھا کہ دسمبر کے وسط سے لے کر آخر جنوری تک برف باری

ہوتی ہے۔''

''ونڈرفل! تب تو میں سردیوں میں یہاں ضرور آؤں گی۔'' مونا نے پُرجوش لہجے میں کہا تھا۔

''بی بی! بہتر ہوگا آپ جا کر کھانے پینے کا سامان نکالیں۔ ہم سب بھوکے ہیں۔'' .

ندیم نے ایک ریستوران سے بچا کھچا مال پیک کروایا تھا۔ اس میں سیخ کباب اور شیر مال کے ساتھ فرنی بھی تھی۔ اسی چکر میں انہیں دیر ہوئی تھی۔ باقی سامان میں انڈے، ڈبل روٹی، مکھن، پنیر، ٹیٹرا پیک دودھ، چائے، کافی، شکر اور ٹن پیک کھانے تھے۔ وہ لوگ کافی کچھ اٹھا لائے تھے۔ مونا چولھا جلا کر سیخ کباب گرم کرنے لگی۔ ہم نے کچن میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ رات کا ایک بج رہا تھا اور ندیم نے اپنی بیوی کو نہیں بتایا تھا۔ اس لئے اسے واپس جانے کی جلدی تھی۔ کھانا کھاتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے مونا سے کہا۔ ''چلو بی بی! دیر ہو رہی ہے۔''

''میں پیدل نہیں جا سکتی۔'' اس نے انکار کیا۔

''تب شہباز کے ساتھ یہیں رہو۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں کہتا روانہ ہو گیا۔

مونا بے ساختہ اس کے پیچھے لپکی۔ ''ارے ندیم بھائی، رکیں۔''

''چلو، میں جیپ پر چھوڑ آتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

میں نے ان دونوں کو جیپ پر نیچے کھڑی کار تک پہنچایا۔ ندیم نے مجھے کیبن کے تالوں کی چابیاں دیں۔

''دل گھبرائے تو ذرا گھوم پھر لینا۔ یہاں دور تک کوئی آبادی نہیں ہے مگر زیادہ دور مت جانا۔''

''تم چار بچوں کے باپ ہو مگر میرے باپ مت بنو اور ہاں، کل مجھے آ کر تازہ رپورٹ دینا۔''

''کل میں نہیں آؤں گا، پرسوں آؤں گا۔ ایک بار پھر کہہ رہا ہوں، بے صبری مت دکھانا...... ورنہ کوئی مسئلہ بن سکتا ہے۔ مجھے قانونی طور پر اسے سلجھانے دو۔''

ان کے جانے کے بعد میں جیپ لے کر کیبن واپس آ گیا۔ اس ویرانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا پھر بھی میں نے جیپ کو احتیاطاً کیبن کے عقبی حصے میں کھڑا کیا تھا۔ اندر آ کر میں نے ساری کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیئے تھے۔ کھڑکیوں پر لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ سامنے اور عقبی حصے والے دروازے بھی ٹھوس اور مضبوط لکڑی کے بنے تھے یعنی کسی کے لئے کیبن میں گھسنا آسان نہیں تھا۔ میں نے تمام لیمپ بجھا کر صرف اس بیڈروم والا لیمپ جلتے رہنے دیا جس کو میں نے سونے کے لئے منتخب کیا تھا۔ ندیم سامان میں ٹارچ، اس کے سیل اور موم بتیوں کے پیکٹ بھی لایا تھا۔ میں نے ٹارچ چیک کر کے اسے بھی سرہانے رکھ لیا تھا۔ بستر صاف ستھرا اور آرام دہ تھا۔ ندیم نے ایک ہلکا سا کمبل نکال کر رکھ دیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے مونا کی نظر بچا کر مجھے کیبن کے ایک خفیہ خانے میں چھپے پستول اور کارتوسوں کے بارے میں بتایا تھا۔ میں بستر پر لیٹا تو مجھے اس کے بارے میں یاد آیا۔ پہلے میں نے فیصلہ کیا کہ پستول صبح نکالوں گا مگر کچھ دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد میں نے اٹھ کر پستول نکالنا مناسب سمجھا۔ ٹارچ لے کر میں نے بیڈروم کے کونے میں سے قالین ہٹایا، نیچے فرش بھی تختوں کا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں بغور دیکھنے پر الگ سے رکھا کوئی دس بائی دس انچ کا تختہ نظر آ گیا، میں نے کچن سے چھری لا کر اس کی نوک سے تختہ اوپر کیا۔ اندر چھوٹے سے خانے میں سیلون کے ایئر ٹائٹ تھیلوں میں پستول اور اس کے سوکے

قریب فاضل کارتوس تھے۔

یہ چینی ساختہ ایم نائن پستول تھا۔ اس کا نشانہ اور کوالٹی اصل کے برابر ہی ہوتی ہے۔ پستول نہ صرف صاف ستھرا تھا بلکہ پوری طرح لوڈ بھی تھا۔ البتہ اس کا سیفٹی کیچ لگا تھا۔ میں نے فاضل گولیاں واپس خانے میں رکھ دیں۔ صرف پستول نکالا تھا۔ تختہ رکھ کر قالین برابر کیا اور واپس آ کر لیٹ گیا۔ پستول میں نے تکیے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ اس بیڈروم میں دو طرف کھڑکیاں تھیں۔ ایک دائیں طرف کھلتی تھی، یہ بڑی کھڑکی تھی۔ بستر کا سرہانہ اس کے نیچے تھا۔ دوسری باتھ روم کے دروازے کے ساتھ کیبن کے عقبی حصے میں تھی۔ میں نے اس کا پردہ برابر نہیں کیا تھا۔ یہ جنگل کا عقبی حصہ تھا اور کیبن کے ساتھ ایک ڈھلان سیدھی اوپر جا رہی تھی، اس طرف بے حد گھنے درخت تھے۔ جنھوں نے کیبن کو ایک طرح گھیر لیا تھا۔ لہٰذا اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی بھی کیبن کے عقبی حصے میں بالکل نزدیک آئے۔ کیروسین لیمپ کی روشنی دیکھ سکے جو کھڑکی کے باہر محدود جگہ تک جا رہی تھی۔

مجھے ہلکی سی سردی لگ رہی تھی اس لئے میں نے کمبل پیٹ تک کھینچ لیا۔ مجھے ذہنی اور جسمانی تھکن ضرور محسوس ہو رہی تھی لیکن سفیر کے گھر میں دیر تک سونے کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں کروٹ بدل کر عقبی کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اچانک ایک سایہ سا کھڑکی کے سامنے سے گزرا۔ مجھے کسی کا شانہ اور جھکا ہوا سر نظر آیا تھا۔ میں بے اختیار اٹھ بیٹھا تھا۔ کیبن کے باہر کوئی تھا اور کھڑکی سے میرا معائنہ کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے تکیے کے نیچے سے پستول نکالا اور اتر کر کھڑکی تک آیا۔ میں نے ٹارچ بھی اٹھالی تھی۔ اسے روشن کر کے باہر دیکھا مگر کوئی نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں اس سائے کو اپنا وہم سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے اسے واضح طور پر دیکھا تھا۔ اب وہ اس جگہ نظر نہیں آ رہا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ یہاں سے چلا گیا تھا۔ وہ کیبن کے دائیں بائیں کسی طرف بھی ہو سکتا تھا اور اس کے عزائم درست نہیں تھے۔ اس طرح چھپنا ظاہر کرتا تھا کہ وہ میرے بارے میں غلط عزائم رکھتا تھا یا چوری کرنے کی نیت رکھتا تھا۔ کیبن کا عقبی دروازہ دوسرے بیڈروم میں تھا۔ میں نے ٹارچ بجھائی اور دبے قدموں دوسرے بیڈروم میں آیا، چند منٹ تک خاموشی سے باہر کی سن گن لیتا رہا۔ باہر ہوا چل رہی تھی، کبھی ایسی آواز آتی جیسے کوئی پتوں پر چل رہا ہے اور کبھی خاموشی چھا جاتی تھی۔

میں نے اچانک دروازہ کھول کر ٹارچ روشن کی تو کوئی شے درختوں میں غائب ہوتی نظر آئی۔ اس بار میں نے دیکھ لیا۔ اس کے جسم پر بھورے بال تھے۔ وہ بہرحال انسان نہیں تھا۔ کوئی انسان اتنا تیز رفتار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ریچھ بھی نہیں تھا۔ ممکن ہے بھیڑیا یا لومڑی ہو۔ میں نے دروازہ بند کیا اور اندر آ کر لیٹ کر سو گیا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو صبح کی روشنی پھیل رہی تھی۔ سات بجے تھے۔ میں واش روم تک گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں کیبن سے باہر نکل آیا تھا۔ صبح کی ہوا خنک، تازہ اور نباتات کی خوشبو سے بھرپور تھی۔ چند گہرے سانس لے کر میں تازہ دم ہو گیا تھا۔ نصف گھنٹے تک کیبن کے آس پاس چہل قدمی کرتا رہا۔ حتیٰ کہ روشنی پوری طرح پھیل گئی تھی۔ اندر جانے سے پہلے میں نے ایک نظر جیپ پر ڈالنا مناسب سمجھا تھا اور جیپ کے بونٹ پر وہ سو رہا تھا، جو کل رات مجھے پریشان کرتا رہا تھا۔ یہ سرخی مائل بھورے رنگ کا درمیانی قد و قامت کا بندر تھا۔ اس کے گلے میں سیاہ رنگ کا پٹا تھا۔ یعنی وہ پالتو بندر تھا۔ اس وجہ سے کیبن کے آس پاس منڈلا رہا تھا کہ انسانوں سے مانوس تھا۔ میں نے اندر جا کر ایک ڈبل روٹی نکالی اور لا کر بونٹ پر بندر کے پاس رکھ دی۔ وہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ اسے پتا ہی نہیں

چلا تھا۔

اپنے لئے انڈے تل کر میں نے ڈبل روٹی سینکی اور چائے کا پانی رکھ کر ناشتا کرنے لگا۔ جب تک ناشتے سے فارغ ہوا، چائے تیار ہو چکی تھی۔ کپ میں بغیر دودھ کی چائے ہلکی سی شکر کے ساتھ ڈال کر میں باہر آ گیا۔ بندر بونٹ پر بیٹھا ڈبل روٹی کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا ضرور ہوا لیکن بھاگا نہیں، میں وہیں ایک پتھر پر ٹک کر چائے پینے لگا۔ پکنک کے لحاظ سے یہ جگہ مثالی تھی۔ ایک طرف بلند ہوتا پہاڑ تھا جس پر گھنا جنگل تھا۔ سامنے دور تک نشیب تھا۔ یہاں بھی جنگل تھا لیکن زیادہ گھنا نہیں تھا۔ کیبن کے سامنے ہموار زمین تھی۔ ندیم نے مجھے چشمے کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ کیبن کے دائیں جانب کوئی سوفٹ کے فاصلے پر نشیب میں تھا۔ پانی کے حصول کے لئے ندیم نے زمین میں پلاسٹک کا پائپ بچھا کر اسے چشمے تک پہنچا دیا تھا۔ اس پائپ کا دوسرا سرا کیبن کی ٹنکی تک جاتا تھا۔ جب پانی بھرنا ہوتا تھا تو ڈیزل پمپ کا ایک سرا پانی میں ڈال کر دوسرا پلاسٹک کے پائپ سے جوڑ دیا جاتا تھا۔

''دوست، اگر اور بھوک لگی ہے تو کل رات کے بچے شیر مال بھی ہیں؟'' میں نے بندر سے کہا، وہ توجہ دیئے بغیر اپنا سر کھجاتا رہا۔ میرا اندازہ تھا کہ ڈبل روٹی کے چار سلائس اس کا پیٹ بھرنے کے لئے ناکافی تھے۔ اس لئے میں نے رات کے بچے شیر مال بھی اسے لا دیئے۔ وہ چند لمحے تو میرے بڑھے ہاتھ کو محتاط نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے جھپٹ کر شیر مال لے لیا اور جیپ کی چھت پر چڑھ گیا۔ میں ہنسا۔ ''برخوردار! کل رات تم نے مجھے بہت تنگ کیا تھا، بہر حال خوش رہو۔''

ندیم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ آج نہیں آئے گا۔ یعنی مجھے پورا دن اکیلے رہنا تھا۔ بوریت سے بچنے کے لئے میں نے کام شروع کر دیا۔ ناشتے کے برتن دھوئے، پھر سامان ترتیب سے رکھا۔ کیبن کی صفائی کی۔ میرے پاس مزید کپڑے نہیں تھے لیکن الماری میں ندیم کے دو تین پاجامے اور قمیصیں لٹکی تھیں۔ میں نے کپڑے بدلے، صابن اور کپڑے لے کر چشمے کی طرف چل پڑا۔ چشمہ خاصا نشیب میں تھا۔ شاید یہ برساتی نالا تھا جس میں کوئی قدرتی چشمہ پھوٹ کر گرنے لگا تھا اس لئے اس میں ہمہ وقت پانی رہا کرتا تھا۔ میں نے پہلے کپڑے دھوئے، اس کے بعد خود نہانے لگا۔ جب نہا رہا تھا تو اچانک بندر کے خوخیانے کی آواز آئی۔ وہ بدمعاش منہ پر ہاتھ رکھے شیم شیم کا انداز اختیار کئے ہوئے تھا۔ میں نے اس کی طرف پانی اچھالا تو وہ بھاگ گیا۔ نہا کر میں واپس آیا۔ کپڑے سوکھنے کے لئے کیبن کے سامنے گھاس پر پھیلا دیئے۔ اس اثنا میں بھوک لگنے لگی تھی اس لئے تلے ہوئے مٹروں اور سارڈن مچھلی کے ٹن پیک کھول کر انہیں گرم کیا اور کسی نہ کسی طرح حلق سے اتار لیا۔ بعض اوقات ہائیکنگ یا ٹریکنگ کے لئے جاتے ہوئے سفر کے دوران میں ٹن بند خوراک پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ مجھے اس کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا تھا لیکن مجبوری تھی، مچھلی یا گوشت جیسی چیز صرف ٹن پیک دستیاب ہوتی ہے۔

کھانا کھا کر سو گیا تھا۔ آنکھ کھلی تو شام اتر رہی تھی۔ میں ایک کپ کافی بنا کر باہر آیا تو بندر ڈھلتی دھوپ میں کیبن کے سامنے درخت کے ایک کٹے تنے پر سو رہا تھا اور میرے کپڑے غائب ہو گئے تھے۔ میرے منہ سے بے اختیار ناگفتنی نکل گئی تھی۔ مجھے پہلے ہی اس بات کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔ بندر سے اس قسم کی حرکت کی توقع رکھنی چاہئے۔ میں نے پتھر مار کر اسے جگایا۔ وہ ڈر کر بھاگا نہیں بلکہ کاہلی سے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ''اوئے بدمعاش

...رے کپڑے کہاں ہیں؟"

بدمعاش سر کھجاتا رہا۔ تھک ہار کر میں نے خود کپڑوں کی تلاش شروع کی جو مجھے جیپ کے بونٹ پر نہایت سلیقے سے پھیلے مل گئے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کپڑے ہلکے سے نم ہونے کے باوجود اندر لے آیا۔ میں نے کیبن کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا اور جب کپڑے رکھ کر آیا تو بندر نشست گاہ کے صوفے پر براجمان تھا۔

"اوئے...... تم ادھر بھی آ گئے، نکلو یہاں سے۔" میں نے کہا تو وہ دانت نکال کر خوخیانے لگا مگر انداز جارحانہ نہیں بلکہ درخواست گزارانہ تھا۔

"دیکھو برخوردار! میں خود یہاں مہمان ہوں اور مہمان کسی اور کو مہمان ٹھہرا نہیں سکتا۔ اس لئے بہتر ہوگا تم جاؤ۔ اپنے مالک کے پاس جاؤ۔"

وہ پاؤں پسارے میری بات غور سے سن رہا تھا یا شاید اونگھ رہا تھا۔ مجھے اس کے انداز پر غصہ آ گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے صوفے سے جست لگائی اور ریک کے اوپر چڑھ گیا۔ جب اس کے وزن سے جھول کر ریک گرنے لگا تو وہ چھلانگ لگا کر چھت سے لٹکے فانوس سے چمٹ گیا جس میں شمعیں جلائی جاتی تھیں۔ فانوس جھولنے لگا۔ ریک پر کئی طرح کے شوپیس رکھے تھے، جو ریک کے فرش پر گرنے سے بکھر گئے۔ میں نے جلدی سے ریک سیدھا کیا۔ شکر ہے قالین کی وجہ سے کچھ ٹوٹا پھوٹا نہیں تھا۔ سامان رکھ کر میں بندر کی طرف متوجہ ہوا۔ "مردود، نیچے اتر آ...... ورنہ تیری......"

مگر وہ اترنے کے موڈ میں نہیں تھا بلکہ فانوس پر جھولتے ہوئے اسے مزے آنے لگے تھے۔ میں اندر جا کر وائپر لے آیا۔ وائپر دیکھتے ہی اس نے چیخ ماری اور فانوس سے کود کر کیبن سے فرار ہو گیا۔ میں نے فوراً دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ سورج غروب ہوتے ہی ہوا میں خنکی آ گئی تھی۔ میں نے لیمپ روشن کئے۔ نشست گاہ میں ایک طرف رسالے رکھے تھے۔ وقت گزاری کے لئے میں ایک رسالے کو لے کر بیٹھ گیا۔ گزشتہ کئی برسوں سے مصروفیات بڑھنے کے سبب مطالعہ کم ہو گیا تھا۔ وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ رسالوں کی وجہ سے میرا وقت اچھا گزر گیا۔ نیشنل جیوگرافک کے ایک مضمون میں ایسا کھویا کہ مجھے کھانے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ مضمون ہمالیہ کی مختلف ٹریکنگ سائٹس کے بارے میں تھا اور یہ میری پسند کا موضوع تھا۔

ہمالیہ کا سلسلہ افغانستان اور قازقستان کی سرحد سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا ایک سلسلہ ہندوکش ہے اور جنوب مشرق میں یہ بھوٹان تک چلا جاتا ہے۔ تقریباً تین ہزار میل لمبے ہمالیہ میں بے شمار بلند اور دشوار گزار چوٹیاں ہیں۔ ہمالیہ کا بیشتر حصہ بھارت کے ساتھ لگتا ہے لیکن اس کی جتنی ٹریکنگ سائٹس اور خوبصورت چوٹیاں پاکستان میں ہیں اتنی کہیں اور نہیں ہیں۔ دنیا کی دوسری بڑی چوٹی کے ٹو اور دنیا کی دشوار ترین چوٹی نانگا پربت پاکستان میں ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقے بلاشبہ کوہ پیماؤں کی جنت ہیں اور ہر سال سیکڑوں ٹیمیں ان چوٹیوں کو سر کرنے پاکستان آتی ہیں اور صرف دیکھنے کے لئے آنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ اگر حکومت توجہ دے تو محض شمالی علاقے کی سیاحت سے کروڑوں ڈالرز کما سکتی ہے۔ مگر محکمہ سیاحت کے افسران کو بیرون ملک کی سیاحت سے فرصت ملے تو وہ اپنے ملک میں سیاحت کے فروغ کے لیے کچھ کریں۔

بھوک لگی تو میں نے بادلِ ناخواستہ اٹھ کر ایک ڈبل روٹی نکالی۔ انڈے ابالے اور پنیر ایگ سینڈوچ

بنائے۔ اکیلے رہنے کی وجہ سے ایسی خاصی چیزیں بنانا آ گئی تھیں۔ سینڈوچز بنا کر پیٹ پوجا کی۔ پھر کافی بنائی۔ رات بارہ بجے میں سونے کے لئے لیٹ گیا تھا۔ خاصی دیر بعد جا کر نیند آئی اور اسی طرح صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی۔ کسل مندی ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر مختصر سا غسل کیا۔ سرد پانی نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ناشتے کا موڈ نہیں تھا۔ اس لئے دو سلائس چائے لے کر باہر آ گیا۔ بندر اپنے اڈے یعنی جیپ کے بونٹ پر بیٹھا تھا۔ کل سے اب تک ایک جیسے منظر دیکھ کر اور ایک جیسا وقت گزار کر میں بری طرح بور ہو چکا تھا اس لئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج ندیم مغرب تک نہیں آیا تو میں خود اس کے گھر پہنچ جاؤں گا۔ وقت گزاری کے لئے سارا دن اردگرد کے جنگلات میں پھرتا رہا۔ دوپہر میں کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کیا تھا۔

جیسے جیسے دن ڈھل رہا تھا، میری جھنجلاہٹ اور بے زاری میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کیبن کو تالا لگایا اور جیپ میں بیٹھا تو اس نے اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔ خاصی دیر کوشش کرتا رہا پھر ٹارچ کی روشنی میں انجن کا معائنہ کیا خاصی دیر بعد جا کر خرابی کا سراغ ملا، ایک پوائنٹ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اسے ٹائٹ کر کے جیپ کو اسٹارٹ کیا تو انجن سیلف لگاتے ہی غرانے لگا تھا۔ اس چکر میں ایک گھنٹا گزر گیا تھا۔ اس اثنا میں موسم اچانک ہی بدل گیا تھا۔ آسمان پر گھرے سیاہ بادل جمع ہو رہے تھے اور لگتا تھا بارش ہو گی۔ اوپر سے مری ہائی وے تک آتے آتے بارش کا آغاز ہو گیا تھا اور چند منٹ کے اندر اتنی تیز بارش ہونے لگی کہ جیپ کی اضافی روشنیاں جلانے کے باوجود دس گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے رفتار سست کر دی اور بے حد محتاط انداز میں ڈرائیونگ کرنے لگا۔

سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ظاہر ہے اس موسم میں کون پُر خطر پہاڑی راستوں کی طرف جانا پسند کرتا۔ بڑی گاڑیوں والے خاص طور سے پرہیز کرتے ہیں۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ خاصی دیر تک رینگنے کی رفتار سے ڈرائیونگ کرنے کے بعد اسلام آباد نزدیک آنے پر میں نے رفتار ذرا تیز کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور جیسے ہی میں نے رفتار بڑھائی، وہ شخص سامنے آ گیا۔ وہ اتنا اچانک سامنے آیا تھا کہ بریک لگانے کا وقت نہیں رہا تھا پھر بھی میں نے بریک لگائی اور ساتھ ہی اسٹیئرنگ گھمایا۔ اس کے باوجود جیپ کا بایاں پہلو اس سے ٹکرایا۔ میں نے اسے اچھل کر تاریکی میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔ فضا میں ایک ہلکی سی چیخ گونجی تھی جو بریکوں کے شور میں دب گئی۔ مجھے پتا نہیں تھا، اس جگہ ایک مختصر سی پلیا تھی۔ سڑک ایک نالے پر سے گزر رہی تھی۔ جیپ نے پلیا کی ریلنگ کو ٹکر ماری۔ اسے توڑ کر جیپ کا دایاں اگلا پہیا خلا میں گیا۔ دھچکے سے میں دروازے سے ٹکرایا اور وہ کھل گیا۔ اگلے ہی لمحے مَیں نالے میں گر رہا تھا۔

☆======☆======☆

میں ساکت ہو گیا تھا۔ فتح خان کے چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ اس کے رائفل اٹھانے کے انداز سے لگا جیسے وہ مجھے ابھی شوٹ کر دے گا مگر جب اس نے گولی نہیں چلائی تو میں نے ہمت کر کے کہا۔ ”فتح خان...... اسے تم نے مارا ہے؟“

”اس نے سر ہلایا۔“ ”ام نے مارا...... اس نے ام سے بے وفائی کیا تھا ام کو دوکا دیا۔“

”اس نے تمہیں آزاد کرایا اور تم نے اسے مار دیا؟“

یکا یک فتح خان تھکا ہوا نظر آنے لگا وہ اندر آ گیا۔ ''ام نے مار دیا۔ اس نے آزادی کے واسطے اکرم کو اپنا جسم دیا۔ ام سے دوکا کیا۔''

''لیکن اس نے اکرم کو مار دیا تھا۔''

''اس نے ام سے دوکا کیا۔ جب اس نے بتایا تو ام نے اسے مار دیا۔'' فتح خان ہانپنے لگا۔ ''اس نے صرف اکرم کو ای نہیں...... اسے بھی مارا۔'' فتح خان نے بلاول کی طرف اشارہ کیا۔ ''ام کو آزاد کرایا پر ام نے اسے مار دیا۔ یہ تو عزت کا بات اے...... ام اسے کیسے چوڑتا۔'' وہ جیسے خود سے بات کر رہا تھا۔ واضح طور پر اسے شینا کی موت کا شدید صدمہ تھا وہ رفتہ رفتہ اپنے حواس کھو رہا تھا اور اس کیفیت میں وہ مجھے بھی مار سکتا تھا۔ میں غیر محسوس انداز میں دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔ فتح خان تنومند اور طاقتور شخص تھا۔ میں اسے خالی ہاتھ سے کبھی زیر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ رائفل سے بھی مسلح تھا۔ اچانک وہ چونکا۔ ''اے تم کدر جاتا اے؟''

''فتح خان! میں اس چکر میں بلاوجہ پھنسا ہوں۔ میرا نہ تو شینا سے کوئی تعلق ہے اور نہ میں نے تمہیں کوئی نقصان پہنچایا ہے۔''

وہ مسکرایا۔ ''تم نے ام کو سب سے بڑا نقصان کیا۔ ام سے شینا کی محبت کو چھین لیا وہ تم کو پسند کرنے لگا اے۔''

''یہ غلط ہے۔ وہ تم سے محبت کرتی تھی، تمہیں پتا ہے جب میں نے اس سے آخری بار بات کی تو اس سے کہا تھا کہ تم سے تعلق سے انکار کر دے۔ وہ سزا سے بچ جاتی لیکن اس نے منع کر دیا۔ تمہاری محبت سے انکار کے مقابلے میں اسے موت قبول تھی۔ فتح خان، یقین کرو تم واحد فرد ہو جس سے شینا نے محبت کی تھی اور تم نے اسے مار دیا۔''

''ام پاگل ہو گیا اے۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''ام کو پتا اے، ام بھی مارا جائے گا۔ ام کسی کو بھی نہیں چوڑے گا۔''

اسے رائفل سنبھالتے دیکھ کر میں نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی۔ فتح خان نے عجلت میں گولی چلائی جو دروازے کی چوکھٹ پر لگی تھی۔ میں باہر گیلری میں جا گرا تھا اور گرنے کی وجہ سے برسٹ سے بچ گیا تھا۔ میں نے تڑپ کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور پھر اتنی تیزی سے اٹھ کر بھاگا کہ لمحوں میں تہ خانے کی سیڑھیوں تک جا پہنچا تھا۔ اس اثنا میں غصے سے دھاڑتا فتح خان کمرے سے نکل آیا تھا۔ اس نے مجھ پر گولی چلانے کی کوشش کی مگر رائفل خالی ہو چکی تھی۔ اس کے میگزین میں اتنی ہی گولیاں تھیں۔ آندھی طوفان کی طرح سیڑھیاں چڑھ کر میں تہ خانے سے باہر آیا اور تہ خانے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ ساتھ ہی چلا چلا کر محافظوں کو آواز دینے لگا۔ ان کے بجائے سیکرٹری آ گیا تھا وہ شاید نزدیک ہی تھا۔ ''کیا ہوا جناب؟''

میں نے ہانپتے ہوئے بتایا۔ ''نیچے فتح خان آزاد اور مسلح ہے اس نے دونوں محافظوں کو مار دیا ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب؟'' سیکرٹری بوکھلا گیا تھا۔

''اندر جا کر فتح خان سے پوچھ لو۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ سیکرٹری نے اپنے پٹے سے ایک عدد سیٹی برآمد کر کے بجانا شروع کر دی تھی، یہ غالباً محافظوں کے لئے اشارہ تھا کیوں کہ فوراً ہی دوڑتے قدموں کی آواز آنے لگی

اور ایک منٹ کے اندر اندر چار، پانچ محافظ وہاں آ چکے تھے۔ سیکرٹری نے غضب ناک انداز اور مقامی زبان میں انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا تو ان کے چہروں پر بھی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ فتح خان ان کے لئے اجنبی نہیں تھا میں نے پہلے ہی محسوس کیا تھا کہ دوسرے محافظ اس سے متاثر تھے۔ اپنے دو ساتھیوں کے مارے جانے کا سن کر وہ ڈر گئے تھے اور تہ خانے میں جاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ سیکرٹری نے دھاڑ کر انہیں حکم دیا تو وہ بادلِ ناخواستہ تہ خانے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ اس اثنا میں راجا عمر دراز وہاں آ گیا۔ اس نے اپنی زبان میں سیکرٹری سے پوچھا۔ اس نے جواب دیا تو یک دم راجا کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے تھے اس نے تیز لہجے میں کچھ کہا اور فوری طور پر دو محافظوں کو طلب کر کے انہیں کہیں اور روانہ کیا اس کے بعد میری طرف متوجہ ہوا۔

''شہباز! نیچے کیا ہوا تھا؟''

میں نے نیچے جو دیکھا وہ بلا کم و کاست راجا عمر دراز کے گوش گزار کر دیا۔ وہ بغور سنتا رہا۔ ''یہ تو بہت برا ہوا۔''

''مجھے بھی محافظوں اور ھینا کے مارے جانے کا افسوس ہے۔'' میں نے کہا تو راجا عمر دراز جھنجلا گیا تھا۔

''انہیں جہنم میں ڈالو۔ مجھے فتح خان کی فکر ہے، وہ شاطر آدمی یہاں کے سارے رازوں سے واقف ہے اب تک وہ نکل چکا ہوگا۔''

راجا عمر دراز کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ تہ خانے سے باہر جانے کا کوئی خفیہ راستہ بھی تھا اور یہ راستہ محل سے باہر جاتا تھا۔ مجھے ان محافظوں کا خیال آیا جنہیں راجا نے کہیں اور بھیجا تھا۔ تہ خانے کے خفیہ راستے سے واقف ہونے کا مطلب تھا کہ فتح خان، راجا عمر دراز کے معتمدوں میں سے ایک تھا اور اس کی حیثیت عام محافظ سے زیادہ تھی۔ راجا عمر دراز کے خدشات کی تصدیق ہوگئی جب نیچے جانے والے محافظ تہ خانے سے منہ لٹکائے نکلے۔ انہوں نے اپنی زبان میں راجا کو رپورٹ دی جس کا لبِ لباب یہی ہو سکتا تھا کہ فتح خان غائب تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ میں فتح خان کے ہاتھ سے بچ کیسے گیا؟ وہ کوئی عام اناڑی آدمی نہیں تھا جسے رائفل چلانی نہ آتی ہو اور نہ ہی انسانوں پر فائر کرنے میں کوئی جھجک ہونی چاہئے تھی اس کے باوجود اس کا نشانہ دو بار چُوک گیا اور وہ بھی اتنے نزدیک سے۔ مجھے یہ بات بچگانہ محسوس ہونے لگی، ایسا تو عام طور سے فلموں یا ناولوں میں ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ فتح خان مجھے قتل کرنے سے گریز کر رہا تھا ورنہ وہ مجھے دروازے تک پہنچنے کی مہلت بھی نہ دیتا، اس رعایت کی وجہ کیا تھی، وہ میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ فتح خان بلاشبہ میرے خون کا پیاسا تھا وہ پہلے بھی مجھے ایک بار مارنے کی کوشش کر چکا تھا۔ مگر ایمن نے مجھے بچا لیا۔ ھینا اور وہ میری وجہ سے پکڑے گئے تھے۔ اس لحاظ سے اسے میرا مزید دشمن ہو جانا چاہئے تھا۔ یہی بات راجا عمر دراز سوچ رہا تھا اس نے کسی قدر مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ''جب فتح خان مسلح تھا تو اس نے تم کو نکل جانے کا موقع کیسے دیا؟''

''اس نے دو بار مجھ پر فائر کئے لیکن خدا کو بچانا منظور تھا اس لئے بچ گیا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' راجا عمر دراز نے سرد لہجے میں کہا تھا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لایا اس کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور دور برف پوش پہاڑوں سے آنے والی ہوا کمرے کو سرد کر رہی تھی۔ پورے کمرے میں صرف آتش

دان کے سامنے ایک آرام کرسی رکھی تھی اور آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کی گرمی کمرے کو سرد ہونے سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ دلچسپ سی کشمکش تھی جب ہوا کا کوئی تیز جھونکا پل بھر کے لئے کمرے کا درجہ حرارت سرد کر جاتا تھا پھر اگلے ہی لمحے آگ سے اٹھتی حرارت کمرے کو معمول پر لے آتی تھی اور یہ معمول کا درجہ حرارت بھی ایسا تھا کہ میں سردی محسوس کرنے لگا تھا۔ راجا عمر دراز نے مجھے بعد میں بتایا کہ یہ کمرا اس نے غور و فکر کرنے کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ باہر سے آتی سرد اور تازہ ہوا اس کے دماغ کو سن ہونے سے بچاتی تھی اور آتش دان اس کے جسم کی حرارت برقرار رکھتا تھا۔ یہیں پر اس نے غور و فکر کر کے اپنی زندگی کے بہترین فیصلے کئے تھے۔ راجا عمر دراز کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کرسی کے سوا کمرے میں صرف قالین تھا۔ دیواریں سادہ گلابی رنگ کی تھیں اور ان پر کوئی آرائشی شے نہیں تھی، حد یہ کہ کسی دیوار پر کلاک تک نہیں لگی تھی۔ غالباً اس لئے کہ گزرتا وقت راجا عمر دراز کی توجہ نہ کھینچ سکے۔

''شہباز...... فتح خان نے بتایا کہ تمہیں بچانے کے لئے ایمن نے اس کے سر پر وار کر کے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔''

''ممکن ہے اس نے ایسا ہی کیا ہو لیکن اس وقت مجھے ہوش نہیں تھا۔ میں تو بس جان بچانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوا تھا اگر میں ایسا نہ کرتا تو ممکن ہے ان لوگوں کی قید سے نہ نکل پاتا اور فتح خان ہوش میں آ کر مجھے قتل کر دیتا۔''

''تہ خانے میں اس نے تمہیں قتل نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا ہے۔ کوئی بھی اسلحہ اس کے لئے کھلونا ہوتا ہے۔''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں، اگر آپ مجھ پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں تو میں اس معاملے میں پہلے کی طرح بے بس ہوں جب آپ کے مرحوم جلاد نے میری پشت ادھیڑ دی تھی۔'' میرا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔

''میں تم پر شک نہیں کر رہا۔ کم سے کم تمہاری نیت پر شک نہیں کر رہا لیکن تم نے مجھ سے کچھ نہ کچھ چھپایا ہے۔ فتح خان نے اپنے بے ہوش ہونے کا جو وقت بتایا اس کے مطابق تمہیں فرار ہو کر ایک گھنٹا پہلے ہی میرے محل تک پہنچ جانا چاہئے تھا اتنی دیر تم کہاں رہے؟''

''میں بھٹک گیا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے مجھے راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اتنی دیر تک میں فتح خان اور اس کے ساتھیوں کے خوف سے جھاڑیوں میں دبکا رہا تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میرے پیچھے نہیں آ رہے ہیں تب میں جھاڑیوں سے نکل کر محل کی طرف آیا تھا۔''

راجا عمر دراز بغور مجھے دیکھ رہا تھا اگرچہ میرا دل زور سے دھڑک رہا تھا لیکن میں مطمئن بھی تھا میں نے اسے کوئی دھوکا نہیں دیا تھا صرف اپنے مفاد کا خیال رکھا تھا۔ راجا عمر دراز مہذب اور شائستہ ہونے کے باوجود بہر حال ایک قبائلی تھا اگر اس کی سوچ سنک جاتی تو وہ میرے ساتھ مروت اور شفقت بالائے طاق رکھ کر کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مجھے اس کا تجربہ تھا۔ میں اس پر ایک حد سے زیادہ اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے میں چپ رہا۔ آخر اس نے گہرا سانس لے کر مجھ پر سے نظریں ہٹائیں اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ سورج غروب ہو چکا تھا لیکن آسمان صاف ہونے کی وجہ سے تارے معمول سے زیادہ ہی چمک رہے تھے۔ ان کی روشنی میں پہاڑوں کی برف

نمایاں تھی۔
"نہ جانے کیوں تمہارے لئے دل میں اچھا خیال ہی آتا ہے۔"
"اچھے خیال پر یہ حال ہے تو خدانا خواستہ کسی برے خیال پر میرا کیا حشر کیا جاتا۔" میں نے دل میں سوچ اور منہ سے بولا۔ "یہ نوازش ہے آپ کی راجا صاحب۔"
"مجھے یقین ہے تم اچھے آدمی ہو۔" راجا نے شاید میری بات نہیں سنی تھی۔ "اور مجھے یقین ہے تم کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچاؤ گے ویسے میرے آدمیوں کے ہاتھوں برٹ شا اور اس کی بیٹی ایمن شا گرفتار ہو چکے ہیں اور آج رات کسی وقت وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔"
میں نے بمشکل اپنے تاثرات قابو میں رکھے تھے۔ راجا عمر دراز ایک بار پھر بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ہنسا۔ "لگتا ہے، تمہیں یہ بات پسند نہیں آئی۔"
"نہیں جناب...... دراصل اس لڑکی نے میری جان بچائی تھی۔"
"فکر نہ کرو۔ اس لڑکی کو کچھ نہیں کہا جائے گا وہ پورے عزت و احترام سے یہاں رہے گی۔ ہم عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کے قائل نہیں ہیں۔"
"اور برٹ شا...... جناب اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"
"اسے بھی میں ماروں گا نہیں لیکن اسے کوئی نہ کوئی سزا ملے گی۔ اس کی وجہ سے اتنا بڑا فساد ہوا، کتنے بے گناہوں کو تکلیف پہنچی، میرے تین آدمی اپنی جان سے گئے اس نے فتح خان جیسے وفادار اور کارآمد آدمی کو مجھ سے چھین لیا۔ میں اسے اتنی آسانی سے معاف نہیں کروں گا۔" راجا عمر دراز کا چہرہ شعلوں کے عکس میں تمتما رہا تھا اور مجھے صاف لگ رہا تھا کہ وہ برٹ شا کو معاف نہیں کرے گا۔
"جناب آپ برٹ شا کے ساتھ ہر سلوک کرنے میں حق بجانب ہیں لیکن ایک بات بھول رہے ہیں، وہ برٹش شہری ہے۔ اس کی گمشدگی پر اس کی حکومت چپ نہیں بیٹھے گی اور یہاں پر مجبوراً حکومت کو حرکت میں آنا پڑے گا۔"
"فکر نہ کرو۔ وہ چھپ کر یہاں آیا ہے اس لئے اس کی گمشدگی کے بارے میں کوئی پوچھنے نہیں آئے گا۔" راجا عمر دراز نے بے پروائی سے کہا۔ "آؤ کھانا کھالیں۔ اس خوش خبری نے...... میری بھوک بڑھا دی ہے۔"
اس کے دو محافظوں سمیت تین افراد چند گھنٹے پہلے اس کے محل کے تہ خانے میں مارے جا چکے تھے، اس کا مجرم فرار ہو گیا تھا لیکن اسے ان کی فکر نہیں تھی۔ اس کے بجائے برٹ شا اور ایمن کے پکڑے جانے کی اتنی خوشی تھی کہ اس کی بھوک بڑھ گئی تھی۔ راجا عمر دراز بھی مخصوص جاگیردارانہ ذہنیت رکھتا تھا۔ اسے انسانوں اور ان کی زندگیوں سے زیادہ اپنے مفادات کی فکر تھی۔ کھانا تیار تھا اور راجا کا حکم پاتے ہی خدام قابیں لانے لگے۔ اس نے ڈٹ کر کھایا۔ البتہ ایمن کے پکڑے جانے کی خبر سن کر میری بھوک اڑ گئی تھی۔ میں نے بمشکل کھانا زہر مار کیا تھا۔ راجا عمر دراز کے ارادے برٹ شاہ کے بارے میں درست نہیں تھے۔ اس صورت میں وہ ایمن کو بھی نہیں چھوڑتا اگر اسے کوئی تکلیف نہ بھی دیتا تب بھی وہ اسے آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ ایمن اپنے باپ کے ساتھ ہونے والے سلوک سے ساری دنیا کو آگاہ کر دیتی۔ راجا عمر دراز یہ خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا۔ اپنے علاقے میں

وہ کتنا ہی با اثر ہو لیکن وہ حکومت سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ اگر اوپر سے دباؤ آتا تو وہ برٹ شا اور ایمن کو چھوڑنے پر مجبور ہو سکتا تھا۔ کھانا خاموشی سے ختم ہوا اور راجا عمر دراز کھڑا ہو گیا۔

''اب تم سے کل ملاقات ہو گی۔''

''راجا صاحب میری ایک درخواست ہے۔''

''اس پر بھی صبح بات ہو گی۔'' راجا عمر دراز جلدی سے بولا۔ غالباً اس نے بھانپ لیا تھا کہ میں جانے کی بات کروں گا۔ لہٰذا اس نے پہلے ہی میری بات کو ٹال دیا اور تیزی سے چلا گیا۔ سیکرٹری وہاں موجود تھا، اس نے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ اس کا مقصد شاید یہ تھا کہ اب مجھے مہمان خانے میں اپنے کمرے میں چلے جانا چاہئے۔ راجا عمر دراز کے رویے سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے کسی صورت یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ یہ اجازت فی الحال تو محال تھی مگر اب مجھے یہ فکر بھی لاحق ہو گئی تھی کہ راجا عمر دراز مجھے جانے دے گا یا نہیں۔ بہر حال میں بھی اس راز سے واقف تھا کہ برٹ شا اور ایمن اس کی تحویل میں تھے۔ یہ راز کھلنا کسی صورت اس کے مفاد میں نہیں تھا۔ سیکرٹری جس کے نام کے آخر میں بیگ آتا تھا، اس کی ننھی سی جسامت اور سرخی مائل رنگت کو دیکھ کر لال بیگ کا خیال آتا تھا۔

''جناب اب آپ کو اپنے کمرے میں چلے جانا چاہئے۔'' اس نے میرے نزدیک آ کر کہا۔ ''راجا صاحب نے رات نو بجے سے صبح نو بجے تک محافظوں کے سوا سب کے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی ہے۔''

گویا اس بہانے مجھے نظر بند کیا جا رہا تھا۔ ''بیگ صاحب کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ راجا صاحب مجھے جانے کی اجازت دے دیں۔ شینا اور فتح خان والا معاملہ تو ختم ہو گیا۔ باقی معاملات سے میرا تعلق نہیں ہے۔''

بیگ نے اپنے صاف چاند پر ہاتھ پھیرا۔ ''جناب! یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ کچھ دن اور صبر کریں۔''

''کتنے دن؟'' میں برہم ہو گیا تھا۔ ''کیا مجھے قید کر دیا گیا ہے؟''

''ایسی بات نہیں ہے، آپ راجا صاحب کے معزز مہمان ہیں۔ قیدیوں کے لئے ہمارے پاس جو جگہ ہے وہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ یہ بات وہ پہلے بھی ایک بار کہہ چکا تھا۔

''بس جگہ کا فرق ہے ورنہ میں ہوں قید میں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''بیگ صاحب مجھے واضح طور پر میری حیثیت بتائیں ورنہ مجھے جانے کی اجازت دیں۔''

''شہباز صاحب آپ جذبات میں ہیں۔ براہ کرم خود کو سنبھالئے...... راجا صاحب کی مجبوری سمجھئے۔ ان کا صرف خلوص ہے ورنہ ان کے لئے کیا مسئلہ ہے آپ کو قید خانے میں ڈالنا۔''

اس کی بات میں وزن تھا۔ بہر حال یہ بھی درست تھا کہ میں راجا عمر دراز کا غیر اعلانیہ قیدی تھا۔ میں نے خود پر قابو پایا اور بیگ کے ساتھ اپنے کمرے تک آیا۔ جانے سے پہلے اس نے ایک بار پھر 9 سے 9 بجے تک والی پابندی کے بارے میں خبردار کیا اور اس کی وضاحت بھی کر دی۔ ''جناب فتح خان اس محل کا بھیدی ہے اور وہ جس طرح غائب ہوا ہے ممکن ہے ابھی تک اس محل میں ہو۔ وہ آپ کا جانی دشمن ہے اور رات کے وقت اپنے کمرے سے نہ نکلنا آپ کے مفاد میں ہے۔''

"میں خیال رکھوں گا۔" میں نے سر ہلا کر کہا۔ "لیکن اگر فتح خان اتنا ہی خطرناک آدمی ہے تو کیا اس کمرے کی دیواریں مجھے اس سے بچا سکیں گی؟"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔" اس نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ "دو محافظ یہاں پر تعینات ہوں گے اس طرف پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا ہے۔"

فتح خان کو پرندہ بننے کی ضرورت نہیں تھی، وہ آرام سے عقبی باغ کی طرف کھلنے والی اس کھڑکی سے مجھے گولی مار سکتا تھا۔ کھڑکی بے شک زمین سے خاصی بلندی پر تھی لیکن اس کے لئے اوپر تک آنا ناممکن نہیں تھا میرا بیڈ بالکل سامنے تھا۔ بیگ کے جانے کے بعد میں نے بند کھڑکیوں کے پردے کھینچ لئے تھے۔ بستر پر لیٹنے کے بعد خاصی دیر تک کروٹیں بدلنے کے باوجود مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ مجھے ایمن کی فکر تھی۔ ممکن ہے وہ محل میں آ چکی ہو اس لڑکی نے مجھے فتح خان سے بچا کر میرے اوپر بوجھ سا لاد دیا تھا۔ اب وہ مشکل میں تھی اور میں بے بس تھا۔ چاہنے کے باوجود میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ساری رات کروٹیں بدلتے اور سوتے جاگتے گزر گئی۔ صبح کے وقت مجھے ذرا گہری نیند آئی تھی لیکن کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو میں اٹھ بیٹھا۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے احتیاطاً پوچھ لیا۔

"کون ہے؟"

باہر سے مہمان خانے کے ملازم کی آواز آئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ ناشتے کی ٹرے لئے کھڑا تھا۔ میں نے اسے اندر آنے دیا اور خود باتھ روم چلا آیا۔ منہ ہاتھ دھو کر میں نے ناشتا کیا اس دوران میں ملازم میرے سر پر کھڑا رہا تھا۔ میں نے اس سے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ "کیا رات کو محل میں کچھ مہمان آئے تھے۔"

"ام کو نہیں ئمیں معلوم۔" اس نے نفی میں جواب دیا۔

"رات کو ہنگامہ ہوا تھا؟" میں نے تکا مارا۔

"ام کو ئمیں معلوم۔" اس نے رٹے رٹائے انداز میں کہا۔ غالباً اسے میرے کسی بھی سوال کے جواب میں یہی کہنے کا حکم تھا۔ تنگ آ کر میں نے کہا۔

"مجھے راجا صاحب یا بیگ صاحب سے ملنا ہے۔"

"ام کو نہیں معلوم وہ کدر اے۔" اس نے اضافہ کیا۔

"تو تم اسے بھیجو جسے کچھ معلوم ہو۔" میں نے بھنا کر کہا۔ ناشتا مکمل ہوتے ہی وہ برتن اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کپڑے بدلے اور باہر نکل آیا۔ جب میں نے مہمان خانے سے محل میں جانے کی کوشش کی تو ایک محافظ سامنے آ گیا۔ "اجازت ئمیں اے...... ادر سے جاؤ۔"

آزمانے کے لئے میں مہمان خانے سے نکل کر باغ میں جانے لگا۔ اس بار کسی نے مجھے نہیں روکا تھا اس کا مطلب تھا کہ صرف محل میں جانے کی پابندی تھی، باغ میں گھوم پھر سکتا تھا۔ میں نے مین گیٹ سے باہر جانے کی کوشش کی تو دربانوں نے مجھے روک دیا۔ مجھے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میرے خدشات درست تھے۔ راجا عمر دراز نے مجھے اپنے محل میں قیدی بنا لیا تھا۔ میں محل کے سامنے والے چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے امید

تھی کہ جلد یا بدیر راجا یا اس کے چھوٹے سے سیکرٹری سے میری ملاقات ضرور ہوگی مگر بارہ بجے تک وہاں بیٹھنے کے باوجود ان دونوں میں سے کسی کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ دھوپ تیز اور چبھنے والی ہوگئی تھی۔ مجبوراً میں وہاں سے اٹھ گیا۔ اس دوران میں کئی ملازموں سے میں نے راجا یا سیکرٹری بیگ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں جھنجلا کر اندر مہمان خانے میں آ گیا۔

دوپہر کا کھانا میں نے جوں کا توں واپس کر دیا۔ بھوک نہیں تھی۔ وقت سُست رفتاری سے گزرتا رہا۔ شام ہوئی اور پھر رات ساڑھے سات بجے رات کا کھانا آیا۔ میں نے چند لقمے زہر مار کیے اور لانے والے سے ایک بار پھر راجا سے ملنے کی درخواست کی۔ حسبِ معمول اس کا بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ یہ بات یقینی تھی کہ برٹ شا اور ایمن پکڑ کر محل میں لائے جا چکے تھے اگر حالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی ہو اور ممکن ہے راجا عمر دراز کے جلادوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہو۔ راجا عمر دراز نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایمن کو کوئی تکلیف نہیں دے گا لیکن اس نے میرے معاملے میں جس طرح قلابازیاں لگائی تھیں، مجھے اس کے کسی وعدے کا اعتبار نہیں تھا۔ وہ ایمن پر بھی تشدد کروا سکتا تھا اور ان باپ بیٹی کو مار کر لاشیں بھی غائب کروا سکتا تھا۔

رات نو بجے کے بعد باہر نکلنے پر پابندی تھی۔ خاصی دیر تک کمرے میں ٹہلنے کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا تھا باہر آسمان پر گھرے بادل تھے اور بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ بند کھڑکیوں کی وجہ سے آواز نہیں آ رہی تھی لیکن بادل گرج رہے تھے۔ اچانک دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ میں چونکا، مگر آواز بے حد معمولی سی تھی۔ میں نے اسے اپنا وہم قرار دیا لیکن ایک منٹ بعد پھر ویسا ہی کھٹکا ہوا، کوئی دروازے کے باہر تھا۔ میں بستر سے اتر کر دروازے تک آیا۔ ''باہر کون ہے؟'' میں نے آواز دبا کر پوچھا جواب میں پھر کسی نے ہلکی سی دستک دی تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے دروازہ کھول دیا اور اس کے کھلتے ہی ایک لڑکی اندر گھس آئی۔ چند لمحے کے لئے میں بوکھلا گیا تھا پھر اسے پہچان لیا۔ وہ محل کی خادماؤں میں شامل تھی میں اسے کئی بار دیکھ چکا تھا۔

''تم کیوں آئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

خادمہ نوجوان اور حسین تھی۔ اس کی آنکھوں سے ایک خاص شوخی جھلکتی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا پھر اپنے سینے پر اور آخر میں ہاتھ اٹھا کر باہر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مجھے کہیں لے جانے کے لئے آئی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ''کیا تم بول نہیں سکتیں؟''

وہ چپ رہی جب اس نے تیسری بار وہی اشارہ کیا تو میں جھنجلا گیا تھا۔ ''اچھا بابا باہر چلو لیکن مجھے مروا مت دینا میرے آزادی سے گھومنے پھرنے پر پابندی ہے۔''

اس وقت میرا خیال تھا کہ مجھے راجا عمر دراز نے طلب کیا ہے مگر خادمہ نے دروازہ کھول کر رازدارانہ انداز میں باہر جھانکا تو مجھے اپنے خیال میں ترمیم کرنا پڑی۔ یہ کوئی اور چکر تھا۔ ورنہ خادمہ چوروں کی طرح باہر کیوں جھانکتی۔ میری چھٹی حس خطرے کا سگنل دینے لگی۔ خادمہ نے اطمینان کرنے کے بعد مجھے چلنے کا اشارہ کیا لیکن میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ''میں نہیں جاؤں گا جب تک تم بتاؤ گی نہیں، مجھے کہاں اور کیوں لے جا رہی ہو۔''

وہ لپک کر میرے پاس آئی اور التجا آمیز انداز میں میرا بازو پکڑ کر کھینچنے لگی۔ اس کے انداز نے مجھے حرکت میں آنے پر مجبور کر دیا۔ ہم کمرے سے نکلے، اس نے دروازہ بند کیا اور مجھے لے کر محل کے اندر والے حصے کی

طرف جانے لگی۔ اس نے میرا بازو چھوڑ دیا تھا اور ہر موڑ پر پہلے جھانک کر دیکھتی تھی اور جب مطمئن ہوتی تو آگے بڑھتی تھی۔ ایک راہ داری میں اس نے جھانکا تو گھبرا کر پیچھے ہٹی اور سراسیمہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا پھر میرا بازو تھام کر لپکتی ہوئی دیوار پر لگے آرائشی پردے کے پیچھے چلی گئی۔ دیوار اور پردے کے درمیان بے حد معمولی سا خلا تھا۔ وہ مجھ سے چپک کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس سے پوچھنے کے لئے منہ کھولا تھا کہ اس کا نازک اور گداز ہاتھ میرے منہ پر آ گیا۔ اسی لمحے میں نے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنی کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ گیلری میں فرش پر دبیز قالین بچھا تھا۔ اس لئے قدموں کی آہٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اگر آنے والا جان بوجھ کر پاؤں زور سے نہ رکھ رہا ہوتا تو یہ ہلکی سی چاپ بھی نہ سنائی دیتی۔ شاید وہ محافظ تھا۔ اس کے نزدیک آتے ہی خادمہ نے مجھے دیوار کی طرف دھکیلتے ہوئے اپنا بدن مجھ میں پیوست کر دیا تھا۔ ظاہر ہے اس نے یہ مجبوری میں کیا تھا کہ پردے کے پیچھے ہماری موجودگی کا شبہ نہ ہو لیکن میں ایک خاص نوعیت کی سنسنی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

سارا زور مجھ پر لگانے کے باوجود اس کی کمر کے خم کے نیچے کا بھاری حصہ پردے سے لگ رہا تھا۔ مزید آگے آنے کی گنجائش نہیں تھی اسی لئے ہم چپ چاپ ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے آنے والے لمحات کا انتظار کر رہے تھے۔ چاپ آہستہ آہستہ نزدیک آتی گئی۔ ایک لمحے کو یوں لگا جیسے آنے والا پردے کے سامنے رکا ہو لیکن یہ صرف ہمارے یا میرے احساسات کا کرشمہ تھا ورنہ پہریدار روانی سے سامنے سے گزر گیا تھا۔ وہ آگے نکلا تو پردے کے رخنے سے نظر آنے لگا۔ وہ آگے جا کر گیلری میں ایک جانب مڑ گیا تھا۔

ہم دونوں نے بیک وقت کب سے روکا ہوا سانس چھوڑا۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے جکڑ لیا تھا۔ وہ کسمسائی تو میں نے خفیف ہو کر اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ پردے سے نکلی اور ایک بار پھر میرے آگے آگے چلنے لگی تھی۔ ذرا دیر بعد ہم محل کے ایک تاریک گوشے میں تھے یہاں اس نے رہنمائی کے لئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ دیر بعد میں نے دستک کی آواز سنی۔ یہاں پر روشنیاں بجھی تھیں اور مکمل تاریکی تھی۔ شاید دروازہ کھلا اور وہ مجھے لے کر اندر داخل ہوئی۔ ہمارے آتے ہی دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ بند ہو گیا اور چٹ کی آواز کے ساتھ کمرے میں روشنی ہو گئی تھی۔ میں وہاں موجود شخص کو دیکھ کر اچھل پڑا تھا۔

میں ایک مہم جویانہ احساس کے ساتھ خادمہ کے ہمراہ یہاں تک چلا آیا تھا لیکن میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ محل میں میرا سامنا فتح خان سے ہوگا، اس فتح خان سے جسے دیوانہ وار تلاش کیا جا رہا تھا اور وہ راجا عمر دراز کے ہاتھ آ جاتا تو اسے شاید ہی موت سے کم کوئی سزا ملتی۔ وہ راجا عمر دراز کا باغی اور تین افراد کا قاتل ہی نہیں بلکہ راجا کا ایسا راز داں بھی تھا جو نہ جانے کتنے رازوں سے واقف تھا۔ اس کا ہاتھ آنا بے حد ضروری تھا اور وہ فتح خان اس وقت راجا عمر دراز کی ناک کے عین نیچے اس کے محل کے ایک کمرے میں موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا خوفناک پستول دیکھ کر مجھے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ فتح خان میرے تاثرات بھانپ کر مسکرایا۔

”ڈرو نہیں۔ ام ابی دوست اے..... تو ماری مدد کرنے آیا اے۔“

”یہ پستول لے کر۔“ میں نے اسے اشارہ کیا۔

"یہ تم کو چپ کرانے کے لئے اے۔" اس نے جواب دیا۔ "تم شور نہیں کرے گا۔"

"فتح خان تمہیں پتا ہے، راجا کے آدمی تم کو تلاش کر رہے ہیں اور تم اس کے محل میں گھسے ہوئے ہو۔"

"یہ سب چھوڑو۔" اس نے بےزاری سے کہا۔ "کام کا بات سنو...... کیا تم ادر سے نکلنا چاہتا اے۔ ام کو پتا اے...... راجا نے تم کو قیدی بنا لیا اے۔"

میں چونکا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

فتح خان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "ام کو ادر کی ایک ایک بات کا پتا اے۔ امارا آدمی اے ادر......" اس نے ایک نظر خادمہ کی طرف دیکھا جو مجھے لانے کے بعد ایک طرف خاموش کھڑی تھی۔

"چلو مان لیا...... لیکن تم نے یہ کیوں سوچا کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے؟"

"ہے...... امارا مدد کی ضرورت ہے۔" وہ زور دے کر بولا۔ "راجا ام سے بڑا ظالم اے...... وہ تم کو کبھی ادر سے جانے نہیں دے گا۔ تم نے زیادہ شور کیا تو مروا دے گا اور دفن کروا دے گا۔ ام نے خود راجا کے واسطے کئی بندے مارے۔ ان کو ادر دفن کیا۔"

"اور پھر پیسے کے لئے برٹ شا سے مل گئے۔" میں نے طنز کیا۔

"پیسے کے واسطے نہیں، انتقام کے لئے برٹ شا سے ملا۔ راجا نے امارے برادر کو مروایا اے۔ ام اس سے بدلہ لے گا۔"

"راجا نے تمہارے بھائی کو مروا دیا، لیکن کیوں؟"

"وہ ایک عورت کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔ اسے راجا نے جرگے میں موت کا سزا سنایا۔"

"تو اس میں راجا کا کیا قصور ہے؟" میں نے اعتراض کیا۔ "اس نے جیسا کیا ویسی سزا پائی۔"

"بکواس بند کرو۔" فتح خان نے خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "امارا ایک ہی برادر تھا۔ ام نے راجا کا منت کیا پر اس نے امارے برادر کو سزا سنایا اور عورت کو اس کے خاندان کو دے دیا۔ وہ بچ گیا، امارا برادر امارا گیا۔ وہ عورت اسے لے گیا تھا۔"

دوسروں کی عورتیں بہکانا فتح خان کے خاندان کا وتیرہ تھا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ "ام راجا کو نہیں چھوڑے گا۔ ام اسے مارے گا۔"

"چلو تمہیں راجا سے انتقام لینا ہے لیکن میں کہاں سے درمیان میں آ گیا۔ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ اگر میں تمہارے ساتھ پکڑا گیا تو یہ لوگ میرا بھی برا حشر ہوگا۔"

"تم فکر مت کرو ادر کوئی نہیں آئے گا، ام ادر ٹھیک اے۔ ام کو تومارا مدد کا ضرورت اے۔ ام برٹ شا اور اس کی بیٹی کو ادر سے نکالنا چاہتا اے...... اس واسطے تومارا مدد چاہئی اے۔"

"ایمن یہاں پر ہے؟" میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔

"ادر محل کے نیچے اے۔" فتح خان نے سر ہلایا۔ "جدر ام کو قید کیا تھا۔"

"اس کے ساتھ زیادتی تو نہیں ہوئی ہے؟" میں نے بےساختہ پوچھا۔

"تم کو لڑکی سے ام دردی اے۔ اس نے تومارا جان بچایا تھا ورنہ تم امارے ہاتھ سے مارا جاتا۔"

''فتح خان! وہ بے گناہ ہے، اس کا اپنے باپ کی حرکتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ اسے چوری سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی، اسے مرنا نہیں چاہئے۔''

''ام کو پتا اے...... اس واسطے ام اسے ادر سے نکالنا چاتا اے۔ راجا اسے مار دے گا یا اس کا شادی زبردستی کسی رشتہ دار سے کر دے گا۔''

''میں...... میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''توم تیار اے؟'' فتح خان خوش ہو گیا تھا۔ ''ام بتائے گا پر ابی نہیں۔ ابی توڑا وقت اے۔ ام کو تیاری کرنا اے...... فیر ام بتائے گا۔''

''مگر یہ تو بتاؤ کہ راجا مجھے کیوں جانے نہیں دے گا اور میں نے ہنگامہ کیا تو مجھے مار کر ادھر دفن کر دے گا؟''

''توم نئیں جانتا، برٹ شا سے اس کا پرانا دشمنی اے۔ وہ اسے معاف نئیں کرے گا اور توم کو بی نئیں جانے دے گا۔ مغز پر زور دو، وہ ایسے بندے کو کیوں جانے دے گا جو اس کا راز جانتا اے۔ توم میرا سات دو۔ ام برٹ شا اور اس کی لڑکی کے سات توم کو بھی لے جائے گا۔''

میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ راجا عمر دراز کے بارے میں میرے اندر بھی شکوک پیدا ہو چکے تھے اور مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مجھے جانے دے گا۔ دوسری طرف فتح خان بھی اچھا آدمی نہیں تھا۔ ابھی کل تک وہ میرے خون کا پیاسا تھا، دو بار مجھے مارنے کی کوشش کر چکا تھا اور اب وہ مجھ سے تعاون کا طلب گار تھا۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ میرے ساتھ پُر خلوص ہو اور کام نکل جانے کے بعد دھوکا نہ کرے بلکہ ممکن ہے کہ مجھے یہاں سے نکال لے جانے کے بعد آرام اور سکون سے قتل کرے۔ فتح خان بغور مجھے سوچتے دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ میرے ذہن میں کسی قسم کے خدشات آ رہے ہیں وہ بولا۔ ''امارا یقین کرو۔ ام دوکا نئیں دے گا۔ ام شینا کا قسم کاتا اے۔''

فتح خان نے شینا کی قسم کھائی تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا اور میرے ذہن میں یہی آ رہا تھا کہ مجھے فتح خان کی پیش کش قبول کر لینی چاہئے ورنہ راجہ عمر دراز نے مجھے کسی قید خانے میں ڈال دیا تو پھر میرے پاس کوئی چانس باقی نہیں رہے گا۔ ابھی میں ایک قسم کی نظر بندی میں تھا اور کسی حد تک نقل و حرکت کر سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں لیکن مجھے کیا کرنا ہو گا لیکن پہلے ہی بتا دوں میں لڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔''

''توم فکر مت کرو۔ ام کو کسی سے لڑنا نئیں اے...... بس توم ایک کام کرو۔ برٹ شا سے پوچو کہ اس نے کالے ڈبے کا کیا، کیا اے؟''

''کالا ڈبا...... یہ کیا چیز ہے؟''

''توم اس کا فکر مت کرو، جو ام نے پوچھا اے وہ کرو۔''

''لیکن میں برٹ شا سے کیسے ملوں گا؟ وہ تہ خانے میں قید ہے۔''

''اس کا بی فکر مت کرو۔ ابی راجا توم کو ادر لے جائے گا تب موقا (موقع) نکال کر برٹ شا سے پوچنا،

اس سے امارا نام لے کر پوچھنا، وہ بتائے گا...... فیر جو بتائے وہ توم ام کو بتانا تب ام ان دونوں کے سات توم کو بی محل سے مکن (مکھن) سے بال کا مافک نکال دے گا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ فتح خان شاید فرار میں مدد چاہے گا لیکن اس نے تو ایک اور ہی کام بتا دیا تھا۔ نہ جانے یہ کالا ڈبا کیا تھا اور ہمیں راجا کے چنگل سے نکالنے کے لئے اس کے بارے میں پوچھنا کیوں ضروری تھا۔ یہ کام تو فتح خان، برٹ شا، ایمن اور مجھے راجا عمر دراز کی قید سے نکالنے کے بعد بھی کر سکتا تھا۔ "ٹھیک ہے، میں پوچھوں گا لیکن تم تک برٹ شا کا جواب کیسے پہنچاؤں؟"

"توم اس مکن کا ڈلی کو بتا دینا۔ یہ ام تک پوچا دے گی۔" فتح خان نے گھٹیا انداز میں خادمہ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تو بولتی ہی نہیں ہے۔"

"یہ بولتی اے...... پر اکیلے میں۔" فتح خان کا لہجہ مزید خبیثانہ ہو گیا تھا۔ "اس کا فکر مت کرو۔ یہ امارے سات اے۔ اب توم جاؤ۔"

"تم محل میں کیسے آئے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

فتح خان مسکرایا۔ "ام سے زیادہ اس جگہ کے بارے میں کوئی نہیں جانتا اے...... راجا بی نہیں...... اسے امارے پردادا نے بنوایا اے، توم جاؤ۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"فتح خان! ایک بات تم نے سوچی نہیں ہے اگر میں جا کر راجا کو سب بتا دوں۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ مارا۔ "وہ یقین نہیں کرے گا۔ توم کو جوٹا بولے گا اور آنے کا جو راستہ اسے پتا اے...... اس پر پہرا اے۔"

"اس کا مطلب ہے، تم نے راجا کے نوادرات اسی خفیہ راستے سے محل سے نکالے تھے جس کے بارے میں راجا بھی نہیں جانتا ہے۔"

"اب توم جاؤ۔" یک دم فتح خان محتاط نظر آنے لگا اور پھر ایک پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ خادمہ بھی مضطرب نظر آنے لگی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے چلنے کو کہا۔ شاید انہوں نے کوئی خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ خادمہ نے روشنی بجھا دی اور ایک بار پھر میرا بازو تھام کر تاریکی میں چل پڑی تھی۔ وہ اس جگہ کے چپے چپے سے واقف تھی، اس لئے آرام سے گھپ اندھیرے میں چل رہی تھی یا اس کی آنکھوں میں بلی کی سی خاصیت تھی جو اندھیرے میں بھی دیکھ لیتی ہے۔ کچھ دیر بعد ہم محل کے روشن حصے میں تھے پہریداروں کی نظروں سے بچتے بچاتے ہم مہمان خانے تک آنے میں، کامیاب رہے تھے۔ میرا خیال تھا وہ مجھے دروازے تک پہنچا کر رخصت ہو جائے گی لیکن وہ اندر آ گئی تھی اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر کے اپنی چادر اتار دی تھی۔

"اب تم جاؤ۔ میں سوؤں گا۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

اس نے حسبِ معمول اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا اس کے بجائے اس نے مسکراتے ہوئے ایک توبہ شکن انگڑائی لی۔ میں نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ "خدا کے لئے جاؤ، کوئی آ گیا تو اسے کیا جواب دو گی؟"

وہ بجھ گئی تھی، کچھ دیر بعد اس نے چادر اٹھا کر لپیٹی۔ دروازہ کھول کر باہر دیکھا اور تیزی سے نکلتی چلی گئی۔ میں نے جلدی سے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ باہر گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش جاری تھی اور یقیناً سردی میں اضافہ ہو گیا تھا مگر محل کے اندر اس کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور ہلکا سا کمبل اوڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن کچھ دیر پہلے میں جن حالات سے گزرا تھا۔ انہوں نے میرے ہوش اُڑا دیئے تھے۔ فتح خان اس قدر دیدہ دلیر ثابت ہو گا، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ نہ صرف آرام سے محل میں پھر رہا تھا بلکہ اسے یہ خوف بھی نہیں تھا کہ میں راجا کو اس کے بارے میں بتا سکتا تھا۔ عجیب آدمی تھا۔ میرے بارے میں پوری طرح باخبر تھا ورنہ اسے کیسے پتا چلتا کہ راجا نے مجھے نظر بند کر دیا ہے۔ اس نے بالکل درست وقت پر مجھ سے رابطہ کیا تھا اگر میں راجا عمر دراز کے عزائم کے بارے میں مشکوک نہ ہوتا تو کبھی فتح خان پر بھروسا نہ کرتا بلکہ وہ مجھ سے رابطہ کرتا تو میں پہلی فرصت میں راجا کو اس کے بارے میں بتا دیتا مگر اب میں اس پر بھروسا کرنے پر مجبور تھا۔

اگلا دن بھی نظر بندی کی حالت میں گزرا تھا۔ سوائے مہمان خانے کے ملازم کے اور کسی کی صورت نظر نہیں آئی تھی اور اس کے پاس ہر سوال کے جواب میں ایک ہی جملہ تھا۔ ''ام کو نہیں مالوم۔'' سارا دن میں الجھن کا شکار رہا کئی بار میرے دل میں خیال آیا کہ راجا کو جا کر فتح خان کے بارے میں بتا دوں لیکن صرف سوچ کر رہ گیا تھا۔ مسلسل نظر بند رہنے کی وجہ سے راجا عمر دراز کی طرف سے میرا دل خراب ہوتا جا رہا تھا...... مشکل لگ رہا تھا کہ وہ مجھے جانے کی اجازت دے۔ برٹ شا کے بارے میں وہ خود کہہ چکا تھا کہ وہ اسے کسی صورت معاف نہیں کرے گا۔ لہٰذا وہ اسے خود اپنے محل سے جانے کی اجازت کیوں دیتا جو اس راز سے واقف ہو کہ برٹ شا اس کی قید میں ہے۔

فتح خان کی شرط بھی معنی خیز تھی۔ وہ سیاہ ڈبے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو برٹ شا کے پاس تھا اور برٹ شا کے جواب پر منحصر تھا کہ فتح خان ہمیں راجا عمر دراز کی قید سے نکالتا یا نہیں...... وہ جس طرح آزادی سے محل میں موجود تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ ہمیں یا کم سے کم مجھے محل سے نکال لے جانا فتح خان کے لئے قطعی مشکل نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں فتح خان کی مدد لینا گوارا نہ کرتا اگر معاملہ ایمن کا نہ ہوتا۔ ایمن راجا کی قید میں تھی اور محض اپنے باپ کی وجہ سے عتاب میں تھی۔ اس نے میری جان بچائی تھی اور اتنی اچھی لڑکی کو کوئی نقصان ہو، یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ اسے بچانے اور راجا کی قید سے نکالنے کے لئے میں فتح خان سے بھی تعاون کرنے کے لئے تیار تھا۔ رات کا کھانا میں نے سات بجے کھایا تھا اور اس امید کے ساتھ انتظار کرنے لگا کہ خادمہ آج آئے گی وہ شاید مجھے فتح خان سے ملواتی۔ دس بجے دروازے پر دستک ہوئی تو میں بستر سے چھلانگ لگا کر اترا، بے تابی سے دروازہ کھولا اور سامنے بیگ کو کھڑے دیکھ کر میرے جوش و خروش کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ وہ میرے تاثرات سے بھانپ گیا۔ ''کیا بات ہے شہباز صاحب! کیا آپ کو کسی اور کا انتظار تھا؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کل سے ایک ہی صورت دیکھ دیکھ کر تھک گیا تھا۔ یہ بتائیں کہ اس مجبور کا خیال کیوں آیا؟''

''میں ایک بار پھر بتا دوں، آپ راجا صاحب کے معزز مہمان ہیں۔ انہوں نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔''
''شکر ہے انہیں میری یاد آئی۔'' میں نے کہا۔
بیگ مجھے مہمان خانے سے محل کے ایک کمرے میں لایا، جہاں راجا عمر دراز کشمیری شال اوڑھے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے نزدیک ہی رکھے دھانی حقے کی چلم سے خوشبودار دھواں اٹھ رہا تھا۔ بے حد سنجیدہ تاثرات کے ساتھ اس نے مجھے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے حقہ گڑگڑاتا رہا پھر اس نے کہا۔
''شہباز مجھے پتا ہے تم اس طرح روکے جانے پر مجھ سے ناراض ہو لیکن بس چند دن کی بات ہے، مسئلہ تقریباً حل ہونے والا ہے۔ برٹ شا اور اس کی بیٹی میرے قبضے...... میں ہیں۔''
''راجا صاحب...... مجھے اب واپس جانا ہے۔ میں اپنے گھر والوں کی طرف سے پریشان ہوں۔ وہ تو مجھے رو دھو چکے ہوں گے۔ آپ کے معاملات سے میرا کیا تعلق ہے اور اگر آپ کو خدشہ ہے کہ میں اس جگہ سے باہر جا کر کسی کو آپ کے رازوں کے بارے میں بتا دوں گا تو میں یقین......''
''برخوردار...... ذرا صبر کرو۔'' راجا نے میری بات کاٹ کر سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''مجھے تمہاری طرف سے کوئی خدشہ نہیں ہے۔ خدشہ اپنے دشمنوں کی طرف سے ہے۔ وہ تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔''
''کیسے دشمن...... برٹ شا تو آپ کی قید میں ہے؟''
''صرف برٹ شا ہی نہیں ہے اس کے اور ساتھی بھی ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ہے۔ آج صبح پولیس کا ایک دستہ میرے محل کی تلاشی لینے آیا تھا۔ انہیں برٹ شا اور رایمن کی تلاش تھی۔''
میں حیران ہوا۔ ''پھر آپ مشکل میں پڑ گئے ہوں گے۔ پولیس کے دستے نے تلاشی لی؟''
''نہیں، وہ وارنٹ کے بغیر آئے تھے۔ میں نے تلاشی دینے سے انکار کر دیا۔'' راجا مسکرایا۔ ''ان کی جرأت نہیں تھی کہ زبردستی میرے محل میں داخل ہوتے۔''
''اس کا مطلب یہ ہوا کہ برٹ شا کے ساتھی اسے چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''
''ہاں اور اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ میں تمہیں اس لئے محل سے جانے نہیں دے رہا کہ تم میرے پاس برٹ شا کی موجودگی سے واقف ہو بلکہ میں تمہیں ان دشمنوں سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ وہ میرے محل کی نگرانی کر رہے ہیں اور تم اگر باہر گئے تو پہلے کی طرح غائب ہو جاؤ گے۔''
راجا کی بات نے مجھے ایک بار پھر الجھن میں ڈال دیا تھا اگر وہ درست کہہ رہا تھا تو...... میں اس کی بات کی تصدیق کرنے سے قاصر تھا۔ راجا عمر دراز نے میری طرف دیکھا۔ ''شاید تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے لیکن یقین کرو میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا۔''
''مجھے شرمندہ مت کریں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ دراصل زندگی میں کبھی ایسی سچویشن سے واسطہ نہیں پڑا ہے اس وجہ سے پریشان ہوں۔''
''اس جگہ اور میری پناہ میں ہوتے ہوئے تمہیں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ بس تمہیں چند دن اس جگہ رکنا ہوگا۔''

"کتنے دن راجا صاحب؟"

"میں ابھی اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اس کا انداز ٹالنے والا تھا۔

اس سے پہلے میں کچھ کہتا وہی رات والی خادمہ ٹرے اٹھائے کمرے میں آئی۔ اس نے ٹرے سامنے میز پر رکھتے ہوئے اپنی فسوں خیز نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھا۔ چند لمحے تک وہ اسی طرح دیکھتی رہی پھر سر جھکا کر قہوہ بنانے لگی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ نظروں ہی نظروں میں منع کر رہی ہو کہ راجا کی بات پر یقین نہ کروں۔ اس نے قہوہ تیار کر کے پیالیاں راجا اور مجھے دیں اور جس طرح خاموشی سے آئی تھی اسی طرح خاموشی سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے راجا سے پوچھا۔

"راجا صاحب...... آپ کے محل کے تمام خادم مرد ہیں پھر یہ واحد عورت......"

"یہ خادمہ نہیں ہے۔ ایک طرح سے تم اسے میری پناہ میں سمجھ سکتے ہو۔ اس کا باپ ایک شکار کے دوران اتفاقاً میری گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس بچی کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا اس لئے میں اسے اپنے ساتھ لے آیا، اس کی اچھی پرورش کی ہے۔ محل کے کام یہ اپنے شوق سے کرتی ہے، اس پر کسی قسم کی کوئی ذمے داری نہیں ہے۔"

میں چونکا تھا۔ کل رات سے اب تک یہ وجہ میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ اتنی خوبصورت اور منفرد نظر آنے والی لڑکی فتح خان کا ساتھ کیوں دے رہی تھی؟ اب پتا چلا، راجا عمر دراز اس کے باپ کا قاتل تھا اور وہ انتقامی جذبے کے تحت فتح خان کی مدد کر رہی تھی۔ راجا اپنے طور پر اس پر احسان کر کے مطمئن تھا اور اس نے غالباً سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ لڑکی اس کے دشمنوں سے ملی ہوئی ہے۔ میں نے دبی زبان میں کہا۔ "راجا صاحب، اس کا باپ آپ کے ہاتھوں مارا گیا تھا، اس لڑکی کے دل میں آپ کے خلاف جذبات نہیں ہوں گے؟"

راجا عمر دراز چونکا۔ "یہ بات تم کیوں کہہ رہے ہو؟" اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ایسے ہی، بس ایک خیال آ گیا تھا۔"

راجا اپنی پیالی اٹھا کر قہوہ نوش کرنے لگا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ قہوہ ختم ہونے تک کمرے میں خاموشی رہی تھی۔ میں نے پیالی میز پر رکھی۔ "راجا صاحب! آپ نے ایمن کے بارے میں کہا تھا، اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ آرام سے رہے گی۔"

"مجھے اپنی بات یاد ہے اور میں ویسے بھی عورت پر ہاتھ اٹھانے کے خلاف ہوں۔"

"راجا صاحب...... کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟" میں نے درخواست کی تو راجا ہنسا تھا۔

"لگتا ہے اسے دیکھے بغیر تمہاری تسلی نہیں ہوگی۔"

"آپ نے درست کہا ورنہ مجھے آپ پر مکمل اعتبار ہے۔"

راجا عمر دراز نے اپنی زبان میں سیکرٹری بیگ سے کچھ کہا۔ بیگ کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے راجا کی بات پسند نہیں آئی۔ اس نے جواب میں کچھ کہا لیکن جب راجا نے تحکمانہ انداز اختیار کیا تو وہ چپ ہو گیا تھا۔ راجا نے میری طرف دیکھا۔ "تم اس کے ساتھ جا کر ایمن کو دیکھ سکتے ہو لیکن زیادہ دیر مت رکنا۔"

سیکرٹری بیگ بادل نخواستہ مجھے لے کر نکلا۔ اس کا رخ تہ خانے کی طرف تھا۔ غالباً وہ مجھے ایمن سے ملوانے کے حق میں نہیں تھا مگر جب راجا نے زور دیا تو مان گیا۔ مجھے فکر لاحق ہونے لگی کہ بیگ قید خانے میں ہم

سر پر مسلط رہے گا تو میں برٹ شا سے سیاہ ڈبے کے بارے میں کیونکر معلوم کروں گا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے بیگ سے انگریزی میں پوچھا۔ "ہاؤ مینی ایئرز یو سرو فار راجا؟" وہ بری طرح چونکا تھا۔

"کیا کہا جناب آپ نے؟" اس نے دریافت کیا۔

"میں نے پوچھا آپ کتنے عرصے سے راجا صاحب کے ساتھ ہیں؟"

اس نے سرد آہ بھری۔ "یہ نہ پوچھیں جناب! یوں سمجھیں کہ میرا خاندان راجا کے خاندان کا پشتینی خدمت گار ہے۔"

مجھے اطمینان ہو گیا کہ اسے انگریزی زبان نہیں آتی ہے۔ اب میں اس کے سامنے بھی برٹ شا سے کھل کر بات کر سکتا تھا۔ بشرطیکہ کوئی اور انگریزی دان وہاں موجود نہ تھا۔ تہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر ہم نیچے آئے۔ میرا خیال تھا کہ برٹ شا اور ایمن پوچھ گچھ والے کمرے میں ہوں گے لیکن بیگ ایک اور کمرے کے سامنے رکا۔ اس کے آگے دو محافظ کھڑے تھے۔ بیگ نے اپنی زبان میں انہیں دروازہ کھولنے کا حکم دیا کیونکہ ان میں سے ایک نے چابیوں کا گچھا نکال کر دروازے کا لاک کھول دیا تھا۔ میں اور بیگ کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ اے کلاس سیل روم تھا یہاں وہ قیدی رکھے جاتے تھے جنہیں آرام دینا مقصود ہو۔ کمرے میں آرام دہ فرنیچر تھا۔ دو بستر تھے، برٹ شا کمبل اوڑھے سو رہا تھا اور ایمن چپ کر کے بیٹھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے پہلے تو توجہ نہیں دی پھر چونک کر اٹھی اور لپک کر میرے پاس آئی۔

"شوباز۔" اس نے پُر جوش لہجے میں میرے نام کی مٹی پلید کی۔ "تم یہاں کیسے؟"

"تم بھول رہی ہو، میں نے بتایا تھا کہ میں راجا کا مہمان ہوں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"شوباز...... پلیز تم راجا سے کہو ہمیں جانے دے، میں نے پاپا کو راضی کر لیا تھا، وہ اب راجا سے نہیں الجھیں گے، راجا نے بلاوجہ ہمیں پکڑوا دیا ہے۔"

"میں کوشش کروں گا کہ راجا تمہارے پاپا کو معاف کر دے اور تمہیں جانے دے۔" میں نے کہا۔

"تھینک یو۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ "مجھے یقین ہے راجا تمہاری بات مان لے گا۔"

وہ عملی طور پر شکریہ ادا کرنے کے لئے آگے آئی تو میں بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔"

"لڑکے...... اس نادان لڑکی کو بے وقوف مت بناؤ۔" برٹ شا کی آواز آئی، وہ کمبل چھوڑ کر بستر سے اتر آیا تھا۔ اس کے اٹھتے ہی بیگ نے بے حد پھرتی سے اپنے ہولسٹر سے ایک عدد ریوالور نکال لیا مگر برٹ شا اس کی طرف توجہ دیئے بغیر میرے قریب آیا۔ "راجا او مرڈ راز...... ہمیں کبھی نہیں چھوڑے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔"

"ایسا بالکل ممکن ہے۔" میں نے بیگ کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ وہ ہماری گفتگو سے بے نیاز نظر آ رہا تھا اگرچہ مجھے سو فی صد یقین نہیں تھا کہ بیگ انگریزی سے نابلد ہے۔ وہ اردو اتنی اچھی بولتا تھا تو انگریزی بھی جان سکتا تھا لیکن مجھے خطرہ مول لینا تھا، ممکن ہے مجھے دوبارہ موقع نہ ملتا۔

"وہ کیسے نوجوان؟" برٹ شا نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"فتح خان نے پوچھا ہے کہ سایہ ڈبا کہاں ہے؟ اس سوال کے جواب پر تم لوگوں کے یہاں سے نکلنے کا انحصار ہے۔" فتح خان کے نام پر وہ چونکا اور سیاہ ڈبے کے ذکر پر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا لیکن اس سے پہلے

کہ وہ کچھ کہتا بیگ چمک کر بولا۔

''تم نے فتح خان کا نام کیوں لیا ہے؟''

''میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ فتح خان کو خرید کر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ راجا صاحب کے محل میں نقب لگا سکے گا۔''

''شہباز صاحب! بس آپ چلیں...... راجا صاحب نے زیادہ رکنے کی اجازت نہیں دی ہے آپ کی تسلی ہو گئی ہوگی۔'' اس نے بے رخی سے کہا۔

''بس ایک منٹ۔'' میں نے کہا اور اب ظاہر ہے ایمن سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے جلدی سے میرے سوال کا جواب دو...... میں اب نہیں رک سکتا۔''

برٹ شا کچھ دیر تولنے والی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر مسکرایا۔ ''اسے کہہ دینا...... سیاہ ڈبا میرے پاس ہے۔''

''یہ کیا بک رہا ہے؟'' بیگ نے ایک بار پھر مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''اپنی بے گناہی پر اصرار کر رہا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''بے گناہی!'' بیگ تلخی سے بولا۔ ''اس شخص نے سازشوں کا جو جال پھیلایا، اس میں الجھ کر کئی افراد کی جان جا چکی ہے۔ شینا اور اس محل کے دو محافظ تمہارے سامنے مارے جا چکے ہیں، یہ شخص کس منہ سے خود کو بے گناہ کہتا ہے!''

''فی الحال تو اسی منہ سے کہہ رہا ہے۔'' میں نے شانے اچکائے اور ایمن سے بولا۔ ''فکر مت کرو، میں تمہیں یہاں سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''نوجوان...... اپنے قد سے اونچی بات مت کرو۔'' برٹ شا کہتا ہوا دوبارہ بستر پر جا لیٹا۔

''پاپا کی بات کا برا مت منانا۔'' ایمن نے معذرت کی تھی۔

سیکرٹری بیگ کچھ زیادہ ہی فکرمند لگ رہا تھا اس لئے میں نے ایمن کو خدا حافظ کہا اور بیگ کے ساتھ باہر آ گیا۔ ہمارے باہر نکلتے ہی محافظ نے دروازہ لاک کر دیا تھا۔ سیکرٹری بیگ برہم نظر آ رہا تھا۔ ''آپ کو ان سے بات نہیں کرنی تھی۔''

''صرف خیریت پوچھ رہا تھا۔''

''یہ راجا صاحب کے دشمن ہیں۔ ان سے زیادہ بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔'' وہ کراہت سے بولا۔ میں نے چپ رہنے میں عافیت سمجھی۔ بیگ بہت عیار آدمی تھا، وہ مجھ پر شک کر سکتا تھا اور اگر اسے شک ہو جاتا تو وہ مجھ پر نگرانی لگا سکتا تھا۔ وہ مجھے واپس راجا عمر دراز کے پاس لایا اور اسے رپورٹ دی۔ راجا خاموشی سے سنتا رہا پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''شہباز تم نے برٹ شا سے کیا بات کی تھی؟''

میں نے اسے بھی وہی بتایا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے تمہیں صرف تمہاری تسلی کے لئے بھیجا تھا لیکن یہ مت بھولو کہ برٹ شا میرا دشمن ہے۔''

''اس کی بیٹی سے تو آپ کی کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر واپس لے جا رہی تھی۔

برٹ شانے آپ کے نوادرات کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔ آپ انہیں معاف کر کے جانے دیں۔'' میں نے عاجزی سے درخواست کی۔

راجا عمر دراز مسکرایا۔''تم اور وہ لڑکی ایمن ابھی بچے ہو۔ برٹ شا جیسا مکار اتنی آسانی سے مان جائے میں مان ہی نہیں سکتا۔ اسے ان نوادرات کے لئے اپنی اولاد بھی قربان کرنی پڑی تو وہ ہنسی خوشی کر دے گا۔ اس قسم کے کاموں میں اپنی اولاد کو کون ملوث کرتا ہے! اس کے باوجود برٹ شاہ اپنی لڑکی کو لے آیا...... بات یہ ہے برخوردار! ان نوادرات کو حاصل کرنا اس کے خاندان کی انا کا مسئلہ ہے وہ پھر کوشش کرے گا اور یہ اس کی پہلی کوشش نہیں ہے اس سے پہلے بھی وہ کئی بار ان چیزوں کو حاصل کرنے کی کوشش کر چکا ہے۔ ایک بار اس نے مجھ سے براہِ راست رابطہ کر کے ان چیزوں کی منہ مانگی قیمت دینے کو کہا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔''

''جناب مجھے نہیں معلوم ان چیزوں کی اہمیت کیا ہے؟ آپ مہربانی کر کے مجھے جانے دیں۔ میں اپنے رسک پر چلا جاتا ہوں اگر میرے ساتھ کچھ ہوا تو آپ پر اس کی ذمے داری نہیں ہوگی۔''

''یہ ممکن نہیں ہے برخوردار! وہ لوگ تمہیں یرغمال بنا کر مجھ سے مطالبہ کریں گے اور میں پہلے کی طرح ان کا مطالبہ ماننے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ شینا کو چھوڑنا...... برٹ شا کو رہا کرنے کی نسبت مشکل فیصلہ تھا کیونکہ وہ وادی کے رسم و رواج اور قانون کی مجرم تھی۔ برٹ شا صرف میرا دشمن ہے۔ اس لئے میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ جب تک میں اس کا فیصلہ نہیں کر لیتا تمہیں میرے پاس ہی رہنا ہوگا۔ اس محل کی حد میں تم آزاد ہو۔''

''لیکن صرف دن میں؟'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''ہاں رات کی پابندی میں نے فتح خان کی وجہ سے لگائی ہے۔ وہ اس محل کے خفیہ راستوں سے واقف ہے اور رات کو خطرے کی وجہ سے سوائے محافظوں کے کوئی باہر نہیں رہ سکتا ہے۔ تمہارا تو وہ ویسے ہی جانی دشمن ہے۔''

میں چپ رہا۔ اسے کیسے بتاتا کہ رات کی تاریکی میں فتح خان آزادانہ محل میں آیا تھا اور اس نے مجھ سے ملاقات کی تھی، محل میں اس کے وفادار تھے۔ ایک خادمہ کو تو میں جانتا تھا اور نہ جانے کون کون تھا جسے میں جانتا بھی نہیں تھا۔ مجھے راجا عمر دراز کی خوش فہمی پر ترس آنے لگا۔ وہ اپنے محل کو محفوظ سمجھتا تھا حالانکہ یہاں آنے کے ایسے چور راستے بھی تھے جن سے وہ خود بھی واقف نہیں تھا۔ اس کے آدمی جن پر وہ پوری طرح بھروسا کرتا تھا وہ اس سے غداری کر رہے تھے۔ بہر حال اس نے جس قطعی لہجے میں مجھے جانے کی اجازت دینے سے انکار کیا تھا میرے اندر خدشات بڑھنے لگے تھے۔

کمرے سے واپس آ کر میں خاصی دیر تک جاگتا رہا میرا خیال تھا کہ خادمہ مجھ سے فتح خان کے سوال کا جواب لینے آئے گی، وہ مجھے راجا عمر دراز کے ساتھ دیکھ چکی تھی اور ممکن ہے برٹ شا اور ایمن سے ملاقات بھی اس کی نظر میں ہو مگر وہ نہیں آئی۔ نیند آئی اور میں سو گیا۔ صبح اٹھ کر دوسرے معمولات اور ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے باہر باغ کا رخ کیا۔ آج راجا عمر دراز چبوترے پر نظر آ رہا تھا، سیکرٹری بیگ اس کے پاس تھا میں چبوترے کی طرف بڑھا تو وہ عجلت میں لپک کر نیچے آیا۔

''جناب...... راجا صاحب اس وقت کسی معاملے میں سوچ رہے ہیں اور ایسے وقت کسی کی مداخلت پسند

نہیں کرتے، مہربانی فرما کر آپ کچھ دیر انتظار کریں۔"

"نو پرابلم۔" میں نے کہا۔

"کیا فرمایا؟" وہ بولا اور پھر شکوہ کیا۔ "آپ اکثر انگریزی بول جاتے ہیں۔"

"عادت پڑ گئی ہے۔ معذرت کے ساتھ۔ میرا مطلب ہے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں بھی صرف سلام کرنے جا رہا تھا۔"

"جب راجا صاحب فارغ ہوں گے تو آپ کو بلا لیں گے۔"

"کیا برٹ شا کے بارے میں......؟" میں نے پوچھنا چاہا۔

"راجا صاحب اپنے معاملات کسی کو نہیں بتاتے۔" بیگ نے میری بات کاٹی۔ "اور براہِ کرم اب یہ نام دوبارہ زبان پر مت لائیے گا۔"

مجھے بھی معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ برٹ شا راجا کا دشمن ہی نہیں تھا اس کے لئے بہت بڑا مسئلہ بھی تھا۔ مجھے اس معاملے میں زبان کھولتے ہوئے محتاط رہنا تھا۔ میں بیگ کے ساتھ پھولوں کے تختوں کے درمیان ٹہلتا رہا تھا۔ وقفے وقفے میں راجا کی طرف دیکھتا تھا۔ شروع میں جو بے تکلفی دکھائی تھی وہ اب اس کے انداز میں نظر نہیں آتی تھی۔ میرے لئے وہ سچ مچ کا راجا بن گیا تھا۔ آخر بیگ پلٹ کر آیا۔

"راجا صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

راجا عمر دراز اس وقت بہت سنجیدہ تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ راجا سر جھکائے کسی سوچ میں گم تھا۔ بیگ اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا تھا۔ خاصی دیر بعد راجا نے سر اٹھایا۔

"شہباز معاملات خراب ہو رہے ہیں۔ میں نے برٹ شا اور اس کی بیٹی کو یہاں سے منتقل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"جی!" میں نے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یہ بات مجھے کیوں بتا رہا تھا۔

"تم بھی ان کے ساتھ جاؤ گے۔" راجا نے میری الجھن بھانپ کر کہا۔

میں چونکا۔ "وہ کیوں راجا صاحب؟"

"مجھے اطلاع ملی ہے اس بار پولیس سرچ وارنٹ کے ساتھ آئے گی اور اگر تمہیں دیکھا تو بعد میں بھی پریشان کر سکتے ہیں اس لئے تمہارا بھی محل سے جانا ضروری ہے۔"

"آپ مجھے کہاں بھیج رہے ہیں؟" میں فکر مند ہو گیا تھا۔ اگر راجا عمر دراز ہمیں کہیں اور بھیج دیتا تو فتح خان کا منصوبہ دھرا رہ جاتا۔

"ایک محفوظ جگہ ہے۔" راجا عمر دراز بولا۔ "وہاں تم اور میرے قیدی آرام سے رہو گے۔"

راجا عمر دراز فیصلہ کر چکا تھا۔ برٹ شا تو اس کا اعلانیہ قیدی تھا، میں غیر اعلان شدہ قیدی تھا جسے بعض مراعات اور مہمانوں کا سا طعام، قیام حاصل تھا۔ میں صرف دبے انداز میں احتجاج کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے واضح طور پر انکار نہیں کر سکتا تھا۔ "ہمیں کب جانا ہوگا؟" میں نے بے بسی سے پوچھا۔

"کسی وقت بھی۔" راجا کے بجائے بیگ نے کہا تھا۔ "آپ تیار رہیں، ذہنی طور پر۔"

راجانے نے مجھے اپنے ساتھ قہوہ پلایا اور خاصی دیر تک مشفقانہ انداز میں گفتگو کرتا رہا لیکن میں اس کے انداز میں صاف طور پر مصنوعی پن محسوس کر رہا تھا۔ شاید وہ بھی میری طرح الجھن کا شکار تھا۔ اگر میں کھل کر جانے کا مطالبہ کر دیتا تو اسے مجبوراً مجھے بھی برٹ شا کی طرح قید کرنا پڑتا۔ اتنا تو میں بھی جان گیا تھا کہ وہ مجھے کسی صورت جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ کچھ دیر بعد راجا عمر دراز اٹھ کر اندر چلا گیا اور میں نے مہمان خانے کا رخ کیا۔ فتح خان کو اس تبدیلی سے آگاہ کرنا ضروری تھا اور اس سے رابطے کا واحد ذریعہ خادمہ تھی مگر وہ کبھی مجھے مہمان خانے یا محل سے باہر بھی نظر نہیں آئی تھی۔ مہمان خانے میں اپنے کمرے میں آ کر میں کچھ دیر مضطربانہ انداز میں کمرے کے چکر لگاتا رہا پھر میں نے محل میں جانے کا فیصلہ کر لیا، ممکن ہے راجانے مجھ پر سے محل میں جانے کی پابندی اٹھالی ہو۔

خوش قسمتی سے مہمان خانے کے محافظ نے مجھے محل میں جانے سے نہیں روکا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھ پر سے پابندی اٹھالی گئی تھی۔ محل کے نچلے حصے میں سب کچھ میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں نے سب سے پہلے کچن اور طعام گاہ کا رخ کیا۔ خادمہ کے وہاں پائے جانے کے امکانات تھے مگر وہاں باورچی اور اس کے مددگار کے علاوہ کوئی نہیں تھا، جو دوپہر کا کھانا بنانے میں مصروف تھے۔ ان سے بات کرنا بے کار تھا کیونکہ وہ سوائے مقامی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ میں نے اشارے سے چائے کا کہا۔ باورچی کے نائب نے فوری طور پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا تھا۔ باورچی خانے سے نکل کر میں نشست گاہوں والے حصے میں آیا۔ یہاں کئی قسم کی نشست گاہیں تھیں۔ بعض باہر سے آنے والوں کے لئے تھیں اور ایک صرف راجا اور اس کے خاص مہمانوں کے لئے مخصوص تھی۔ اس نشست گاہ میں کل رات اس نے مجھے شرف باریابی بخشا تھا۔ نشست گاہیں بھی خالی تھیں جب میں نے راجا عمر دراز کی خاص نشست گاہ میں جھانکا تو مجھے ایک چادر پوش عورت گلدان میں تازہ پھول رکھتی نظر آئی۔ اس کا چہرہ نمایاں نہیں تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور آہستہ سے کھنکارا تو وہ پھرتی سے مڑی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا وہ خادمہ ہی تھی لیکن اس سے پہلے میں کچھ کہتا اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں کوئی تھا اور میرا بولنا نامناسب ہوتا۔ وہ تیزی سے میرے پاس آئی اور سرگوشی میں بولی۔

''ابی جاؤ۔ ام تومارے کمرے میں آتا۔''

''کب تک؟ مجھے ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے بھی سرگوشی میں کہا۔

''ام کو معلوم اے۔'' وہ فتح خان کی طرح گلابی اردو بول رہی تھی۔ شروع میں مجھے اس کے بارے میں شبہ ہوا تھا کہ وہ گونگی ہے یا اردو نہیں جانتی مگر اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اسے اچھی خاصی اردو آتی ہے۔

''اب تو م جاؤ۔'' اس نے مجھے دھکیلا، وہ میرے اتنے نزدیک آ گئی تھی کہ میں اس کی مہک کے ساتھ اس کے ہوشربا وجود کی گرمی بھی محسوس کر سکتا تھا۔

''دیر مت کرنا۔ ایسا نہ ہو راجا مجھے کہیں اور بھیج دے۔'' میں نے آہستہ سے کہا اور جلدی سے وہاں نکل آیا۔ باورچی خانے میں جانے کے بجائے میں نے مہمان خانے کا رخ کیا تھا۔ کوئی میرے لئے چائے رکھ گیا تھا۔ میں نے گرم کیتلی سے چائے کپ میں ڈال کر بنائی اور اس کے سپ لیتے ہوئے خادمہ کا انتظار کرنے لگا۔

میرا خیال تھا کہ وہ جلد آئے گی مگر دو کپ چائے پینے اور ایک گھنٹے تک انتظار کرنے کے باوجود وہ نہیں آئی تھی اس کے بجائے دوپہر کا کھانا آ گیا تھا۔ مجھے بھوک نہیں تھی، اس کے باوجود میں نے کھالیا کہ نہ جانے آگے کیا حالات پیش آئیں اور اگلا کھانا کب نصیب ہو، یا مجھے بھی برٹ شا کے ہمراہ کسی عقوبت خانے میں ڈال دیا جائے جہاں کھانے میں صرف گالیاں اور مار ہو۔ ملازم کھانا دے کر چلا گیا تھا اور برتن لینے خادمہ آئی تھی۔ میرے سامنے سے برتن سمیٹتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ ''توم کیا بولتا اے؟''

''فتح خان سے کہنا کہ مجھے اور برٹ شا کو اس کی بیٹی سمیت محل سے کہیں اور بھیجا جا رہا ہے۔ آج جانا ہے اور کسی وقت بھی روانگی ہو سکتی ہے۔''

''ام بتا دے گا۔'' اس نے بغیر کسی تاثر کے کہا اور برتن لے کر چلی گئی۔

میں نے اس کی قسمت پر افسوس کیا۔ وہ اس قابل تھی کہ کسی محل میں رانی ہوتی لیکن وہ راجا عمر دراز کے محل میں محض ایک خادمہ تھی۔ بہرحال میں صرف افسوس ہی کر سکتا تھا اور وہ بھی چند لمحے کے لئے کیونکہ مجھے اپنی پڑی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے نہ جانے کہاں بھیجا جانے والا تھا۔ خادمہ کے جانے کے کوئی گھنٹے بھر بعد راجا عمر دراز کی طرف سے بلاوا آیا تھا۔ وہ اپنی مخصوص نشست گاہ میں موجود تھا اور اس کے لباس سے لگ رہا تھا کہ وہ کہیں باہر جانے کے لئے تیار ہے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''برخوردار تیار ہو جاؤ۔ ہمیں چلنا ہے۔''

''میرا سامان......''

''اس کی فکر مت کرو، اب تک پہنچ چکا ہوگا۔''

راجا عمر دراز مجھے لے کر نکلا اس کے ساتھ ایک محافظ بھی تھا۔ ایک جگہ رک کر راجا نے محافظ سے کچھ کہا اور مجھ سے بولا۔ ''برخوردار مجھے افسوس ہے۔ آگے چلنے سے پہلے تمہیں اپنی آنکھوں پر پٹی بندھوانی پڑے گی۔''

''یعنی آپ نہیں چاہتے کہ میں اس راستے کو دیکھوں جس سے ہم جائیں گے۔''

''تم ذہین آدمی ہو۔'' راجا بولا اور اس کے اشارے پر محافظ نے میری آنکھوں پر ایک رومال باندھ دیا جس سے نسوار کی بو آ رہی تھی۔ وہی میرا ہاتھ تھام کر چلنے لگا۔ میں نے اپنے پیروں تلے ڈھلانی راستہ محسوس کیا یہاں گھٹن سی تھی جیسے ہم کسی بند جگہ سے گزر رہے ہوں کچھ دیر بعد مجھے حیوانی بو محسوس ہوئی تھی اور پھر گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ محافظ نے سہارا دے کر مجھے گھوڑے پر سوار کرایا اور گھوڑا چلنے لگا۔ ٹاپوں کی گونج سے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کسی سرنگ میں سفر کر رہے ہوں اور سفر کرنے والے کئی تھے کیونکہ زیادہ ٹاپوں کی آواز میری سماعت تک آ رہی تھی۔ کوئی دس منٹ تک گھوڑے اسی طرح چلتے رہے۔ مجھے تعجب ہونے لگا اگر یہ سرنگ ہی تھی تو کتنی طویل تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم نے اس طرح چلتے چلتے کوئی ایک میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا پھر گھوڑے رکے اور میں نے پتھر سرکنے جیسی آواز سنی۔ محافظ نے مجھے نیچے اترنے کو کہا اور پھر میرا بازو تھام کر چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ ہم کھلی فضا میں آ گئے ہیں۔ درختوں کی مہک آ رہی تھی لیکن محافظ نے رکنے یا مجھے پٹی اتارنے کی اجازت نہیں دی پھر میں نے راجا عمر دراز کی آواز سنی۔ ''ان کی پٹیاں اتار دو۔''

پٹی اترتے ہی ایک لمحے کے لئے میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ رفتہ رفتہ میں دن کی تیز روشنی کا عادی ہونے لگا۔ ایک کھلی جگہ ہم چھ افراد تھے یعنی میں، راجا عمر دراز، برٹ شا، ایمن اور دو عدد مسلح محافظ۔ ان میں سے

ایک چوکس کھڑا تھا اور دوسرا چھ عدد گھوڑے لا رہا تھا میں نے پہلی بار دیکھا ایمن اور برٹ شا کے منہ ٹیپ چپکا کر بند کر دیئے گئے تھے اور ان کے ہاتھ سامنے کی طرف رسی سے بندھے تھے اور اس رسی کا ایک سرا ان کے بائیں پیروں میں گھٹنوں سے نیچے اس طرح بندھا تھا کہ وہ منہ تک ہاتھ لے جا کر ٹیپ نہیں اتار سکتے تھے۔ یہ کام وہ صرف بیٹھ کر، کر سکتے تھے مگر انہیں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک مسلح محافظ ان کے سروں پر مسلط تھا۔ گھوڑے آتے ہی محافظوں نے انہیں گھوڑوں پر بٹھایا پھر ہم سب بھی سوار ہوئے۔ راجا عمر دراز کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے ایک محافظ تھا اس کے بعد میں اور میرے عقب میں برٹ شا اور ایمن تھے جب کہ ایک محافظ عقب میں تھا۔ میں نے دیکھا ہم ایک ڈھلان پر کھڑے تھے۔ سورج کے رخ سے میں نے اندازہ لگایا کہ راجا کا محل اس پہاڑ کے دوسری طرف تھا اور ہم سرنگ سے گزر کر براہِ راست اس طرف آ گئے تھے۔ راجا کے محل سے آنے والا یہ راستہ ایسی جگہ نکلتا تھا کہ اس کے دشمن اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ نہ جانے وہ سرنگ قدرتی تھی یا بنائی گئی تھی۔ امکان یہی تھا کہ سرنگ قدرتی تھی ورنہ ان سخت پہاڑوں میں سرنگ بنانا اور وہ بھی کوئی میل بھر بے حد مشکل کام تھا۔

اس وقت ہم ڈھلان سے اتر کر ایک درّے میں سے گزر رہے تھے۔ سورج مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا۔ راستہ ایسا نہیں تھا کہ اس پر گھوڑے دوڑائے جا سکتے اس لئے سفر بے حد سُست رفتاری سے جاری تھا۔ ایک گھنٹے بعد درّہ عبور کر کے ہم نے ایک چھوٹی سی وادی میں قدم رکھا تھا جس کے چاروں طرف اونچے پہاڑ تھے، بے حد گھنے جنگل تھے۔ وادی کے وسط میں اونچی گھاس والے میدان میں اوپر برف سے پگھل کر آنے والا خوشبودار پانی بہہ رہا تھا۔ ایک بار میں نے گھوڑے سے اتر کر پانی پیا تو یوں محسوس ہوا جیسے آبِ حیات پی لیا ہو۔ اس جیسا پانی میں نے پھر نہیں پیا۔ سورج ڈوبنے کے قریب تھا جب ہم نے وادی سے باہر نکلنے والے درّے کو عبور کیا۔ دور نشیب میں گھنے جنگل سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ راجا عمر دراز نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ’’ہمیں وہاں تک جانا ہے، تم تھکے تو نہیں ہو؟‘‘

یہ سچ تھا اتنے دن۔ سدا اتنے دشوار راستوں پر گھڑ سواری کرنے سے میرا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا اور میرے لئے سیدھا بیٹھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ میرے مقابلے میں راجا عمر دراز کسی مجسمے کی طرح ساکت اور پُرسکون انداز میں گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ اس عمر میں اس کا اسٹیمنا اور جسم کی مضبوطی قابلِ رشک تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے گھوڑا آگے بڑھایا تھا کہ اوپر سے فائر کی آواز آئی اور میرے عقب میں موجود محافظ چیخ مار کر گھوڑے سے گر گیا۔ گھوڑے بدک رہے تھے اور ہم انہیں قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسرے محافظ نے اس سمت رائفل سے فائر کئے جس طرف سے گولی آئی تھی اوپر سے پھر گولی چلی اور میں نے دوسرے محافظ کو گولی کھا کر گرتے دیکھا۔ میں گھوڑے سے اتر آیا۔ راجا عمر دراز پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بظاہر غیر مسلح تھا۔ برٹ شا اور ایمن دم بخود سے ساکت بیٹھے تھے۔

’’راجا......‘‘ میں نے فتح خان کی آواز سنی اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ راجا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اس نے چیخ کر جواب میں کچھ ارشاد فرمایا۔ ظاہر ہے وہ فتح خان کو سخت سُست سنا رہا تھا۔ دونوں کے درمیان بلند آواز سے تبادلۂ خیال جاری رہا تھا۔ ایمن اپنا گھوڑا آگے میرے پاس لے آئی تھی۔ ’’یہ لوگ کیا بات کر رہے

ہیں؟ آواز فتح خان کی لگ رہی ہے۔''

''یہ فتح خان ہی ہے لیکن ان میں کیا گفتگو ہو رہی ہے، میں اتنا ہی ناواقف ہوں جتنا کہ تم۔ میں ان کی زبان نہیں سمجھتا۔''

''میرا خیال ہے یہ دونوں مر گئے ہیں۔'' ایمن نے محافظوں کی طرف دیکھا۔

فائرنگ کرنے والا یقینی طور پر مر چکا تھا میں نے اس کے سر پر گولی لگتے دیکھی تھی۔ البتہ پہلا محافظ ابھی زندہ تھا، وہ حرکت کر رہا تھا شاید اسے اتنا مہلک زخم نہیں آیا تھا جو فوری موت کی وجہ بنتا۔ میں نے راجا کو بالآخر ہاتھ بلند کر کے گھوڑے سے اترتے دیکھا۔ اس کے نیچے اترتے ہی فتح خان اور ایک دوسرا شخص نیچے اترنے لگے۔ وہ اوپر چٹانوں میں چھپے ہوئے تھے۔ راجا عمر دراز اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ فتح خان نے کلاشنکوف اٹھا رکھی تھی۔ اس کے ساتھی نے آتے ہی برٹ شا اور ایمن کے ہاتھ اور پاؤں سے رسی کاٹ کر انہیں آزاد کرا لیا تھا۔ فتح خان نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا تو وہ انہیں لے کر اوپر جانے لگا۔ راجا عمر دراز نے دانت پیس کر اپنی زبان میں کچھ کہا تو فتح خان مسکرانے لگا۔ ''اب یہ بھی امارے سات جائے گا۔'' فتح خان نے میری طرف اشارہ کیا۔

''یہ میرا مہمان ہے، اسے ہاتھ لگانے کے لئے تمہیں میری لاش سے گزرنا پڑے گا۔'' راجا عمر دراز غرایا۔

''ام یہ بی کر گزرے گا۔'' فتح خان نے راجا کی طرف رائفل سیدھی کر لی اور اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ سچ مچ راجا عمر دراز کو گولی مار دے گا۔ میں نے جلدی سے مداخلت کی۔

''ایک منٹ فتح خان! میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔''

''شہباز تم نہیں جاؤ گے۔'' راجا زور سے بولا۔

''راجا صاحب! آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں، میں اپنی خوشی سے جا رہا ہوں۔''

راجا عمر دراز نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''خوشی سے...... احمق لڑکے ...... یہ تمہارا دشمن ہے۔''

''مجھے معلوم ہے، آپ میری فکر نہ کریں۔'' میں نے لہجہ مزید روکھا کر لیا۔ ''آپ نے اتنے دن مجھے اپنے پاس رکھا اس کا بے حد شکریہ۔''

''فتح خان! اسے مت لے کر جاؤ۔ میں تمہارے سارے جرم بھول جاؤں گا۔ میرا کوئی آدمی تمہاری تلاش میں نہیں جائے گا۔'' راجا نے نرم لہجے میں کہا۔

''ام اسے لے کر جائے گا زندہ یا مردہ چوڑ کر جائے گا۔'' فتح خان نے گن کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔

''ابی فیصلہ کرو۔''

میں ڈر رہا تھا کہ فتح خان بھانڈا نہ پھوڑ دے کہ میں اس سے ساز باز کر چکا ہوں۔ اس صورت میں راجا عمر دراز کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑتی۔ اگر اس کے عزائم میرے بارے میں درست ہوتے تو اسے زیادہ صدمہ ہوتا لیکن فتح خان نے بالکل درست حربہ استعمال کیا۔ اس وقت میں نے یہ نہیں سوچا کہ فتح خان مجھے بھی لے جانے کے لئے اتنا بے تاب کیوں ہے۔ اصولاً تو کام نکل جانے کے بعد اس کو واپس چلے جانا چاہئے تھا۔ راجا کی قید میں مجھ پر کیا گزرتی ہے اس کی بلا سے۔

''ٹھیک ہے...... لیکن فتح خان اسے ذرا سا بھی نقصان ہوا تو میں دنیا کے آخری سرے تک تمہارا پیچھا

کروں گا۔" عمر دراز نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

"آپ فکر نہ کرو راجا صیب!" فتح خان مکاری سے بولا۔ "ام اسے چوڑ دے گا ابی ام اس کو یرغامال (یرغمال) بنا کر لے جاتا اے۔ اگر تو مارا آدمی امارے پیچھے آیا تو ام اس کا سر میں گولی اتار دے گا۔"

"میں ضمانت دیتا ہوں میرا کوئی آدمی تمہارے پیچھے نہیں آئے گا۔ ان لوگوں کو میں کچھ دن بعد خود چھوڑ دیتا۔ اب ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"ام ضمانت پر بھروسا نئیں کرتا اے...... ام اپنا کام اپنی تسلی سے کرتا اے...... چلو شہباز خان......" اس نے آخری جملہ مجھ سے کہا۔

"میرا نام شہباز ہے...... اس کے ساتھ خان نہیں لگتا ہے۔" میں نے خفگی سے کہا اور اوپر کی طرف قدم بڑھائے۔

"راجا صیب! کوئی شرارت مرارت مت کرنا۔ امارا آدمی اوپر رائفل لئے بیٹھا اے۔"

"میں کبھی دشمن کی پشت پر وار نہیں کرتا۔" راجا عمر دراز تلخی سے بولا۔ "تم تو صرف ایک نمک حرام ہو۔"

فتح خان نے خندہ پیشانی سے گالی سنی اور میرے ساتھ اوپر چڑھنے لگا۔ وہ جان بوجھ کر میرے نزدیک رہا تھا کہ راجا کے پاس کوئی ہتھیار ہو بھی تو وہ فائر نہ کرے۔ ذرا دیر بعد ہم اوپر جا پہنچے تھے یہاں سے ایک بلندی کی طرف جاتی عظیم الشان تہ در تہ ڈھلان کا آغاز تھا جس پر بے حد گھنے اور اونچے درختوں والا جنگل تھا۔ بلندی پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ راجا زندہ محافظ کے ساتھ گھوڑے پر اس طرف جا رہا تھا جہاں اس نے اپنے قید خانے کی نشان دہی کی تھی۔ اس طرف سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ بلندی پر دھوپ تھی اور وادی کے نچلے حصوں میں تاریکی چھا رہی تھی۔ اوپر جاتے ہی فتح خان نے روانگی کا حکم دیا تھا۔ ان کے پاس چار عدد خچر تھے۔ یہ خاصے صحت مند پہاڑی خچر تھے جو اس علاقے میں سفر کرنے کے لئے بے حد موزوں ہوتے ہیں۔ برٹ شا اور ایمن ایک ہی خچر پر سوار ہو گئے تھے جب کہ ایک خچر میرے اور فتح خان کے ساتھی کے حصے میں آیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اوپر آتے ہی فتح خان کا رویہ بدل گیا تھا اور اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے میں اس کا قیدی ہوں۔ خچر پر اس کا ساتھی بھی شاید اس لئے ساتھ بیٹھا تھا کہ میں راستے میں کوئی شرارت نہ کروں۔

ایک خچر خالی تھا۔ فتح خان اپنا خچر برٹ شا کے پاس لے گیا تھا اور وہ آپس میں دبے لہجے میں بات کرنے لگے۔ ان کے اِکا دُکا الفاظ میرے کانوں تک آ رہے تھے۔ فتح خان انگریزی جانتا تھا۔ کئی بار میں نے بلیک بکس کا لفظ سنا لیکن ان کی مجموعی گفتگو نہیں سن سکا تھا۔ میرا اندازہ تھا فتح خان اس بلیک بکس یا سیاہ ڈبے کے بارے میں پوچھ رہا تھا جس کا اس نے مجھ سے بھی ذکر کیا تھا کہ میں برٹ شا سے معلوم کر کے بتاؤں اور اس کے جواب پر ہماری رہائی کا انحصار تھا۔ رفتہ رفتہ برٹ شا اور فتح خان کی آواز بلند اور تند ہونے لگی۔ وہ جھگڑ رہے تھے۔ میں نے برٹ شا کو چلا کر بولتے سنا۔ "تمہارا بلیک بکس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تمہارا پورا معاوضہ تمہیں دے چکا ہوں۔"

"کس کام کا؟" فتح خان زہر خند سے بولا۔ "جس کام کا معاوضہ دیا تھا وہ میں کر چکا ہوں۔ ابھی میں نے تمہیں راجا کی قید سے نکالا ہے۔"

''یہ کام تم نے اپنی مرضی سے کیا ہے۔'' برٹ شا بے پروائی سے بولا۔ ''میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ مجھے اس سے بچاؤ۔ اس لئے معاوضے کی ذمے داری مجھ پر نہیں ہے۔ بے شک تم ہمیں راجا کے حوالے کر دو۔''

''اتنا بے وقوف نہیں ہوں میں اور بلیک بکس میں لے لوں گا کہ تم خود دو گے۔''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ مکمل تاریکی چھانے تک ہم جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ راستہ کسی قدر بہتر تھا لیکن تاریکی میں اس پر سفر کرنا آسان نہیں تھا۔ فتح خان اور اس کے ساتھی نے بڑی ٹارچیں نکال کر روشن کر لی تھیں۔ ان کی روشنی میں سفر جاری رہا۔ کوئی دو گھنٹے بعد فتح خان نے خچر ایک جگہ روکے اور خود اتر کر جھاڑیوں میں غائب ہو گیا تھا۔ اس کا ساتھی نیچے اتر آیا اور پستول نکال کر ہماری نگرانی کرنے لگا۔ فتح خان کوئی دس منٹ بعد آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی فوری ضرورت کے تحت جھاڑیوں میں گیا تھا لیکن باہر آ کر اس نے اپنے ساتھی سے اپنی زبان میں کچھ کہا اور وہ ہمیں پستول کی نوک پر ہانک کر جھاڑیوں میں لے گیا جو اصل میں ایک غار کے دہانے پر تھیں اور اس طرح پھیلی تھیں کہ دہانہ مکمل طور پر چھپ کر رہ گیا تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی سے ہمیں راستہ دکھا رہا تھا۔

غار اندر سے کشادہ تھا اور یہاں ضرورت کا خاصا سامان بھی تھا۔ فتح خان کے ساتھی نے مجھے ایک کونے میں رکھی موم بتیاں روشن کرنے کا حکم دیا۔ ماچس بھی تھی میں نے موم بتیاں روشن کر دیں۔ ایک طرف چند بستر پڑے تھے اور غار کے اندر والے حصے میں خشک راشن پڑا تھا۔ فتح خان کے ساتھی نے خشک راشن سے بھنے ہوئے چنے نکالے اور ایک طرف بیٹھ کر کھانے لگا۔ اس نے ہمیں غار کی دیوار کے ساتھ دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر کے بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے چنے ہمیں دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ برٹ شا نے مجھ سے کہا۔

''کیا تم فتح خان کے ساتھ ہوں؟''

''بد قسمتی سے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''اور اب مجھے لگ رہا ہے میں نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ فتح خان نے مجھ سے کہا تھا وہ مجھے راجا کی قید سے آزاد کرائے گا۔''

''لیکن تم قید میں کہاں تھے؟'' برٹ شا تاسف سے بولا۔ ''تم نے حماقت کی۔''

''ہاں...... لیکن تم ان حالات سے گزرتے جن سے میں گزرا ہوں تو شاید تم بھی فتح خان کے جھانسے میں آ جاتے۔''

''فتح خان سخت بے اعتبار اور کمینہ شخص ہے۔'' برٹ شا نے مجھے آگاہ کیا۔ ''اپنے مفاد کے لئے یہ اپنے باپ کو بھی قربان کر سکتا ہے۔''

''درست کہا تم نے۔'' غار کے دہانے کی طرف سے فتح خان کی آواز آئی وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا وہ سامنے آیا۔ ''خود سوچو جو اپنے باپ کو قربان کر سکتا ہے تمہاری اس کے نزدیک کیا حیثیت ہوگی۔ برٹ، مجھے ہر صورت میں وہ بلیک باکس چاہئے اگر آسانی سے نہیں دو گے تو میں مشکل سے لے لوں گا۔''

''فتح خان، میں نے کہا ناں...... وہ بکس تم کو نہیں مل سکتا ہے۔''

''نا...... نا...... ایسی بات مت کرو جس پر بعد میں قائم نہ رہ سکو۔'' فتح خان کا انداز استہزائیہ تھا۔ ''ابھی

تمہارے پاس کچھ وقت ہے سوچنے کے لئے۔ اس دوران میں سوچ لو۔"

"فتح خان! تم نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ اپنے وعدے کے مطابق مجھے جانے دو۔" میں نے کہا۔

فتح خان چونکا۔ "توم بی اے..... ابی توم سے بی بات کرتا اے۔"

فتح خان اپنے ساتھی کے پاس چلا گیا اور وہ آپس میں آہستہ آواز میں بات کرنے لگا۔ ایمن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں۔ راجا کی قید سے چھڑا کر اس نے ہمیں اپنا قیدی بنا لیا ہے۔"

"مجھ سے بھی اس نے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی مدد کروں تو یہ راجا کی گرفت سے نکال کر مجھے آزاد کر دے گا۔" میں نے جوابی سرگوشی کی۔

"یہ پاپا سے بلیک بکس مانگ رہا ہے۔ پاپا اسے کسی قیمت پر نہیں دیں گے۔"

"بلیک بکس میں کیا چیز ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ایک کالے رنگ کا چوکور دھاتی بکس ہے۔ چھ بائی دو بائی تین انچ کا ہوگا۔ پاپا نے اسے یہاں کسی سے خریدا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کیا ہے لیکن پاپا اسے بہت حفاظت سے رکھتے تھے۔ یہاں سے نکلتے ہوئے جب راجا کے آدمیوں نے ہمیں گھیر لیا تھا تو پاپا نے وہ بکس کہیں چھپا دیا تھا۔"

"ایمن..... کیا بات کر رہی ہو؟" برٹ شا نے اچانک کہا۔

"کچھ نہیں پاپا!" وہ گھبرا گئی تھی۔ "میں ایسے ہی بات کر رہی تھی۔"

برٹ شا اس کے نزدیک آیا اور آہستہ سے بولا۔ "بلیک باکس کا ذکر مت کرنا۔"

فتح خان اور اس کا ساتھی بھنے چنے کھاتے رہے۔ وہاں پانی نہیں تھا پھر فتح خان کا ساتھی ایک گیلن لے کر پانی لینے چلا گیا۔ فتح خان مخالف سمت میں دیوار سے ٹک کر ہماری نگرانی کرنے لگا۔ موم بتیوں کی روشنی میں اس کا منگولوں جیسے نقوش والا چہرہ زیادہ ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ اس نے اچانک کہا۔

"برٹ! تمہیں اپنی بیٹی سے کتنا پیار ہے؟"

"جتنا کسی باپ کو اپنی بیٹی سے ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

فتح خان ہنسا۔ "ابھی میں باپ نہیں بنا ہوں۔ اس لئے مجھے نہیں معلوم..... ایک بیٹی سے اس کا باپ کتنی محبت کرتا ہے۔ مجھے مثال دے کر بتاؤ۔ ایک باپ کو اپنی بیٹی زیادہ پیاری ہوسکتی ہے یا کوئی اور چیز؟" فتح خان کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"برٹ! تمہیں اپنی بیٹی زیادہ پیاری ہے یا وہ بلیک باکس.....؟ تم ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کو لے جا سکتے ہو۔"

"تم.....! تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔" برٹ شا نے زور سے کہا لیکن اس کے لہجے کی لرزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

فتح خان نے اپنے پستول کو نچایا۔ ''برٹ شا طاقت میرے پاس ہے...... میں تمہیں مجبور کر سکتا ہوں۔''

''میری بیٹی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے، کیا یہ تمہاری بیٹی نہیں ہے؟'' فتح خان طنزیہ انداز میں بولا۔ اس نے اچانک اٹھ کر برٹ شا کا گلا پکڑتے ہوئے پستول اس کے ماتھے سے لگا دیا۔ ''برٹ شا! تمہارے پاس سوچنے کے لئے صرف دو گھنٹے ہیں۔ اس کے بعد میں تمہاری بیٹی کو یہاں سے لے کر چلا جاؤں گا۔''

برٹ شا چپ رہا۔ فتح خان نے ایک جھٹکا دے کر اس کا گلا چھوڑ دیا اور اپنی جگہ واپس چلا گیا۔ اس دوران میں ایمن خوف زدہ انداز میں میرا بازو پکڑے رہی تھی۔ فتح خان نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''یہاں مرد کو عورت خریدنی پڑتی ہے۔ جتنی خوب صورت عورت ہوگی اتنی ہی قیمت ملتی ہے۔ کمسن کی قیمت بھی زیادہ لگتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ کوئی بڑا خان تمہاری بیٹی کو اچھے دام میں لے، لے گا پھر یہ ساری عمر اس کی حویلی میں قید رہ کر گزارے گی۔''

''نہیں۔'' ایمن چلائی۔ ''میں مر جاؤں گی۔''

فتح خان ہنسا۔ ''ننھی حسینہ تمہیں مرنے کون دے گا، تم کچھ عرصے بعد عادی ہو جاؤ گی۔ ہر سال بچہ پیدا کرو گی اور خان سے مار کھاؤ گی پھر بھی خوش رہو گی۔''

''بکواس بند کرو۔'' اس بار برٹ شا حلق پھاڑ کر چلایا تھا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

فتح خان نے اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے پاس صرف ایک گھنٹا اور پچاس منٹ ہیں۔ جیسے ہی وقت پورا ہوگا میں تمہاری بیٹی کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا اور اس کے بعد تم کبھی اس کو نہیں دیکھ سکو گے۔''

''پاپا...... پاپا پلیز مجھے اس وحشی سے بچالیں۔'' ایمن نے رونا شروع کر دیا۔ ''میں مر جاؤں گی۔''

فتح خان کی دھمکی نے برٹ شا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے مردہ لہجے میں کہا۔ ''فتح خان! اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم بلیک باکس لینے کے بعد مجھے جانے دو گے۔''

''تم میری زبان پر اعتبار کر سکتے ہو۔''

''تمہاری زبان......!'' برٹ شا نے حقارت سے کہا۔ ''پیسے کے لئے وفاداری بدل لینے والے شخص کی کوئی زبان ہو سکتی ہے؟''

فتح خان نے برا نہیں مانا۔ ''مت کرو...... لیکن مجھے بلیک باکس نہ ملا تو میں وہی کروں گا جو ابھی کہہ چکا ہوں۔''

فتح خان کا ساتھی پانی لے آیا تھا انہوں نے پانی پیا لیکن ہمیں نہیں دیا پھر اس نے فتح خان کے کہنے پر ہمارے ہاتھ پیچھے کر کے رسی سے باندھ دیئے۔ مجھے اور برٹ شا کو ایک ہی رسی سے باندھا تھا۔ فتح خان بے حد چالاک شخص تھا اس نے برٹ شا پر دباؤ ڈالنے کے لئے ایمن کو زبردستی اس کے پاس سے اٹھا کر سامنے دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔ وہ اب چپ تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ پستول کے سامنے ہم مزاحمت بھی نہیں کر سکتے تھے اوپر سے پشت پر بندھے ہاتھوں نے ہمیں بے بس کر دیا تھا۔ ایک گھنٹا گزرنے کے بعد فتح ان

نے اپنے ساتھی سے خچر تیار کرنے کو کہا۔ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

''پاپا...... پلیز اسے وہ منحوس بکس دے دیں۔'' ایمن بلبلا گئی۔

''ایمن، یہ جھوٹا آدمی ہے...... یہ پھر بھی ہمیں آزاد نہیں کرے گا؟'' برٹ شا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''پاپا! اگر یہ مجھے لے گیا تو بیچ دے گا، پاپا میں مر جاؤں گی۔''

''برٹ شا تم ظالم باپ ہو۔'' فتح خان مسکرایا۔ ''میں تو سمجھتا تھا کہ باپ اپنی بیٹی سے زیادہ محبت کرتے ہیں لیکن تمہیں تو وہ بلیک بکس عزیز ہے۔''

''بکومت...... لعنت ہو اس بلیک بکس اور تم پر؟'' برٹ شا پھٹ پڑا تھا۔ ''ٹھیک ہے، میں وہ بکس تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تمہیں پہلے ایمن کو چھوڑنا ہوگا۔''

''تا کہ تم ایک بار پھر بکس دینے سے انکار کر دو۔''

''میں تمہاری طرح ضمیر فروش نہیں ہوں۔ معزز برطانوی شہری ہوں، جو کہتا ہوں کر کے دکھاتا ہوں۔''

''معزز برطانوی۔'' فتح خان نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''زیادہ عرصہ نہیں گزرا تم لوگ ہمارے حکمران تھے اور ہم تم لوگوں کی زبان بھی دیکھ چکے ہیں، تم پر اعتبار نہیں کر سکتا اگر بعد میں تم مکر گئے تو میں سوائے تمہیں قتل کرنے کیا اور کیا کر سکتا ہوں۔''

برٹ شا چپ رہا۔ فتح کے ساتھی نے اس سے کچھ کہا۔ فتح خان نے سوچا اور ہم سے کہا۔ ''تم لوگ چار گھنٹے تک آرام کر سکتے ہو۔ صبح چار بجے ہمیں یہاں سے چلنا ہے۔''

''ہمیں کچھ کھانے کو اور پانی دو۔ تم دونوں ہی کھاتے جا رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''بس یہی بھنے ہوئے چنے ہیں۔ ابھی دیتا ہوں۔ ذرا انتظار کرو۔''

غار میں سردی بڑھ رہی تھی۔ فتح خان کے ساتھی نے باہر سے خشک لکڑیاں لا کر غار کے وسط میں ڈھیر کیں اور ان کے گرد پتھر رکھ کر الاؤ لگانے لگا۔ آگ جلی تو رفتہ رفتہ سردی کا اثر کم ہونے لگا تھا۔ فتح خان نے ایمن کے ہاتھ کھول دیئے۔ ''خود بھی کھاؤ اور ان دونوں کو بھی کھلاؤ لیکن دس منٹ کے اندر۔'' ایمن نے جلدی سے چنوں کا برتن لیا اور خود کھانے کے ساتھ مجھے اور اپنے باپ کو بھی باری باری کھلانے لگی پہاڑی راستوں پر کئی گھنٹے تک سفر کرنے کے بعد ہمارے پیٹ خالی ہو چکے تھے اور کم سے کم مجھے خاصی بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ برٹ شا نے بھی کھانے سے انکار نہیں کیا تھا۔ چنے کھانے کے بعد شدت سے پیاس محسوس ہونے لگی تھی لیکن میں نے احتیاط سے پانی پیا ورنہ اس کے اخراج کا مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا اور فتح خان کے موڈ سے لگ رہا تھا کہ وہ ہم میں سے کسی کو غار سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ کھا پی کر ہم فرش پر ہی دراز ہو گئے۔ فتح خان نے ایمن کے ہاتھ دوبارہ پشت پر باندھ دیئے تھے اور خود ایک کونے میں پڑے بستر پر جا کر لیٹ گیا تھا اس کا ساتھی چوکسی سے پہرا دے رہا تھا۔ میں نہ چاہنے کے باوجود کسی وقت سو گیا تھا۔ ایک بار آنکھ کھلی تو فتح ان پہرا دے رہا تھا اور اس کا ساتھی سو رہا تھا یعنی وہ باری باری ہماری نگرانی کر رہے تھے۔

ہم رات دس بجے سوئے تھے اور فتح خان نے تین بجے اٹھا دیا۔ ''بس اب اٹھ جاؤ۔'' اس نے میرے

پاؤں پر ٹھوکر ماری۔ ''بہت سو لیئے۔''

''فتح خان۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہارا کام کر دیا تھا اب حسبِ وعدہ تم مجھے جانے دو۔''

''اتنی جلدی نہیں۔'' وہ مسکرایا۔ ''ابی ام کو کالا بکس چائی اے...... اس کے بادتوم تینوں کو ایک ساتھ چوڑے گا۔ پرابی جانے کا بات مت کرو۔''

فتح خان کے ساتھی نے ہمارے لئے دلیے اور خشک کیئے گوشت کا ناشتا بنایا تھا۔ اسے کھا کر ہم چلنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ ہمارے ہاتھ ناشتے سے پہلے ہی کھول دیئے گئے تھے۔ ناشتے کے بعد فتح خان نے آگ بجھائی۔ موم بتیاں گل کیں اور ہم ٹارچ کی روشنی میں باہر آئے جہاں خچر جھاڑیوں میں کھڑے تھے۔ سردی سے بچانے کے لئے ان پر ترپالیں ڈال دی گئی تھیں۔ فتح خان کے ساتھی نے ترپالیں اتار کر غار میں ڈال دیں اور ہم خچروں پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔ اندھیرے میں ہم ٹارچ کی روشنی کے سہارے سفر کر رہے تھے۔ ایمن حسبِ معمول اپنے باپ کے ساتھ تھی۔ ایک خچر پر میں تھا اور باقی دو پر فتح خان اور اس کے ساتھی تھے۔ اس بار مجھے اکیلے بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ روانگی سے پہلے فتح خان نے خاص طور سے مجھے خبردار کیا تھا کہ میں کسی قسم کی گڑبڑ نہ کروں کیونکہ میں گولی کی رفتار سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ اس نے دھمکی دی کہ کسی کی بھی غلط حرکت کا خمیازہ بالآخر ایمن کو بھگتنا پڑے گا۔ اس دھمکی کا مجھ پر کیا اثر ہوتا لیکن برٹ شا چراغ پا ہو گیا۔

''میری بیٹی کا نام مت لو بار بار۔'' برٹ شا تیز لہجے میں بولا۔ ''میں کہہ چکا ہوں وہ بکس میں تمہارے حوالے کر دوں گا۔''

ہم بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ اس وقت بھی خاصی سردی تھی مگر حرکت میں ہونے کی وجہ سے اس کا احساس کم تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم ڈھلان عبور کر کے دوسری طرف اتر رہے تھے۔ یہ پورا علاقہ بھول بھلیوں قسم تھا کیونکہ راستے ناپید تھے اور فتح خان راستے تلاش کر کے چلتا تھا۔ بعض اوقات جس راستے پر ہم سفر کرتے تھے وہ آگے جا کر بند یا ناقابلِ عبور ملتا تھا۔ اس لئے ہم پلٹ آتے تھے۔ صبح چھ بجے جب روشنی نمودار ہو رہی تھی تو ہم ایک وادی کے عین اوپر تھے۔ نیچے وادی میں کھلونوں کی طرح بکھرے مکانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ہم وادی میں اترنے کے بجائے اس کی ڈھلانوں پر سفر کرتے جا رہے تھے۔ فتح خان کا خچر میرے خچر سے آگے تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ راجا عمر دراز ہمیں کہاں لے جا رہا ہے؟''

''امارے آدمی اور بی اے۔'' اس نے کہا۔ ''ام کو منٹ منٹ کی خبر اے۔''

''اگر راجا اپنے ساتھ زیادہ محافظ لے کر آتا تب تم کیا کرتے؟''

''اور ایسے دو آدمی، سو آدمی قابو کر سکتا اے تم نے وہ جگہ دیکا اِدر کوئی نئیں لڑ سکتا۔ ام توم سب کو لے کر جاتا۔''

میں نے خچر اس کے نزدیک کیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ''اس کالے ڈبے میں کیا ہے؟''

اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ''توم کیوں پوچتا اے؟''

''ایسے ہی...... مسلسل اس کا ذکر سن رہا ہوں تو تجسس ہو گیا۔''

''اس میں دولت اے...... ام کو...... سب کو دولت اچا لگتا اے۔''

''ہر ایک دولت کے لئے اس حد تک نہیں جاتا۔''

''وہ بزدل اوتا اے۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

آٹھ بجے ہم ایک جگہ رکے۔ یہاں پر زمین کسی قدر ہموار تھی۔ فتح خان کے ساتھی نے سوکھی لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی اور چائے بنانے لگا۔ اس کے پاس چینی، پتی کے علاوہ خشک دودھ بھی تھا۔ اس نے چائے بنا لی اور باری باری سب کو دی۔ کپ دو تھے۔ میں نے اور برٹ شا نے پی لی لیکن ایمن نے جھوٹے کپ میں چائے لینے سے انکار کر دیا۔ ''مرضی تمہاری۔'' فتح خان نے اس کی چائے بھی خود پی۔ ''بس اب چل پڑو...... برٹ شا...... مجھے معلوم ہے کہ تم نے بلیک بکس...... اس جگہ چھپایا ہوگا، جہاں راجا کے آدمیوں نے تمہیں گھیرا ہو گا۔ وہ جگہ بھی مجھے معلوم ہے۔ میں تمہیں وہاں تک لے جاؤں گا۔ اس کے بعد بکس والی جگہ تم نے تلاش کرنی ہے۔''

''مجھے منظور ہے۔'' برٹ شا نے مردہ لہجے میں کہا تھا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فتح خان اس کی جان چھوڑنے والا نہیں ہے۔ وہ اس سے بلیک بکس حاصل کر کے رہے گا۔ چائے پینے کے بعد سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ برٹ شا متفکر اور گم صم سا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کبھی کبھی ایمن سے بات کر لیا کرتا تھا لیکن اب اس سے بھی نہیں بول رہا تھا۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ''کیا تم سچ مچ اس بے گناہ لڑکی کو کسی کے ہاتھ بیچ دیتے؟''

''ام ایسا ای کرے گا اگر اس نے ذرا بھی گڑبڑ کیا۔'' فتح خان نے سر ہلایا۔ ''تم اس کو اچا مت سمجو یہ بوت مردود گورا اے...... ام جانتا اے۔''

''لیکن اس کی لڑکی اچھی ہے۔ باپ کا بدلہ اس سے لینا مناسب نہیں ہے۔''

''کیا بات اے...... تم لڑکی کا زیادہ بات کر را اے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اس نے ایک بار میری جان بچائی تھی جب تم غصے سے پاگل ہو کر مجھ پر گولی چلانے والے تھے۔''

''چوٹ کا نشان اب تک امارے سر پر اے۔'' اس نے اپنا سر ٹٹولا۔ ''پر اس لڑکی نے ٹھیک کیا۔ اگر اس روز ام تم کو گولی مار دیتا تو آج امارا مدد کون کرتا؟''

میں سیاہ بکس کے بارے میں سوچ رہا تھا اس میں کیا ہو سکتا تھا۔ سونا...... لیکن اس کا جو سائز تھا اس میں بمشکل دو تین کلو سونا آ سکتا تھا۔ اس کی قیمت چھ سات لاکھ روپے تھی۔ فتح خان کے لئے یہ رقم معنی رکھتی تھی لیکن برٹ شا کے لئے نہیں۔ اس نے فتح خان کو پہلے ہی خاصا معاوضہ دیا تھا بکس میں اس سے زیادہ مالیت کی کوئی قیمتی شے تھی اور سونے سے زیادہ قیمتی صرف جواہر ہو سکتے تھے۔ مٹھی بھر اعلیٰ درجے کے ہیروں کی قیمت کروڑوں میں ہو سکتی تھی۔ ہم وادی کے اوپری ڈھلان پر سفر کرتے رہے اور دوپہر تک ہم ایک سطح مرتفع پر تھے۔ یہ اونچے نیچے مختصر پہاڑوں کے درمیان پھیلی تھی ہم مزید شمال مشرق کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مجھے حیرت ہونے لگی۔ رانا کے آدمیوں نے کتنی دور سے برٹ شا اور ایمن کو پکڑا تھا۔ میں نے فتح خان سے کہا تو اس نے جواب دیا۔

''راجا عمر دراز معمولی آدمی نہیں اے...... اس کے باپ دادا کا اثر اے...... اب بھی راجا کا نام چلتا اے...... کتنا بندہ اس کا چاکری کرتا اے۔''

دوپہر دو بجے ہم ایک چشمے کے کنارے رکے۔ اس کے سرد اور شیریں پانی سے اپنی پیاس بجھائی اور ایک بار پھر بھنے ہوئے چنے کھائے اور تین بجے چل پڑے۔ فتح خان نے بتایا کہ وہ جگہ اب زیادہ دور نہیں ہے۔ روانگی سے پہلے فتح خان کا ساتھی اسے ایک طرف لے گیا اور کچھ دیر اس سے بات کرتا رہا۔ جب وہ واپس آئے تو میں نے محسوس کیا کہ ان کے چہروں پر کشیدگی تھی۔ شاید ان میں کسی مسئلے پر اختلاف تھا۔ فتح خان کا ساتھی جس کا نام کرم خان تھا، تنومند اور صحت مند نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر کسی تیز دھار آلے کے زخم کا طویل نشان تھا۔ اس بار سفر زیادہ تیز رفتاری سے کیا گیا۔ چشمے کا پانی پی کر اور اس کے کنارے اُگی سبز گھاس کھا کر خچر بھی چاق و چوبند ہو گئے۔ سطح مرتفع پر سفر کرنا بھی نسبتاً آسان تھا۔

ایک موقع پر جب فتح خان کا ساتھی خاصا پیچھے رہ گیا تو میں نے اپنے خچر کی رفتار کم کی اور برٹ شا اور ایمن کے خچر کے نزدیک ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے برٹ شا سے پوچھا۔ ''کیا تم اسے سچ مچ بلیک بکس دے دو گے؟''

اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''مجھے لگ رہا ہے فتح خان اور اس کے ساتھی کی نیت درست نہیں ہے، اگر تم نے کسی ضمانت کے بغیر بلیک بکس اس کے حوالے کر دیا تو پچھتاؤ گے۔''

برٹ شا نے کوئی جواب نہیں دیا وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ایمن دبے انداز میں بولی۔ ''پاپا، یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ فتح خان کا ساتھی اکثر مجھے غلط نظروں سے دیکھتا ہے۔''

ممکن ہے مشرقی باپ ہوتا تو اس کی غیرت فوری طور پر جوش میں آ جاتی لیکن برٹ شا مغرب کا ٹھنڈا خون رکھنے والا باپ تھا۔ لہٰذا اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ کرم خان نزدیک آ رہا تھا۔ لہٰذا میں نے خچر کو ایڑھ لگاتے ہوئے آگے بڑھا دیا۔ میں نے صرف خدشہ ظاہر نہیں کیا تھا بلکہ مجھے سچ مچ لگ رہا تھا کہ کرم خان شاید فتح خان سے کوئی مطالبہ کر رہا تھا اور فتح خان انکار کر رہا تھا اور یہ مطالبہ ایمن کے بارے میں تھا۔ جب وہ دونوں الگ ہو کر بات کر رہے تھے تب کرم خان بار بار ایمن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت فتح خان اس کا مطالبہ ماننے سے انکار کر رہا تھا لیکن عین ممکن تھا جب بلیک باکس اس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اپنا خیال بدل دیتا۔

تمام تر کوشش اور تیز رفتاری کے باوجود ہم رات ہونے سے پہلے اس علاقے تک نہیں پہنچ سکے تھے جہاں برٹ شا نے بکس چھپایا تھا۔ راستے میں دو بار فتح خان غلط راہ اختیار کر بیٹھا جس کے نتیجے میں وقت ضائع ہوا تھا۔ فتح خان جھنجلایا ہوا تھا اس کی خواہش تھی کہ بلیک باکس جلد از جلد اس کے قبضے میں آ جائے۔

''تم اس جگہ تک جا سکتے ہو۔'' اس نے برٹ شا سے پوچھا۔

''اس تاریکی میں۔'' برٹ شا نے چاروں طرف دیکھا۔ ''بہت مشکل ہے۔ صبح کی روشنی میں ہی یہ کام ہو سکتا ہے۔''

''ٹارچ کی روشنی میں کرو۔'' فتح خان نے مطالبہ کیا۔

''مجھے مجموعی طور پر اندازہ نہیں ہے۔'' برٹ شا کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''ورنہ میں ٹارچ کی روشنی کے بغیر بھی اس جگہ تک تمہاری رہنمائی کر سکتا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ ابھی نہ سہی لیکن صبح تک اس سے انکار نہیں کر سکو گے۔'' فتح خان نے غرا کر کہا۔ ''ورنہ تم جانتے ہو میں اپنے قول کا پکا ہوں تمہاری لڑکی کو کسی خان کے حرم کی زینت بنا کر رہوں گا۔''

''مجھے دھمکی مت دو۔'' برٹ شا نرمی سے بولا۔ ''ویسے اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم بلیک باکس لینے کے بعد بھی یہ کام نہیں کرو گے۔''

فتح خان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کرم خان اس وقت ارد گرد رات گزارنے کے لئے کوئی موزوں جگہ تلاش کر رہا تھا۔ فتح خان ہماری نگرانی کر رہا تھا اور بے حد چوکس تھا۔ کامیابی کے اتنے نزدیک آ کر وہ ناکام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد کرم خان نے ایک معقول جگہ کی دستیابی کے بارے میں بتایا جہاں رات گزاری جا سکتی تھی۔ یہ جگہ غار تو نہیں تھی لیکن ایک باہر کی طرف نکلے چٹانی چھجے کے اطراف میں گھنی جھاڑیاں اُگ آنے سے ایک محفوظ قسم کی پناہ گاہ بن گئی تھی۔ فتح خان نے اس کے سامنے خچر باندھے اور جلانے کے لئے خشک لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ اس دوران میں کرم خان ہماری نگرانی کر رہا تھا۔ آگ جلا کر انہوں نے کھانے کے لئے چنے نکالے۔ جنہیں ہم نے بھی پانی کے ساتھ حلق سے اتارا اور سونے کے لئے کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ تھکن سے سب کا برا حال تھا کچھ دیر بعد برٹ شا نے کہا۔

''میرے پیٹ میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔''

''صبح تک انتظار کرو۔'' فتح خان نے جواب دیا۔

''نہیں کر سکتا۔ چنے کھا کر میرا پیٹ گڑبڑ کر گیا ہے۔'' برٹ شا گڑگڑایا۔

''ٹھیک ہے۔'' فتح خان نے بادل نخواستہ کہا اور کرم خان سے کہا کہ وہ اسے مناسب جگہ لے جائے پھر برٹ شا کو دھمکی دی۔ ''برٹ شا، کوئی عقل مندی نہیں کرنا۔ یاد رکھنا تمہاری لڑکی میرے پاس ہے۔''

''میں کوئی حرکت نہیں کروں گا۔'' برٹ شا نے کمزور لہجے میں جواب دیا اور کرم خان کے ہمراہ تاریکی میں غائب ہو گیا۔ رات خاصی سرد تھی۔ کمبل اور الاؤ کے باوجود ہم سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ میں آنکھ بند کر کے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہوا جب چٹانی چھجے سے ٹکراتی تو سیٹی جیسی آواز ابھرتی تھی۔ اچانک فتح خان نے مجھے ٹھوکر ماری اور غرایا۔ ''وہ اب تک نہیں آئے۔''

میں غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ میں نے بھنا کر کہا۔ ''مجھے کیا معلوم...... وہ کیوں نہیں آئے۔''

''پندرہ منٹ سے اوپر ٹیم او گیا اے۔'' فتح خان بولا پھر چلا کر کرم خان کو آواز دی مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو یک دم فتح خان کی حالت بدل گئی وہ کسی بھیڑیے کی طرح غرانے لگا تھا اس نے ایمن کو بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا اور کمبل جھٹک کر پستول اس کے سر سے لگا دیا۔ ایمن نے چیخ ماری اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ فتح خان نے ایک گندی گالی دی۔ ''سیدی کڑی را۔''

''فتح خان، اسے چھوڑ دو۔'' میں نے کہا۔

''توم چوپ کرو۔'' وہ گرجا اور ایمن سے بولا۔ ''اپنے باپ کو پکارو۔ ورنہ ابی تمہارا سر اڑاتا اے۔'' فتح خان نے پستول کا ہیمر کھینچا تو ایمن کا بدن لرزنے لگا تھا۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں باپ کو پکارا تو فتح خان نے پستول کی نال اس کے سر پر ماری۔ ایمن بری طرح چیخی۔ ''زور سے آواز نکالو۔'' فتح خان غرایا۔

''پاپا...... پاپا...... کہاں ہو...... مجھے بچاؤ۔'' ایمن چلانے لگی۔

میں نے فتح خان کی آپے سے باہر ہوتی حالت دیکھی تو اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''فتح خان، ممکن ہے انہیں کوئی حادثہ پیش آیا ہو۔''

''بکومت۔'' فتح خان نے انگریزی میں کہا تھا۔ ''یہ سب برٹ کا حرامی پن ہے۔ میں اسے دیکھ لوں گا، یہ کتیا اپنے باپ کا کیا ہوا بھگتے گی۔'' اس نے ایمن کی طرف دیکھا جو اس کے بازو میں کسی بے بس چڑیا کی طرح پھنسی تھی۔ مجھے فتح خان کے لہجے سے خون کی بو آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی وحشت میں راجا عمر دراز کے محل کے تہ خانے میں دیکھ چکا تھا۔ جب اس نے شینا کو مار ڈالا تھا۔ جو شخص اپنے محبوب کو اپنی وحشت کی بھینٹ چڑھا دے، اس کے لئے کسی اور شخص کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی! اس نے پستول کی نال ایمن کے سر سے لگائی تو میں لرز گیا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''فتح خان۔ ایک منٹ...... جلد بازی مت کرو۔ ابھی ایمن کی صورت میں تمہارے پاس ایک پتا ہے، اسے مار دیا تو پھر تم برٹ شا کو کس طرح مجبور کرو گے؟''

''اس نے مجبور ہونا ہوتا تو اس طرح بھاگتا کیوں؟'' فتح خان تلخی سے بولا۔

''ممکن ہے وہ اضطراری طور پر کوئی حرکت کر چکا ہو اور اب پچھتا رہا ہو۔ دیکھو اسے بیٹی سے پیار نہ ہوتا تو وہ اسے یہاں تک کیوں لاتا؟ میری بات مانو...... صبر سے کام لو۔ ایمن کے لئے وہ جلد یا بدیر سامنے آئے گا اور تم ایک بات اور بھول رہے ہو اس کے پاس اب رائفل بھی ہوگی۔ اگر تم نے ایمن کو مار دیا تو پھر کسے ڈھال بناؤ گے؟ وہ اردگرد جہاں بھی چھپا ہے تمہیں دور سے گولی مار دے گا۔''

فتح خان سوچ میں پڑ گیا تھا اور اس کے چہرے پر طاری وحشت میں بھی رفتہ رفتہ کمی ہوتی جا رہی تھی مگر پستول کی نال ابھی تک ایمن کے سر سے ٹلی نہیں تھی بالآخر اس نے گہری سانس لے کر ایمن کے سر سے پستول ہٹا لیا اور اس کا ہیمر بھی نیچے کر لیا۔ ''ٹھیک اے...... اپی دیکھے گا...... وہ کب تک امارے سامنے نہیں آتا۔''

چالاک فتح خان نے سب سے پہلے الاؤ کی لکڑیاں بجھائیں تاکہ اس جگہ روشنی نہ رہے۔ اسے خطرہ تھا کہ روشنی میں برٹ شا اسے دور سے رائفل کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس کے بعد اس نے میرے اور ایمن کے ہاتھ ایک ہی رسی سے پشت کی طرف کر کے باندھے۔ اس کی وحشت کم ہوئی تھی لیکن غصہ بڑھتا جا رہا تھا اور وہ رہ رہ کر برٹ شا کو مغلظات سے نواز رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ برٹ شا کو آوازیں دیتا اور اسے بتاتا کہ وہ ایمن کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ یہ دھمکیاں ناقابل بیان تھیں۔ انہیں سن کر ایمن سہمی جا رہی تھی۔ اس نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ ''کیا یہ سچ مچ...... یہ سب کرے گا۔''

میں نے جوابی سرگوشی کی۔ ''یہ کوئی شریف آدمی تو ہے نہیں۔ تم اس سے کس بات کی توقع کر سکتی ہو۔ ویسے تمہارے باپ نے حماقت کی ہے اگر میں اسے نہ سمجھاتا بجھاتا تو اس نے تمہیں مار ہی دینا تھا۔''

''پتا نہیں پاپا پر کیا گزری ہے۔ مجھے ان کی فکر ہو رہی ہے۔'' وہ سسکیاں لینے لگی۔

''چپ کرو۔'' فتح خان زور سے غرایا اور اس نے نزدیک آ کر ایمن کو تھپڑ مارا تھا۔

''فتح خان عورتوں پر ہاتھ اٹھانا مردوں کا شیوہ......'' میرا باقی جملہ منہ میں رہ گیا تھا کیونکہ فتح خان نے

ایک عدد ہاتھ مجھے بھی رسید کیا تھا۔

''چپ کرو۔'' وہ ہانپ رہا تھا۔

میں نے اپنے ہونٹوں پر خون کا ذائقہ محسوس کیا تھا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔''فتح خان، اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔''

اس نے پستول نکال کر میرے سینے پر رکھ دیا۔''تو م کو گولی مارے گا۔ توم امارے کس کام کا؟''

میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی تھی اور میں دم بخود رہ گیا تھا۔ فتح خان چند لمحے تک پستول اسی طرح میرے سینے پر رکھے رہا پھر اس نے قہقہہ مار کر پستول اٹھالیا۔''شہباز توم ڈرتا اے۔''

''جب ہتھیار تمہارے جیسے شخص کے ہاتھ میں ہو تو آدمی کو ڈرنا ہی چاہئے۔'' میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

رفتہ رفتہ صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ صبح کاذب کی روشنی چند لمحے کے لئے پہاڑوں پر پھیلی تھی اور پھر سے تاریکی چھا گئی تھی۔ فتح خان نے ہم دونوں کو آگے بٹھایا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔''فرض کرو وہ دونوں کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہوں۔''

''ومیں...... برٹ شا نے کرم خان کو قابو کرلیا اے...... ام کو یقین اے۔''

''وہ کیسے؟ برٹ شا نہتا اور عمر والا آدمی ہے۔ کرم خان جوان اور مسلح ہے۔''

''ام نہیں جانتا، یہ فرنگی بوت مکار اے۔''

''ہم کب تک یہاں رہیں گے؟'' ایمن نے پوچھا۔

''جب تک تمہارا باپ سامنے نہیں آجاتا۔'' فتح خان بولا۔

صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ رات بھر جاگنے اور اعصابی کشیدگی کی وجہ سے میرا اور ایمن کا برا حال تھا۔ فتح خان بھی ٹھیک نہیں تھا لیکن وہ اس قسم کے حالات کا عادی ضرور تھا۔ دوسرے اس کی جان پر بنی تھی اس لئے وہ کسی بھیڑیے کی طرح چوکنا تھا روشنی ہونے پر وہ چھجے کے اندرونی حصے میں چلا گیا تھا۔ میں نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔''فتح خان، تم بھی ڈر رہے ہو۔''

''چوپ کرو۔'' اس نے غرا کر کہا۔''ام پہلے تو مارے سر میں سوراخ کرے گا۔''

ہم چھجے کے سامنے والے حصے میں تھے۔ یہ حصہ مشرق کی طرف تھا اس لئے سورج کی کرنیں براہِ راست ہم پر آرہی تھیں۔ رات بھر ٹھٹھرنے کے بعد ان حرارت بخش کرنوں سے بڑا سکون رہا تھا۔ اب تک کم سے کم مجھے اردگرد کوئی حرکت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اگر برٹ شا نے کرم خان پر قابو پالیا تھا تب بھی وہ چالاکی سے اردگرد کہیں چھپا تھا اور سامنے آنے کے بجائے فتح خان کے اس جگہ سے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جبکہ فتح خان اس سے زیادہ مکار تھا۔ اس نے ہمیں سامنے کر رکھا تھا اور خود پیچھے چھپا بیٹھا تھا۔ وہ رائفل کے نشانے سے باہر تھا۔ جیسے جیسے سورج بلند ہو رہا تھا چٹان گرم ہوتی جارہی تھی اور مجھے گرمی لگنے لگی تھی، ایمن کا حال زیادہ خراب تھا۔ فتح خان نے جان بوجھ کر ہمیں دھوپ میں بٹھایا تھا۔ بلندی کی وجہ سے سورج کی چمک میں تیزی تھی۔ رات کی خنکی زائل ہوئی تو باقاعدہ پسینہ آنے لگا تھا۔ ایمن کسمسائی، اس نے مجھ سے کہا۔''مجھے پیاس لگ رہی ہے۔''

میں نے فتح خان کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں پانی دو پیاس لگ رہی ہے۔'' فتح خان نے گیلن والے کین کی طرف دیکھا اور بے پروائی سے بولا۔ ''تومارے لئے امارے پاس پانی نہیں اے۔ ایسے ای بیٹو۔''

''اچھا ہمیں اندر آنے دو۔ یہاں دھوپ بہت تیز ہے۔'' ایمن نے التجا کی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ فتح خان پانی دینے سے انکار کر رہا ہے۔ فتح خان کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''تم ادھر اچھی لگ رہی ہو۔ ممکن ہے تمہارا باپ بھی کہیں چھپ کر دیکھ رہا ہو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں وہ کب تک تمہیں بھوکا پیاسا اس طرح دھوپ میں بیٹھا دیکھ سکتا ہے۔'' وہ انگریزی میں بولا۔

''اور اگر وہ یہاں نہیں ہوا تو......؟'' میں نے پوچھا۔

''تب بی تو م اس کی سزا بھگتے گا۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا۔

مجبوراً ہم دھوپ میں بیٹھے رہے۔ ارد گرد چٹانیں ہونے کی وجہ سے گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ جھاڑیاں بھی چٹانوں تلے تھیں۔ ورنہ دھوپ کی شدت انہیں جلا سکتی تھی۔ ایمن کا چہرہ ستُ گیا تھا اور ہونٹ پیاس کی شدت سے خشک ہو چکے تھے۔ فتح خان سے التجا کرنا بھی بے سود تھا۔ وہ ہمیں استعمال کر کے برٹ شا کو سامنے لانا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لئے وہ اس سے بھی زیادہ سفاکی کا مظاہرہ کر سکتا تھا ارد گرد سفید چٹانوں کی وجہ سے دھوپ کی چمک خیرہ کن حد تک بڑھ گئی تھی اور دیکھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے شبہ ہوا دائیں طرف چٹانوں میں کوئی سیاہ چیز حرکت کر رہی ہے۔ میں نے بغور دیکھا لیکن اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ کیا وہ برٹ شا تھا اس کے بال سیاہ تھے اور چہرے پر کئی دن کی داڑھی بھی تھی۔ میں فتح خان کو ایسا تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ میں نے کوئی خاص چیز دیکھی تھی۔ اس لئے میں وقفے وقفے سے ان چٹانوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''تمہارے باپ کو سامنے آنا پڑے گا۔'' فتح خان نے ایمن سے کہا جو گرمی اور پیاس سے بے حال ہو رہی تھی۔ مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس بلندی پر اتنی خوف ناک گرمی پڑ سکتی ہے۔

خراب حالت کے باوجود ایمن نے اسے جواب دیا۔ ''پاپا...... یہاں نہیں ہیں ورنہ...... مجھے اس حال میں دیکھ کر سامنے آ جاتے۔''

فتح خان طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''بے بی، اسے تم سے زیادہ دولت عزیز ہے جو بلیک بکس میں ہے۔''

''میرے پاپا ایسے نہیں ہیں۔ وہ دولت مند آدمی ہیں۔''

''دولت مندوں کو ہی مزید دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' فتح خان نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''بکواس مت کرو۔ میرے پاپا مجھ سے محبت کرتے ہیں، دولت سے نہیں۔'' ایمن ہذیانی لہجے میں چلائی۔ ''وہ یہاں ہوتے تو اب تک تمہارا سر اڑا چکے ہوتے۔''

''وہ یہیں ہیں۔'' فتح خان بولا۔ ''میں اس کی قوتِ برداشت آزما رہا ہوں ورنہ میں چاہوں تو وہ ابھی ایک منٹ میں ہمارے سامنے ہو۔''

ایمن دبی دبی سسکیاں لینے لگی تھی۔ ''فتح خان، اتنی سختی مناسب نہیں ہے۔ تم مجھے نہ سہی اس لڑکی کو پانی دے دو۔'' میں نے کہا۔

''جب تک برٹ شا سامنے نہیں آتا اور ام کو بلیک بکس نہیں دیتا، کسی کو پانی نہیں ملے گا۔'' وہ فیصلہ کن

لہجے میں بولا۔

''کیا میں اسے تلاش کر کے لاؤں؟'' میں نے پوچھا تو اس نے قہقہہ مارا۔

''فتح خان بے وقوف ٹمیں اے۔ توم جائے اور باگ جائے۔''

اس سے بحث کرنا بے کار تھا اور مجھے بولنے سے بھی شدت کی پیاس لگنے لگی تھی۔ فتح خان نے ہمیں جھاڑیوں کے سائے میں جانے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ تپتا ہوا سورج ہمارے سروں کے عین اوپر تھا اور چٹانوں سے گرمی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ایمن نے ہانپتے ہوئے اپنا سر میرے شانے سے ٹکا دیا تھا، اس پر غشی سی طاری ہو رہی تھی۔ ایک بجے وہ بے ہوش ہوگئی۔ میں نے ایک بار پھر فتح خان سے التجا کی۔

''خدا کے لئے اسے پانی دے دو ورنہ یہ مر جائے گی اور یہ مرگئی تو تم اس کے باپ کو کس طرح مجبور کرو گے۔''

''مر جانے دو اس بے غیرت کا لڑکی کو۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''ام اسے پانی ٹمیں دے گا۔''

میں نے بے ہوش ایمن کو اپنے زانو پر لٹاتے ہوئے اس کے سر کے اوپر اپنا سایہ کر لیا تھا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور کچھ دیر بعد اسے ہوش آ گیا تھا۔ ''پانی۔'' اس نے نحیف سی آواز میں کہا۔

''پانی ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا لیکن زبان بھی خشک تھی۔

''اس سے کہو...... مجھے گولی مار دے۔''

''اگر تمہارا باپ جلد یا بدیر سامنے نہیں آیا تو اس نے یہی کرنا ہے۔''

''پاپا مجبور ہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''مجھے شک ہے کہ کرم خان کی نیت خراب ہو گئی ہے۔ وہ پاپا کو کہیں لے گیا ہوگا اور ان سے بلیک باکس کا پتا پوچھ رہا ہوگا۔''

''آخر اس بلیک بکس میں ہے کیا؟''

''اس میں ہیرے ہیں۔ ملکہ کے آنسو نامی دو جڑواں ہیرے جو کبھی روس کے زارین کیتھرین کے خزانے میں شامل تھے ان کے علاوہ بھی تقریباً تین درجن قیمتی ہیرے ہیں لیکن اصل اہمیت ان کی ہے۔ پاپا نے ان کا سودا بھی کیا تھا، ایک روسی جنرل سے جو افغانستان میں تعینات ہے۔ یہ ہیرے کسی طرح اس کے ہاتھ لگ گئے اور سوئٹزرلینڈ کا ایک تاجر انہیں خریدنے کے لئے تیار ہو گیا۔ پاپا اس کے ایجنٹ بن کر آئے ہیں۔ یہ ہیرے اس سوئس تاجر تک پہنچانا پاپا کے لئے عزت کا مسئلہ ہے۔''

''تبھی وہ شدت سے انکار کر رہا ہے۔''

ایمن نے سر ہلایا۔ ''پاپا کی غلطی سے فتح خان کو ان ہیروں کا پتا چل گیا اور وہ اب موقع سے فائدہ اٹھا کر انہیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

ایمن نے جو نکتہ اٹھایا وہ میرے یا فتح خان کے ذہن میں نہیں آیا تھا، مجھے خیال آیا کہ میں اس نکتے سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ میں نے فتح خان کی طرف دیکھا۔ ''سنو ہمیں سائے میں آنے دو۔ میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ تمہارے فائدے کی بات ہے۔''

''کیا؟'' اس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''پہلے ہمیں سائے میں آنے دو اگر ہم کچھ دیر اور یہاں رہے تو بے ہوش ہو جائیں گے۔ ممکن ہے مر جائیں اگر تمہیں اطمینان نہ ہو تو واپس دھوپ میں بٹھا دینا۔ پستول تمہارے پاس ہے اور ہم تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔''

اس نے سوچا اور سر ہلا کر بولا۔ ''ٹھیک ہے، آ جاؤ لیکن اگر کوئی احمقانہ بکواس کی تو اس لڑکی کو میں دھوپ میں بٹھا دوں گا لیکن تمہیں گولی مار کر لاش سامنے پھینک دوں گا۔'' اس نے غالباً ایمن کو بتانے کے لئے انگریزی میں کہا۔ فتح خان کی انگریزی اس کی اردو سے بدرجہا بہتر تھی شاید اس نے یہ زبان باقاعدہ سیکھی تھی۔ میں نے ایمن کو سہارا دے کر اٹھایا۔ بندھے ہاتھوں کے ساتھ یہ کام خاصا مشکل تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں اسے سائے میں لے آیا۔ سائے میں آتے ہی سکون کا ایک لطیف احساس ہوا تھا۔ پیاس کی شدت میں کمی نہیں آئی تھی لیکن ناقابل برداشت دھوپ سے نجات مل گئی تھی۔ پسینے کی وجہ سے جسم کی نمی تیزی سے ضائع ہو رہی تھی۔ پسینے میں ذرا کمی آئی تھی۔ فتح خان پھاڑ کھانے والے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ''اب بکو بی۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ برٹ شا نے کرم خان پر قابو پا لیا ہے اور اب تمہاری تاک میں ہے؟''

فتح خان چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ معاملہ الٹ بھی ہو سکتا ہے؟''

''ٹھیک سے بکو۔'' وہ غرایا۔

''ہو سکتا ہے کرم خان نے برٹ شا سے اپنے طور پر فائدہ اٹھانے کا سوچا ہو اور وہ اسے لے گیا ہو۔ اسے بھی معلوم ہو گا کہ تم برٹ شا سے بلیک بکس حاصل کرنے کے چکر میں ہو جس میں روس کی ملکہ کیتھرین کے دو عدد قیمتی ہیرے ہیں۔''

''تم کو پتا چل گیا؟'' اس نے کہا اور بے ساختہ ایمن کی طرف دیکھا۔ ''اس نے بتایا ہوگا۔''

''اسے چھوڑو...... فتح خان، تم لکھ کر رکھ لو کہ یہی بات ہے۔ کرم خان نے سوچا ہو گا کہ وہ ہیرے اکیلے ہڑپ کر لے ورنہ تم خود سوچو برٹ شا اس پر کس طرح قابو پا سکتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسے دھوکا دے کر بھاگ سکتا ہے، اس صورت میں کرم خان کو تمہارے پاس واپس آنا چاہئے تھا۔ اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے تب بھی گولی چلنے کی آواز نہیں آئی میری بات کا یقین کرو اس وقت باہر جو شخص تمہاری تاک میں ہے وہ برٹ شا نہیں کرم خان ہے۔''

''بکواس!...... کرم خان کیوں ہونے لگا؟'' فتح خان نے بھڑک کر کہا۔

''اس لئے ہونے لگا کہ وہ کوئی بھی دھمکی دے کر برٹ شا سے بلیک بکس حاصل نہیں کر سکتا ہے اس کے پاس ایک ہی راستہ ہے، ایمن کو حاصل کرے اور اسے استعمال کر کے برٹ شا سے بلیک بکس حاصل کرے۔''

فتح خان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ''اگر کرم خان نے ایسا کیا اے تو میں اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کروں گا۔''

''یعنی تم مانتے ہوئے یہ کام کرم خان بھی کر سکتا ہے۔ اس صورت میں ہمیں پانی سے محروم کرنا زیادتی ہے۔''

''میں پانی نہیں دے سکتا۔'' اس نے پھر انکار کر دیا۔ ''میرے پاس اتنا ہی پانی ہے اور تم لوگوں کو دے دیا

تو مجھے پانی لینے کے لئے باہر جانا پڑے گا۔"

"چلو مجھے مت دو لیکن اسے تو دو۔" میں نے ایمن کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا بات اے؟" اس بار وہ اردو میں معنی خیز انداز میں بولا۔ "توم اس کا بوت خیال کرتا اے۔" ایمن پر سائے میں آنے کے بعد پھر سے غشی طاری ہو گئی تھی۔ مضبوط جسم رکھنے کے باوجود وہ ایک نازک لڑکی تھی۔ پیاس سے اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ فتح خان نے کچھ دیر سوچا پھر گلاس میں پانی لے کر میری طرف بڑھا دیا۔ "اسے دو۔"

پانی بمشکل آدھا گلاس تھا۔ میں نے ایمن کو سہارا دے کر اس کا سر اوپر کیا اور گلاس کا پانی قطرہ قطرہ اس کے منہ میں ٹپکانے لگا۔ پانی کا ذائقہ محسوس کرتے ہی وہ تیزی سے ہوش میں آئی تھی اس نے بے تابی سے گلاس کا پانی پینا چاہا لیکن میں نے گلاس پیچھے کر لیا۔ "آرام سے ایمن، آرام سے...... اس طرح پانی پینا اچھا نہیں ہوگا۔ آرام سے......" میں اسے گھونٹ گھونٹ دینے لگا۔ تشنگی کی شدت سے میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس گلاس سے ایک گھونٹ میں بھی...... پانی پی لوں...... لیکن دل پر جبر کر کے اسے پلاتا رہا۔ اس نے آخری قطرہ تک پی لیا اور نڈھال ہو کر سر زمین پر رکھ دیا۔ میں نے گلاس فتح خان کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کسی قدر ہچکچانے کے بعد گلاس میں دوبارہ پانی ڈال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "توم بی پیو۔"

"شکریہ......" میں نے اس سے گلاس لیا اور اس کا پانی چوس چوس کر پی لیا۔ اسے ایک دم پینا خطرناک ہو سکتا تھا۔ نصف گلاس میں نے تھوڑا تھوڑا کر کے پانچ، چھ منٹ میں پیا اور زندگی میں پانی کا ایسا ذائقہ کم ہی محسوس کیا تھا۔ پانی پی کر میں نے گلاس اسے واپس کر دیا۔ "فرض کرو کہ باہر کرم خان تمہاری تاک میں ہے تو تم کیا کرو گے؟"

"ام انتظار کرے گا۔ اس کے پاس کانے کو کوچ نئیں اے، چنا امارے پاس اے۔"

"لیکن تمہارے پاس پانی نہیں ہے۔"

"ام اسے تین دن چلا سکتا اے۔" اس نے گیلن کی طرف دیکھا۔

"اور ہم...... ان تین دن میں کیا ہم زندہ رہیں گے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "صرف ایک دن میں ہمارا پانی کے بغیر یہ حال ہو گیا تھا۔"

"ام کو نئیں معلوم۔ پر اب اس پانی سے توم کو ایک بوند بی نئی دے گا۔"

"اچھا مجھے باہر جا کر پانی تلاش کرنے دو۔"

اس نے پھر انکار کیا۔ "اور خطرہ اے۔ کرم خان توم کو پکڑ لے گا۔"

"مجھے اس سے کیا فرق پڑے گا۔ چاہے تمہاری قید میں رہوں یا کرم خان کی۔"

"اچھا چوپ کرو۔" اس نے مجھے جھڑک دیا۔ "اور جاؤ۔"

میں ایمن کے پاس آ بیٹھا۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا مگر کھانے کا خیال بھی نہیں تھا۔ آدھے گلاس پانی سے شدت کی پیاس میں معمولی سی کمی آئی تھی۔ سورج مغرب کی طرف ڈھلنے سے چٹان کے سامنے سایہ بڑھ گیا تھا اس تناسب سے تپش بھی کم ہو رہی تھی۔ فتح خان نے مجھ سے کہا۔ "جا کر خچر سے چنے کا تھیلا لے آؤ۔"

''اور کرم خان کی گولی کا نشانہ بن جاؤں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔''میں نہیں جاؤں گا۔''

''بکومت...... جاؤ......'' وہ پستول اٹھا کر دھاڑا۔''ابی ام گولی مار دے گا۔''

''بے شک تم مار دو لیکن مجھے تمہارے دھوکے میں مارا جانا گوارا نہیں ہے۔'' میں اڑ گیا تھا۔

''کرم خان توم پر گولی نہیں چلائے گا۔'' اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

''وہ چلائے گا۔ کیونکہ اس طرح وہ تمہیں ڈرائے گا۔ اس کے لئے ایمن ضروری ہے، میں یا تم نہیں۔''

''یہ ادر پڑا اے۔'' فتح خان نے خفگی سے ایمن کو دیکھا۔''تمیں توم جائے گا۔ ام تین تک گنے گا۔ اگر توم نہیں گیا تو ام توم کو گولی مار دے گا۔ ایک...... دو...... تین......'' اس نے کہہ کر پستول میری طرف کیا۔

''ٹھیک ہے...... میں جا رہا ہوں۔'' میں نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔''لیکن میں مارا گیا تو اس کی ساری ذمے داری تم پر ہوگی۔''

''توم فکر مت کرو۔ ایک بار ام کو کالا ڈبا مل گیا تو ام تومارے نام کا فاتیا (فاتحہ) کروائے گا۔''

''تو اس کا مجھے کیا فائدہ ہوگا؟'' میں نے بھنا کر کہا تھا۔

''توم سیدا جنت میں جائے گا۔'' وہ بولا۔''اب جاؤ۔''

میں اٹھ کر خچروں کی طرف بڑھا جو بائیں طرف جھاڑیوں کے ساتھ بندھے تھے۔ ان کے پاس جانے کے لئے مجھے کھلے سے گزرنا پڑتا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کھلے حصے میں قدم رکھا جب کچھ نہیں ہوا تو میں نے خچروں کی طرف قدم بڑھایا اور اسی لمحے کوئی شے سنسناتی ہوئی میرے سر کے پاس سے گزر کر آگے چٹان پر لگی۔ فائر کی آواز ذرا تاخیر سے آئی تھی۔ میں نے بے تحاشا چھلانگ لگائی اور خچروں کے درمیان میں جا گرا جو فائر کی آواز پر بھڑک رہے تھے۔ مجھے فتح خان کے چلانے کی آواز آئی، وہ اپنی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے چٹان کی اوٹ سے اس طرف لگا تار فائر کئے جس طرف سے گولی آئی تھی۔ میرا اندازہ بلکہ ایمن کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ کرم خان نے برٹ شا کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا کیونکہ برٹ شا کو مجھے گولی مارنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ باہر روشنی اتنی بہر حال تھی کہ ایک کمزور نظر والا بھی مجھ میں اور فتح خان میں تمیز کر سکتا تھا۔ چلانے والے نے مجھ پر جان بوجھ کر دوسری گولی چلائی تھی۔ اس کے بعد تو دھڑا دھڑ فائرنگ کرنے لگا۔

خچر فائرنگ سے بھڑک رہے تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ ایک گولی آ کر میرے سامنے والے خچر کی گردن میں لگی۔ اس نے بھیانک آواز نکالی اور زمین پر گر کر ایڑیاں بلکہ کھر رگڑنے لگا۔ دوسرے خچر اس افتاد پر مزید بدحواس ہو گئے اور اپنی لگامیں جھاڑیوں سے چھڑانے کے لئے اچھل کود کرنے لگے۔ میں ان کے کھروں سے بچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران میں مجھے کرم خان کی آواز آئی وہ فتح خان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ فتح خان بھی اسے جواب دے رہا تھا۔ ظاہر ہے ان کی گفتگو کا ایک لفظ میرے پلے نہیں پڑ رہا تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ گالیوں کا آزادانہ تبادلہ کر رہے تھے۔ فتح خان کا زورِ بیان زیادہ تھا مگر پوزیشن کرم خان کی بہتر تھی وہ چٹانوں میں کہیں اوپر تھا اور فتح خان اس جگہ دبکے رہنے پر مجبور تھا۔ ہتھیار کے معاملے میں بھی کرم خان کو برتری حاصل تھی اس کے پاس کئی سو گز تک مار کرنے والی رائفل تھی۔ جب کہ فتح خان کا پستول سو فٹ سے زیادہ کار آمد نہیں تھا۔ کرم خان بہت دور تھا اس سے۔

میں جھاڑیوں میں دب گیا تھا۔ میرے سامنے مردہ خچر کا جسم تھا جس نے مجھے تحفظ دے رکھا تھا۔ ورنہ اب تک کرم خان مجھے نشانہ بنا چکا ہوتا اس نے چند گولیاں میری طرف اور چلائی تھیں جو مر جانے والے خچر کو لگی تھیں۔ ایک خچر لگام آزاد ہو جانے کے بعد دولتیاں جھاڑتا بھاگ گیا تھا اب وہاں دو خچر تھے اور وہ بھی رہ رہ کر بھڑک رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دہشت اور خوف تھا۔ میں انہیں دبی زبان میں چمکار رہا تھا کیونکہ ان خچروں کے ہونے سے مجھے تحفظ تھا۔ اگر یہ درمیان سے نکل جاتے تو کرم خان مجھے آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ فتح خان اور کرم خان کے درمیان گالیوں اور گولیوں کا تبادلہ بند ہو چکا تھا۔ فی الحال محاذ پر خاموشی چھائی تھی۔

"فتح خان!" میں نے آواز دی۔ "یہ حرامزادہ میری جان کا دشمن کیوں ہو رہا ہے؟"

"یہ تو مارے کو رقیب قرار دے راا ہے۔" فتح خان نے بتایا۔ "یہ بی ایمان (ایمن) کو پسند فرماتا اے۔"

"بھی سے کیا مطلب ہے؟ تم لوگوں کا دماغ خراب ہے۔ میری جان پر بنی ہے اور میں لڑکیاں پسند کروں گا۔ پہلے تم کو شینا کے معاملے میں مجھ پر شک تھا اور اب کرم خان نے ایک نئی پخ نکال لی ہے۔" میں نے بھنا کر کہا۔

"پخ کیا اوتا اے؟"

"گدھا گاڑی میں...... گدھے کے ساتھ جو اس کا مددگار گدھا ہوتا ہے اسے پخ کہتے ہیں۔" حالات کی خرابی کے باوجود میں اس کے سوال کا جواب دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔

"اچا...... اچا...... ام سمجا، یہ بی کوئی نیا گالی اے۔"

"گالی ہی سمجھو...... اگر میں کرم خان کو پخ کہتا ہوں تو اس کا مطلب ہے تمہیں گدھا قرار دے رہا ہوں، وہ تمہارا ساتھی ہے۔"

"اب وہ امارا دشمن اے۔" فتح خان خفگی سے بولا۔

"فتح خان ایمن محفوظ ہے ناں؟"

"اسے ام نے چٹان کے سب سے اندر کر دیا اے...... ادر گولی نئی آتی۔"

"کرم خان کے پاس رائفل ہے اور تمہارے پاس پستول ہے۔ اس صورت میں تم اس کا کیا بگاڑ سکتے ہو؟"

"ام کو نشانہ بنانے کے لئے اسے اوپر آنا پڑے گا اور ام اسے کتے کی مافک مار دے گا۔"

"وہ کتے کے موافق مرنے کے لئے ادھر کیوں آئے گا؟ وہ آرام سے اپنی جگہ بیٹھ کر تمہارے باہر آنے کا انتظار کرے گا۔"

"رات ام ادر سے نکل جائے گا۔"

فتح خان نے یہ بات قابلِ غور کہی تھی۔ کرم خان اسے صرف دن میں روک سکتا تھا۔ رات کی تاریکی میں فتح خان بآسانی نکل سکتا تھا اور میں ایک بار پھر اس کے رحم و کرم پر ہوتا جبکہ مجھے آزادی حاصل کرنے کا موقع نظر آ رہا تھا کرم خان اس پناہ گاہ کے بائیں جانب کہیں چٹانوں میں تھا اور اس کے بائیں جانب کوئی سو فٹ کے میدان کے بعد چٹانیں تھیں اگر میں ان تک پہنچ جاتا تو نہ صرف کرم خان بلکہ فتح خان سے بھی محفوظ ہو جاتا لیکن

سوفٹ کا فاصلہ طے کرنا آسان نہیں تھا۔ کرم خان کے پاس رائفل تھی۔ اچانک مجھے خچروں کا خیال آیا تھا۔ میں ان کی آڑ میں یہاں سے نکل سکتا تھا۔

''شہباز توم اوپر آ جاؤ۔'' غالباً فتح خان کے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا، اس نے مجھے حکم دیا۔

''معاف کرنا...... پہلے ہی میں مرتے مرتے بچا ہوں اگر گولی دو انچ نیچے ہوتی تو خچر کے بجائے یہاں میری لاش پڑی ہوتی۔ اندھیرا ہونے سے پہلے میں اس جگہ سے حرکت بھی نہیں کروں گا۔''

''اور سے باگنے کا خیال مت کرنا۔'' آخر فتح خان نے کھل کر کہہ دیا۔ ''ام توم کو جانے نہیں دے گا۔''

''...... مجھے بھی اس کوشش میں جان دینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' میں نے کہتے ہوئے ایک خچر کی باگ جھاڑی سے نکالنا شروع کر دی۔ جب اس کی باگ ڈھیلی پڑ گئی تو میں نے اسے جھاڑی میں اپنے نزدیک ہی باندھا دیا تا کہ جب ضرورت پڑے، اسے نکال سکوں۔ اس کے بعد میں دوسرے خچر کی طرف کھسک کر آیا لیکن وہ نسبتاً کھلے میں تھا اور فتح خان نہ سہی کرم خان مجھے اس کی لگام نکالتے دیکھ سکتا تھا۔ لہٰذا میں رک گیا۔ کرم خان مشرق میں تھا جب سورج ڈوبنے لگتا تو اس کی روشنی براہ راست کرم خان کی آنکھوں میں جاتی اور اس وقت موقع ہوتا کہ میں خچر کی لگام نکال لیتا۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ درمیان میں فتح اور کرم کے درمیان کئی بار گفتگو ہوئی۔ جس میں برٹ شا اور ایمن کا ذکر آیا تھا اور ان کے لہجے میں اب تندی کے بجائے مفاہمت کا رنگ نمایاں تھا۔ شاید رفتہ رفتہ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ آپس کے جھگڑے میں کہیں یہ موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے لیکن ان میں مفاہمت اتنی آسان بھی نہیں تھی۔ ان کے اعتماد میں دراڑ آ چکی تھی۔ فتح خان کو باتوں میں لگانے کے لئے میں اس سے کرم خان کے بارے میں پوچھتا رہا۔ وہ اس کا چچازاد بھائی تھا اور ایک زمانے میں وہ ایک ساتھ گائڈ کا کام کرتے تھے اور غیر ملکی سیاح ٹیموں کو مختلف جگہوں پر لے جاتے تھے۔ اب مجھے پتا چلا کہ فتح خان اتنی بہترین انگریزی کیسے بولتا تھا۔ وہ غیر ملکی سیاحوں کے ساتھ جاتا تھا اور اسی وجہ سے اس کی انگریزی کی استعداد بہتر ہوتی گئی۔

''جب تم پورٹر اور گائڈ کا کام کرتے تھے تو پھر راجا عمر دراز کے پاس کیسے آئے؟''

''ام راجا کے ساتھ ایک ٹور پر گیا۔ تب ام نے اس کا جان بچایا اور راجا نے ام کو ملازمت میں لے لیا تب سے ام اس کے سات اے۔''

''تھے...... اب تم پلٹ کر راجا کی طرف گئے تو وہ اپنے ہاتھ سے تمہیں گولی مار دے گا۔'' میں نے تصحیح کی۔

اس دوران میں سورج رفتہ رفتہ مغرب کی طرف اتنا جھک گیا کہ میرے اندازے کے مطابق کرم خان کے لئے اس طرف دیکھنا آسان نہیں رہا تھا اس لئے میں آہستہ سے کھسک کر دوسرے خچر تک گیا اور اس کی لگام کھولنے کی کوشش شروع کی تھی کہ ایک سنسناتی گولی جھاڑیوں سے گزری اور میں پھرتی سے دوبارہ مرحوم خچر کی لاش کے عقب میں ہو گیا۔ کرم خان نے چلا کر فتح خان سے کچھ کہا اور فتح خان مجھ پر دھاڑا۔

''توم بھاگنے کی کوشش کرتا اے۔''

''یہ بکواس کرتا ہے۔ میں خچر کے پیچھے ہوں اس نے بلاوجہ گولی چلائی اور اب تمہیں گمراہ کر رہا ہے۔''

''توم ادھر والے خچر کی طرف کیوں آیا؟'' فتح خان نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"فتح خان...... یہ مکار شخص...... تمہیں اس طرح الجھا کر سامنے لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسری صورت میں تم مجھے اندر آنے کو کہو گے۔ ہم میں جو بھی مارا گیا فائدہ کرم خان کا ہی ہوگا۔"

"تو م ٹھیک بولتا اے۔" فتح خان نے چند لمحے بعد کہا۔ "یہ خنزیر ام کو دوکا دیتا اے۔"

"اندھیرا ہوتے ہی میں اندر آ جاؤں گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"کیا تو م چنے کا تھیلا اندر ہمیں پھینک سکتا اے، ام کو زور کا بوک لگا اے۔"

میں نے تھیلے والے خچر کو دیکھا جو ذرا آگے تھا یعنی وہی خچر جس کی میں نے لگام نکالنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے فتح خان کو بتایا۔ "وہ خچر کھلے میں ہے کرم خان مجھے نشانہ بنا سکتا ہے، اس لئے اندھیرا ہونے تک انتظار کرو۔"

"اچھا......" فتح خان نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ "خیر اب دیر نہیں اے۔"

ہمیں صبح سے پانی کے لئے ترسانے والے کو اپنی بھوک کا احساس تھا۔ رفتہ رفتہ سورج پہاڑوں کے عقب میں رُوپوش ہو گیا تھا اور اب تاریکی چھانے لگی تھی۔ پہاڑی علاقوں میں سورج غروب ہونے کے بعد بہت تیزی سے اندھیرا چھا جاتا ہے اور مجھے انتظار تھا۔ اندھیرا چھاتے ہی مجھے حرکت میں آنا تھا کیونکہ کرم خان کی آنکھوں کو تاریکی سے مانوس ہونے میں وقت لگتا۔ خوش قسمتی سے میں نے گہرے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے اس لئے میں بھی تاریکی کا جزو بن جاتا۔ سورج غروب ہونے کے پانچ چھ منٹ بعد میں حرکت میں آیا اور آگے سرک کر دوسرے خچر کی لگام بھی کھول دی۔ اسے پیچھے لایا اور پہلے والے خچر کو کھولتے ہوئے میں دونوں کو لے کر حرکت کرنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ میں خچروں کے عقب میں ہی رہوں۔ تاریکی کے باوجود آسمان صاف ہونے کی وجہ سے کرم خان کو خچروں کی حرکت کا احساس ہو گیا تھا اس نے فائر کیا۔ خچر بھڑک کر بھاگے اور میں ان کی آڑ میں بھاگتا رہا۔ دوسرے فائر پر ایک خچر بے ہنگم آوازیں نکالتا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے گولی لگ گئی تھی۔ میں اور دوسرا خچر بھاگتے ہوئے چٹانوں تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ میں نے آڑ میں آتے ہی اس کی لگام تھام کر اسے روکا ورنہ اس کا ارادہ بھاگتے ہی چلے جانے کا تھا۔ عقب میں زبردست شور شرابا تھا۔ کرم خان اور فتح خان آپس میں چیخ چیخ کر بات کر رہے تھے مگر ان کا سارا زور گفتگو تک محدود تھا۔ نہ تو کرم خان نے مزید کوئی فائر کیا اور نہ ہی فتح خان نے روشنی کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرے فرار سے واقف ہونے کے باوجود فتح خان سامنے آنے اور کرم خان پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

میں نے تاریکی میں خچر کو ٹٹولا تو یہ جان کر میری باچھیں کھل گئیں کہ یہ چنے کے تھیلے والا خچر تھا اور مجھے بھی زبردست قسم کی بھوک لگ رہی تھی لیکن اس وقت یہاں رکنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ فتح خان نہ سہی، کرم خان ضرور میرے پیچھے آ سکتا تھا۔ میں نے خچر کی لگام تھامی اور چٹانوں کی آڑ میں رہتے ہوئے آگے بڑھنے لگا میری کوشش تھی کہ جلدی سے جلد چٹانوں سے نکل کر درختوں اور جھاڑیوں والے حصے میں پہنچ جاؤں۔ وہاں چھپنے اور بچنے کے زیادہ مواقع تھے۔ پتھریلی زمین پر خچر کے سم آواز پیدا کر رہے تھے اور مجھے خوف تھا کہ یہ آواز میری نشان دہی نہ کر دے۔ کرم خان کے پاس کلاشنکوف رائفل تھی۔ وہ برسٹ مار دیتا تو میں اور خچر دونوں ہی آں جہانی ہو جاتے۔

درختوں والے حصے میں تاریکی شدید تھی اور وہاں قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ بمشکل میں نے خچر کو ایک جھاڑی تلاش کر کے وہاں باندھا اور اس کا تھیلا ٹٹولنے لگا۔ میں چنے والا تھیلا اتار رہا تھا کہ مجھے اس کے نیچے کسی اور شے کا احساس ہوا، میں نے اسے ٹٹولا۔ ایک اور تھیلے میں کوئی سخت دھاتی شے تھی مجھے فوراً چل گیا تھا کہ یہ پستول تھا۔ فتح خان نے اضافی پستول خچر کے تھیلے میں ڈال دیا تھا صرف پستول ہی نہیں اس میں فاضل گولیاں اور ایک عدد چھوٹی ٹارچ بھی تھی اور میرے لئے دونوں چیزیں نعمت غیر مترقبہ تھیں۔ میں نے پستول نکال کر ٹارچ کی محدود روشنی میں اس کا معائنہ کیا۔ اس کا میگزین مکمل طور پر بھرا تھا۔ فاضل گولیاں میں نے اپنی جیب میں ڈال لی تھیں۔ چنے کا تھیلا بھی خچر سے اتار لیا۔ اسے تلاش کرنا آسان تھا اور میری عافیت اسی میں تھی کہ خچر سے زیادہ سے زیادہ دور رہوں۔ خچر شاید پیاسا بھی تھا۔ اس لئے رہ رہ کر آوازیں نکال رہا تھا اور کوئی بھی ان آوازوں سے متوجہ ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک مٹھی چنے نکالے اور انہیں کھانے لگا اگرچہ اس میں یہ ضرور تھا کہ پیاس مزید بھڑک جاتی۔ بہر حال اب میں آزاد تھا اور اپنی تلاش کر سکتا تھا۔ مجھے یاد تھا جب ہم اس طرف آ رہے تھے تو ڈھلان پر کئی چشمے اور نالے ملے تھے جن میں بارش کا پانی موجود تھا۔ چنے کھانے سے پیٹ میں ہونے والی اینٹھن کم ہوئی تھی لیکن پیاس مزید بڑھ گئی تھی۔ رات ہونے کی وجہ سے موسم نم اور سرد تھا۔ ورنہ دن کی گرمی ہوتی تو میں شاید چلنے کی ہمت بھی نہ کر پاتا۔

کبھی کبھی میں ٹارچ جلا کر راستہ دیکھ لیا کرتا تھا۔ میرے کانوں کو پانی بہنے کی مخصوص آواز کی تلاش تھی اوپر آتے ہوئے نصف گھنٹے بعد بالآخر مجھے پانی بہنے کی مدھم آواز آئی اور میں نے ٹارچ کی روشنی میں پانی کا نالا تلاش کر لیا جس کی تہ میں پانی پتلی سی لکیر کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ میں نے چھلانگ لگانے کی خواہش پر قابو پایا اور احتیاط سے اتر کر نیچے تک جا پہنچا تھا۔ بارش کئی روز پہلے ہوئی تھی اور پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ بہر حال میری پیاس بجھانے کے لئے کافی تھا۔ میں نالے کے پاس بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ یہ سرد اور صاف پانی پیتا رہا۔ ساتھ ہی چنے کھاتا رہا حتیٰ کہ بھوک پیاس کا احساس ختم ہو گیا چنے میں نے کم کھائے تھے اور پانی زیادہ پیا تھا۔ یک لخت میرے حواس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میں وہیں نالے کی دیوار سے ٹیک لگا کر سو گیا۔ نیچا ہونے کی وجہ سے نالے میں ٹھنڈ کی شدت کم تھی۔ میں سکڑ سمٹ کر سوتا رہا تھا۔

اچانک کسی آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔ جاگنے کے بعد میں نے حرکت نہیں کی اور شاید اسی وجہ سے میں بچ گیا۔ مجھ سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر ایک سایہ پانی کے ساتھ بیٹھا چلو سے پانی پی رہا تھا اور اس کے پانی پینے کی آواز نے مجھے جگایا تھا اسے دیکھتے ہی میں نے سانس بھی روک لی تھی۔ تاریکی کے باوجود مجھے اس کی رائفل کی نال کی چمک نظر آئی تھی اور وہ یقیناً کرم خان تھا جو یہاں پانی پینے آیا تھا۔ جانے برٹ شا کہاں تھا! جب تک وہ اٹھ کر نالے کی دیوار پر چڑھ کر نہیں چلا گیا میں نے حرکت نہیں کی تھی۔ میرا پستول میرے پاس تھا لیکن اس کے پاس رائفل تھی۔ دوسرے میں عام انسان تھا جب تک میری جان پر نہ بن جاتی میں کسی کو مار نہیں سکتا تھا۔ شاید میں کوشش کرتا تب بھی میں اسے بے خبری میں نہیں مار سکتا تھا۔ اس کے جانے کے پانچ منٹ بعد میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی، ایک بار پھر جی بھر کے پانی پیا اور اوپر آ گیا۔ میری گھڑی میں صبح کے تین بج رہے تھے میں کوئی چھ سات گھنٹے سویا تھا اور پھر پوری طرح تازہ دم تھا بھوک ایک بار پھر میرے پیٹ میں ہلچل

مچا رہی تھی۔ میں چنے پھانک کر اسے کم کرنے لگا۔

میں واپس جاتے ہوئے محتاط تھا۔ ممکن ہے کرم خان بھی میری طرح اطراف میں منڈلا رہا ہو اور میرا اس سے ٹکراؤ ہو جائے۔ فتح خان کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ تاریکی ہوتے ہی وہ باہر نکل کر کرم خان پر قابو پانے اور برٹ شا کو اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ بلیک بکس کے ہیروں کے پیچھے دیوانہ ہو رہا تھا۔ ایمن اس کے پاس ترپ کے پتے کی طرح تھی مگر وہ برٹ شا کے بغیر بے کار تھی۔ اس سارے کھیل میں میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں جس کے سامنے بھی آتا وہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کرتا۔ مجھے یہاں سے فرار ہو جانا چاہئے تھا۔ اس سارے معاملے پر لعنت بھیج کر...... لیکن ایمن کا خیال میرے پاؤں میں زنجیر ڈال رہا تھا۔ اسے فتح خان اور کرم خان جیسے وحشیوں کے قبضے میں چھوڑ کر جانا ممکن نہیں تھا۔ میں ایک بار اسے ان کے چنگل سے نکال کر اس کے احسان کا بدلہ اتارنا چاہتا تھا۔

مجھے فکر لاحق تھی کہ کرم خان نے برٹ شا کا کیا کیا۔ وہ اسے آزاد نہیں چھوڑ سکتا تھا، یقیناً اسے بے دست و پا کر کے آیا تھا۔ دوسری طرف فتح خان بھی ایمن کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں جھاڑیوں اور درختوں سے ہوتا چٹانوں تک آیا۔ آسمان صاف ہو گیا تھا اور ستاروں کی روشنی میں چٹانیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ میں ایک جگہ بیٹھ کر نظر دوڑانے لگا۔ بغیر کسی واضح وجہ کے جنگل سے نکل کر چٹانوں میں داخل ہونا خطرناک ہو سکتا تھا کیونکہ کرم خان اور فتح خان ایک دوسرے کی تاک میں تھے۔ کسی کو میں مل جاتا تو یہ اس کے لئے بونس ہوتا۔ مجھے خیال آیا اگر میں کرم خان ہوتا تو برٹ شا کو کس طرح قید کرتا۔ میں اسے کسی درخت سے باندھ دیتا۔ اس طرح وہ خود کو آزاد نہیں کرا سکتا تھا اور درخت سے باندھنے کے لئے ضروری تھا کہ کرم خان اسے چٹانوں سے اوپر جنگل کی طرف لے جاتا۔ میں نے مشرقی ڈھلان کا جائزہ لیا۔ اس طرف جانے کے لئے مجھے خاصا طویل چکر لگانا پڑتا لیکن برٹ شا کے پائے جانے کا امکان اس طرف تھا میں اٹھ کر چلنے لگا۔ چھ سات گھنٹے کی نیند اور پیٹ بھر کر کھا پی لینے کے بعد جسم میں توانائی سی آ گئی تھی میں درختوں کے نیچے سے گزرتا مشرقی ڈھلان کی طرف آیا۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے لیا تھا اور کسی بھی صورت حال کا سامان کرنے کے لئے تیار تھا۔

میں درختوں کے درمیان برٹ شا کو تلاش کر رہا تھا۔ جس طرف مجھے شبہ ہوتا میں اسی طرف جاتا اچانک میں نے کسی کے کھانسنے کی آواز سنی۔ آواز بے حد نزدیک سے آئی تھی۔ میں چوکنا ہو گیا۔ ممکن ہے یہ برٹ شا ہوتا لیکن کرم خان کے پائے جانے کا امکان بھی تھا۔ میں بے حد آہستگی سے اس طرف حرکت کرنے لگا۔ اگر یہ برٹ شا تھا تب بھی کرم خان کے آس پاس پائے جانے کا پورا امکان تھا میں نے ایک درخت کے تنے پر ہاتھ رکھا تو میرے ہاتھ تلے رسی آ گئی تھی۔ میں نے ٹٹولا رسی کئی بار درخت کے تنے کے گرد گھومی ہوئی تھی اور دوسری طرف یقیناً برٹ شا تھا۔ میں نے اس تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کہ برٹ شا کی آواز سنی۔ ''کرم...... تم کدھر ہو مجھے پیاس لگی ہے۔ پانی دو...... مجھے کچھ کھانے کو دو...... سور کے بچے...... کتے کے بچے۔''

کرم خان نے اسے نہ جانے کب سے باندھ رکھا تھا۔ خود نہ جانے کہاں تھا۔ میں کرم خان کی طرف سے کسی ردِعمل کا منتظر تھا۔ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا لیکن سمجھ سکتا تھا۔ برٹ شا کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ گزشتہ چوبیس گھنٹے سے بھوکا پیاسا ہے۔ تقریباً پندرہ منٹ تک جب کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا تو میں گھوم کر

برٹ شا کے سامنے آ گیا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''آواز مت نکالنا۔'' میں نے سرگوشی کی۔ ''میں شہباز ہوں۔ ابھی تمہیں کھولتا ہوں۔ کرم خان کتنی دیر پہلے گیا تھا؟''

''دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔'' برٹ شا نے بھی آہستہ سے کہا۔ ''وہ حرامی یہیں کہیں ہوگا، مجھے پانی دو۔''

''پانی نہیں ہے لیکن میں تمہیں پانی تک لے جا سکتا ہوں۔'' ایک منٹ پہلے میں تمہیں کھول دوں۔''

میں نے گرہ تلاش کر لی جو کرم خان نے خاصی سخت باندھی تھی بڑی مشکل سے ایک ناخن تڑوا کر میں نے اسے کھول لیا۔ بل دے کر رسی اتاری تو برٹ شا آزاد ہوتے ہی گرنے لگا تھا میں نے اسے سہارا دیا۔ بھوک پیاس سے زیادہ مسلسل بندھے رہنے سے اس کا جسم بے جان ہو رہا تھا۔ میں اسے سہارا دے کر چلانے لگا۔ اس ترکیب سے وہ اپنی طاقت بحال کر سکتا تھا۔ چند منٹ کے بعد وہ صرف میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر چلنے لگا۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ برٹ شا بھی یہ بات سمجھتا تھا۔ اس لئے ہم خاموشی سے اور ہر ممکن تیزی سے سفر کرتے رہے۔ حرکت کرنے سے برٹ شا کا دوران خون بحال ہوا تھا اور اب وہ بغیر سہارے کے چل رہا تھا لیکن اس کی پیاس اور بھوک بھڑک اٹھی تھی۔ میرے پاس چنے تھے انہیں کھانے سے پیاس اور بھڑک جاتی اس لئے میں نے اسے چنوں کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس نے پہلا سوال ایمن کے بارے میں کیا۔

''وہ فتح خان کے قبضے میں ہے۔'' میں نے اسے جواب دیا اور مختصراً اسے اپنے فرار کا بتایا۔ ''یہ بتاؤ تم پر کیا گزری تھی؟''

''یہ سب کرم خان کا حرامی پن ہے۔ واپسی کے سفر میں اس نے اچانک میرے سر پر رائفل کا بٹ مارا اور جب مجھے ہوش آیا تو میں درخت سے بندھا تھا۔ وہ مجھ سے بلیک بکس کا پوچھ رہا تھا جب میں نے جواب نہیں دیا تو اس نے مجھ پر تشدد بھی کیا تھا۔''

''کرم خان کو انگریزی آتی ہے؟'' مجھے تعجب ہوا۔

''بہت اچھی......'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے اس سے صاف کہہ دیا جب تک مجھے ایمن نہیں ملے گی میں اسے بلیک بکس کا پتا نہیں بتاؤں گا چاہے وہ میری بوٹیاں کیوں نہ نوچ لے۔ اس پر مجبور ہو کر اس نے فتح خان سے ایمن کو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''فتح خان تو تم پر شک کر رہا تھا، یہ تو ایمن کو خیال آیا کہ کرم خان نے تمہیں قبضے میں لے لیا ہے پھر جلد کرم خان کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اس نے فتح خان سے ایمن کا مطالبہ کیا تھا۔''

''تمہارے پاس پستول ہے۔'' برٹ شا نے ایک کھلی جگہ پر میرے ہاتھ میں پستول دیکھ لیا تھا۔

''ہاں مجھے خچر سے ملا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''میرے پاس چنے بھی ہیں لیکن بہتر ہے تم پہلے تھوڑا پانی پی لو تا کہ پیاس اور نہ بھڑکے۔ نالا کچھ ہی دور ہے۔''

پانی کی آواز سن کر برٹ شا اتنا بے تاب ہوا کہ نالے میں تقریباً کود گیا تھا جب تک میں اسے روکتا وہ کئی بڑے گھونٹ لے چکا تھا۔ اچانک اسے ابکائی آئی اور پیا ہوا سارا پانی الٹی کی صورت میں نکل گیا۔

''آرام سے۔'' میں نے جھک کر کہا۔ ''پانی چوس کر پیو اور چند گھونٹ کے بعد چنے لے لینا ورنہ خالی پیٹ پھر الٹی آ جائے گی۔''

اس بار اس نے تھوڑا پانی پیا اور چنے لے کر چبانے لگا۔ ہم نالے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے میں اسے بتانے لگا کہ فتح خان کا ارادہ تھا رات ہوتے ہی وہ ایمن کے ہمراہ اس پناہ گاہ سے نکل جائے گا جو دن میں اس کے لئے چوہے دان ثابت ہوئی تھی۔ برٹ شا بے قرار ہو گیا۔ ''کہیں وہ ایمن کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کرے۔''

''فکر مت کرو، جب تک بلیک بکس ان کے ہاتھ نہیں آ جاتا وہ اسے انگلی بھی نہیں لگائیں گے مگر جیسے ہی بلیک بکس ہاتھ آئے گا وہ تمہیں قتل کریں گے اور ایمن ان کی درندگی کا نشانہ بنے گی کیونکہ وہ ایک کمزور لڑکی ہے۔''

''نہیں۔'' برٹ شا نے اضطراب سے کہا۔ ''میں انہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔''

''اس کی ایک ہی ترکیب ہے۔ ایمن کو ان کے قبضے سے چھڑا لیا جائے۔ کرم اور فتح ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے ہیں۔ ہم ان کی دشمنی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''یہ تو میں نے ابھی نہیں سوچا لیکن اگر وہ آپس میں لڑ جائیں تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔''

برٹ شا نے غور کیا۔ ''وہ اتنے پاگل نہیں ہیں کہ خود لڑ کر ہمیں بھاگنے کی موقع دیں۔''

''لالچ بری بلا ہے۔ وہ مل بانٹ کر کھانے کے بجائے ہیروں کو اکیلے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

''پستول مجھے دے دو۔ مجھے چلانا آتا ہے۔''

''پستول مجھے بھی چلانا آتا ہے۔ بیس فٹ کے فاصلے پر رکھا سیب اڑا سکتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''آؤ کچھ دیر میں صبح کی روشنی نمودار ہو جائے گی۔''

چنے کھانے کے بعد اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ اس نے میرے روکنے کے باوجود ایک بار پھر جی بھر کر پانی پیا۔ ہم کچھ دور چلے تھے کہ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ''مجھے...... چکر آ رہا ہے۔''

''یہ کھا کر اتنا پانی پینے کا نتیجہ ہے اب تم کہیں لیٹ کر آرام کرو۔ ورنہ کسی کام کے قابل نہیں رہو گے۔'' میں نے اسے مشورہ دیا اور وہ وہیں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر دراز ہو گیا اور ذرا دیر میں وہ بے ہوشی کے انداز میں سو چکا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ تین چار گھنٹے سے پہلے نہیں جاگے گا۔ دوسرے مجھے اس کی نہیں ایمن کی فکر تھی۔ اسے سوتا چھوڑ کر میں نیچے اترنے لگا۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ تارے کم ہو گئے تھے کیونکہ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے اور دھند چھا رہی تھی۔ روشنی اتنی کم تھی کہ راستہ نظر آنا محال ہو رہا تھا جیسے تیسے میں چٹانوں تک پہنچا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ فتح خان اور کرم خان کہاں ہیں اس تاریکی میں وہ نچلے نہیں بیٹھے ہوں گے بلکہ حرکت کر رہے ہوں گے۔

اچانک چٹانوں والے علاقے کے مغربی حصے سے رائفل کا فائر ہوا اور اس کے بعد پے در پے پستول سے فائر ہوئے اور پھر سناٹا چھا گیا۔ فتح اور کرم میں مقابلہ شروع ہو گیا تھا صرف فائر کی آواز بتا رہی تھی کہ کوئی نی نہیں ہوا ہے۔ دونوں بچ گئے تھے یا ان میں سے کوئی فنا کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ میں تیزی سے ڈھلان پر سے زنے لگا اور چٹانوں میں آنے کے بجائے ان کے اوپر سے ہوتا مغربی حصے کی طرف جانے لگا۔ چٹانوں میں

جانے کی صورت میں ان لوگوں سے اچانک سامنا ہوسکتا تھا اور بہر حال میں ان کے مقابلے میں ایک عام فرد تھا اور وہ دونوں پکے بدمعاش تھے۔ جیسے جیسے میں مغربی حصے کی طرف جا رہا تھا مجھے ایک عجیب سی سرسراتی آواز آ رہی تھی۔ قریب جانے پر یہ آواز واضح ہونے لگی۔ کوئی سسکیاں لے رہا تھا بلکہ لے رہی تھی اور یہ بلاشبہ ایمن تھی۔ میں گھومتا ہوا ایک چٹان کے اوپر پہنچا تھا۔ میں نے فتح ان کی دبی دبی آواز سنی، وہ اسے پھٹکار رہا تھا۔

''چپ رہو۔ تمہارے اس باپ نے سن لیا تو اس بار سر میں گولی مارے گا۔''

''مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔'' میں نے ایمن کی کراہتی آواز سنی۔ ''بہت درد ہو رہا ہے۔''

''اب کیا ادسکتا ہے؟'' فتح خان بولا۔ ''برداشت کرو۔ ام اس حرامی کو گولی مار دے گا۔''

''تم اس سے کون سے کم ہو؟'' ایمن تلخی سے بولی۔ ''کاش میں نے پاپا کے ساتھ آنے کے بجائے گھر رکنے کا فیصلہ کیا ہوتا۔''

''اور آنا تمارے مقدر میں تھا۔'' فتح خان فلسفیانہ انداز میں بولا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ ایمن کو گولی لگی ہے مگر زخم خطرناک نہیں تھا ورنہ وہ اس اسپرٹ میں بات نہ کر رہی ہوتی اور زخم رائفل کی گولی کا تھا جو بہر حال خطرناک ہوتا ہے۔ فتح خان اس چٹان تلے چھپا تھا تو کرم خان لازماً سامنے والے حصے میں کہیں تھا۔ میں چٹان کے اوپر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ روشنی ہونے پر مجھے کرم خان نظر آ جاتا کیونکہ میں بلندی پر تھا پھر میں نے اس کی آواز سنی وہ اپنی زبان میں فتح خان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ فتح خان نے غراتے لہجے میں جواب دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے کرم خان کی طرف ایک فائر بھی کیا تھا۔

آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ کرم خان بیس پچیس گز کے فاصلے پر تھا۔ یعنی وہ بھی فتح خان کی فائرنگ کی حد میں تھا اور اس لحاظ سے میرے پستول کے فائر کی زد میں بھی تھا لیکن میرا نشانہ کرم خان نہیں تھا بلکہ مجھے فتح خان سے ایمن کو حاصل کرنا تھا۔ وہ زخمی بھی ہوگئی تھی اور اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی جبکہ فتح خان کو اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ مشرق سے روشنی نمودار ہونے لگی تھی اور میں کرم خان کی نظر میں آ سکتا تھا۔ اس لئے میں چٹان سے ہٹ گیا اور ذرا دائیں طرف ایک گول چٹان کے پیچھے مورچہ بنالیا۔ یہاں سے میں دونوں طرف نظر رکھ سکتا تھا۔ کرم خان روشنی نمودار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس طرح وہ فتح خان کو آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ جس جگہ وہ چھپا تھا وہ جگہ کرم خان کی فائرنگ کی زد میں تھی تبھی ایمن کو گولی لگی تھی۔ روشنی ہونے پر یہ جگہ اور بھی غیر محفوظ ہو جاتی۔ یہ بات غالباً فتح خان کے ذہن میں بھی تھی۔ میں نے ایک سائے کو اس چٹان کی طرف سے نمودار ہوتے دیکھا جس کے تلے فتح خان اور ایمن چھپے تھے۔ سایہ اوپر سے خاصا چوڑا لگ رہا تھا۔ میں نے آنکھوں پر زور دیا تو پتا چلا کہ سائے نے شانے پر کسی کو اٹھا رکھا ہے۔ فتح خان ایمن کو اس طرح سے لے کر آ رہا تھا۔ اچانک رائفل کا فائر ہوا اور وہ نیچے گر گیا۔ میں دم بخود رہ گیا۔ گولی اسے یا ایمن کو لگی تھی۔ مکار کرم خان بھی ان کے پیچھے تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ سایہ لیٹے لیٹے اوپر کی طرف حرکت کر رہا ہے اور اوپر لیٹی ایمن چپ اور ساکت تھی شاید بے ہوش ہو چکی تھی۔ اتفاق سے فتح خان ایمن کو لئے اس چٹان کی طرف آ رہا تھا جس کے عقب میں، میں تھا۔ مشرق کی طرف سے روشنی خاصی نمودار ہو چکی تھی اور ماحول بھی رفتہ رفتہ روشن ہوتا جا رہا تھا مجھے کرم خان کی

تلاش تھی آخر وہ مجھے ایک ۔دوسری چٹان کے عقب میں رینگتا نظر آیا۔ میں چاہتا تو اسے نشانہ بنا سکتا تھا مگر اس پر فائر کرنے سے فتح خان ہشیار ہو جاتا اور اس کے قبضے سے ایمن کو حاصل کرنا دشوار ہو جاتا۔ میں پوری طرح چوکس تھا جیسے ہی فتح خان نزدیک آتا میں پستول کی مدد سے اس پر قابو پالیتا مگر دوسری طرف کرم خان موت بن کر ان کا تعاقب کرر ہا تھا۔ وہ ایمن کو زخمی کر چکا تھا۔ بے شک اس کا ارادہ فتح خان کو جہنم رسید کرنا تھا مگر گولی اس میں اور ایمن میں فرق نہیں کرتی۔ ان کی آپس کی لڑائی میں وہ بھی ماری جا سکتی تھی۔

کرم خان وقفے وقفے سے سر اٹھا کر فتح خان کو دیکھنے کی کوشش کرر ہا تھا، وہ مجھ سے کوئی دس گز کے فاصلے پر تھا اور ایک چھوٹی سی چٹان کے عقب میں پوشیدہ تھا۔ اس نے ایمن کو اس چٹان کے پیچھے لٹایا اور خود رینگتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ وقتی طور پر میری ساری توجہ فتح خان پر مبذول ہو گئی تھی اور جیسے ہی وہ چٹان کے پاس آیا میں نے اچانک عقب سے اس کے سر پر پستول کے دستے سے ضرب لگائی۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی تھی لیکن دوسری ضرب پر وہ ساکت ہو گیا میں نے جھک کر اس کے ہاتھ سے پستول نکال لیا پھر کرم خان کی طرف متوجہ ہوا لیکن وہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ اتنی جلدی وہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اچانک اپنے سر کے عقب میں کسی شے کا دباؤ محسوس ہوا اور مجھے کرم خان کی آواز آئی۔ وہ مقامی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ بے اختیار میرے دونوں ہاتھ اوپر بلند ہو گئے کرم خان نے ایک ایک کر کے مجھ سے دونوں پستول چھین لئے اور پھر رائفل بدست سامنے آ گیا۔ میں اب تک حیران تھا وہ اتنی پھرتی اور خاموشی سے آیا تھا کہ مجھے کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔

''اوپر کیسے آئے؟ میری موجودگی کا کیسے پتا چلا؟'' میں نے انگریزی میں پوچھا۔

''ادھر سے۔'' اس نے ایک راستے کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔''

کرم خان نے مجھے فوری طور پر گولی نہیں ماری تھی اس کا مطلب تھا کہ وہ فی الحال مجھے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے نیچے بے سدھ پڑی ایمن کی طرف اشارہ کیا۔ ''اگر اجازت ہو تو میں اسے دیکھ لوں۔''

''ابھی نہیں...... اسے دیکھو......'' اس نے فتح خان کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کی چادر سے اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔''

میں نے کرم خان کے چاقو سے چادر کے ٹکڑے کر کے پٹیاں بنائیں اور ان سے فتح خان کے ہاتھ پیر باندھ دیئے۔

''اب یہ سارا دن ادھر دھوپ میں پڑا رہے گا۔'' کرم خان مسکرایا۔

ایمن چٹان کے ساتھ گٹھری سی بنی پڑی تھی۔ گولی اس کے بازو سے چھوتی گزر گئی تھی اور خون سے پوری آستین سرخ ہو رہی تھی مگر اس کی بے ہوشی کی وجہ کچھ اور تھی وہ اس نے بعد میں بتایا کہ فتح خان نے اس کے سر پر زور سے مکا مارا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے اسے کرم خان کے حکم کے مطابق اٹھا لیا۔ مجھ سے چنے کا تھیلا اس نے لے لیا تھا اور بے صبری سے چنے کھائے تھے وہ بھی بھوکا تھا۔ چٹانوں کے اوپر سے ہوتے ہم جنگل میں داخل ہوئے۔ میں سخت دل برداشتہ تھا۔ کامیابی اتنی آسانی سے میرے ہاتھ سے نکل جائے گی، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ دن کی روشنی نمودار ہو چکی تھی۔ کرم خان نے ایک جگہ مجھے ایمن کو زمین پر لٹانے کا حکم دیا اور

پہلا سوال برٹ شا کے بارے میں کیا۔

''وہ کہاں ہے؟...... جھوٹ مت بولنا مجھے معلوم ہے اسے تم نے ہی آزاد کرایا ہے۔''

''میں اسے پانی پلانے نالے تک لے گیا تھا مگر زیادہ پانی پی لینے سے وہ راستے میں بے ہوش ہو گیا۔''

''کہاں...... مجھے اس تک لے چلو۔'' وہ بے تابی سے بولا تھا۔ ''اگر وہ نکل گیا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

''اسے کہاں چھوڑیں......'' میں نے ایمن کی طرف دیکھا۔ ''یہ بے ہوش ہے اور بے بس ہے۔''

''اسے یہیں پڑا رہنے دو اور چلو۔'' اس نے مجھے دھکیلا۔ مجبوراً مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ ہم دوبارہ مغربی ڈھلان سے ہوتے اس حصے کی طرف آئے جس کے اوپر برساتی نالا بہتا تھا۔ کرم خان مجھے رائفل کی نال سے دھکیل رہا تھا اور مجھے اس کے تیوروں سے لگ رہا تھا برٹ شا کے ملتے ہی وہ مجھے گولی مار دے گا۔ وہ صرف اس وجہ سے رکا تھا، میں نے محسوس کیا کہ کرم خان اپنے کزن فتح خان سے کہیں زیادہ سفاک تھا۔ میں اسے اندازے سے اس جگہ تک لایا جہاں میں برٹ شا کو چھوڑا تھا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ کرم خان جھنجلا گیا۔

''کدھر ہے وہ؟''

''مجھے کیا معلوم؟ اس جگہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اب بعد میں اسے ہوش آیا اور وہ کہاں گیا یہ مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے جواب دیا تو وہ جھنجلا گیا تھا۔

''بکواس مت کرو۔ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

''اگر مجھے گولی مارنے سے برٹ شا ملتا ہے تو مجھے ضرور مار دو لیکن فائر کی آواز اسے ہوشیار کر دے گی۔ ابھی ایمن کی صورت میں تمہارے پاس ایک کارڈ ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے بے تابی سے کہا۔ ''جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو وہ غائب ہو جائے۔'' اس نے مجھے پھر دھکیلا اور ہم تیز رفتاری سے واپسی کا سفر کرنے لگے۔ پتا نہیں میں کرم خان کو صحیح مقام تک لے گیا تھا یا لاشعوری طور پر اسے غلط جگہ دکھائی تھی۔ شکر ہے اس نے غصے سے پاگل ہو کر مجھے گولی نہیں ماری۔ تیز رفتاری سے ہم واپس اس جگہ آئے جہاں ایمن کو لٹا کر گئے تھے، اب وہ جگہ بھی خالی تھی۔ کرم خان کا غصے سے برا حال ہو گیا اور وہ چیخ چیخ کر اپنی زبان میں گالیاں دینے لگا۔ کم سے کم اس کے تاثرات سے ایسا ہی لگ رہا تھا پھر اس نے پستول نکال کر اس کا رخ میری طرف کر دیا۔ ''یہ سب تمہارا قصور ہے میں تمہیں قتل کر دوں گا۔''

''اگر تم مجھے بے فائدہ قتل کرنا چاہتے ہو تو کر دو۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ہاں یہ تم نے ٹھیک کہا۔ میں تمہیں بے فائدہ نہیں ماروں گا۔ مجھے معلوم ہے برٹ شا اور اس کی لڑکی اس جگہ کے آس پاس ہیں۔'' وہ زور سے بولنے لگا۔ ''اگر میرے دس گننے تک وہ سامنے نہیں آئے تو میں تمہیں بائیں گھٹنے میں گولی ماروں گا اور پھر دس گننے تک سامنے نہیں آئے تو دائیں گھٹنے کو نشانہ بناؤں گا اس طرح ہر دس بار گننے کے بعد تمہیں ایک گولی ماروں گا اور پھر بھی یہ دونوں سامنے نہیں آئے تو آخری گولی۔'' اس نے انگلی سے میرا ماتھا تھپکا۔ ''یہاں ماروں گا۔''

میں سچ مچ ڈر گیا تھا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''میں ایسا کروں گا۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا اور بلند آواز سے گنتی گننے لگا۔ ''ایک...... دو...... تین...... چار...... پانچ۔''

''کرم خان میری بات سنو۔ میں اتنا اہم نہیں ہوں کہ وہ میری جان بچانے کی خاطر تمہارے سامنے آ جائیں اس وقت وہ تمہاری حماقت سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ تم خود سوچو کوئی کسی کی خاطر خود کو موت کے سامنے دھکیلے گا۔''

''بے شک وہ سامنے نہ آئیں اس صورت میں، میں پہلے وعدے کے مطابق تمہیں گولیاں ماروں گا اور پھر ان کی تلاش میں جاؤں گا۔ اس علاقے کو وہ مجھ سے بہتر نہیں جانتے میں انہیں پکڑ لوں گا۔ چھ...... سات...... آٹھ...... نو۔''

''میری بات سنو۔'' میں نے ہاتھ اوپر کیا۔

''دس......'' اس نے گنتے ہی پستول بلند کیا تھا کہ ایمن کی آواز آئی۔

''رکو......'' وہ ایک درخت کے پیچھے سے نکل کر آئی تھی۔ ''اسے مت مارو۔''

ایمن کی حالت خراب تھی۔ میں دیکھ رہا تھا وہ بمشکل کھڑی ہے اور زور زور سے ہانپ رہی تھی مگر کرم خان کو برٹ شا کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ''لڑکی! تمہارا باپ کہاں ہے؟''

''پتا نہیں...... میں نے اسے نہیں دیکھا۔'' ایمن بولی اور کرم خان کی طرف آنے لگی۔ اسی لمحے میں نے برٹ شا کو دیکھ لیا وہ ایک عدد ڈنڈا لئے عقب سے کرم خان کی طرف بڑھ رہا تھا اس کی کوشش تھی کہ اس کے قدموں کی آہٹ کرم خان تک نہ پہنچے جو پوری طرح ایمن کی طرف متوجہ تھا۔ ''مجھے ہوش آیا تو میں یہاں پڑی تھی۔ مجھے فتح خان سے کس نے چھڑایا؟''

''میں نے؟'' کرم خان فخر سے بولا۔ حالانکہ یہ سفید جھوٹ تھا۔

''تم شہباز کو کیوں مارنے کی بات کر رہے تھے؟''

''کیونکہ یہ میرے لئے بے کار شے ہے اور میں بے کار چیزوں کو ضائع کر دیا کرتا ہوں۔'' اس نے کہا اور پستول کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ لاشعوری طور پر میں جان بچانے کے لئے بغیر کسی ارادے کے خود بخود گرا تھا اور اسی لمحے کرم خان نے گولی چلا دی جو سنسناتی ہوئی میرے پاس سے گزری تھی۔ ایمن نے چیخ ماری اور اس کے والد بزرگوار نے ڈنڈا کرم خان کے پستول والے بازو پر مارا۔ حالانکہ یہ ڈنڈا کرم خان کے سر پر مارنا چاہئے تھا بہرحال ضرب کی شدت کی وجہ سے پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا اس نے چلا کر گالی دی اور گھوم کر برٹ شا کو لات ماری۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا لیکن ڈنڈا ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا، اسے کرم خان کے پیروں پر مارا اور وہ چیخ مار کر نیچے گرا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ شانے پر لٹکی رائفل کے بجائے دوسرا پستول نکالنے کی فکر میں تھا۔ برٹ شا نے ڈنڈا مارا مگر وہ کروٹ لے کر بچ گیا۔ میں نے زمین پر گرے پستول کی طرف چھلانگ لگائی اور جس وقت کرم خان جیب سے پستول نکال کر برٹ شا کو نشانہ بنانے جا رہا تھا، میں نے پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ ''بس اب حرکت مت کرنا۔ پستول نیچے رکھ دو ورنہ......''

اس نے بادل نخواستہ پستول نیچے رکھ دیا جسے میں نے اٹھا کر برٹ شاہ کی طرف اچھال دیا اور خود اس کے

شانے سے رائفل اتار کر سب سے پہلے ایک عدد ٹھوکر اس کے سر پر رسید کی۔ لگا تار چند ٹھوکریں سر پر کھانے کے بعد وہ بھی لیٹ گیا تھا۔ یہ ایمن پر گولی چلانے کی سزا تھی۔ ایمن نے ہی آ کر مجھے روکا۔ ''بس کرو، یہ بے ہوش ہے۔''

''اتنا غیرت مند نہیں ہے۔'' میں نے اس کے جسم پر ایک موزوں مقام پر پاؤں رکھا تو وہ بے ہوشی کی اداکاری بھول کر بلبلا گیا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی تو اس کی شلوار سے ایک خنجر اور ایک چھوٹا سا ریوالور نکلا تھا۔ برٹ شا چوکس کھڑا تھا اور لگ رہا تھا کہ کرم خان کی کسی بھی غلط حرکت پر اسے شوٹ کر دے گا۔ میں نے کرم خان کی قمیص اتار کر پھاڑی اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ برٹ شاہ ایمن کا زخم دیکھ رہا تھا۔ اس کا خون رک گیا تھا لیکن اسے طبی امداد کی اشد ضرورت تھی۔ ''رائفل کی گولی کا زخم جلدی خراب ہو جاتا ہے اور ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ پہلے ہمیں نالے تک جا کر اس کا زخم صاف کرنا ہوگا ممکن ہے وہاں کوئی ایسی جھاڑی بھی مل جائے جس کے پتے مرہم کا کام دے سکیں۔'' برٹ شا بولا۔

''اس کی حالت نالے تک جانے والی نہیں ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم دونوں ٹھہرو۔ میں خچر لے کر آتا ہوں۔ دو خچر تو مارے جا چکے ہیں ایک میں نے جھاڑیوں میں باندھ دیا تھا۔''

میں نے پہلے جا کر چٹانوں والی پناہ گاہ دیکھی۔ خوش قسمتی سے بھاگنے والا خچر وہاں آ گیا تھا۔ میں نے سامان اس پر لادا اور اسے لے کر اس جگہ پہنچا جہاں دوسرے خچر کو باندھا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ موجود تھا۔ ان دونوں کو لے کر واپس آیا۔ برٹ شا اور ایمن چنے کھا رہے تھے۔ ایمن کو بعد میں فتح خان نے پانی بھی دیا تھا۔ اس لئے اسے بے تاب کرنے والی پیاس نہیں لگی تھی۔ برٹ شا نے کرم خان کو ایک درخت سے باندھ دیا تھا۔ وہ ہوش میں تھا اور مجھے دیکھ کر گڑگڑایا۔ ''خدا کے لئے مجھے اس طرح باندھ کر مت جاؤ۔''

''تمہیں آزاد کر دیں تا کہ تم پھر ہمارے پیچھے پڑ جاؤ۔'' میں نے طنز کیا۔

ایمن کو خچر پر بٹھا کر ہم نالے تک آئے، اس کے زخم کو دھویا۔ خود بھی پیاس بجھائی۔ ڈبے میں پانی بھرا اور خچروں کو بھی پانی پلایا۔ اس کے بعد انہیں نالے کے ساتھ اگی ہوئی گھاس کھانے کے لئے چھوڑ دیا۔ میں نے برٹ شا سے کہا۔ ''ہم اس علاقے سے باہر کیسے جائیں گے؟''

''مجھے راستہ پتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن ابھی ایک کام باقی ہے۔''

''بلیک بکس۔'' مجھے یاد آیا۔ ''وہی اس فساد کی جڑ ہے۔''

''ہاں، لیکن یہ ایک ذمے داری ہے، میں اس کی قیمت سوئس بینک کے ڈرافٹ کی صورت میں ادا کر چکا ہوں۔ اگر میں انہیں نہ پہنچا سکا تو اپنا سب کچھ بیچ کر بھی ان کی قیمت ادا نہیں کر سکوں گا اور بدنامی الگ ہوگی۔''

''بلیک بکس کہاں ہے؟''

''تم ایمن کا خیال رکھو۔'' اس نے میرا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ ''میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں، اس کے بعد ہم روانہ ہوں گے۔''

برٹ شا پستول اور خچر لے کر چلا گیا۔ یہ آخری موقع تھا جب میں نے اسے دیکھا۔ میں اور ایمن نالے کے کنارے سبز گھاس پر دراز تھے۔ میں رات سویا تھا لیکن اس کے بعد ہونے والی اعصاب شکن جدوجہد اور مار

دھاڑ نے مجھے تھکا دیا تھا۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ میں کب سو گیا۔ دوپہر دو بجے مجھے ایمن نے اٹھایا۔ ''شہباز، پاپا ابھی تک نہیں آئے، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

برٹ شا آدھے گھنٹے کا کہہ کر گیا تھا اور اسے گئے ہوئے چار گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ یہ خاصی تشویش ناک بات تھی۔ اتنی دیر میں تو آدمی وادی کے دو چکر لگا سکتا تھا۔ ایمن پریشان تھی۔ ''فکر نہ کرو، ہم ابھی انہیں تلاش کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ نالے میں اتر کر میں نے پانی پیا جو نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا کین کا پانی میں محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ سامان خچر پر رکھا اور ایمن کو اس پر بٹھا کر نیچے کی طرف چل پڑا۔ سچی بات ہے مجھے برٹ شا کی اس لئے فکر تھی کہ وہ ہمیں اس علاقے سے باہر لے جا سکتا تھا۔ زخم صاف ہونے اور اس پر پتوں کے مرہم کا لیپ ہونے کے بعد ایمن کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ ذرا دیر بعد ہم چٹانی علاقے میں تھے۔ ایمن کو ذرا اوپر سائے میں چھوڑ کر اور اسے ایک عدد پستول دے کر میں نے چٹانوں کا رخ کیا۔ میرے پاس رائفل تھی۔ میں نے چٹانوں میں برٹ شا کو آوازیں دیں۔ خود بھی گھوم کر دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ پھر میں اس چٹان تک گیا جس کے اوپر فتح خان کو باندھا چھوڑ کر آئے تھے مگر وہ غائب تھا اور اس کی چادر کے ٹکڑے پڑے تھے۔ میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں بھاگتا دوڑتا واپس آیا اور ایمن کو اپنی جگہ پا کر سکون کا سانس لیا۔ میں نے اسے فتح خان کے غائب ہونے کے بارے میں بتایا۔ اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ ''پاپا خطرے میں ہیں۔''

اور میں سوچ رہا تھا کہ برٹ شا خطرے کی حد سے گزر چکا ہے۔ ''ہمیں کرم خان تک جانا ہوگا۔ ممکن ہے برٹ شا وہاں ہو، نیچے چٹانوں میں وہ نہیں ہے۔''

خچر سمیت ہم اس ڈھلان تک پہنچے جہاں کرم خان کو درخت سے باندھا تھا۔ دور سے وہ سر جھکائے بے ہوش سا نظر آیا لیکن قریب جانے پر مجھے اندازہ ہوا، اس کی بے ہوشی دائمی تھی۔ اس کے عریاں سینے پر خون پھیلا ہوا تھا۔ کسی نے اس کا گلا کاٹ دیا تھا۔ ایمن نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا اور میرا خیال پختہ ہونے لگا کہ برٹ شا اب زندہ نہیں ہے۔ فتح خان نے کسی طرح خود کو آزاد کرا لیا تھا۔ اس نے برٹ شا اور کرم خان دونوں کا کام تمام کر دیا تھا اور خود فرار ہو گیا تھا۔ اگر اس نے برٹ شا کو ہلاک کیا تھا تو اس کا پستول فتح خان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اب اس جگہ ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

''ایمن ہمیں اس جگہ سے نکلنا ہوگا۔''

''میں پاپا کے بغیر نہیں جاؤں گی۔''

''ایمن حوصلہ کرو...... میرا خیال ہے...... تمہارے پاپا اب زندہ نہیں ہیں۔''

''نہیں۔'' اس نے چلا کر کہا۔ ''تم بکواس کرتے ہو۔''

''ممکن ہے لیکن دیکھو، فتح خان غائب ہے۔ کرم خان کو اس نے قتل کیا ہے۔ یہ کام تمہارے پاپا کا نہیں ہو سکتا۔ فتح خان نے انہیں بھی مار دیا ہے اور اب وہ ہماری تاک میں ہوگا۔''

''نہیں......'' ایمن نے سسکی لی تھی۔

''امکان یہی ہے ورنہ تم بتاؤ برٹ شا کہاں ہے؟ میں نے اسے جتنی دیر تلاش کیا ہے اگر وہ اس وادی میں ہوتا تو اسے مل جانا چاہئے تھا۔ پتا نہیں فتح خان کہاں ہے؟ اگر وہ یہاں ہے تو ہم خطرے میں ہیں۔''

ایمن باپ کے بغیر جانے کے لئے تیار نہیں تھی لیکن میں نے اسے کسی نہ کسی طرح راضی کرلیا۔ سورج کے غروب ہونے کی پوزیشن دیکھ کر میں نے جنوب مشرق کا تعین کیا اور ہم چل پڑے۔ ایمن بار بار پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ ہمارے پاس کمبل اور خوراک تھی۔ دو تین دن ہم آرام سے سفر کر سکتے تھے۔ دو، تین بار ایمن نے ضد کی کہ واپس چل کر اس کے باپ کو تلاش کیا جائے لیکن میں ایسا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ایک مہینے بعد مجھے اس جنجال سے نکلنے کا موقع ملا تھا اور میں اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے ایمن کی التجائیں نظر انداز کیں اور سفر جاری رکھا۔ ایک بار اس نے زیادہ ہی رونا دھونا کیا تو میں نے خچر کی لگام اس کے حوالے کر دی۔

''تم جا کر شوق سے اپنے باپ کو تلاش کرو۔ میں صرف یہ رائفل لے کر جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور چل پڑا۔ عقب سے ایمن کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ذرا آگے جا کر میرے قدم رک گئے اور میں نے واپس آ کر خچر کی لگام اس سے لے لی۔ رات دس بجے تک ہم تاروں کی چھاؤں میں سفر کرتے رہے حتیٰ کہ ایمن نے ٹھنڈ سے لرزنا شروع کر دیا۔ مسلسل سفر سے اس کی حالت ویسے ہی خراب ہو رہی تھی۔ ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے اسے زمین پر کمبل بچھا کر لٹا دیا۔ لکڑیاں جمع کر کے الاؤ جلایا اور اسے چنے کھانے کو دیئے۔ حرارت ملی تو اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی تھی۔ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ فرار ہونے کے بعد میں نے کیا کیا تھا۔ کیسے برٹ شا کو آزاد کرایا اور کیسے فتح خان کو قابو میں کیا لیکن کرم خان نے حیرت انگیز پھرتی سے مجھے قابو کر لیا تھا۔ باپ کے ذکر پر وہ آبدیدہ ہو گئی تھی۔

''شہباز، ممکن ہے پاپا زخمی ہوں، انہیں مدد کی ضرورت ہو؟''

''اگر وہ وہاں موجود ہوتے تب بھی میں انہیں تلاش کر لیتا۔ میرے ذہن میں ابھی ایک خیال اور آیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فتح خان نے کسی طریقے سے تمہارے پاپا پر قابو پا لیا ہو اور انہیں اپنے ساتھ لے گیا ہو۔ برٹ شا نے اسے بتایا ہو کہ کرم خان کہاں بندھا ہے، ورنہ اسے کیا پتا کہ کرم خان کہاں اور کس حال میں ہے؟''

''ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔'' ایمن کے لہجے میں امید آ گئی تھی۔ ''شہباز کیا ہم پاپا کو تلاش کر کے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ فتح خان انہیں کہاں لے گیا ہے۔ یہ کام حکومت کر سکتی ہے، ہمیں جلد از جلد کسی آبادی تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے، تمہارے پاپا کو بچانے کی یہی ایک صورت ہے۔ اب تم سو جاؤ، ہم صبح سویرے یہاں سے نکل جائیں گے۔''

ایمن کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی تھی۔ اس کے بازو کا زخم سوج رہا تھا لیکن مجموعی طور پر اس کی حالت بہتر تھی۔ میں بھی آگ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس سفر کے دوران میں، میں نے محسوس کیا کہ کوئی ہمارے پیچھے نہیں ہے اور کسی اکیلے انسان کے لئے ہمارا تعاقب کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔ خچر کی وجہ سے ہماری رفتار تیز تھی اور ہمارے پاس خوراک اور خاص طور سے پانی تھا۔ سفر کے دوران میں مجھے کہیں کوئی چشمہ یا نالا نظر نہیں آیا تھا۔ اس جگہ خاصے دن سے بارش نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے پانی کے ذرائع خشک ہو گئے تھے۔ فتح خان کے پاس پانی نام کی کوئی شے نہیں تھی اگر وہ ہمارے پیچھے آ رہا تھا تو اسے لازماً پانی کی ضرورت پڑتی اور پانی اس کے پاس تھا نہیں۔ ایک بجے کے قریب مجھے بھی نیند آ گئی تھی۔

''شہباز۔'' کسی نے مجھے شانہ ہلا کر آواز دی تو میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ میں نے پستول اٹھایا تھا کہ ایمن بولی۔ ''میں ہوں...... اٹھ جاؤ، روشنی ہونے والی ہے۔''

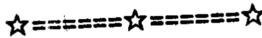
میں اتنی گہری نیند سویا کہ مجھے وقت کا اندازہ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر جلدی سے سامان سمیٹا۔ ایمن تازہ دم نظر آ رہی تھی مگر اس کے بازو کی سوجن بڑھ گئی تھی اور ہلانے پر اسے زیادہ درد ہو رہا تھا۔ ہمارا جلد از جلد کسی آبادی تک پہنچ جانا ضروری تھا تا کہ ایمن کو کسی قسم کا علاج میسر آ سکے اور اس کے باپ کی تلاش شروع کی جا سکے۔ کھانے کے لئے ہمارے پاس صرف چنے تھے۔ انہیں کھا کر روانہ ہوئے۔ ایک جگہ ہمیں پکے ہوئے آڑو بھی نظر آئے لیکن درخت پر چند ایک لگے تھے باقی جانور یا پرندے کھا چکے تھے اونچے نیچے پہاڑوں، تنگ وادیوں، گھاٹیوں اور ٹیلوں پر ہم سارا دن رینگتے رہے لیکن کوئی آبادی نظر نہیں آئی۔ ایک بار ایک چرواہا ملا مگر نہ وہ میری زبان سمجھ رہا تھا اور نہ ہی میں اس کی۔ بہرحال اس نے اشاروں سے بتایا کہ آبادی آگے ہے۔ جب رات تک سفر کے باوجود کوئی آبادی نہیں ملی تو ہم نے پڑاؤ ڈال دیا۔ ایمن کی حالت دن بھر کے سفر اور زخم کی وجہ سے خراب ہو رہی تھی۔ ایک بار میں نے اسے ہاتھ لگایا تو اس کا جسم گرم محسوس ہوا تھا، اسے خاصا تیز بخار ہو رہا تھا اور چند منٹ کے بعد وہ بری طرح تپنے لگی تھی، میرے پاس کوئی دوا نہیں تھی۔ اس لئے اس کا بخار کم کرنے کے لئے میں پانی میں بھگو کر کپڑا اس کے ماتھے پر رکھتا رہا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد اس کا بخار کم ہوا تھا اور اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔

''شکریہ شہباز! اب تم آرام کرو، تم نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔''

''ایمن میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ تم نے میری جان بچا کر جو احسان کیا تھا۔ یہ اس کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں تمہیں محفوظ ہاتھوں میں پہنچا کر ہی رہوں گا۔''

''مجھے یقین ہے۔'' وہ مسکرائی تھی اور چند لمحے بعد وہ سو چکی تھی۔

اگلے روز ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک بستی تک جا پہنچے تھے۔ وہاں ایک شخص ہماری رہنمائی کے لئے تیار ہوا۔ بستی میں ایمن کے زخم کی عارضی مرہم پٹی کر دی تھی مگر اسے فوری اور باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی۔ اس دن شام تک ایمن کو ایک آرمی اسپتال تک پہنچا دیا گیا۔ اس کے برٹش شہری ہونے کا علم ہوتے ہی انتظامیہ تیزی سے حرکت میں آئی تھی۔ اس رات برٹ شا کی تلاش کے لئے ایک پولیس ٹیم روانہ کر دی گئی تھی، جس کے ساتھ میں بھی تھا۔ شامت اعمال کے سبب میں ایک ہفتے تک ان علاقوں میں پولیس کے ساتھ پھرتا رہا تھا مگر برٹ شا کا پتا نہیں چلا۔ اس دوران میں ایمن برطانیہ روانہ کر دی گئی تھی اور اس کے بعد مجھے اس سے رابطہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور نہ ہی اس نے کوئی رابطہ کیا تھا۔



ایک شدید جھٹکا لگا اور میں نے خود کو ہوا میں معلق پایا۔ خوش قسمتی سے پل سے نیچے گرتے ہوئے میرے ہاتھ میں کھلے دروازے کا ہینڈل آ گیا تھا اور میں اس کے سہارے لٹک رہا تھا۔ اگر یہ ہینڈل ہاتھ میں نہ آتا تو میں نجانے کتنی گہرائی میں جا گرتا۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جھکی جیپ کا انجن بند ہو گیا تھا لیکن اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ میں نے پانی کی وجہ سے پھسلتے ہینڈل کو مضبوطی سے تھاما اور دوسرا ہاتھ بڑھا کر سیٹ کا سہارا لیا۔ جسم ذرا اوپر آیا تو میں نے اندر ہینڈ بریک کو پکڑا اور خود کو اندر کھینچ لیا۔ شکر ہے ریلنگ ذرا مضبوط قسم کی تھی ورنہ جیپ نالے میں جا گرتی۔ اس کا اگلا دایاں پہیا ہوا میں معلق تھا۔ میں نے انجن اسٹارٹ کرنے کے لئے چابی گھمائی۔ ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ انجن اسٹارٹ ہو گیا اور میں نے ریورس گیئر لگاتے ہوئے جیپ کو کسی قدر دقت سے پیچھے کر لیا۔ جیپ سڑک پر لا کر میں نے انجن بند کیا اور ٹارچ لے کر نیچے اترا۔ جس شخص کو میں نے جیپ سے بچانے کی کوشش کی تھی اسے بائیں طرف ہونا چاہئے تھا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں سڑک کا جائزہ لے رہا تھا کہ مجھے وہ شخص گٹھری بنا ساکت پڑا نظر آیا۔ شاید بے ہوش تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ چیتھڑا اور گندا لباس جس سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ بڑھی ہوئی شیو اور الجھے ہوئے بال۔ وہ فقیر لگ رہا تھا پھر میری نظر اس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک رول پر گئی جسے اس نے سینے سے لگا رکھا تھا۔ میں نے گردن پر نبض دیکھی تو اسے ساکت پایا۔ بدحواس ہو کر میں نے سینے پر سر رکھ کر اس کے دل کی دھڑکن سننا چاہی لیکن وہاں بھی خاموشی تھی۔ وہ شخص مر چکا تھا۔ میں چند لمحے کے لئے دم بخود رہ گیا تھا۔ اسے جیپ سے ہلکی سی ٹکر لگی تھی اور اس وقت جیپ کی رفتار بھی کم تھی پھر بھی وہ مر گیا تھا! ایک اور حادثہ میرے نام کر گیا تھا۔ پھر میں چونکا۔ ایک لاش کے ساتھ پکڑے جانا عقل مندی نہ ہوتی جبکہ پولیس پہلے ہی سرگرمی سے میری تلاش میں تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ میں دبے رول کی طرف دیکھا اور رول نکال لیا۔ یہ پلاسٹک رول نہیں تھا بلکہ پلاسٹک شیٹ میں کوئی شے لپٹی تھی۔ میں نے رول کھولا اور اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ یہ کوئی پینٹنگ تھی۔ ایک اہرام تھا...... جس کے اوپر کرنیں پھینکتا سورج تھا۔ میں چونکا تھا یہ تو وہی پینٹنگ تھی جو میں نے آٹھ سال پہلے راجا عمر دراز کے محل میں دیکھی تھی اور جس کے چوری ہونے پر عتاب مجھ پر نازل ہوا تھا اور وہ تصویر بعد میں دوسرے ذریعے سے راجا کو مل گئی تھی۔ یہی تصویر میں آج اس فقیر نما مرحوم کے پاس دیکھ رہا تھا۔ میں نے تصویر کو دوبارہ رول کیا جسے گرد اور پانی سے بچانے کے لئے پلاسٹک کو ٹنڈ کر دیا گیا تھا۔ میں نے فقیر کے لباس کی تلاشی لی۔ اندر سے ایک پرس نکلا تھا۔ میں اسے دیکھنے جا

رہا تھا کہ عقب سے تیز روشنی آئی تھی کوئی گاڑی آرہی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ گاڑی آ کر مجھ سے چند گز کے فاصلے پر رکی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی مجھ پر پڑ رہی تھی اور پھر میں نے اکرم چشتی کی منحوس آواز سنی۔

''واہ بھئی واہ...... یہ تو اپنے شہباز صاحب نظر آتے ہیں۔''

خطرے کو سامنے پا کر میرے اندر جیسے بجلی سی بھر گئی تھی میں نے زقند بھری اور جیپ کی طرف بھاگا۔ عقب سے اکرم چشتی کی للکار کی آواز آئی وہ مجھے رکنے کو کہہ رہا تھا پھر اس نے فائر کر دیا۔ گولی میرے سر کے خاصی اوپر سے گزری، یہ عجلت میں کیا گیا فائر تھا۔ اگلے لمحے میں جیپ میں تھا۔ چیزیں برابر والی نشست پر پھینک کر میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور ایکسی لیٹر دبا دیا۔ اگلا فائر جیپ کی باڈی پر کہیں لگا تھا میں نے ''ٹن'' کی آواز سنی تھی۔ جیپ تیزی سے حرکت میں آئی تھی اگر پیچھے پک اپ موبائل تھی تو وہ مجھے ہرگز نہیں پکڑ سکتے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ موبائل وائرلیس سے اسلام آباد پولیس کو خبردار کر دیتی تو مجھے منٹوں میں گھیر لیا جاتا۔ ذرا آگے جاتے ہی میں نے جیپ کچے میں اتار دی، اس طرف جھاڑیاں تھیں اور ناہموار زمین تھی۔ اس پر جیپ جیسی کوئی گاڑی چل سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آگے جا کر ایک کچا راستہ تھا جو اس کالونی کی طرف جاتا تھا جہاں ندیم بھٹی کا گھر تھا لیکن جیپ لے کر اس کے گھر تک جانا اسے بھی پھنسانے کے برابر تھا اور یہ جیپ اب خطرہ بن چکی تھی۔ میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیا لیکن فی الحال پولیس سے جان چھڑانی تھی۔ میرے تعاقب میں پولیس موبائل بھی کچے میں اتر آئی تھی مگر اس جگہ چلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی میں نے اسے رکتے دیکھا تھا۔ جیپ کو زبردست جھٹکے لگ رہے تھے مگر وہ رکی نہیں ذرا آگے جا کر میں نے اس کا رخ دوبارہ مری ہائی وے کی طرف موڑ دیا تھا میرا ارادہ واپس کامیج تک جانے کا تھا لیکن سڑک تک جانے سے پہلے ہی جیپ ایک نالے میں اتر گئی۔ مجھے آخری لمحے میں احساس ہوا اس وقت میں اسے روکنے کے قابل نہیں تھا۔ زبردست دھچکے سے جیپ کا اگلا حصہ نالے کی تہ سے ٹکرایا اور فوراً ہی جیپ کے اندر پانی بھرنے لگا۔ میں نے ہاتھ مارے اور تصویر اور بٹوا اٹھا لیا تھا۔ بارش کی وجہ سے نالے میں خاصا پانی تھا۔ جیپ کے کاغذات اور چابی نکال کر میں جیپ سے اتر آیا تھا۔ جیپ کا بونٹ پانی میں تھا اور پانی ونڈ اسکرین تک نظر آرہا تھا۔ میں نے بونٹ کا سہارا لے کر نالا عبور کیا۔ پیچھے جانے کے بجائے آگے بڑھتے رہنے میں عافیت تھی۔ بارش ایک بار پھر تیز ہو گئی تھی اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ شدید بارش میں ہماری پولیس ٹھنڈی پڑ جاتی اور مجھے نکل جانے کا موقع ملتا۔ میں نے تصویر کا رول اور بٹوا اپنی قمیص میں ڈال لیا تھا۔ نالے سے نکل کر میں نے ہائی وے کا رخ کیا مگر سخت اندھیرے میں راستہ تلاش کرنا دشوار تھا۔ میں ٹٹول ٹٹول کر چل رہا تھا اور اکرم چشتی کو کوس رہا تھا جسے اس وقت ہی نازل ہونا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے یوں بھاگنا پڑا اور میری پیاری جیپ نالے میں پڑی تھی۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا پانی اس کا کیا حشر کرے گا۔

خاصی دیر تک چلنے کے باوجود مجھے ہائی وے نظر نہیں آئی۔ شاید میں راستہ بھٹک گیا تھا اتنے اندھیرے میں یہی ایک بات یقینی حد تک ممکن تھی۔ تین چار منٹ بعد ایک آدھ بار بجلی چمکتی تو ماحول نظر آتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اس طرح چلتا رہا تو اپنی جیپ کی طرح کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں گا۔ اس لئے میں ایک درخت تلے رک گیا تھا مگر اس کے نیچے برسات زیادہ جاری تھی اس لئے میں پھر کھلے میں آ گیا۔ پانی تلے بھیگتے ہوئے کھڑے رہنا مجبوری تھی۔ بارش ایک مستقل رفتار سے جاری تھی۔ ایک بار بجلی زور سے چمکی۔ میں نے دیکھا

ذرا فاصلے پر ایک مکان تھا شاید فرلانگ بھر دور تھا۔ درمیان میں کھیت تھے یہاں مکئی کی فصل کھڑی تھی۔ بلندی ہونے کی وجہ سے ابھی تک فصل نہیں پکی تھی۔ میں اس طرف چلنے لگا اس وقت گھپ اندھیرا تھا اور میں اندازے سے سفر کر رہا تھا جب مکئی کی فصل شروع ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ میں درست سمت میں سفر کر رہا تھا۔

بظاہر یہ ویرانہ تھا لیکن اس مکان سے لگ رہا تھا کہ آس پاس آبادی ہے۔ اس بار بجلی چمکی تو میں نے مکان واضح طور پر دیکھ لیا۔ اس کے گرد سرخ اینٹوں سے بنی چاردیواری تھی مگر بڑے گیٹ کا ایک پٹ گرا ہوا تھا۔ اندر مکان میں ہلکی سی روشنی تھی جو سامنے والی کھڑکیوں سے جھلک رہی تھی۔ مکان بھی سرخ اینٹوں کا بنا تھا اور پختہ چھت تھی۔ بناوٹ سے شہری قسم کا مکان تھا۔ میں گرے گیٹ سے گزر کر اندر پہنچا اور برآمدے میں داخل ہو گیا۔ اس جگہ میں کم از کم بارش کی بوچھاڑ سے محفوظ تھا۔ ہوا کے جھونکے سرد اور تیز تھے لیکن قابل برداشت تھے۔ میں پانی جھاڑنے لگا۔ مکان کے اندر خاموشی تھی اور اگر کوئی آواز تھی تب بھی بارش کے شور میں اسے سننا ممکن نہیں تھا۔ میں نے دروازے پر دستک نہیں دی۔ میں صاحبِ خانہ کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ مجھے کیا سمجھتا اور پولیس کو مطلع کر دیتا۔ اس لئے میں دم سادھے برآمدے میں کھڑا رہا۔ اس طرح نصف گھنٹا گزر گیا۔ اچانک اندر سے آہٹ ہوئی اور اس سے پہلے کہ میں دروازے سے ہٹتا وہ کھل گیا۔ سامنے ایک جوان العمر عورت کھڑی دم بخود سی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے معذرت کی۔

"معاف کیجئے گا، میں بغیر اجازت آپ کے مکان میں پناہ کے لئے آ گیا جیسے ہی بارش رکے گی میں چلا جاؤں گا۔ آپ کو ذرا بھی زحمت نہیں ہو گی۔"

"کون ہو تم؟" عورت سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

"ایک مسافر ہوں۔ میری جیپ ادھر نالے میں پھنس گئی ہے۔ بڑی سڑک کی طرف جا رہا تھا کہ راستہ بھٹک گیا۔ بجلی چمکی تو آپ کا مکان نظر آیا۔ پناہ کے لئے یہاں چلا آیا۔"

میری بات سن کر عورت کا خوف کم ہوا تھا وہ چند لمحے تذبذب میں سوچتی رہی پھر آہستہ سے کہا۔ "اندر آ جاؤ۔ یہاں تو ہوا سرد ہے تم بھیگے ہو کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ۔" اس کا لہجہ کسی قدر دیہاتی تھا۔

"شکریہ خاتون میں یہیں ٹھیک ہوں۔ ایسا نہ ہو آپ کے گھر والے برا منائیں۔"

"میرا گھر والا ہے لیکن وہ شام سے فتح جنگ گیا ہے۔ اسے کسی سے اپنی رقم لینی تھی۔ اب تک واپس نہیں آیا۔"

"تب تو میرا اندر آنا اور بھی نامناسب ہو گا۔" میں ہچکچایا مگر پھر اس کے اصرار پر اندر چلا آیا۔ مکان اندر سے متوسط قسم کا تھا پہلا کمرا نشست گاہ تھا۔ اندر کیروسین لیمپ جل رہا تھا یہاں بجلی نہیں تھی۔ عورت نے مجھے تولیا دیا۔ جس سے میں نے بال اور کسی حد تک لباس صاف کیا میرے جوتے کیچڑ میں سنے ہوئے تھے وہ میں نے باہر ہی اتار دیئے تھے۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔

"ایسا کرو۔ میں تمہیں اپنے شوہر کا لباس دیتی ہوں وہ پہن لو، تمہارے کپڑے بالکل گیلے ہو رہے ہیں۔"

"نہیں! میں کپڑے نہیں بدلوں گا۔" میں نے حتمی انداز میں کہا۔ مجھے اس کی دلیری پر حیرت تھی اس

ویرانے میں رہتے ہوئے اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ رات کے بارہ بجے وہ بالکل اکیلی تھی اگر میری نیت اس پر خراب ہو جاتی تو یہاں دور تک بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ عورت بھی جوان اور دلکش تھی۔ اس نے مجھے چائے بنا کر دی اور اندر چلی گئی۔ میں نے کسی بچے کے رونے کی آواز سنی۔ آواز سے بچہ شیر خوار لگ رہا تھا۔ بچہ چند لمحے بعد چپ ہو گیا تھا۔ نشست گاہ میں لکڑی کی بنی ہوئی کرسی تھی میں اس پر ہی بیٹھ گیا۔ گیلے کپڑوں سے صوفے خراب ہو جاتے۔ عورت نصف گھنٹے بعد آئی تھی۔

''تم کرسی پر کیوں بیٹھے ہو، ادھر صوفے پر بیٹھو۔''

''شکریہ...... میں یہاں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا اور ذرا توقف کے بعد بولا۔ ''آپ کا بچہ ہے؟''

''ہاں، اسے بھوک لگ رہی تھی اس لئے رو رہا تھا۔ اسے دودھ پلا کر آ رہی ہوں۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''ایسا کرو، ادھر قالین پر لیٹ جاؤ۔''

''خاتون۔'' میں نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ ''بہتر ہوگا، آپ مجھے اجازت دیں اور یہ بتائیں کہ بڑی سڑک یہاں سے کس طرف اور کتنی دور ہے۔ بارش ہلکی ہو رہی ہے۔''

''بڑی سڑک تو ادھر سے کوئی ایک میل دور ہے مگر تم اس وقت نہیں جا سکتے۔ بارش کی وجہ سے راستہ خراب ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے کھڈ ہیں...... خلیل اسی وجہ سے نہیں آیا۔ اب وہ صبح آئے گا۔''

''خلیل تمہارا شوہر ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہماری شادی کو چار سال ہوئے ہیں۔''

''کیا تمہیں اس ویرانے میں اکیلے رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟''

''اب تو عادی ہو گئی ہوں۔ شروع میں بہت ڈر لگتا تھا۔ ادھر ہماری زمین ہے۔ خلیل اس پر سبزیاں لگاتا ہے۔ اسلام آباد میں اس کے اچھے دام مل جاتے ہیں۔ ہم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ خلیل کا چھوٹا بھائی اور ماں بھی ہیں، وہ رشتے داروں کی شادی میں لائل پور گئے ہیں۔''

''فیصل آباد!'' میں نے تصحیح کی۔ ''پھر بھی آپ کو اس طرح کسی اجنبی پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔''

''تم اچھے آدمی لگے تھے اس لئے اندر بلا لیا۔''

''اب میں چلتا ہوں۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''چائے کا شکریہ۔''

''مرضی تمہاری۔'' اس بار اس نے رکنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ میں نے باہر آ کر بارش میں صاف ہو جانے والے جوتے پہنے چمڑا بھیگ کر نرم پڑ گیا تھا۔ میں نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ سامنے سے روشنی نظر آئی، کوئی گاڑی اس طرف آ رہی تھی۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس موسم میں صرف پولیس ہی میری تلاش میں اس طرف آ سکتی تھی۔ میں نے عورت سے پوچھا۔ ''کیا تمہارے شوہر کے پاس گاڑی ہے؟''

''نہیں، ہمارے پاس صرف ایک گدھا گاڑی ہے...... خلیل اس پر سبزیاں بیچنے جاتا ہے۔''

''اندر چلو۔'' میں نے عورت کو اندر دھکیلا۔

''کیا بات ہے، تم ڈر رہے ہو؟'' وہ پریشان ہو گئی تھی۔

''سنو...... یہ جو کوئی بھی ہوں اگر اس طرف آئیں تو دروازہ مت کھولنا اور میرا ذکر مت کرنا۔''

اسی لمحے مکان کے احاطے میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ عورت یکدم ہی خوف زدہ اور پریشان نظر آنے لگی۔ اس نے مجھے مکان کے اندر والے حصے کی طرف دھکیلا۔ ''اندر جاؤ...... پیچھے ایک کوٹھری ہے اس میں چلے جانا جب تک میں آواز نہ دوں، باہر مت آنا۔''

مذکورہ کوٹھری اندر والے کمرے کے بعد تھی اور یہ مکان کے عقبی حصے میں کھلتی تھی۔ یہاں اوزار رکھے تھے۔ میں تاریک کوٹھری میں دبکا اپنی حالت پر غور کر رہا تھا۔ اگر آنے والا عورت کا شوہر تھا اور اس نے مجھے یہاں دریافت کرلیا تو وہ مجھے قتل کرنے میں حق بجانب ہوتا۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہوتی۔ میں ایک ناکردہ جرم میں مارا جاتا پھر مجھے پستول کا خیال آیا۔ یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ میں نے جیب سے پستول نکال کر اس کا معائنہ کیا۔ بھیگنے کے باوجود مجھے امید تھی کہ یہ کام کرے گا۔ اس لمحے مجھے نشست گاہ کی طرف سے کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز آئی۔ آواز مردانہ تھی۔ اس کے پس منظر میں عورت کی دبی دبی آواز بھی آ رہی تھی پھر آوازیں اس کمرے کی طرف آنے لگیں جس کے ساتھ کوٹھری میں، میں چھپا ہوا تھا۔

''زینب، مجھے شبہ ہے یہاں کوئی ہے۔'' مردانہ آواز آئی اور مجھے اپنے کانوں پر شبہ ہوا، کیا یہ اکرم چشتی کی آواز تھی؟

''اکرم، مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟'' عورت کی آواز ابھری اور اس نے میرے شک کی تصدیق کردی۔ وہ اکرم چشتی ہی تھا۔ وہ عورت کو زینب کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور اس کے انداز سے لگتا تھا، وہ اسے جانتا ہے۔ معاً مجھے خطرے کا شدید احساس ہوا۔ میں کسی چوہے کی طرح اس چوہے دان میں آ پھنسا تھا۔ باہر پولیس اور میرا دشمن اکرم چشتی موجود تھا۔ زینب اسے یقین دلا رہی تھی۔ ''خلیل کی غیر موجودگی میں کون آنے لگا ادھر؟''

''کیوں نہیں آ سکتا۔'' اکرم چشتی معنی خیز انداز میں بولا۔ ''کیا تُو کسی سے یاری نہیں لگا سکتی۔ آخر بھی میرے ساتھ بھی تو......''

''اکرم، ان باتوں کو بھول جا۔'' زینب تڑپ کر بولی۔ ''اب میں خلیل کی گھر والی ہوں۔ خدا گواہ ہے کسی اور کا کیا...... کبھی تیرا خیال بھی ذہن میں نہیں آیا۔''

''ویسے اب تو اور بھی خوبصورت ہوگئی ہے، پکے ہوئے انگور کی طرح۔'' اکرم چشتی بے ہودگی سے بولا۔ ''ادھر گھر والی ہے، بچے پیدا کرکر کے پوری بھینس ہوگئی ہے اور تُو بچے کے بعد اور سوہنی لگنے لگی ہے، کیا خیال ہے، پرانے دنوں کی یاد نہ تازہ کرلیں؟''

''اکرم، اب میں کسی کی بیوی ہوں...... مجھ سے دور رہ۔''

''خلیل ادھر ہے نہیں...... اور ایسی راتیں کبھی کبھی آتی ہیں۔''

''چھوڑ مجھے۔'' زینب چلائی۔ ''خدا کے لئے......''

میں دم بخود سا کمرے سے آتی آوازیں سن رہا تھا۔ زینب اکرم چشتی کو خدا رسولؐ کے واسطے دے رہی تھی لیکن اس پر شیطان سوار تھا۔ وہ یہ واسطے کیوں سنتا؟ میں نے کپڑا پھٹنے کی آواز سنی اور اکرم چشتی نے قہقہہ لگایا۔ ''میں نے ٹھیک کہا تھا......'' اگلا جملہ ناقابلِ بیان تھا۔

''اکرم...... چھوڑ دے مجھے۔'' عورت بے بس ہو کر فریادوں پر اتر آئی تھی۔

''چھوڑ دوں گا۔'' اکرم چشتی بولا۔ ''بس آدھا پون گھنٹا برداشت کر لے۔''

''نہیں۔'' زینب چیخی۔ اس کے انداز میں ایسی بے بسی اور وحشت تھی کہ میں خود پر قابو نہ پا سکا اور بے اختیار کوٹھری سے نکل آیا۔ اکرم چشتی زینب کو بستر پر گرائے اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے زینب کی قمیص پھاڑ کر جسم سے تقریباً الگ کر دی تھی۔ اپنی کارروائی میں وہ اس قدر مگن تھا کہ اسے میرے آنے کا پتا ہی نہیں چلا اور میں نے پستول کا دستہ پوری طاقت سے اس کی گدی پر رسید کیا۔ اس ضرب کے پیچھے میرا تمام تر غصہ اور نفرت تھی۔ وہ ایک سیکنڈ میں بے ہوش ہو کر زینب کے اوپر گر پڑا تھا جو آنکھیں بند کئے کمزور انداز میں مزاحمت کر رہی تھی۔ یہ ایک ایسی عورت کی مزاحمت تھی جو ایک بار پہلے بھی ہار چکی تھی۔ اکرم چشتی کی باتوں سے لگ رہا تھا، شادی سے پہلے زینب کے اس سے جسمانی تعلقات تھے۔ ضرب کی آواز اور اکرم چشتی کے بے سدھ ہونے سے اسے تبدیلی کا احساس ہوا اور اس نے اکرم چشتی کو خود پر سے دھکیل دیا پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے جلدی سے بستر کی چادر سے اپنا عریاں جسم چھپا لیا۔ میں نے اکرم چشتی کو نیچے گرایا۔

''اس کے ساتھ اور کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

زینب ابھی تک حواس باختہ تھی، اس نے بمشکل کہا۔ ''باہر پولیس کی گاڑی ہے۔ مجھے نہیں پتا، اس میں کتنے بندے ہیں؟''

''اب مجھے جانا ہوگا۔ یہ بتاؤ کہ پیچھے سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟''

''ہاں ہے۔'' اس نے خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ یہ ہوش میں آ کر پھر مجھ سے زیادتی کرے گا۔''

''تمہارے لئے کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا تو وہ شرمندہ نظر آنے لگی۔

''تم نے سب سن لیا مگر میں اس وقت بھی بے قصور تھی۔ یہ میرے تائے کا لڑکا ہے۔ بچپن سے ایک گھر میں رہے تھے۔ مجھے پتا نہیں تھا، یہ انسان کے بھیس میں شیطان ہے۔ ابھی میں پوری طرح جوان بھی نہیں ہوئی تھی، ایک روز اکیلے پا کر اس نے مجھے پکڑ لیا۔ اس کے بعد میں اس کا کھلونا بن گئی۔ موقع پاتے ہی دبوچ لیتا تھا پھر خدا نے اس سے میری جان چھڑائی اور میں خلیل کی گھر والی بن گئی۔ آج یہ پھر شیطان بن کر آیا تھا اور خدا نے تمہیں فرشتہ بنا کر بھیج دیا۔''

میں نے اکرم چشتی کا سر ٹٹولا۔ اس کا سر نہیں پھٹا تھا۔ بس ایک گومڑ نکلا تھا۔ میں نے زینب سے کہا۔ ''میں جا رہا ہوں۔ کچھ دیر بعد اس کے ساتھیوں کو بلا کر اسے ان کے حوالے کرنا اور کہنا کہ یہ پھسل کر گر گیا تھا میں چوٹ لگی ہے، اسے اسپتال لے جائیں۔ مجھے امید ہے یہ کسی کو اصل بات نہیں بتائے گا اور شاید تمہیں دوبارہ تنگ نہ کرے اور تم اس جگہ کو چھوڑ دو۔ جوان عورتوں کو اتنی ویران جگہ نہیں رہنا چاہیے۔''

''میں ایسا ہی کروں گی۔ اب میں خلیل سے صاف کہہ دوں گی۔ بے شک مجھے ایک کوٹھری لے دے مجھے اب یہاں نہیں رہنا ہے۔''

اچانک اسے اپنی حالت کا احساس ہوا۔ وہ صرف چادر میں تھی اور اس کی پھٹی قمیص ایک طرف پڑی

اس نے شرما کر کہا۔ "مجھے کپڑے پہننے ہیں، اس نے......"

"ٹھیک ہے، میں کوٹھری میں جا رہا ہوں۔" میں نے کوٹھری کا رخ کیا۔ "تم مجھے آواز دے لینا۔"

چند منٹ بعد اس نے مجھے آواز دی۔ میں باہر آیا تو اس نے پھولدار ریشمی قمیص پہن لی تھی اور خفیف نظر آ رہی تھی شاید اسے خیال آیا تھا کہ میں اسے کس حال میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنے چیتھڑا لباس کے ٹکڑے بھی چھپا دیئے تھے۔ "اس طرف راستہ ہے۔" اس نے کمرے کے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "تم جلدی سے نکل جاؤ۔ میں اس کے ساتھیوں کو بلاتی ہوں۔"

"کسی کو اصل بات کا پتا مت چلنے دینا۔" میں نے اسے ایک بار پھر خبردار کیا۔ "ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گی۔"

"میں ایسا ہی کروں گی۔" اس نے ایک بار پھر یقین دلایا۔ "تمہارا شکریہ۔ تم نے میری عزت لٹنے سے بچا لی۔"

میں نے اسے خدا حافظ کہا اور باہر تاریکی میں قدم رکھ دیا۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ اس بار بجلی بھی رہ رہ کر چمک رہی تھی اس لئے مجھے راستہ نظر آ رہا تھا۔ زمین پر ہر طرف پانی تھا اور نشیبی جگہوں پر تو اچھا خاصا پانی کھڑا تھا۔ میں گڑھوں سے بچ کر چل رہا تھا۔ ہائی وے تک پہنچنے میں مجھے نصف گھنٹا لگا تھا۔ بارش کے تسلسل میں کمزوری آنے لگی تھی اور آدھے گھنٹے بعد بارش رک چکی تھی اور بادل چھٹ رہے تھے۔ ستاروں اور کبھی کبھی چاند کی روشنی سے ماحول منور ہو جاتا تھا۔ ہوا رک جانے سے سردی کا احساس بھی کم ہو گیا تھا۔ مجھے ابھی پندرہ سولہ میل پیدل سفر کرنا تھا۔ کاش کوئی گاڑی مل جاتی تو میں زحمت سے بچ جاتا۔ اس وقت شاید کوئی اور دعا مانگتا تو وہ بھی قبول ہوتی کیونکہ فوراً ہی عقب سے روشنی نمودار ہوئی تھی، یہ کوئی بڑی گاڑی تھی، شاید ٹرک۔ میرا اندازہ درست تھا، یہ بیڈفورڈ ٹرک تھا جو دودھ لے کر جا رہا تھا۔ میرے اشارے پر ٹرک رک گیا اور اس کے ڈرائیور نے جھانکا۔ "کیا بات ہے بھاجی! کیا گڈی چھین لی ہے ڈاکوؤں نے؟"

"نہیں یار! پیچھے خراب ہو گئی تھی، چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ ذرا آگے جانا ہے۔"

"آ جاؤ" اس نے دوسرا دروازہ کھول دیا اور میں ٹرک پر سوار ہو گیا۔ کلینر بھی اندر بیٹھا تھا۔ "گڈی کتھوں خراب ہوئی؟"

"پل کے ذرا بعد...... سڑک سے اتر کر ایک گڑھے میں پھنس گئی، کرین ہی نکالے گی۔"

"پل پر تو پولیس لگی ہے۔" اس نے کہا۔ "کوئی چکر ہو گیا ہے۔"

"ہاں میں نے بھی دیکھی تھی پر دھیان نہیں دیا۔"

"ایک لاش اٹھا رہے تھے پولیس والے۔" کلینر بولا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، تھکا ہوا تھا اور مسلسل بھیگنے سے جسم بھی ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے پشت سے سر ٹکا لیا۔ ٹرک جس رفتار سے جا رہا تھا، آدھے گھنٹے سے پہلے میں منزل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو بتا دیا کہ مجھے کہاں اتارنا ہے؟

"فکر مت کرو بھاجی! ادھر پہنچ کر میں خود اٹھا دوں گا، تسی بے شک تسلی سے سو جاؤ۔"

میں غنودگی محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے سیٹ سے سر ٹکاتے ہی نیند آ گئی۔ ا... مجھے لگا جیسے کوئی میری قمیص میں ہاتھ ڈال کر رول نکالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے چونک کر ہاتھ... کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ''چھوڑ میرا ہاتھ۔'' اور جھٹکا دے کر چھڑانے کی کوشش ں۔ میں نے کمر میں بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال کر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

''بدمعاش کیا مجھے غافل سمجھ رہے تھے۔ میرا لباس ٹٹول رہے تھے، ابھی گولی مار دوں گا۔''

ڈرائیور نے ڈیش بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ''خبردار...... اگر ہلا تو جہنم رسید کر دوں گا۔'' ڈرائیور کا ہاتھ رک گیا، یقیناً ڈیش بورڈ میں کوئی ہتھیار تھا۔ آج کل طویل فاصلے پر اور خاص طور سے شہروں سے باہر جانے والے ٹرک ڈرائیور کوئی نہ کوئی ہتھیار رکھتے ہیں کیونکہ شاہراہوں پر ڈاکوؤں کی لوٹ مار عام ہے۔ یہ ٹرک ڈرائیور اور اس کا کلینر خود بدمعاش تھے۔ تبھی مجھے اتنی آسانی سے بٹھا لیا تھا۔ میری قمیص کے ابھار کو دیکھ کر سمجھ رہے تھے کہ میں نے اس میں کوئی قیمتی شے چھپا رکھی ہے۔

''لوگوں کو لوٹتے ہو۔'' میں نے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''جانتے ہو، میں کون ہوں؟''

ان کے چہرے فق ہو گئے تھے، ڈرائیور ہکلا کر بولا۔ ''آپ...... تسی خفیہ والے ہو۔''

میں معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''لیکن فکر مت کرو، ہم تم جیسے چھوٹے بندوں پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔ اگر مجھے ذرا سا بھی نقصان ہوتا تو تمہیں پتا چل جاتا۔''

ڈرائیور اور کلینر اب بالکل سدھی ہوئی بھیڑیں بن گئے تھے۔ میرے کہے پر دل و جان سے عمل کرنے والے۔ ڈرائیور مستعدی سے بولا۔ ''سر جی، تسی جتھے کہو، میں ادھر ہی اتارتا ہوں۔''

''نہیں...... میں نے جہاں کہا ہے، وہیں اتار دینا۔'' میں نے بھی بارعب لہجہ بنایا۔ ''لیکن یاد رکھنا...... میرا کسی سے ذکر کیا اور یہ بات پھیلی تو تم دونوں یوں غائب ہو جاؤ گے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔''

دونوں قسمیں کھا کر مجھے یقین دلانے لگے کہ ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔ اگر نکلا تو بے شک ان کی زبان کاٹ دی جائے۔ میں طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''اسے اتنا ہلکا معاملہ نہ سمجھو، اس میں زبانیں نہیں بلکہ گردنیں کٹتی ہیں، میری جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہاری لاشیں ٹرک سمیت کسی کھڈ میں پڑی ہوتیں اور کسی کو بھی پتا نہیں چلتا کہ تمہارے ساتھ کیا گزری۔''

ان کے چہرے سفید پڑ گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ مقررہ جگہ پر ڈرائیور نے ٹرک روکا۔ میں نے اترنے سے پہلے کہا۔ ''یہ مت سمجھنا کہ میری پہنچ سے باہر ہو جاؤ گے۔ میں نے ٹرک کا نمبر نوٹ کر لیا ہے اور تمہارے چہرے بھی میری یادداشت میں محفوظ ہو گئے ہیں، اب جاؤ۔''

میرے اترتے ہی ٹرک دھواں چھوڑتا بھاگا تھا۔ اتنا پکا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے کوئی پولیس تک نہ پہنچے۔ اکرم چشتی کو معلوم ہوتا تو وہ سمجھ جاتا اور کسی کتے کی طرح میری بو سونگھتا یہاں تک آ جاتا۔ میں نے پیدل چلنا شروع کیا۔ کپڑے خاصی حد تک خشک ہو گئے تھے مگر اس بلندی پر سردی خاصی تھی۔ میں نے کانپنا شروع کیا تو چلنے کے بجائے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس سے جسم میں کسی قدر گرمی آئی تھی۔ میں دس منٹ بعد کاٹیج کے سامنے تھا۔ بندر برآمدے میں سکڑا ہوا سو رہا تھا۔ میں نے کاٹیج کا دروازہ کھولا تو وہ بھی جاگ گیا تھا۔ میں نے اندر جا کر

لیمپ جلایا۔ بندر نے دروازہ بجایا، میں نے جا کر کھولا۔

''کیا بات ہے برخوردار؟''

اس نے التجا آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ بھوکا اور سردی کا مارا ہوا تھا۔ مجھے ترس آنے لگا۔ میں نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ ''برخوردار! آ جاؤ...... لیکن براہِ کرم چیزوں پر مت چڑھنا اور پوٹی کا مسئلہ ہو تو باہر کا رخ کرنا، دروازہ کھولنا آتا ہے؟''

اندر آ کر وہ منہ اٹھائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندر جا کر سب سے پہلے آتش دان جلایا، اس کے بعد ندیم کا سلیپنگ سوٹ نکال کر پہنا۔ آگ سے حرارت ملی تو میری جان میں جان آئی تھی۔ کچن میں آ کر میں نے ڈبل روٹی نکالی جو کسی حد تک باسی ہو چلی تھی مگر کھانے کے قابل تھی۔ نصف توس میں نے بندر کی خدمت میں پیش کیے اور باقی نصف کے سینڈوچز بنائے۔ دو عدد انڈے ابالے۔ کھا پی کر آخر میں کافی تیار کی تو بندر کیتلی کے پاس آ کر اسے سونگھنے لگا۔ لگتا تھا اسے بھی کافی پسند ہے۔ میں نے ایک مگ میں ڈال کر اسے بھی کافی دی تھی۔ اس نے لی اور فرش پر بیٹھ کر پینے لگا۔ اس کی عادات اور کھانے پینے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ باقاعدہ تربیت یافتہ تھا۔ چمپانزی نسل کا بندر تھا جو سب سے ذہین بندر ہوتے ہیں۔ کھا پی کر وہ وہیں کچن کے فرش پر لیٹ گیا۔ میں نے بھی بیڈ روم کا رخ کیا۔ جسم کے درد کو دبانے کے لئے ایک پین کلر لی اور بستر پر گر کر خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں مرنے والے فقیر کا بٹوا دیکھ سکتا۔ بٹوا اچھا اور قیمتی تھا، کسی فقیر کے پاس ایسا بٹوا ہونا محال تھا۔

ان چند گھنٹوں میں مجھے وہ تجربات ہوئے تھے جو لوگوں کو برسوں میں بھی نہیں ہوتے۔ اس فقیر کی موت آئی تھی جو وہ جیپ کے سامنے آیا اور معمولی سی ٹکر کھا کر مر گیا جبکہ میں نے اس سے کہیں زیادہ شدید ایکسیڈنٹ میں لوگوں کو خراش سے بھی محفوظ دیکھا ہے۔ بہرحال اکرم چشتی کی آمد سے معاملہ سنگین رخ اختیار کر گیا تھا۔ اکرم چشتی اب زیادہ انتقامی جذبے سے میرے خلاف کیس کو مضبوط کرے گا۔ یہی نہیں، وہ فقیر کی موت کو قتل عمد ثابت کرے گا اور اس بار میری گلوخلاصی مشکل ہو جائے گی۔ ندیم سے رابطہ کرنا اشد ضروری تھا اور میں اپنی جیپ بھی گنوا چکا تھا۔

صبح مجھے بندر نے اٹھایا۔ وہ میرا بازو پکڑ کر ہلا رہا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو چھلانگ لگا کر دور ہو گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ میں جھنجلا کر اسے ہاتھ نہ ماردوں۔ اس نے منہ سے آواز نکالی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔

''کیا بات ہے یار! سونے دو مجھے۔'' میں نے بے زاری سے کروٹ لی۔ اچانک مجھے خیال آیا، اسے کچھ آ رہا ہو گا، شاید اسی وجہ سے اس نے مجھے اٹھایا تھا۔ میں نے اٹھ کر باہر جانے والا دروازہ کھولا۔ بندر نے قلقاری ماری اور باہر چلا گیا۔ میں دوبارہ لیٹ کر سو گیا اور ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ پھر آ گیا۔ یہ مصیبت خود میں نے گلے لگائی تھی۔ جب اس نے دروازہ بجانا شروع کیا تو مجبوراً مجھے اٹھ کر جانا پڑا۔

''اُلو کے پٹھے، اب کیا ہے؟'' میں نے دروازہ کھول کر کہا اور شرمندہ ہو گیا، سامنے ندیم کھڑا تھا۔ وہ اندر آیا۔

''اُلو کے پٹھے کے بارے میں بعد میں پوچھوں گا پہلے یہ بتا...... رات تُو نے کیا کارنامے انجام دیئے،

مجھ سے پوچھے بغیر۔'' وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

''تجھے کیسے پتا چلا؟''

''وہ تیرا نہ ہونے والا سالا آیا تھا صبح سویرے...... اکرم چشتی، بپھرا ہوا تھا۔ میں نے ایک ایس ایس پی سے بات کی تو بالکل پُرسکون ہو گیا تھا مگر تیری جیپ پولیس کے قبضے میں ہے اور تجھ پر چند مزید کیسوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔''

''وہ تو مجھے معلوم تھا۔'' میں نے تلخی سے کہا اور کچن کا رخ کیا۔ کافی کے لئے پانی رکھ کر ندیم کے سامنے میز پر آ بیٹھا۔ جب تک کافی کا پانی کھولا، میں نے اسے رات کے معرکے کے ابتدائی واقعات سنائے اور باقی واقعات کافی پیتے ہوئے اس کے گوش گزار کر دیئے۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر میں اس نے میری شان میں چند ہمہ صفت قسم کے الفاظ کہے۔ ''آخر تجھے کیا تکلیف تھی جو تُو نے شہر کا رخ کیا؟''

میں بھنا گیا۔ ''مجھے یہاں چھوڑ کر سب بھول گئے تھے۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ جواب دے گیا تھا اس لئے......''

''جناب نے فیصلہ کیا کہ اپنے مصائب میں مزید اضافہ کر لیا جائے۔'' اس نے طنز کیا۔ ''مرشد علی والے کیس میں کوئی جان نہیں تھی لیکن اب تُو نے اکرم چشتی کے لئے ایک عدد لاش بھی مہیا کر دی ہے۔''

''مجھے شبہ ہے کہ وہ ٹکر سے مرا ہے، تم اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔''

''اکرم چشتی نے پکا کام کیا ہے۔ مرنے والے کا جسم بری طرح مجروح ہے۔''

''ڈاکٹر احمق نہیں ہوتے...... زندہ جسم کی چوٹ اور مرنے کے بعد پہنچائے جانے والے نقصان کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔''

''ڈاکٹر بھی پولیس کی مرضی کے مطابق رپورٹ دیتے ہیں...... ممکن ہے کوئی اچھا ڈاکٹر ہو اور اڑ جائے موت کی اصل وجہ لکھ دے مگر فی الحال تیری ضمانت قبل از گرفتاری منظور ہونے کا امکان باقی نہیں رہا ہے۔ تجھے مستقل طور پر رُوپوش رہنا ہو گا۔''

میں نے سر تھام لیا۔ ''بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں پھنس گیا۔''

''مرد بن...... ہمت کر...... رونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ابھی تیرے یار ہیں، ہر جگہ تیرا مقدمہ لڑیں گے، ایسی پریشانیاں آتی رہتی ہیں۔''

''مونا کیسی ہے...... وہ آنے کو کہہ رہی تھی؟''

''وہ تو نہیں لیکن اس کا لٹو صبح صبح آ گیا تھا۔ آج وہ تیرے معاملے میں اپنے ڈائریکٹر سے بات کرے گا۔ ڈائریکٹر کا بھائی وزارتِ داخلہ میں کسی اونچی پوسٹ پر ہے۔''

''اکرم چشتی نے اس واقعے کا ذکر کیا جس میں وہ اپنی کزن پر دست درازی کرتے ہوئے میرے ہاتھوں بے ہوش ہوا تھا؟''

''وہ بے غیرت ضرورت ہے، بے وقوف نہیں۔ اس واقعے کا وہ کسی سے ذکر نہیں کرے گا لیکن یہ اس کے خلاف اچھا پوائنٹ بن سکتا ہے اگر زینب......''

''اسے بھول جا...... میں اپنی بچت کی خاطر ایک عورت کا گھر نہیں اجاڑ سکتا۔''

''تیری مرضی...... اب مجھے اجازت دے اور میرے ساتھ آ کر سامان اتروا لے۔ میں راشن بھی لے آیا ہوں، تجھے نامعلوم مدت تک اس جگہ رہنا ہے۔''

''اپنا قیام زیادہ طویل نہیں ہوگا۔ اکرم چشتی کو پتا چل گیا ہے، میں ان اطراف میں کہیں پایا جاتا ہوں۔ وہ اس کاٹیج تک بھی آ سکتا ہے۔''

''اتنی مستعد نہیں ہے ہماری پولیس اور یہ کاٹیج جائے واردات سے کوئی سترہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور اکرم چشتی کے فرشتے بھی اس طرف نہیں آ سکتے تُو بے فکر ہو کر رہ۔''

میں نے جا کر ندیم کی کار سے سامان نکلوایا اور وہ رخصت ہو گیا۔ میں سامان اٹھا اٹھا کر اندر لانے لگا۔ ایک بار باہر نکلا تو بندر ایک پیکٹ اٹھا کر چلا آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے دانت نکالے اور اندر چلا گیا۔ میں نے سر ہلایا۔ یہ بندر تو عربی کا اونٹ ثابت ہو رہا تھا۔ بہرحال میں باقی سامان لے کر اندر آیا تو وہ بے حد تمیز سے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھا تھا اور غالباً ناشتے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے ابلے ہوئے مٹروں کا ایک ٹن کھول کر دیا، اس نے سونگھا اور ٹن ایک طرف رکھ دیا۔ اسے مٹر پسند نہیں آئے تھے لہٰذا میں نے اپنے ساتھ اس کے لئے بھی سینڈوچز تیار کئے اور اس نے میرے ساتھ بالکل انسانوں کی طرح بیٹھ کر ناشتا کیا تھا۔ تمیز اور سلیقے سے سینڈوچز ختم کر کے اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے کافی کے بارے میں استفسار کر رہا ہو۔ میں نے کافی کا پانی رکھ دیا تھا مگر پھر چائے کا موڈ ہونے لگا۔ میں نے کھولتے پانی میں پتی ڈالی تو اس نے آ کر سونگھا اور دوبارہ لاتعلقی سے کرسی پر جا بیٹھا۔ اسے چائے پسند نہیں آئی تھی اس لئے میں نے صرف اپنے لئے نکالی۔

''آؤ میاں ذرا باہر ہو آئیں۔'' میں نے کہا تو وہ کرسی سے اٹھ کر میرے ساتھ ہو لیا۔ صبح کی دھند چھٹ رہی تھی اور سورج کی نرم کرنیں چہرے کو گدگدا رہی تھیں، میں درخت کے کٹے تنے پر جا بیٹھا۔ بندر مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''برخوردار! تمہارا اصل وطن افریقہ میں ہے تم یہاں کیسے آئے، تمہارا مالک کون ہے؟''

اس سوال کا جواب بندر کی گردن سے بندھے پٹے میں ہو سکتا تھا۔ چائے پی کر میں نے مگ رکھا اور محتاط انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ کتنا ہی مہذب سہی تھا تو جانور، مشتعل ہو کر مجھے نوچ کھسوٹ سکتا تھا لیکن وہ سکون سے بیٹھا رہا۔ میں نے عقب سے ہُک نکال کر اس کا پٹا کھولا۔ اس پر نہ تو کوئی نمبر تھا اور نہ ہی کوئی پتا۔ صرف ایک دھاتی بلا تھا جو پٹے کے اندر کی جانب تھا اور اس پر انگریزی میں J-D لکھا تھا۔

''جیدی۔'' میں نے مسکرا کر کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''خوب، تو برخوردار کا نام جیدی ہے لیکن یہ ہمارے ایک معروف اور محترم شاعر اور مزاح نگار کا نام اور تخلص ہے اس لئے میں تمہیں جیدی کے بجائے جونی کہوں گا۔ کیا خیال ہے جونی؟''

جونی کے نام پر وہ ذرا بھی نہیں ہلا۔ میں مگ اٹھا کر اندر آنے لگا تو وہ کٹے ہوئے تنے پر بیٹھ گیا۔ میں نے اندر آ کر برتن دھوئے۔ ندیم کا لایا سامان لگایا۔ اس میں فوری تیار ہونے والی اشیاء تھیں جیسے نوڈلز، اسپاگیٹی...... خشک گوشت کے ٹن پیک پارچے۔ ایک تھیلے میں سیب اور آڑو بھی تھے۔ انہیں میں نے ڈائننگ ٹیبل پر رکھی

ٹوکری میں سجا دیا۔ میں نے ندیم سے اپنے دفتر کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ ایک دو دن تو معاملات چل جاتے لیکن اس سے زیادہ دن وہ لوگ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اخراجات کے لئے بینک سے رقم میرے سائن کئے چیک سے نکلتی تھی اور چیک بک میرے پاس تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جب ندیم آئے گا تو اپنے چیک سائن کر کے اس کے حوالے کر دوں تا کہ دفتر میں جب رقم کی ضرورت ہو، وہ نکال کر دے سکے۔ کچن سے نمٹ کر میں نے ریڈیو آن کیا اور مقامی اسٹیشن لگا کر خبریں سننے لگا لیکن ان میں میرا یارات ملنے والی لاش کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ معاً مجھے لاش کے لباس سے ملنے والے بٹوے کا خیال آیا۔ میں نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔

بٹوا بیڈروم میں پڑا تھا۔ میں نے اسے کھولا اندر سے خاصی رقم کے ساتھ ایک شناختی کارڈ نکلا۔ اس کے علاوہ چند کاغذی چٹیں تھیں جن پر کچھ پتے اور فون نمبر تھے۔ شناختی کارڈ دیکھ کر میں چونکا۔ اس پر نام سجاد مہر لکھا تھا لیکن خاص بات اس کا پتا تھا۔ یہ کاغان کے کسی گاؤں کا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ گاؤں راجا عمر دراز اور سرمد علی کے گاؤں کے پاس ہی کہیں تھا۔ کیا یہ اتفاق تھا، یہ شخص اس علاقے سے تعلق رکھتا تھا تو اس کے پاس تصویر کہاں سے آئی؟ مجھے یاد تھا، راجا عمر دراز اس تصویر کا کتنا دیوانہ تھا، اسے کتنا عزیز رکھتا تھا۔ اس نے اس تصویر کو حفاظت سے رکھا تھا۔ چوری ہونے کے بعد جب تصویر واپس ملی تو پہلے سے زیادہ اس کی حفاظت کا بندوبست کیا تھا اور اب یہ تصویر ایک شخص کے پاس سے نکلی تھی۔ بٹوے میں رکھے نوٹوں اور شناختی کارڈ سے ظاہر تھا کہ مرحوم فقیر نہیں تھا بلکہ اس نے کسی خاص وجہ سے ایسا حلیہ بنایا تھا اور شامت کا مارا میری جیپ کے سامنے آ کر مر گیا تھا۔ اب پتا نہیں وجہ انتقال کیا تھی لیکن مجھے یقین تھا، اکرم چشتی مرحوم کو میرے کھاتے میں ڈالنے کی پوری کوشش کرے گا۔ بٹوے میں کوئی گیارہ ہزار اور چند سو روپے تھے۔ بٹوے کی سائیڈ میں چھوٹی سی فون ڈائری تھی اس پر بھی کئی نمبر لکھے تھے۔

میں نے تصویر پلاسٹک شیٹ سے نکالی۔ اسے ٹیپ لگا کر مکمل طور پر سیل کر دیا گیا تھا۔ اس لئے تصویر بالکل خشک تھی۔ میں نے اسے میز پر پھیلایا۔ تصویر کے نچلے حصے میں افسانوی اور تخیلاتی مخلوقات تھیں۔ اسے دیکھتے ہوئے عجیب سا احساس ہونے لگا تھا۔ ایک لمحے کو یوں لگا جیسے سب کچھ متحرک ہو۔ میں نے سر جھٹکا تو تصویر پہلے کی طرح ساکت تھی۔ میں نے جلدی سے اسے لپیٹ دیا۔ نہ جانے کیوں مجھے ڈر سا لگا تھا۔ اسے لپیٹ کر میں نے دوبارہ پلاسٹک میں ڈال دیا۔ شاید یہ میرے احساسات کا کرشمہ تھا، اس تصویر اور سیاہ پتھر کے لئے میں نے ایسی جدوجہد دیکھی تھی کہ میرے ذہن میں اس کی حیثیت مافوق العقل ہو گئی اور شاید اس وجہ سے مجھے اس کے کردار متحرک نظر آئے تھے۔ رول لپیٹ کر بٹوے کے ساتھ میں نے الماری میں رکھ دیا تھا۔

اچانک مجھے کسی مشین کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ غور کرنے پر پتا چلا کہ کوئی گاڑی اس طرف آ رہی ہے۔ میں نے چوکنا ہو کر ریوالور نکالا اور سامنے والے حصے سے باہر جھانکا۔ جھاڑیوں سے ایک چھوٹی فور وہیل ڈرائیو برآمد ہو رہی تھی اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر سفیر تھا، اس کے ساتھ مونا بیٹھی تھی۔ میں ریوالور پھینک کر باہر بھاگا۔ جونی درخت کے کٹے تنے پر محو استراحت تھا۔ گاڑی رکی اور سفیر نکل کر مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ ''مبارک ہو، سنا ہے تمہارے پکڑے جانے کی ایک اور کوشش ناکام ہو گئی ہے؟''

میں جھینپ گیا۔ ''بس یار! بور ہو کر نکل پڑا تھا۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ شامت میرا انتظار کر رہی ہے۔''

''بس اب سب ایک بندے کے پیچھے مت پڑ جایا کرو۔'' مونا بھی باہر آ گئی۔ ''ندیم بھائی بھی صبح اتنی سنا کر گئے تھے، گھر میں بھی غصے میں تھے۔''

''اس کا غصہ بجا ہے۔ اس نے خود اپنا کیس خراب کیا ہے۔'' سفیر بولا۔

مونا نے چیخ ماری۔ ''یہ کیا ہے؟'' اس نے بندر دیکھ لیا تھا۔

''محترم جونی صاحب!'' میں نے تعارف کرایا۔ ''ناشتے کے بعد قیلولہ کرتے ہیں۔''

''واہ...... یہ تو وی آئی پی بندر ہے۔'' سفیر نے دلچسپی سے کہا۔ ''تمہارے ہاتھ کیسے آیا؟''

''خود ہی آ گیا تھا بلکہ اس نے مجھے خاصا ڈرایا بھی تھا۔ پُراسرار طور پر کاٹیج کے آس پاس گھومتا رہا تھا اور میں ڈرتا رہا کہ یہ کون میری نگرانی کر رہا ہے۔''

''یہ پالتو ہے، اس کی گردن میں پٹا ہے۔'' مونا نے غور کیا۔

''ہاں...... لیکن پٹے پر صرف اس کا نام ہے، جیدی...... میں نے اسے جونی کر دیا ہے۔''

''لگتا ہے اس کا مالک حسِ مزاح سے عاری کوئی شخص ہے۔'' مونا غصے سے بولی۔

بندر کو سوتا چھوڑ کر ہم اندر آئے۔ مونا نے مہمان ہونے کے باوجود کچن کا چارج سنبھالا اور چائے بنائی۔ وہ بریانی بہت اچھی بناتی تھی۔ میں نے فرمائش کی۔ اتفاق سے سامان بھی تھا لہٰذا اس نے دوپہر کے کھانے کے لئے بریانی کی تیاری شروع کر دی۔ کچھ چیزوں کی کمی تھی، اس لئے سفیر کو جانا پڑا۔ دوپہر میں کھلے لان میں دسترخوان بچھا کر ہم نے پُرلطف لنچ کیا۔ مونا نے میرے لئے شام کا سالن بھی تیار کر دیا تھا۔ وہ دونوں شام تک میرے ساتھ رہے تھے۔ انسپکٹر اکرم چشتی نے سفیر کا پتا چلا لیا تھا اور اسے تلاش کر رہا تھا۔ سفیر دو دن سے دفتر نہیں گیا تھا اور دفتر میں اس کا جو پتا تھا وہ بھی اب بدل چکا تھا۔

''میں نے چار دن کی مزید چھٹی لے لی ہے۔'' سفیر نے ہنس کر بتایا۔ ''اب اسے جھک مارنے دو۔''

''اس چکر میں نہ رہنا۔ کل رات مجھے اندازہ ہوا، وہ پولیس والا ضرور ہے لیکن اس کی کھوپڑی میں شیطان کا دماغ ہے۔''

''ہاں، ندیم بتا رہا تھا، تم اس کی کزن کے گھر جا پہنچے تھے اور اس نے اپنی کزن پر دست درازی کی تھی۔ تم نے اس کی کھوپڑی بجادی تھی۔''

''ہاں، وہ اسے اکیلا سمجھ کر دست درازی پر اتر آیا تھا۔'' میں نے مونا کی وجہ سے گول مول انداز میں کہا، وہ سمجھ گئی اور چائے بنانے کے بہانے کچن کی طرف چلی گئی۔ تب میں نے سفیر کو تفصیل سے اکرم چشتی کی خباثت سے آگاہ کیا۔ اس نے تبصرہ کیا۔

''یہ کوئی پیدائشی حرامی لگتا ہے۔''

''اسے گولی مار......'' میں نے کہا اور اسے مرنے والے کے پاس سے نکلنے والی تصویر کے بارے میں بتایا۔ سفیر کو پتا تھا۔ وہ حیران رہ گیا۔

''کیا حیرت انگیز اتفاق ہے!''

''مرنے والا اس علاقے سے تعلق رکھتا ہے اور مجھے شبہ ہے کہ یہ شخص راجا عمر دراز کی تصویر چرا کر بھاگا

تھا۔ ورنہ اس کے پاس سے تصویر نکلنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ راجا یہ تصویر ساری دنیا کی دولت کے عوض بھی کسی کو نہیں دے سکتا ہے۔''

''ممکن ہے راجا مر چکا ہو اور اس کے وارثوں نے تصویر بیچ دی ہو؟''

''اس تصویر کے لئے ولیم شا کا خاندان دیوانہ ہے۔ وہ راجا عمر دراز کو منہ مانگی قیمت کی پیش کش کر چکے تھے۔ اگر اس کے وارثوں نے تصویر بیچنا ہی تھی تو انہیں بیچتے نہیں بیٹے! یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔''

''ان چکروں کو چھوڑو...... اپنے چکر پر غور کرو۔''

''یار! پولیس مرشد علی کے اشارے پر میرے پیچھے پڑی ہے اور اکرم چشتی ان کا خاص مہرہ ہے۔ اس کا توڑ یہی ہو سکتا ہے کہ میں بھی کوئی بڑی سفارش پکڑوں۔''

''ان لوگوں کا اثر رسوخ بہت زیادہ ہے۔ مذہب کے نام پر انہوں نے بڑی کاروباری سلطنت قائم کر رکھی ہے۔ ہزاروں جاہل عقیدت مند ان کے ایک اشارے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس طاقت کا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔'' سفیر بولا۔

''تب میں کیا کروں...... خود کو ان کے سامنے پیش کر دوں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''یا ان کے وحشیانہ جذبۂ انتقام کی تسکین کے لئے بندھے ہاتھ آگے کر دوں۔ وہ مونا کے لئے بھی مکروہ عزائم رکھتے ہیں۔''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' سفیر بھڑک کر بولا۔ ''لیکن ہم اثر رسوخ کے لحاظ سے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، پولیس ان کا ساتھ دے گی۔ ہمیں یہ جنگ عدالت میں لڑنا ہوگی۔''

''عدالت...... وہ بھی دباؤ میں ہوتی ہے۔ پولیس میرے خلاف ایک کے بعد ایک مقدمہ بنا سکتی ہے۔ اس کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ نہیں سفیر، یہ معاملہ زمین سے نیچے ہی طے کیا جا سکتا ہے۔''

''شوبی ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' مونا چائے لے کر آئی۔ ''قانون کے طریقے سے ان سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہے، ہمیں کوئی اور راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔''

''شوبی، تمہارے بھائی اب فوج میں شاید کرنل ہیں۔'' سفیر بولا۔ ''کیا وہ......''

''فی الحال میں اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔''

میں نے حتمی لہجے میں کہا تو وہ چپ ہو گیا تھا، شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس نے غلط موضوع چھیڑ دیا ہے۔

''خیر ابھی معاملہ گرم ہے۔'' مونا بولی۔ ''شوبی یہاں محفوظ ہے۔ ہم دوسرے معاملات دیکھ لیں گے۔''

''مونا تمہیں فی الحال ندیم کے گھر تک محدود رہنا ہے۔ کوشش کرو کہ دفتر سے چھٹی مل جائے۔''

''لیکن یہ مسئلے کا حل تو نہیں ہے۔'' مونا کے لہجے میں بھی تلخی آ گئی تھی۔ ''میں کب تک دفتر سے چھٹی کر کے بیٹھی رہوں گی؟ میری نوکری ختم ہو جائے گی۔''

''جب تک مسئلے کا کوئی حل نہ نکل آئے۔'' سفیر نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ''ہنگامی حالات میں نارمل زندگی نہیں گزاری جا سکتی ہے۔ بہرحال زندگی کی اہمیت ہر شے سے بڑھ کر ہے۔ نوکری، کاروبار، مکان اور حیثیت...... ہر شے زندگی اور عزت کے بعد آتی ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ہم دونوں جذباتی ہو گئے تھے۔'' میں نے غور کر کے کہا۔

''اب ہم چلتے ہیں۔'' سفیر کھڑا ہو گیا۔''ممکن ہے تین چار دن بعد پھر چکر لگائیں، بشرطیکہ تم اپنی حرکتوں کی وجہ سے حوالات میں نہ ہو۔''

''بکواس نہ کر..... آدمی ایک حماقت بار بار نہیں کرتا۔''

''لیکن بعض اوقات آدمی عقدِ ثانی کی صورت میں یہ غلطی کر جاتا ہے۔'' سفیر سرد آہ بھر کر بولا۔''غلطی بشریت کا تقاضہ ہے۔''

''تم چلو.....تو.....'' مونا نے دانت پیسے۔

''بیٹے ابھی تیرا پہلا عقد بھی نہیں ہوا تو کیوں عقد ثانی کی بات کر کے اس کے امکانات ختم کر رہا ہے؟'' میں نے ہنس کر کہا تو مونا خفگی سے واک آؤٹ کر گئی تھی لیکن رخصتی سے پہلے اس کا موڈ درست ہو گیا تھا۔ سفیر مجھ سے گلے مل کر رخصت ہوا۔''اپنا خیال رکھنا..... میں کوشش کروں گا کہ معاملات سلجھ جائیں..... ورنہ دیکھ لیں گے جو تقدیر میں ہوا۔''

''ان شاء اللہ۔'' میں نے جواب دیا۔ ان کی فور وہیل ڈرائیو جب جھاڑیوں میں غائب ہوئی تو سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ان لوگوں کے جاتے ہی ماحول اداس اور خاموش ہو گیا تھا۔ میں درخت کے کٹے تنے پر آ بیٹھا۔ آج سفیر نے میرے زخموں کو چھیڑ دیا تھا۔ شجاع بھائی کا ذکر کر کے۔

☆======☆======☆

بابا کا ردِعمل میری توقعات کے عین مطابق تھا۔ انہوں نے میری صورت دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ میرے لئے ان کا حکم تھا کہ میں ان کے سامنے نہ آؤں۔ شجاع بھائی اور شاہد بھائی بھی مجھ سے ناراض تھے لیکن بہرحال مجھ سے بات کرتے تھے۔ ماں جی چند دن خفا رہنے کے بعد مان گئی تھیں اور صغراں آپا میرے لئے ہمیشہ محبت رکھتی تھیں۔ سویرا شروع میں جھجکی تھی لیکن رفتہ رفتہ مجھ سے مانوس ہوتی چلی گئی۔ شجاع بھائی نے مجھ سے آگے کے بارے میں پوچھا تو میں نے گریجویشن کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس پر شجاع بھائی نے راولپنڈی کے ایک کالج میں میرا داخلہ کرا دیا تھا۔ ہوسٹل میں قیام تھا اور میں دو سال کے لئے حویلی سے رخصت ہو گیا۔

کالج لائف الگ ہنگامہ خیز تھی، تعلیم سے زیادہ غیر نصابی سرگرمیوں پر زور تھا۔ دونوں سال گرما کی چھٹیوں میں کالج فیلوز کے ہمراہ شمالی علاقے کے ٹورز کئے۔ ان چھٹیوں میں بھی چند دن کے لئے حویلی گیا تھا۔ دل تو بہت کرتا تھا لیکن بابا کا رویہ میرا حوصلہ توڑ دیتا تھا اور مجھ سے چند دن سے زیادہ حویلی میں نہیں رکا جاتا تھا۔ ماں جی، صغراں آپا، ننھی شمی اور سویرا سب بے حد اصرار کرتے تھے مگر میں وہاں سے چلا آتا۔ دوسرے سال گرما کی چھٹیاں گلگت اور بلتستان میں گزار کر کالج کھلنے سے پہلے میں چند دن کے لئے حویلی آیا تو میں نے سویرا کے انداز میں تبدیلی محسوس کی تھی۔ وہ میرے آگے پیچھے پھرتی تھی لیکن جہاں میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا، وہ بھاگ جاتی تھی۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے خوب قد کاٹھ نکالا تھا۔ رنگت پکی گندم کی جیسی سنہری ہو گئی تھی۔ چھریرا جسم کسی قدر بھر گیا تھا۔ سنجیدہ وہ پہلے بھی تھی لیکن اب زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ میں ایک ہفتے بعد واپس جا رہا تھا تو اس کی آنکھیں روئی روئی سی تھیں۔ اس سال شجاع بھائی کی شادی ہو گئی۔ میری پڑھائی زوروں

پر تھی۔ اس لئے میں صرف چار دن کے لئے حویلی آ سکا۔ میں نے ماں جی سے شکوہ کیا کہ شجاع بھائی کی شادی دو مہینے بعد کرتے تو کیا جاتا؟

''سب نے یہی کہا تھا لیکن تیرے بابا نہیں مانے۔'' ماں جی بولیں۔

''اگر وہ مجھے بھائی کی شادی میں شریک نہیں کرنا چاہتے تھے تو ویسے ہی کہہ دیتے۔'' میں نے تلخی سے کہا تھا۔

''شوبی! پاگل نہ بن۔'' ماں جی نے مجھے ڈانٹا تھا۔

شجاع بھائی کے ولیمے کے اگلے روز میں واپس روانہ ہو گیا تھا۔ دو مہینے تک امتحانات کی وجہ سے سر کھجانے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ جب امتحان دے کر فارغ ہوا تو حویلی جانے کی تیاری شروع کر دی۔ ان دنوں ماں جی شاہد بھائی کے لئے لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔ میں حویلی پہنچا تو ماں جی اور صغراں آپا میاں والی جا رہی تھے۔ جہاں صغراں آپا کے سسرال میں کوئی لڑکی تھی۔ بابا حسبِ معمول میری آمد کے بعد بیٹھک تک محدود ہو گئے تھے اور اتنی بڑی حویلی میں ایک سویرا تھی جس سے میں بات کر سکتا تھا۔

اس روز ناشتے کے بعد میں اپنے کمرے میں ساتھ لائی چند کتابیں دیکھ رہا تھا کہ سویرا آئی۔ ''آپ چائے پئیں گے؟''

''ہاں، اگر تم پلاؤ گی تو ضرور پیوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں ابھی لائی۔'' وہ چٹکی بجا کر بولی اور بل کھا کر واپس گئی تو میں اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ چند منٹ بعد وہ ٹرے میں چائے سجا کر لے آئی اور کپ بنا کر مجھے دیا۔ میں نے سپ لیا۔ چائے اچھی تھی، میں نے تعریف کر دی۔ وہ کھل اٹھی۔ ''سچ اچھی ہے۔''

''ہاں...... میں کسی کی جھوٹی تعریف نہیں کرتا۔''

''چھوڑیئے، آپ تو سچی تعریف بھی نہیں کرتے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ نے بتایا نہیں...... میں کھانا کیسا بناتی ہوں؟''

میں حیران ہوا تھا۔ ''تم نے کھانا کب بنایا؟''

''لیجئے...... جو پچھلے تین دن سے آپ کھا رہے ہیں، وہ کون بناتا ہے؟''

''خدا کی قسم، مجھے نہیں معلوم تھا۔ باقی کھانوں کے ذائقے یاد نہیں...... لیکن کل رات کا پلاؤ لاجواب تھا۔''

وہ خوش ہو گئی۔ ''آج میں کڑاہی بناؤں گی اور ساتھ میں گڑ والے چاول۔''

''واہ......!'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''تم نے تو میرا پسندیدہ مینو بنا دیا۔''

''مجھے آپ کی پسند اور ناپسند کے بارے میں سب پتا ہے۔'' اس نے اتنے اعتماد سے کہا کہ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

''سویرا، تم میرا اتنا خیال کیوں رکھ رہی ہو؟''

اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ ''یہ سوال تو آپ کو خود سے کرنا چاہئے۔''

اس لمحے مجھے لگا جیسے میں اس لڑکی کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ میٹرک کر کے

فرسٹ ایئر میں آئی تھی لیکن اس کی باتیں اپنی عمر سے کہیں زیادہ پختہ تھیں۔

''اور اگر مجھے کوئی جواب نہ ملے؟''

اس کے چہرے پر مایوسی کی بدلی آ گئی تھی۔ ''تب میں اسے اپنی قسمت سمجھوں گی۔''

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ دوپہر کا کھانا مجھے ملازم نے لا کر دیا۔ سویرا نہیں آئی تھی۔ میں شام کو باہر نکلا تو وہ صحن میں بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے دوپٹا درست کیا۔ ''تم دوپہر کا کھانا لے کر کیوں نہیں آئیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ چاول چننا بھول گئی تھی، ایسے ہی ہاتھ مار رہی تھی۔ ''میں نے سوچا آپ میرے بار بار آنے سے تنگ نہ آ جائیں۔''

''میں تم سے کیوں تنگ آنے لگا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ نروس ہو رہی تھی۔

''سویرا! میں تمہاری کسی بات سے کبھی تنگ نہیں ہو سکتا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا اور باہر چلا گیا۔ شدت کا حبس تھا اور آسمان پر کالے بادل جمع ہو رہے تھے۔ مون سون کا آغاز ہونے والا تھا۔ مجھے ماں جی اور صغراں آپا کی فکر ہونے لگی۔ اگر بارش ہو جاتی تو وہ پھنس جاتیں۔ بارشوں میں راستے خراب ہو جاتے تھے۔ خاص طور سے پکی سڑک سے ملک وال تک آنے والا راستہ قطعی بے کار ہو جاتا تھا۔ بابا نے علاقے کے رکن صوبائی اسمبلی سے اس سڑک کو پختہ کروانے کی بات کی تھی۔ اس نے وعدہ بھی کیا تھا لیکن الیکشن جیت کر وہ اپنا وعدہ بھول گیا تھا۔ میں ٹہلتا ہوا ذرا دور نکل گیا تھا۔ اچانک بادل گرجے اور اتنی تیز بارش ہوئی کہ مجھے کسی درخت تلے جانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ لمحوں میں شرابور ہو کر رہ گیا تھا۔ جب بھیگ گیا تو میں نے پناہ تلاش کرنے کے بجائے واپسی کا سوچا اور حویلی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ابھی شام تھی لیکن بادلوں اور بارش کی وجہ سے ماحول تاریک ہو رہا تھا۔ مجھے راستے میں آنے والے گڑھے کا اندازہ نہیں ہوا۔ اچانک پیر گڑھے میں چلا گیا تو ٹخنے میں درد کی لہر سی اٹھی تھی۔ اس وقت میں نے توجہ نہیں دی مگر حویلی آتے آتے پاؤں کا درد اتنا شدید ہو گیا تھا کہ پاؤں رکھنا بھی محال ہو رہا تھا۔ میں سہارا لے کر اندر داخل ہوا تو سویرا سامنے برآمدے میں کھڑی تھی۔ شاید میری راہ دیکھ رہی تھی کیونکہ مجھے دیکھ کر وہ بارش کی پروا کیے بغیر بھاگی آئی تھی۔

''آپ کو کیا ہوا...... ایسے کیوں چل رہے ہیں؟''

''راستے میں پاؤں ایک گڑھے میں چلا گیا تھا۔ شاید موچ آ گئی ہے۔''

''بہت تکلیف ہو رہی ہے، آئیں میں آپ کو اندر لے چلتی ہوں۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''میں چلا جاؤں گا۔'' مجھے جھجک محسوس ہو رہی تھی، کوئی اسے میرے اتنے نزدیک دیکھتا تو کیا سوچتا!

''نہیں، آپ کو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'' اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور میرا ہاتھ اپنے شانے پر رکھ لیا۔ ''آپ میرا سہارا لے لیں۔ پاؤں پر زور نہ ڈالیں۔''

مجھ سے واقعی پاؤں پر زور نہیں ڈالا جا رہا تھا۔ مجبوراً میں نے اپنا وزن اس کے نازک شانوں پر ڈال دیا اور اس کے سہارے برآمدے تک رکھی کرسیوں تک آیا۔ وہ اتنی بے قرار تھی کہ مجھے کرسی پر بٹھا کر خود میرا پاؤں

دیکھنے لگی جو سوچ گیا تھا۔ میں حیران رہ گیا، وہ رو رہی تھی۔ ''ارے...... روتی کیوں ہو؟''

''آپ کو بہت چوٹ لگی ہے...... اس وقت تو حکیم بھی نہیں ملے گا۔''

''فکر مت کرو۔ صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میں فضل سے کہتی ہوں، وہ آپ کو کمرے میں لے جائے گا۔ میں دودھ گرم کر کے اور ہلدی ملا کر لاتی ہوں۔ ماں جی نے تیل بنایا ہے، وہ بھی لاتی ہوں۔''

میرے منع کرنے کے باوجود اس نے ملازم فضل سے مجھے میرے کمرے میں بھجوا دیا۔ میرے لئے خشک کپڑے بھجوائے اور جب میں نے دوسرے کپڑے پہن لئے تو وہ ہلدی ملا دودھ اور مالش کے لئے تیل لے آئی۔

''میں یہ نہیں پی سکتا۔''

''پئیں۔'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''اس سے توانائی ملے گی، درد بھی کم ہو گا۔ جب تک میں مالش کرتی ہوں۔ پی لیں...... ورنہ میں رونا شروع کر دوں گی۔''

''پلیز رونا مت!'' میں نے جلدی سے گلاس اٹھا لیا۔ اس نے شلوار کا پائنچہ اوپر کیا اور ہاتھ میں تیل لے کر میرے مضروب ٹخنے پر ملنے لگی۔ شروع میں درد ہوا تھا لیکن نہ جانے یہ تیل کی تاثیر تھی یا اس کے نرم ہاتھ کا اثر۔ میرا درد رفتہ رفتہ کم ہونے لگا تھا۔ میں نے دودھ کا گلاس ختم کر کے اسے دکھایا۔ ''دیکھو، سارا پی لیا۔''

وہ پہلی بار مسکرائی۔ ''میری دھمکی سے ڈر گئے؟''

''جی نہیں، مجھے رونے والی لڑکیاں بالکل اچھی نہیں لگتی ہیں۔''

''یعنی آپ کو لڑکیاں اچھی لگتی ہیں؟''

''نہیں بابا!'' میں گھبرا گیا۔ ''یہ کیسی باتیں کر رہی ہو، کسی نے سن لیا تو شامت آ جائے گی۔ خاص طور سے بابا نے سن لیا تو میری وفات یقینی سمجھو۔''

''اللہ نہ کرے۔'' اس نے بے ساختہ کہا پھر ہچکچا کر بولی۔ ''کیا واقعی آپ کو دوسری لڑکیاں اچھی لگتی ہیں؟''

''یہ دوسری سے کیا مراد ہے؟'' میں نے اس کے سوال پر غور کیا۔

''کک...... کچھ نہیں۔'' وہ گھبرا کر بولی۔ ''اچھا میں چلتی ہوں...... آپ آرام کریں۔ رات کا کھانا میں یہ سے لاؤں گی۔''

''نہیں، دو گھنٹے بعد لے آنا۔ میں ہلکی سی بھوک محسوس کر رہا ہوں۔''

''لیکن آپ بستر سے اتریں گے نہیں، میں آپ کو بابا جان کی چھڑی لا دیتی ہوں۔ اس کے سہارے چلئے گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔

وہ دروازے سے پلٹ آئی۔ ''شہباز، آپ کے بابا آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔''

''ہاں، جیسے مالک اپنے کتے سے محبت کرتا ہے...... لیکن وہ اس کا حکم نہ مانے تو اسے دھتکار دیتا ہے۔''

''پلیز ایسا مت کہیں۔ وہ سچ مچ آپ سے محبت کرتے ہیں۔''

''مجھے یقین ہے۔'' میں بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ چند لمحے کھڑی دیکھتی رہی پھر باہر چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا، میری چوٹ کا علم ہونے کے باوجود بابا مجھے دیکھنے نہیں آئیں گے۔ وہ اتنے ہی ضدی تھے اور میں بھی ان کی اولاد تھا۔ نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ درمیان میں سویرا کھانے کا پوچھنے آئی تھی لیکن مجھے بے خبر سوتا پا کر واپس چلی گئی۔ پھر پیاس کی وجہ سے میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں تاریکی تھی لیکن میں نے محسوس کیا، دروازے کے پاس کوئی کھڑا تھا۔ میں نے سویرا سمجھ کر پانی مانگا تو سایہ آہستہ سے حرکت میں آیا۔ میں ششدر رہ گیا۔ وہ بابا تھے، نہ جانے کب سے دروازے پر کھڑے تھے۔ اس کے کچھ دیر بعد سویرا آئی۔ اس نے روشنی کی۔ اس وقت حویلی میں بجلی آ چکی تھی۔ ''آپ جاگ گئے، میں آپ کو دیکھنے آئی تھی۔'' وہ ظاہر کر رہی تھی کہ اس کی آمد اتفاقی ہے۔

''تمہیں بابا نے بھیجا ہے؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''بابا...... نے...... نہیں تو۔'' وہ اٹک اٹک کر بولی پھر اقرار کر لیا۔ ''ہاں، وہ میرے پاس آئے تھے، کہہ رہے تھے کہ آپ کو پیاس لگی ہے، انہیں کیسے پتا چلا؟''

''میرا اندازہ غلط تھا، وہ مجھے دیکھنے آئے تھے...... لیکن دروازے سے واپس چلے گئے۔''

سویرا نے مجھے گلاس میں پانی دیا۔ ''میں نے کہا ناں وہ آپ سے محبت کرتے ہیں۔''

''لیکن اپنی انا کے حصار میں...... یہ انا انہیں دروازے تک آنے کے باوجود اندر آنے سے روکتی ہے۔''

میرے لہجے کی تلخی محسوس کر کے اس نے موضوع بدل دیا۔

''آپ کو بھوک لگ رہی ہے تو میں کھانا لے آؤں۔ روٹیاں خود ڈالوں گی۔''

''ہاں لے آؤ۔'' میں نے کہا، وہ چلی گئی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے، باہر زور شور سے بارش جاری تھی۔ کھڑکی سے بھیگی ہوا کے خنک اور سبک جھونکے اندر آ رہے تھے۔ سویرا پندرہ منٹ بعد کھانا لے آئی تھی۔ تنور کی موٹی روٹیوں کے بجائے اس نے پتلی روٹیاں بنائی تھیں۔ اسے معلوم تھا مجھے پتلی روٹیاں اچھی لگتی ہیں۔ کھانا گرم اور لذیذ تھا۔ مجھے بھوک بھی لگی تھی اس لئے سیر ہو کر کھایا۔ سویرا پاس بیٹھی رہی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم جا کر سو جاؤ۔ برتن صبح اٹھا لینا۔''

''نہیں۔ میں برتن لے کر جاؤں گی۔'' اس نے اصرار کیا۔

سچی بات ہے اتنی رات گئے اس کی اپنے کمرے میں موجودگی اور امی اور آپا کے گھر میں نہ ہونے سے مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی اور میں چاہتا تھا وہ اب چلی جائے۔ مجھے رہ رہ کر بابا کا خیال بھی آ رہا تھا۔ اس معاملے میں وہ سخت خیالات رکھتے تھے اور کزنز کے آپس میں بے تکلفانہ میل جول کے قائل نہیں تھے۔ شجاع بھائی کی بیوی فوزیہ بھابی ہمارے سگے چچا کی لڑکی تھیں مگر منگنی کے پانچ سالوں کے دوران میں ان کی ایک بار بھی شجاع بھائی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے معلوم تھا، وہ سویرا کی رات گئے میرے کمرے میں موجودگی پسند نہیں کریں گے۔ میں نے کھانا ختم کیا اور سویرا سے برتن اٹھانے کو کہا، اس نے پوچھا۔ ''آپ چائے پئیں گے؟''

''اتنی رات گئے؟'' میں نے زبردستی جماہی لی۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے۔''

وہ خاموشی سے برتن لے کر چلی گئی اور میں اسٹک کے سہارے باتھ روم گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر آیا تو وہ

کمرے میں موجود تھی۔ میں جھنجلا گیا تھا اور میرے منہ سے نکل گیا۔ ''تم پھر آ گئیں۔ کیا رات یہاں گزارنے کا ارادہ ہے؟'' منہ سے یہ بات نکالتے ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، اس کے چہرے کا رنگ لمحوں میں بدل گیا تھا اور پھر وہ منہ چھپا کر روتی کمرے سے نکل گئی تھی اور میں اپنی زبان کی لغزش پر پچھتا تا رہ گیا۔ پھر جب میری نظر سرہانے تپائی پر رکھے دودھ کے گلاس پر پڑی تو میرے پچھتاوے میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بے چاری سونے سے پہلے مجھے دودھ کا گلاس دینے آئی تھی اور میں نے کتنے سفاک الفاظ کہہ دیئے تھے۔ میرے پاؤں کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ میرے پاس عام پین کلر گولیاں پڑی تھیں۔ وہی کھا کر سو گیا۔ بلکہ سویا کہاں، ساری رات درد اور پچھتاوے کے زیر اثر کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ صبح تک پاؤں کی سوجن اور تکلیف میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ فضل صبح سویرے مقامی حکیم کو لے آیا۔ اس نے پاؤں کا معائنہ کر کے اس پر سخت پٹی باندھ دی اور لگانے کو مرہم دیا تھا۔

سویرا ناشتا لے کر نہیں آئی۔ اس نے فضل کے ہاتھ بھجوا دیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کتنی ناراض ہو گی لیکن میں نے ڈر کر اسے آنے کا پیغام بھی نہیں بھیجا۔ حکیم کے مرہم اور سخت بینڈیج سے فائدہ ہوا تھا۔ سارا دن حبس کے بعد شام کو پھر سے بارش شروع ہوئی تو میں چھڑی کا سہارا لے کر برآمدے تک آ گیا۔ سویرا ذرا آگے ایک کرسی پر اس طرح بیٹھی تھی کہ بارش کی بوچھاڑیں اس کے پیروں تک آ رہی تھیں۔ اسے میری آمد کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ میں کھنکارا تو وہ چونکی تھی۔ میری طرف دیکھا اور اٹھ کر جانے لگی تو میں آہستہ سے پکارا۔ ''سویرا......رک جاؤ......میری بات سن لو، پھر بے شک چلی جانا۔''

وہ رک گئی مگر نہ تو زبان سے کچھ کہا اور نہ میری طرف دیکھا۔ ''سویرا! یہاں آؤ......ادھر کرسی پر بیٹھو۔''

''میں یہاں ٹھیک ہوں، کہئے کیا کہنا ہے؟'' وہ بولی۔

''میں کل والی بات پر سوری کہنا چاہتا ہوں۔ وہ سب میں بے اختیار کہہ گیا تھا۔ میرا مقصد تمہاری توہین کرنا نہیں تھا۔''

''آدمی وہی بے اختیار کہتا ہے جو اس کے ذہن میں ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ مجھے ایسا......'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''سویرا! خدا کی قسم میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم نہیں جانتیں، میں اس حویلی میں کیسے رہ رہا ہوں۔ مجھے ڈر تھا تمہاری میرے کمرے میں اتنی دیر موجودگی پسند نہیں کریں گے۔ میں منہ سے کہنا نہیں چاہتا کہ تم اب جاؤ...... اب اپنے کمرے میں دوبارہ دیکھا تو......''

''آپ کی بات ہو گئی۔'' اس نے میری بات کاٹی اور وہاں سے چلی گئی۔

''سویرا!'' میں نے آواز دی لیکن وہ رکی نہیں تھی۔

رات کا کھانا بھی فضل لے کر آیا تو میں نے واپس بھجوا دیا۔ ''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''بی بی کہہ رہی ہیں، کھانا کھالیں آپ نے دوپہر میں بھی نہیں کھایا تھا۔'' فضل پھر ٹرے اٹھائے چلا آیا۔

''میں نے کہہ دیا ناں...... مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

میرا خیال تھا کہ سویرا خود آ جائے گی مگر اس بار فضل بھی نہیں آیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب سویرا مجھ سے

ناراض ہوئی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا، وہ اتنی سخت ثابت ہوگی۔ میں اسے منانا چاہتا تھا اور وہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ ایک ڈر مجھے یہ بھی تھا کہ وہ صغراں آپا سے شکایت نہ کر دے۔ ان سے زبردست ڈانٹ تو پڑتی لیکن اس سے زیادہ مجھے شرمندگی کا ڈر تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گی کہ ان کا بھائی کسی لڑکی سے اس طرح بات بھی کر سکتا ہے؟ رات نو بجے میری بھوک اتنی بڑھ گئی کہ میں نے بے قرار ہو کر باورچی خانے کا رخ کیا۔ وہاں فریج میں سالن تھا۔ روٹیاں چنگیری میں پڑی تھیں۔ ٹھنڈے سالن کو ٹھنڈی روٹیوں سے حلق سے اتارا اور پانی پی کر واپس جانے لگا تھا کہ کوئی باورچی خانے کے پاس سے تیزی سے گیا۔ میں نے ایک جھلک دیکھی، وہ سویرا ہی تھی۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور اس کے کمرے کے دروازے پر اسے روک لیا۔ ''سویرا...... میری بات سنو۔''

''اب آپ کو خیال نہیں ہے کہ آپ کے بابا برا سمجھیں گے؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔

''پلیز...... میں تم سے معذرت کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ چلے جائیں...... مجھے کچھ نہیں سننا۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی اور کمرے میں چلی گئی۔

میں شرمندگی کے عالم میں جانے کے لئے پلٹا تو راہداری میں بابا کھڑے نظر آئے۔ میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ میری بے عزتی کا منظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کے تاثرات سخت تھے۔ میں سر جھکا کر جانے لگا تو وہ تاثرات سے بھی زیادہ سخت لہجے میں بولے۔ ''شہباز! میرے کمرے میں آؤ۔''

میں چپ چاپ ان کے پیچھے چل پڑا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ میری طرف مڑے اور تلخ لہجے میں بولے۔ ''شہباز! مجھے معلوم نہیں تھا، میرا خون اس حد تک گر سکتا ہے؟''

''بابا! میں نے کیا، کیا ہے؟'' میں حیران رہ گیا تھا۔

''تم نے...... تم نے اس معصوم بچی کی نظروں میں مجھے بھی شرمندہ کر دیا ہے جسے میں پناہ دے کر اس گھر میں لایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس گھر میں اتنی محفوظ ہوگی جتنی ایک بیٹی باپ کے گھر میں ہوتی ہے مگر تم نے میرے اعتماد کا خون کر دیا۔''

مجھے احساس ہونے لگا کہ بابا کو میری اور سویرا کی گفتگو سن کر کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ''بابا! میری بات سنیں۔''

''برخوردار! اب مجھے صرف اتنا کہنا ہے...... آئندہ میں تمہیں سویرا سے بات کرتے یا اس کے آس پاس بھی نہ دیکھوں۔'' بابا کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''بابا! آپ غلط سوچ رہے ہیں۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''سویرا بہت پیاری اور لحاظ کرنے والی بچی ہے۔ وہ تم سے اس انداز میں بات کر ہی نہیں سکتی ہے، تم تک تم اسے اس حد تک تنگ نہ کر دو۔ شہر میں رہ کر تمہارے خیالات بھی آوارہ ہو گئے ہیں۔''

''بابا! آپ...... آپ میرے بارے میں اتنا غلط سوچ سکتے ہیں......'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''آپ نے سنا اس کی بنیاد پر فیصلہ کر لیا۔''

''اب تم جا سکتے ہو۔'' بابا نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ دوسری طرف مڑ گئے تھے۔ میں اشتعال

میں ان کے کمرے سے نکلا تھا۔ بابا سمجھ رہے تھے کہ میں سویرا کو تنگ کر رہا تھا، یہ سمجھ کر کہ وہ ہمارے گھر میں بے بس اور مجبور ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط تھا۔ سویرا کے بارے میں میرے ذہن میں کبھی کوئی غلط خیال نہیں آیا تھا۔ چند الفاظ سن کر بابا نے میرے کردار پر شک کی حتمی مہر لگا دی تھی۔ میں کھولتے ذہن کے ساتھ کمرے میں آیا لیکن بے چینی ایسی تھی مجھ سے کمرے میں نہ رہا گیا اور میں باہر صحن میں نکل آیا جہاں بارش برس رہی تھی۔ سرد پانی جسم پر گرا تو مجھے سکون محسوس ہوا تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک پانی میں بھیگتا رہا۔ پھر اندر آ کر بستر پر بے سدھ گر گیا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ ذہن پر غبار سا طاری تھا۔ اس غبار کے پار کبھی تاریکی چھا جاتی اور کبھی روشنی ہو جاتی تھی، ماں جی اور صغراں آپا کی آواز آتی۔ کبھی کبھی سویرا کی آواز بھی آتی تھی۔ زیادہ تر اجنبی آوازیں آتی تھیں پھر میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اسپتال میں پایا تھا۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر ماں جی اور صغراں آپا خوشی سے پاگل ہو گئی تھیں، میں چار دن سے بخار اور بے ہوشی کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ دوسرے دن مجھے اسپتال لایا گیا تھا اور ساری حویلی مع بابا کے اسپتال میں موجود تھی۔ شاہد بھائی کورس کے سلسلے میں انگلینڈ گئے تھے مگر شجاع بھائی کراچی سے آئے تھے۔ مجھے ہوش اور خطرے سے باہر دیکھ کر انہوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

ایک ہفتے بعد میں اسپتال سے واپس حویلی آیا تھا۔ سویرا میرے ہوش میں آتے ہی واپس چلی گئی تھی۔ جب میں آیا تب بھی میرے سامنے آنے سے کتراتی رہی تھی۔ بابا کے حکم کے بارے میں، میں نے یا سویرا نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ ماں جی اور آپا کسی قدر حیران تھیں کہ سویرا میرے کمرے کی طرف کیوں نہیں آتی ہے۔ آپا نے پوچھ لیا۔ ''سویرا کو تم نے کچھ کہا ہے......؟ وہ تمہارے پاس آتی ہے نہ بات کرتی ہے؟''

''نہیں تو۔'' میں نے انکار کیا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''اچھا!'' آپا معنی خیز انداز میں بولیں۔ ''یہ بتاؤ سویرا کیسی لگتی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بوکھلا کر جواب دیا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ سویرا نے اب تک مجھے معاف نہیں کیا ہے۔ اس سے معافی مانگنے کے چکر میں، میں بابا کی نظروں میں برا بن گیا تھا۔ وہ میرے پاس بھی نہیں آ رہی تھی کہ میں اس سے معافی مانگ سکتا اور اس کے پاس جانے پر بابا نے پابندی لگا دی تھی۔ اسپتال سے آ کر بھی مجھے ہفتہ بھر تک آرام کرنا پڑا تھا۔ تب کہیں جا کر میری کمزوری دور ہوئی تھی۔ صحت بحال ہونے کے بعد میں زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنے لگا تھا۔ گرمی کے دن تھے اس لئے نہر کے کنارے چلا جاتا۔ وہاں بیٹھ کر کتاب پڑھتا یا تیراکی کیا کرتا تھا۔

اس روز میں صبح ناشتا کر کے جانے لگا تھا کہ ماں جی نے کہا۔ ''شوبی! پتر......سویرا کو کالج چھوڑ آ...... تانگے والا نہیں آیا ہے، اس کا ضروری پرچہ ہے۔'' ماں جی غالباً ٹیسٹ کا کہہ رہی تھیں۔

''ماں جی......میں......'' میں جھجک گیا تھا۔

''ہاں......تو......اور کون لے کر جائے گا۔ موٹر سائیکل پر چھوڑ آ۔''

شجاع بھائی نے کار لے لی تھی اور اپنی موٹر سائیکل حویلی میں چھوڑ گئے تھے، وہی کام آتی تھی۔ ''مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔'' میں نے بہانہ کیا۔

''فضول میں جا کر پھرے گا۔'' ماں جی نے ڈانٹا۔ ''جا کر اسے چھوڑ کر آ۔''

مجبوراً میں نے موٹر سائیکل نکال کر صاف کی اور سویرا کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کچھ دیر بعد چادر میں لپٹی اور گھبرائی ہوئی آئی تھی۔ "وہ...... مجھے...... ماں جی نے بھیجا ہے۔" اس نے اٹک اٹک کہا۔

"مجھے معلوم ہے، تمہیں میرے ساتھ جانا اچھا نہیں لگ رہا...... لیکن مجبوری ہے، آؤ۔" میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور وہ خاموشی سے پیچھے بیٹھ گئی۔ میں نے بائیک حویلی سے نکالی۔ مختصر راستہ خراب تھا اس لئے میں نے سڑک کا رخ کیا۔ یہ راستہ ذرا طویل تھا لیکن صاف ستھرا تھا۔ پون گھنٹے بعد میں نے سویرا کو کالج کے سامنے اتارا۔ "واپس کیسے آؤ گی؟"

"پتا نہیں...... ویسے ٹیسٹ صرف ایک گھنٹے کا ہے، گیارہ بجے ختم ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کالج کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔" میں نے کہا۔

گرلز کالج کے سامنے رکنا مناسب نہیں لگا تھا۔ میں ایک جاننے والے کے پاس چلا گیا وہ گاؤں کا رہنے والا تھا اور سرگودھا کے بازار میں اس کی دُکان تھی۔ ایک گھنٹا اس کے ساتھ گپ شپ میں گزار کر میں واپس کالج آیا۔ گیارہ بجے سویرا اندر سے نکلی تھی۔ اسے لے کر واپس جانے کے بجائے میں نے ایک ہوٹل کا رخ کیا۔ جہاں پر فیملی کیبن بھی تھے۔ سویرا گھبرا گئی۔ "یہ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"فکر مت کرو...... تم سے صرف چند باتیں کرنی ہیں۔ اس کے بعد بحفاظت حویلی پہنچا دوں گا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کے ساتھ میں ہر جگہ محفوظ ہوں۔"

فیملی کیبن میں آ کر وہ ذرا گھبرائی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے چائے منگوائی۔ "آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

"پلیز شہباز جو کہنا ہے جلدی کہیں، مجھے اس جگہ سے وحشت ہو رہی ہے۔"

"سویرا! کیا تم نے مجھے اب تک معاف نہیں کیا؟"

"میں...... نے...... میں تو خود شرمندہ ہوں...... اس رات آپ کے ساتھ......"

"تم نے سن لیا تھا۔"

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں، جب بابا آپ کو اپنے کمرے میں لے گئے تب میں بھی پیچھے آئی تھی۔ مجھے بے حد افسوس ہے، میں آپ سے شرمندہ ہوں۔"

"تمہاری شرمندگی میرے کس کام کی۔ بابا کی نظروں میں میرا امیج بگڑ چکا ہے۔ بلکہ اس میں تمہارا بھی کیا قصور ہے۔ یہ امیج تو ہمیشہ کا بگڑا ہوا تھا۔"

"ایسا نہیں ہے، بابا اب بھی آپ سے محبت کرتے ہیں۔ جب میں نے آپ کے پاؤں کی چوٹ کا بتایا تو ان کی بے قراری دیکھنے والی تھی۔"

میں چپ رہا، بیرا چائے لے آیا تھا۔ اس نے چائے بنا کر ہمارے سامنے رکھی۔ اس کے جانے کے بعد بھی خاموشی رہی۔ ہم چائے پیتے رہے۔ آخر میں نے ہمت کر کے وہ سوال کر دیا جو اس رات سے میرے ذہن میں تھا، جب سویرا نے معنی خیز انداز میں مجھ سے بات کی تھی۔ "سویرا، میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟"

اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی تھی۔ "آپ...... آپ اچھے ہیں۔"

"میں اچھا ہوں یا نہیں...... مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟"

اس کے چہرے کی سرخی بڑھ گئی تھی۔ ''اچھے لگتے ہیں۔'' اس نے سر جھکا لیا اور پھر آہستہ سے بولی۔ ''میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟''

''سویرا...... میں نے آج تک تمہارے بارے میں نہیں سوچا تھا، کم سے کم از انداز سے نہیں سوچا تھا۔''

''کس انداز میں؟'' اس کے انداز میں سوال تھا۔

''سویرا! اگر میں کہوں کہ تم ہمیشہ کے لئے حویلی میں رہ جاؤ؟''

''تو...... تو میں رہ جاؤں گی۔'' اس نے اٹک اٹک کر کہا تھا۔

☆=====☆======☆

اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ مارا، میں چونکا۔ یہ جونی تھا، اس نے مخصوص انداز میں دانت نکالے، میں سمجھ گیا اسے بھوک لگی تھی۔ وہ سارا دن غائب رہا تھا۔ شاید سفیر اور مونا کی وجہ سے پاس نہیں آیا تھا۔

''چلو برخوردار! تمہاری پیٹ پوجا بھی کرا دوں۔''

میں نے اندر آ کر اسے سیب اور چاول کھانے کو دیئے۔ اس نے کھانا شروع کیا اور میں اخبار دیکھنے لگا جو سفیر لایا تھا۔ یہ ایک اخبار نہیں تھا بلکہ سفیر گزشتہ تین دن کے وہ سارے اخبار لے آیا تھا جس میں میرے بارے میں کوئی خبر تھی۔ میں ان نشان زدہ خبروں کو دیکھنے لگا۔ اس سے جو تصویر سامنے آئی وہ خاصی پریشان کن تھی۔ پولیس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ مجھے پوری طرح مجرم سمجھ لیا گیا تھا اور میری تلاش میں پولیس پوری طرح سرگرداں تھی۔ مزے کی بات ہے کہ اس سارے معاملے میں مرشد علی عباسی کے خاندان کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ جو اس سارے فساد کی جڑ تھا۔ مری کے راستے میں جیپ حادثے کا شکار ہونے والے شخص کا نام بھی ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ پولیس کے رویے سے صاف ظاہر تھا، وہ مجھے بچانے کی جتنی کوشش کر رہی تھی، اس سے زیادہ کوشش وہ مرشد علی عباسی کے خاندان کو بچانے کے لئے کر رہی تھی۔

اخبارات ایک طرف رکھ کر میں نے مایوسی کے عالم میں اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا لیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ان لوگوں کے بچھائے ہوئے جال سے نہیں بچ سکوں گا، وہ کامیابی سے میرے خلاف ایک کے بعد ایک کیس بنا رہے تھے، مجموعی طور پر مجھ پر چھ مقدمات تھے۔ ان میں قتل، اقدام قتل، مار پیٹ، پولیس پارٹی پر حملہ اور حراست سے فرار کے الزامات تھے۔

جونی کھاپی میز کے پاس فرش پر بیٹھا کسی غور و فکر میں مصروف تھا۔ باہر ایک بار پھر بونداباندی شروع ہو گئی تھی لہٰذا میں نے اسے باہر نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے بھی گزشتہ رات وہ کاٹیج میں نہایت تمیز سے رہا تھا۔ اس نے نہ تو کوئی شے چھیڑی تھی اور نہ ہی گندگی پھیلائی تھی۔ وہ تربیت یافتہ اور سدھایا ہوا لگتا تھا۔ نہ جانے اس کا مالک کون تھا، اور یہ یوں بے یار و مددگار پھر رہا تھا۔ ''برخوردار! تمہارا مالک کہاں ہے؟''

اس نے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا پھر اٹھ کر کیتلی سونگھنے لگا۔ اسے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کافی کا پانی رکھا۔ سورج ڈوبتے ہی سردی کی شدت میں اضافہ ہوا تھا اور میں بھی کافی کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ کافی بنا کر اسے دی اور خود مگ لے کر نشست گاہ میں آ گیا۔ ایک بار پھر اخبارات کو کھنگالا۔ مجھے اپنی جیپ سے ٹکرا کر مرنے والے سجاد مہر کے بارے میں جاننا تھا۔ خاصی جستجو کے بعد اندر کے صفحے پر اس کے بارے میں

خبر ملی اور یہ بھی بے کار ثابت ہوئی۔ پولیس تفتیش کے باوجود اس کو شناخت نہیں کر سکی تھی۔ حالانکہ حادثے کے اگلے روز اس کی تصاویر اخبارات میں دی گئی تھیں، میں سوچنے لگا کہ کسی طریقے سے اس کا پرس پولیس تک پہنچا دیا جائے تا کہ اس کی لاش وارثوں کو دے دی جائے۔ میں نے اپنی جیب سے اس کا پرس نکالا۔ بندر نشست گاہ کے دروازے کے پاس قالین پر بیٹھا تھا۔ جیسے ہی میں نے پرس نکالا، وہ چونکا اور چھلانگ لگا کر میری طرف جھپٹا۔ میں بوکھلا کر صوفے پر کھسکا۔ وہ میرے ہاتھ سے پرس لینے کی فکر میں تھا۔ وہ دانت نکال کر خوخیا رہا تھا اور اس کی ساری متانت رخصت ہو چکی تھی۔ میں نے پرس پیچھے کیا اور اسے چمکارنے لگا۔ ''برخوردار! بیٹے، آرام سے...... کیا ہو گیا ہے، ارے......''

اس نے میرے ہاتھ پر کاٹنے کی کوشش کی تو میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا تھا۔ وہ صوفے سے چھلانگ لگا کر سینٹر ٹیبل پر تاک لگانے والے انداز میں بیٹھ گیا۔ میں نے پرس جیب میں ڈالا تو وہ بھی پُرسکون ہو گیا تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا اور تجربے کے طور پر پرس باہر نکالا تھا کہ وہ پھر چوکنا ہو گیا۔ دانت نکال کر مجھے بھبکی بھی دی تھی۔ میں نے پرس جیب میں رکھا اور پھر اندر جا کر الماری میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔ یہ سوال رہ رہ کر میرے ذہن میں اٹھ رہا تھا کہ بندر پرس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا تھا؟ کیا سجاد سے اس کا کوئی تعلق تھا اور بندر اس کے پرس کو پہچانتا تھا۔ بندر اب اونگھ رہا تھا اور سونے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے طرزِ عمل نے مجھے مشکوک کر دیا تھا۔ پرس کی خاطر وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ رات کو بھی کوئی کارروائی کر سکتا تھا۔ میں نے اچانک اسے پٹے میں ہاتھ ڈال کر اٹھا لیا اور اس کے چیخنے چلانے کی پروا کئے بغیر اسے کیبن سے نکال کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ برآمدہ بارش سے محفوظ تھا اور سردی سے بچنے کے لئے اس کے جسم پر بالوں بھری کھال موجود تھی۔

اندر آ کر میں نے آتش دان میں لکڑیاں جلائیں اور لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ حالاتِ حاضرہ اور مستقبل کے بارے میں غور کرتے کرتے مجھے نیند آ گئی تھی۔ رات کسی پہر میری آنکھ کھلی۔ میں سوچنے لگا کہ آنکھ کیوں کھلی تھی۔ شاید میں نے سوتے میں کوئی آواز سنی تھی۔ میں نے اٹھ کر نشست گاہ میں دیکھا۔ اس کی کھڑکی پر پردے پڑے تھے۔ سامنے والی کھڑکی کا پردہ ذرا سرکا ہوا تھا اور باہر تاریک خلا اس سے جھانک رہا تھا۔ اچانک ہلکی سی روشنی اس خلا میں لہرائی۔ یہ بجلی کی چمک نہیں تھی۔ میں تیزی سے کھڑکی تک آیا اور پردہ سرکا کر باہر جھانکا۔ نشست گاہ میں تاریکی تھی۔ صرف بیڈ روم کے لیمپ کی ہلکی سی روشنی آ رہی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ یہ روشنی باہر تک جا سکے گی۔ کیبن کے سامنے تاریکی تھی۔ بارش رک گئی تھی لیکن بادل بدستور چھائے ہوئے تھے۔ تاریکی میں کہیں کوئی روشنی نہیں تھی مگر لہرانے والی روشنی میرا واہمہ نہیں تھی۔

میں تاریکی میں گھورتا رہا۔ اچانک سامنے والی جھاڑیوں سے روشنی لہرائی۔ کسی کے پاس ٹارچ تھی، وہ اسے بار بار لہرا رہا تھا۔ ہوا میں دائرے بنا رہا تھا۔ جب ٹارچ کا رخ سامنے کی طرف ہوتا تو اس کی روشنی کیبن تک آتی تھی۔ معاً میں نے بندر کو بھاگ کر جھاڑیوں کی طرف جاتے دیکھا۔ تیز رفتاری کے لئے وہ چاروں ہاتھوں پیر استعمال کر رہا تھا۔ وہ جھاڑیوں میں ٹارچ لہرانے والے کے پاس جا پہنچا۔ میں نے اچھل کر اسے ٹارچ والے سے لپٹتے دیکھا۔ اس کا انداز دوستانہ تھا۔ کچھ دیر بعد ٹارچ والے نے اسے نیچے اتار دیا۔ بندر سر ہلا ہلا کر کیبن کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا، وہ نہ صرف ٹارچ والے سے واقف تھا بلکہ اس

سے محبت کرتا تھا۔ اس کے چمٹنے کے انداز سے یہی ظاہر تھا پھر ٹارچ والا کیبن کی طرف آنے لگا۔ میں کھڑکی سے ہٹا اور جلدی سے اندر جا کر ریوالور اور بڑی ٹارچ نکالی اور دوبارہ کھڑکی کی طرف آیا۔ ٹارچ والا کیبن کے سامنے تھا اور اس بار اس نے ٹارچ بجھا دی تھی۔ بندر اس کے برابر میں کھڑا تھا۔ میں نے پردہ سرکاتے ہوئے ٹارچ اس کی طرف کر کے روشن کر دی اور چند لمحے کے لئے بوکھلا گیا۔ میرے سامنے وہ شخص کھڑا تھا جو میری جیپ سے ٹکرا کر مر گیا تھا اور اس کی لاش اس وقت سرد خانے میں پڑی تھی۔ ویسا ہی سیاہ میلا کچیلا لباس، بڑھے ہوئے بال اور داڑھی، چہرے سے وہی وحشت برس رہی تھی۔ اس کے نقوش بھی ویسے ہی تھے۔ روشنی پڑنے کے بعد چند لمحے تک وہ ساکت کھڑا رہا تھا۔ پھر اس نے چھلانگ لگائی اور جھاڑیوں کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ بندر اس کے پیچھے تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ میں اب تک ہکا بکا تھا۔ کیا وہ واقعی وہی شخص تھا؟ میں نے خود سے پوچھا اور پھر جھینپ گیا۔ سوال احمقانہ تھا، بھلا کوئی مر کر واپس آتا ہے۔ یہ اسی حلئے کا شخص تھا اس لئے مجھے اس پر دھوکا ہوا تھا۔

خاصی دیر تک مجھے باہر وہ شخص یا بندر دوبارہ نظر نہیں آئے اس لئے میں کھڑکی سے ہٹ کر بیڈ روم میں آ گیا۔ معاملہ پُر اسرار سا تھا۔ آخر یہ شخص کون تھا اور یہاں کیوں آیا تھا؟ بندر اس کا تھا تو اس نے اسے واپس لینے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ رات کے اس پہر پُر اسرار انداز میں بندر سے ملنے کیوں آیا تھا؟ کیا بندر کو کسی خاص مقصد کے لئے میرے پاس بھیجا گیا تھا؟ ان ہی سوالات میں گھرا نہ جانے میں کب سو گیا۔ مجھے خطرے کا احساس تھا مگر ساتھ ہی یہ اطمینان بھی تھا کہ فقیرانہ حلئے والے اس شخص کا پولیس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ورنہ اب تک میں حوالات میں ہوتا۔

اگلی صبح تیز بارش جاری تھی اور بندر بدستور غائب تھا۔ شاید بھانڈا پھوٹنے پر وہ شخص اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ناشتا کر کے میں نے برساتی اور ربر کے لانگ شوز پہنے اور کاٹیج سے باہر آ گیا۔ ریوالور میں نے ساتھ رکھا تھا۔ بارش کے ساتھ ہوا کے یخ بستہ جھونکے بھی آ رہے تھے لیکن میں برساتی میں محفوظ تھا۔ کاٹیج کے سامنے والی جھاڑیوں سے میں نے آغاز کیا۔ سڑک تک جا کر میں واپس آیا پھر میں نے اوپری حصے کا رخ کیا۔ اگرچہ اتنی بارش اور ٹھنڈ میں کوئی باہر رات نہیں گزار سکتا تھا پھر بھی میں نے چیک کر لینا مناسب سمجھا۔ اوپری درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس پہنچ کر میں ٹھٹک گیا۔ درختوں کے درمیان زمین پر آگ جلانے کے نشانات تھے اور وہاں پر کھانے پینے کی بچی کھچی اشیاء بھی پڑی تھیں۔ میں نے ڈبل روٹی کا پیس اٹھایا جو دو دن سے زیادہ پرانا نہیں تھا۔ دو دن پہلے یہاں پر کوئی تھا، ممکن ہے اس کے بعد بھی رہا ہو۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ کوئی میرے پیچھے تھا۔ میری نگرانی کر رہا تھا۔ لیکن کیوں......؟ میں سوچتا ہوا کاٹیج تک آیا اور اس کا دروازہ کھلا دیکھ کر چونک گیا تھا۔

☆======☆======☆

ہر انسان کی زندگی میں ایک بار ایسی تبدیلی ضرور آتی ہے جب یہ دنیا اسے پہلے سے زیادہ اچھی اور خوبصورت لگنے لگتی ہے۔ میری زندگی میں یہ تبدیلی سویرا کی صورت میں آئی تھی۔ صبح جب میں اسے کالج لے کر گیا اور جب لے کر واپس آیا تو میرے اندر کی دنیا بدل چکی تھی۔ ماں جی ہمارے لئے فکر مند تھیں اور ہمیں ہنستے

مسکراتے دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ انہوں نے میری بلائیں لیں۔ ''آج میرا پتر کتنے دن بعد مسکرایا ہے!''

سویرا شرما گئی۔ بابا زمین پر گئے تھے۔ بارشوں نے فصل کو کتنا نقصان پہنچایا تھا، آج کل وہ اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ اکثر صبح جاتے تو سورج ڈھلنے کے بعد گھر آتے تھے۔ اس لئے مجھے سویرا سے بات کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ اگر چہ وہ جھجکتی تھی لیکن میرے بلاوے پر انکار نہیں کرتی تھی۔ ماں جی اور آپا جس لڑکی کو شاہد بھائی کے لئے دیکھنے گئی تھیں، وہ لڑکی انہیں پسند نہیں آئی تھی۔ معاملہ لڑکی کے گھر والوں کی شرائط نے خراب کیا تھا۔ شادی کی بات ہونے سے پہلے انہوں نے شرائط لگانا شروع کر دی تھیں۔ شاہد بھائی نے سن کر ہی انکار کا فون کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ رشتے کبھی شرط کے ساتھ نہیں کیے جاتے ہیں۔ ان ہی دنوں میرا رزلٹ آیا تھا۔ میں نے فرسٹ ڈویژن لی تھی۔ سب بے حد خوش تھے۔ سویرا نے مجھے اپنے ہاتھ سے بنا سویٹر تحفے میں دیا اور جب میں ماسٹرز میں داخلے کے لئے حویلی سے جانے لگا تو مجھے آنسوؤں کا تحفہ دیا تھا اور یہ تحفہ ہمیشہ میرے پاس رہا تھا۔ اس کے دو مہینے بعد ہاسٹل میں مجھے اطلاع ملی۔ سویرا کی شادی شاہد بھائی سے طے کر دی گئی ہے اور میں دوبارہ حویلی کی طرف نہیں گیا۔

☆======☆======☆

ندیم شام کے وقت آیا تھا اور اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ حالات اچھے نہیں ہیں۔ اس نے پہلی خبر یہ سنائی۔ ''ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست مسترد ہو گئی ہے۔''

''پھر......؟'' میں نے پوچھا۔

''اب تجھے گرفتاری دینا ہو گی۔'' اس نے قانونی پہلو بتایا۔

''مجھے ہڈیاں تڑوانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

''تب جب تک مقدمات کا فیصلہ نہیں ہو جاتا تُو مفرور رہ سکتا ہے...... لیکن پولیس کیس پیش ہی نہیں کرے گی جب تک تُو ان کے ہاتھ نہیں آ جاتا۔''

''مقدمہ تم کرو گے، آخر وکیل کس لئے ہو؟''

''وہ تو میں کروں گا لیکن بھیا، معاملہ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ وفاقی اور صوبائی سطح پر بادشاہ گر قوتوں کو ضمنی اور پھر مقامی حکومت کے انتخاب میں عباسی خاندان کی ضرورت ہے اور سمجھو انتظامیہ اس وقت ان کے اشارے پر ناچ رہی ہے۔''

''تصفیہ نہیں ہو سکتا ہے۔''

''میرا ایک جاننے والا صحافی ہے...... لیکن وہ پہلے ہی مرشد علی عباسی کے خلاف لکھ چکا ہے۔ اگر اس کی طرف سے یہ اسٹوری آئی تو اسے ڈس انفارمیشن قرار دیا جائے گا۔''

''وہ کسی اور نام سے چلا دے۔''

''معاملہ اتنا ہلکا نہیں ہے۔ مرشد علی کے خلاف جعلی نام سے رپورٹ نہیں بنائی جا سکتی ہے۔ وہ اصل بندے کا پتا چلا لے گا۔''

''ایسا کر، اسے کہہ کر رپورٹ بنوا دے...... لیکن نام نہ دے۔ بس اشارہ دے اور میرا کیس پیش کر دے۔''

''ہاں، یہ ہوسکتا ہے۔'' ندیم نے سر ہلایا۔

میں نے اسے رات والے واقعے کے بارے میں بتایا تو وہ فکرمند ہو گیا۔ ''مرنے والے کی تدفین آج تھی، قبر دیکھنے کے لئے میں خود گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی مل گئی۔ رپورٹ تیرے خلاف بھی ہے اور حق میں بھی۔ موت کی وجہ سر پر لگنے والی چوٹ ہے اور باقی زخموں کے بارے میں لکھا ہے وہ اس کے مرنے کے بعد کے ہیں۔''

''اس صورت میں کیس کو سازش قرار دیا جا سکتا ہے۔'' میں نے جوش سے کہا۔

''یہ سارے نقطے میری نظر میں ہیں لیکن فی الحال مجھے تیری طرف سے درخواست عدالت میں لگانی ہے۔ جب سماعت ہو گی تو یہ ساری باتیں بھی سامنے آئیں گی۔ بہرحال پولیس کی کوشش ہے کسی طرح تجھے گرفتار کر کے مرشد علی کی نظروں سے سرخرو ہو جائے۔''

''بندر اور اس آدمی کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟''

''وہ آدمی شاید چور تھا اور بندر کی مدد سے چوریاں کرتا ہے۔ اس کے بارے میں اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی خطرہ ہوتا تو اب تک سامنے آ چکا ہوتا۔ یہ بتا کہ تجھے کس شے کی ضرورت ہے، میں کل صبح آؤں گا۔''

''تازہ اخبار لے آنا اور کوشش کر رپورٹر والا کام جلد از جلد کروا اور ہاں، ایک منٹ رکنا...... میں تجھے کچھ چیک سائن کر کے دے رہا ہوں۔ بوقتِ ضرورت طاہر کو رقم لکھ کر دے دینا۔ ویسے تو وہ بھی ایماندار آدمی ہے لیکن ذمے داری لینے سے گھبراتا ہے۔''

''لاؤ دو۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

میں نے اپنی چیک بک سے چیک سائن کر کے اسے دیئے۔ ''بلاضرورت باہر مت نکلنا...... بلکہ کوشش کرو۔ کسی کو احساس نہ ہو کہ اس کیبن میں کوئی رہتا ہے۔''

''یہاں رہتا ہی کون ہے؟''

''ایسا مت سمجھ ادھر چرواہے آتے ہیں۔ اوپر پہاڑ پر لکڑیاں کاٹ کر بیچنے والے آتے ہیں۔ یہ کیبن کئی افراد کی نظر میں رہتا ہے۔ چوکیدار بھی آتا ہے۔''

''مجھے تو اب تک نہیں ملا۔''

''جب بھی ملے، اسے بتا دینا میں نے اسے فارغ کر دیا ہے۔ مجھے ایسا چوکیدار نہیں چاہئے جو گھر بیٹھ کر چوکیداری کرے۔''

''یہاں سب ایسے ہی ملیں گے۔'' میں ہنسا۔ ''جسے رکھے گا وہ گھر بیٹھ کر یہ کام کرے گا۔''

''میں سوچ رہا ہوں تیرا کیس عدالت میں پیش ہی نہ کروں۔ تو یہاں رہے گا، مجھے مفت کا چوکیدار مل جائے گا۔''

''پھر روز کون آئے گا۔ جب پکنک منانے آئیں گے تو تجھے بھی راشن پانی ڈال دیا کریں گے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''اب میں چلتا ہوں تیری بھابی نے مٹن کڑاہی بنائی ہے۔''

''مزے ہیں تیرے!'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''ایک ہم ہیں، پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔''

''فکر نہ کر...... اس چکر سے نکل کر پھر تیرا کہیں نہ کہیں چکر چلا دیں گے۔'' وہ بولا۔ ''ارے ہاں، یاد آیا...... وہ تصویر تو دکھا اور مرنے والے کا بٹوا بھی مجھے دے دے۔ میں کسی طریقے سے پولیس تک پہنچا دوں گا۔''

میں نے اسے تصویر اور بٹوا دیا۔ ''رقم مرنے والے کے نام ایصالِ ثواب کر دینا ورنہ جس کو دے گا وہ رقم کی وجہ سے بٹوا بھی غائب کر دے گا اور بے چارے کی لاش کبھی ورثا تک نہیں پہنچے گی۔''

ندیم نے پلاسٹک سے تصویر نکالی اور بے توجہی سے اسے دیکھا، اسے آرٹ کے بارے میں صرف اتنا پتا تھا کہ اسے اردو میں فنونِ لطیفہ بھی کہتے ہیں۔ ''اس سے اچھی تصویر آج کل میرا بیٹا بنا لیتا ہے۔ اسے بھی لے جا رہا ہوں، فرصت سے دیکھوں گا۔''

''اگر میں کہوں کہ اس تصویر کی وجہ سے کم سے کم چار افراد مارے گئے اور ایک برطانوی گورا آج تک پاکستان کے شمالی علاقے میں لاپتا ہے۔''

''اس تصویر کی خاطر......؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''اس میں ایسی کیا خاص بات ہے، کیا یہ قیمتی تصویر ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا پھر اسے راجا عمر دراز اس کے علاقے میں آٹھ برس بیشتر پیش آنے والے واقعات کے بارے میں مختصراً بتایا۔ ''میں حیران ہوں راجا کے محل سے یہ تصویر نکلی کیسے؟''

ندیم کو راجا اور اس کی تصویر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ''اچھا میں چلتا ہوں، دیر ہو رہی ہے۔''

میں اسے چھوڑنے باہر تک آیا تھا۔ ''ندیم! تصویر حفاظت سے رکھنا۔ اس چکر سے نکل جاؤں تو راجا تک اسے پہنچانے کی کوشش کروں گا۔''

''فکر نہ کر۔'' وہ بولا اور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ اپنی بے داغ کار وہ نیچے چھوڑ کر آتا تھا۔ کیونکہ اوپر آتے ہوئے اس پر خراشیں آ سکتی تھیں۔ اس کی خاطر وہ پیدل اوپر آنا گوارہ کرتا کر لیتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں واپس کاٹیج میں آیا اور شام کے کھانے کی تیاری کرنے لگا۔ سارا دن کچھ نہیں کھایا تھا اس لئے اب بھوک لگ رہی تھی۔ اکیلے ہونے کے باوجود مجھے کھانا بنانے میں خاص مہارت نہیں تھی اس لئے کبھی مجبوری میں خود بنانا تھا تو جیسے تیسے کھانا پڑتا تھا۔ جو ڈشیں مجھے بنانا آتی تھیں ان کا سامان نہیں تھا لہٰذا میں نے پکایا ہوا زہر مار کیا اور کافی بنا کر بیڈ روم میں آ گیا۔ آج سردی نہیں تھی اس لئے آتش دان جلانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ میں نے کمبل لیا اور لیمپ سرہانے رکھ کر ایک میگزین کا مطالعہ کرنے لگا۔ ایک گھنٹے بعد ہلکی سی غنودگی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں سونے سے پہلے واش روم گیا تھا۔ یہ کاٹیج کے عقبی حصے میں تھا۔ میں باہر آ رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے باتھ روم کے باہر کوئی ہلکی آواز میں بول رہا ہے۔ اس کا روشن دان ذرا سا کھلا تھا۔ میں قریب گیا تو پھر سرگوشی جیسی آواز آئی۔ باہر کوئی تھا، الفاظ میری سمجھ سے باہر تھے مگر آواز کسی انسان کی تھی۔ میں چوکنا ہو گیا، جلدی سے

...بیڈروم سے باہر کے والے دروازے پر کن سن لیتا رہا پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا مگر عقبی سمت میں کوئی نہیں تھا۔ مگر میں نے خود آواز سنی تھی۔ میں دبے قدموں چلتا دائیں طرف والی دیوار تک آیا اور پھر سامنے آ گیا، اس طرف بھی کوئی نہیں تھا۔ میں پھر دبے قدموں سامنے والے حصے تک آیا، میدان چاند کی روشنی میں دور تک صاف تھا۔ میں بار بار پلٹ کر بھی دیکھ رہا تھا کہ کوئی عقب سے نہ آ جائے۔ اب صرف کیبن کا بایاں حصہ بچتا تھا۔ میں نے وہاں بھی دیکھ لیا اور گھوم کر دوبارہ کیبن کے عقبی حصے میں آ گیا۔ کیا میں نے جو آواز سنی تھی، وہ کان کا وہم تھا۔ پہاڑی علاقے میں جب ہوا چلتی ہے تو عجیب عجیب آوازیں نکالتی ہے جن پر بعض اوقات انسانی آوازوں کا شبہ ہوتا ہے۔ میں مطمئن ہو کر اندر آیا اور جیسے ہی دروازے سے اندر قدم رکھا، کوئی سخت شے سر سے ٹکرائی۔ میں چکرا گیا۔ ٹارچ میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ میرا سر چکرا گیا تھا اور میں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ حملہ کرنے والا بے حد چالاک تھا، اس نے باہر سے آوازیں نکالیں اور جب میں باہر آیا تو وہ چکر کاٹ کر میری عدم موجودگی میں اندر آ کر میرا انتظار کرنے لگا تھا۔ کیبن سے باہر مجھ پر حملہ کر کے قابو پانا محال تھا۔ میں مسلح تھا اور چوکنا بھی۔ البتہ جب کیبن میں آیا تو اتنا چوکس نہیں رہا تھا اور اس نے اسی سے بھرپور فائدہ اٹھا کر مجھے ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دھندلائی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ریوالور والا ہاتھ اس کی طرف بلند کرنا چاہا۔ وہ اب تک آرام سے کھڑا میرا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے ریوالور اوپر کرنے کی کوشش کرتے دیکھ کر اس کا ہاتھ ایک بار پھر حرکت میں آیا اور اس دوسری ضرب نے مجھے بے ہوش کر دیا۔

☆======☆======☆

مجھے کئی بار بے ہوش ہونے کا اتفاق ہو چکا تھا اور ہر بار میں نے ہوش میں آنے کے بعد الگ کیفیت محسوس کی تھی۔ شعور جاگنے پر مجھے لگا جیسے میں کسی کنکریٹ مکسر میں ہوں اور اسے چلا دیا گیا ہو۔ چکر اور گھماؤ کی کیفیت اتنی شدید تھی کہ سوچ بھی ایک جگہ قائم نہیں تھی۔ الفاظ واشنگ مشین میں کپڑوں کی طرح گڈمڈ ہو رہے تھے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو زمین آسمان بھی گھوم رہے تھے۔ چہرے سامنے آ کر ہٹ رہے تھے، بن اور بگڑ رہے تھے۔ یہی حالت ساعت کی تھی، کبھی الفاظ صاف آتے اور کبھی یوں شور ہونے لگتا جیسے ریڈیو میں نشریاتی لہروں میں خلل کی وجہ سے شور ہوتا ہے۔

''ضرب شدید...... دماغ متاثر ہوا...... کیفیت مستقل ہے...... موٹی سی گالی...... ضرب لگانے والے کی ماں، بہن کی شان میں گستاخی...... مزید گالیاں اور دھمکیاں۔''

مجھے لگ رہا تھا کہ زمین اور آسمان کے ساتھ میری کھوپڑی میں دماغ بھی گھوم رہا ہو۔ آوازیں آ رہی تھیں۔

''مستقل پاگل...... بہتر ہے...... سلا دیا...... انجکشن لاؤ۔''

میں نے اپنے بازو میں چبھن محسوس کی اور میں سو گیا تھا۔ اگلی بار آنکھ کھلی تو سب کچھ تھم چکا تھا۔ سکون اور سناٹا اتنا زیادہ تھا کہ غیر فطری محسوس ہو رہا تھا۔ جسم اور ذہن بھی حالت سکون میں تھا لیکن سر کا عقبی حصہ بوجھل تھا جہاں ضرب لگی تھی۔ وہاں وزن سا آ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ سے سر چھوا۔ سر پھٹا نہیں تھا لیکن اس جگہ ورم تھا۔ میں

نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں، اوپر سیاہ چھت تھی اور کمرے کی دیواریں بھی رنگ سے محروم تھیں۔ میں ایک کھاٹ نما بیڈ پر پڑا تھا جس کے عین اوپر ایک پیلا بلب روشن تھا۔ سیاہ در و دیوار کی وجہ سے اس کی روشنی یرقان زدہ لگ رہی تھی۔ پیاس سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے سر گھمانا چاہا تو مضروب حصے سے ٹیس سی اٹھی تھی۔ میں نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا کمرے کا فرش پکا تھا لیکن اس پر ابھی ٹائلیں لگانا باقی تھا۔ لگ رہا تھا جیسے میں کسی زیر تعمیر مکان میں ہوں۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے یاد آیا، میں کیبن میں تھا اور کسی نے دھوکے سے سر پر وار کر کے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ درمیان میں ہوش آ کر میں نے بے ہوش کرنے والے کے خاندان کی تاریخ مسخ ہوتے سنی تھی۔ ڈاکٹر اس وقت میرے بارے میں رائے دے رہا تھا۔ یہ میرا اندازہ تھا، بستر کے برابر میں پلاسٹک کی بوتل تھی اس میں کولڈ ڈرنک آتی ہے لیکن فی الحال اس میں پانی تھا۔ میں نے بے تابی سے بوتل سے پانی پیا۔ پانی خالی پیٹ میں جا کر لگا تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے کئی وقت سے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ میری بے ہوشی کو نہ جانے کتنی دیر گزری تھی۔ میرے ہاتھ سے گھڑی اتار لی گئی تھی اور اس بند کمرے میں اندازہ لگانا محال تھا کہ باہر دن ہے یا رات؟ البتہ ایک بات یقینی تھی کہ اب میں شہر میں یا کسی نیچے کے علاقے میں تھا کیونکہ بند کمرے میں خاصا حبس اور گرمی تھی۔ میں پسینے میں بھیگ رہا تھا۔

میں نے کمرے کا اکلوتا دروازہ بجایا۔ ''کوئی ہے...... مجھے یہاں کیوں قید کر رکھا ہے؟'' میں چلایا۔

کچھ دیر تک دروازہ بجانے کے باوجود کوئی جواب نہیں آیا تو میں واپس بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نہ جانے کس دشمن کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس قید میں ڈالنے والا کوئی دشمن ہی ہو سکتا تھا۔ میں پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا لیکن مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ میں اکرم چشتی کی کسی نجی عقوبت گاہ میں تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد میں نے پھر دروازہ بجایا۔ اس بار کسی نے باہر سے درشت لہجے میں کہا۔ ''شور مت کرو، آرام سے بیٹھو، ابھی تم سے پوچھتے ہیں۔''

''مجھے کیوں بند کیا ہے، میرا قصور کیا ہے؟''

''قصور بھی بتا دیں گے، اتنی جلدی کیا ہے؟''

''اچھا...... مجھے کھانے کے لئے کچھ دو۔''

''کھانے کو بھی یہاں بہت کچھ ملے گا۔'' آواز نے قہقہہ لگایا تھا۔ اس کے بعد اس کی آواز نہیں آئی۔ بھوک کی شدت سے میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے کم سے کم چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ سن والی کیفیت رفتہ رفتہ ختم ہو رہی تھی اور سر میں درد جاگ رہا تھا۔ شاید دی جانے والی دوا کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ بہر حال درد برداشت کی حد میں تھا۔ پانی پی کر میں لیٹ گیا۔ حبس اور گرمی رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔ یہ ہر طرف سے بند کمرا تھا جس میں ہوا کی آمد و رفت کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی، اندر کی ہوا بھاری اور گرم ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی نصف گھنٹے بعد دروازہ اچانک کھلا اور دو افراد اندر آئے۔ ڈیل ڈول، لباس اور اسلحے سے وہ کسی جاگیروار کے باڈی گارڈ لگ رہے تھے۔ بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخ آنکھیں کسی بھی عام آدمی کو دہلانے کے لئے کافی تھیں۔ میں نے خوش مزاجی سے کہا۔

''کیا حال ہے دوستو! اگر ڈاکا مارنے آئے ہو تو غلط جگہ آئے ہو۔ تم سے پہلے ہی کچھ لوگ میرا سب لوٹ چکے ہیں۔''

''بکواس مت کرو۔'' ایک کٹ کھنے کتے کی طرح غرایا۔ ''ہمارے ساتھ چلو۔''

''اگر تاوان کی غرض سے اغوا کرنا چاہتے ہو تو یہ بھی بے کار ہے، پیچھے ایسا کوئی نہیں ہے جو تاوان ادا کرے۔''

''اب بولے تو گولی ماردوں گا۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔

دوسرے نے درشت انداز میں میرا بازو تھام کر دروازے کی طرف دھکیلا۔ ''چلو، مرشد نے یاد کیا ہے۔ ان کے سامنے کوئی فالتو بات مت کرنا۔''

''ورنہ وہ مجھے جلا کر بھسم کردیں گے؟'' میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

کٹ کھنے نے مشتعل ہو کر مارنے کے لئے رائفل کا بٹ بلند کیا لیکن دوسرے نے اسے روک دیا۔ ''اسے مرشد نے بلایا ہے، وہی اسے سزا دے گا۔''

مرشد کے نام پر مجھے مرشد علی کا خیال آیا۔ کیا میں اس کے قبضے میں تھا؟ لیکن اسے میری قیام گاہ کا علم کیسے ہوا۔ مجھے ندیم پر شبہ ہوا۔ کسی نے اس کا تعاقب کیا اور کیبن تک آ گیا تھا۔ وہ دونوں مجھے اس زیر تعمیر عمارت کی راہ داریوں اور کمروں سے گزار کر ایک ایسے کمرے میں لائے جو خاصی حد تک مکمل تھا۔ حتیٰ کہ اس پر رنگ بھی کیا ہوا تھا۔ فرش پر ایک چھوٹا قالین تھا، جس پر شاہانہ طرز کی سنہری کرسی پر ایک سرخ و سفید اور پُر گوشت چہرے والا شخص بیٹھا تھا۔ میں نے مرشد علی کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ اخبار میں کئی بار اس کی تصاویر دیکھ چکا تھا۔ اس نے سنہری کام والا گاؤن پہن رکھا تھا اور اوپر سنہری کلاہ تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں سرمے سے بھری تھیں اور ان میں ہلالی ڈورے اس کے عقیدت مندوں کو مرعوب کرنے کے لئے کافی تھے۔ اس کے دائیں بائیں دو مسلح محافظ کھڑے تھے۔ ایک ملازم قسم کا شخص کونے میں سمٹا سہا کھڑا تھا۔

''شہباز احمد!...... خوش آمدید!'' مرشد علی نے مسکرا کر کہا۔

''یہ تم کہہ رہے ہو، میرا خیال......''

''ادب سے بات کر۔ میرے پیچھے کھڑے کٹ کھنے نے غرا کر کہا، اس پر مرشد علی نے اسے قہرناک نظروں سے دیکھا اور گرج کر بولا۔

''حرام زادے...... تیری جرأت کیسے ہوئی...... میرے سامنے بولنے کی۔''

کٹ کھنے کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ وہ ہکلانے اور بکری کی طرح منمنانے لگا۔ ''مرشد...... مم معافی......''

''غفورے، اس سے گن لے لو...... جسے ہمارے سامنے زبان پر اختیار نہ ہو، ہم اسے ہتھیار کیسے دے دیں، باہر جاؤ تمہارا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا، جاؤ یہاں سے۔''

کٹ کھنے کے ساتھی نے اس سے گن لے لی اور اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ میں نے مسکرا کر مرشد کی طرف دیکھا۔

''تم مجھے حیران کر رہے ہو۔ میرا خیال تھا کہ اب تک مجھے کسی اسپتال کے ہڈی وارڈ میں لٹکے ہونا چاہئے تمہارے بھائی نے یہی ارادہ کیا تھا ناں......؟''

''اس کی بات چھوڑو۔ وہ نوجوان ہے، اس کا خون گرم ہے۔ پھر اسے چوٹ بھی لگی تھی اس لئے غصے میں آ گیا۔''

''وہ تو غصے میں آیا تھا۔'' میرا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ ''لیکن پولیس مجھ پر کیوں چڑھ دوڑی...... اب تک مجھے کیوں تلاش کر رہی تھی۔ کیا نادر کے غصے کا جن پولیس پر بھی چڑھ گیا تھا جو اتنی سرگرمی سے مجھ پر مقدمے بنا رہی ہے؟''

''ان پر بھی بات ہو سکتی ہے، اور مقدمے ختم کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' مرشد علی کا لہجہ حیران کن حد تک مصالحانہ تھا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ کوئی چکر ہے۔ مرشد علی کی کوئی گوٹ پھنس گئی تھی اور وہ مجھ سے نرم رویہ اختیار کرنے پر مجبور تھا یا پھر وہ میرے ساتھ بلی کی طرح کھیل رہا تھا جو چوہے کے ساتھ کھیلتی ہے اور جب وہ خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ ایک جھٹکے سے اس کی گردن مروڑ دیتی ہے۔ اب میرے ساتھ نہ جانے کیا تھا۔ میں چپ رہا، مرشد علی کچھ دیر بعد بولا۔

''شہباز احمد ملک! میں ان تمام مقدمات کو ختم کرا سکتا ہوں۔ نادر کی طرف سے میں ضمانت دوں گا کہ وہ تمہیں یا تمہارے دوستوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

''اتنی مہربانی کس خوشی میں؟''

''میری نیت پر شک نہ کرو۔'' وہ بولا پھر اس نے بارعب آواز میں کہا۔ ''تخلیہ!''

دونوں محافظ اور سہما ہوا ملازم کھلونوں کی طرح حرکت میں آئے اور کمرے سے چلے گئے۔ اب میں اور مرشد علی وہاں تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ مرشد کا ایک ہاتھ اس کے گاؤن کی جیب کے پاس تھا۔ جس میں کوئی بھاری شے تھی۔ ''بیٹھو شہباز ملک!'' اس نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں کرسی پر ٹک گیا۔ ''مجھے یہاں آئے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟''

''اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔'' اس نے اپنی گھڑی دیکھی۔

''گویا میں نے چھبیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا۔ تمہارے گرگے نے مجھے رات ایک بجے بے ہوش کیا تھا۔''

اس نے تالی بجائی، ملازم اندر آیا۔ ''کھانے کے لئے کچھ لاؤ۔''

ملازم نصف گھنٹے میں سینڈوچز اور ایک بڑا برگر لے آیا۔ شاید اس جگہ سے کوئی کھانے پینے کا رات بھر کھلا رہنے والا اسپاٹ نزدیک تھا۔ بھوک سے میرا برا حال تھا اس لئے میں نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا اور سب کچھ صاف کر دیا۔ اس دوران میں ملازم چائے بنا کر لے آیا تھا جو اس نے مجھے اور مرشد علی کو دی۔ دشمن کی قید میں رہ کر اس کا کھانا پینا ناگوار ہی سہی لیکن زندہ رہنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مرشد علی مجھے کھاتے پیتے دیکھ کر خوش تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے درندے کی آنکھوں میں تگڑا شکار دیکھ کر نمودار ہوتی ہے۔ اتنا تو میں بھی سمجھ رہا تھا کہ مرشد علی کی یہ عنایات بے سبب نہیں تھیں۔ وہ جتنا سفاک تھا اتنا ہی شاطر بھی نظر آتا تھا۔ اس کے بارے میں چند سال پہلے میں نے ایک خبر سنی تھی کہ اس نے ملتان کے نزدیک اپنے چند معتوبوں کو شوگر مل کے بوائلر میں ڈلوا دیا تھا۔ ان بے چاروں کی ہڈیاں تک راکھ ہو گئی تھیں اور مرشد علی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں

ہو سکی تھی۔ ایسے شخص سے مجھے کسی نرمی کی امید نہیں تھی۔ بلا سبب معاف کرنا ایسے لوگوں کی سرشت ہی نہیں ہوتی ہے۔

''مرشد علی...... تمہارا بھائی نادر خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ حالانکہ میں نے اس کا کا کچھ نہیں بگاڑا۔ مری میں اس سے صرف سامنا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے واپسی پر میری جیپ کو اپنی جیپ سے ٹکر مار کر گرانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ ایک بار خود کھائی میں جا گرا۔ میری جیپ پولیس کی تحویل میں ہے تم خود اس کا عقبی حصہ دیکھ سکتے ہو جسے نادر کی جیپ کی ٹکروں نے نقصان پہنچایا ہے...... وہ......'' اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں بول رہا تھا اور مرشد علی نہیں سن رہا تھا۔ اسے غالباً ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چائے نوشی میں مصروف تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر ایک بار پھر پوچھا۔

''مرشد علی، مجھ پر یہ عنایت کیوں؟''

اس نے کپ سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ ''شہباز احمد! اگر کبھی تمہاری جان پر بن آئے اور معمولی سی قیمت ادا کر کے تم اپنی جان بچا سکتے ہو تو تم کیا کرو گے؟''

میں نے سوچ کر جواب دیا۔ ''یہ تو شے پر منحصر ہے۔ ممکن ہے وہ شے مانگنے والے کی نظر میں معمولی ہو لیکن میری نظر میں اتنی قیمتی ہے کہ میں جان کی قیمت پر بھی اسے دینا گوارہ نہ کروں، دوسرے وہ شے میری دسترس میں بھی ہو۔''

''معقول جواب ہے...... لیکن اگر مانگنے والا ہر قیمت پر وہ شے حاصل کرنا چاہے اور اس کے لئے کوئی بھی قدم اٹھانے کے لئے تیار ہو۔ دیکھو ناں...... آدمی موت سے ڈرتا ہے لیکن بعض حالات میں آدمی خود موت کی دعا کرتا ہے۔''

میں اس دھمکی کو سمجھ رہا تھا۔ ''مرشد علی گول مول باتیں کرنے کے بجائے مجھے کھل کر اپنا مطالبہ بتاؤ، میں اس چکر سے نکلنے کے لئے تمہارا ہر معقول مطالبہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں ایک کاروباری آدمی ہوں اور بلاوجہ کی دشمنی مول لینا مجھے پسند نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں صاف بات کرتا ہوں۔ شہباز احمد! مجھے وہ تصویر چاہئے جو تم نے اپنی جیپ سے ٹکرانے والے فقیر کے پاس سے لی تھی۔''

میں بری طرح چونکا تھا۔ ''وہ تصویر...... وہ تو میں نے بعد میں پھینک دی تھی، میرے نزدیک بے کار کی چیز تھی۔ مجھے تصاویر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

میرا جواب سن کر مرشد علی کا نرم چہرہ یکدم مسخ ہو گیا تھا۔ اس کے تاثرات سے نفرت اور سفاکی جھلکنے لگی تھی۔ اس نے سانپ کی طرح پھرتی سے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔ ''شہباز احمد! اگر تم نے تصویر ضائع کر دی ہے تو اپنے حق میں بہت برا کیا ہے۔ اس جرم کی کم سے کم سزا یہ ہے کہ تمہارے سر میں سوراخ کر دوں۔ مجھے بتاؤ، وہ تصویر کہاں ہے؟''

اس کے جنونی تاثرات نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا جیسے وہ مجھ پر گولی چلا دے گا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ اٹھایا۔ ''ایک منٹ، میں نے یہ نہیں کہا کہ میں نے اسے ضائع کیا ہے۔ میں نے اسے جھاڑیوں

میں پھینک دیا تھا، اس پر پلاسٹک شیٹ لپٹی تھی اور اسے پانی سے نقصان نہیں ہوسکتا۔ ہاں، کسی نے اسے وہاں سے اٹھالیا ہوتو الگ بات ہے۔"

مرشد کے تاثرات میں تبدیلی آئی۔ "تمہیں وہ جگہ یاد ہے جہاں تم نے تصویر پھینکی تھی؟"

"ہاں...... لیکن سوال یہ ہے، تم ایک ایسی شے کے لئے جس کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں تھی اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا، کیا تم اس کے لئے میری جان لینے پر آمادہ ہو جاؤ گے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی وجہ سے تمہاری جان بخشی ممکن ہوئی ہے۔"

لاشعوری طور پر اس نے اگل دیا تھا کہ تصویر کا معاملہ نہ ہوتا تو میرا وہی حشر ہوتا جس کا ارادہ اس کے بھائی نادر علی نے کیا تھا۔ اس تصویر نے معمے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ پہلے میں نے راجا عمر دراز کی دیوانگی دیکھی اور اپنی پشت پر ہنٹروں کی صورت میں سہی تھی اور اب مرشد علی اپنی عداوت بھول کر مجھے معاف کرنے کے لئے تیار تھا دوسری طرف تصویر کے ضائع ہونے کے امکان نے اسے بھڑکا دیا تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "اس تصویر میں ایسی کیا خاص بات ہے...... بچگانہ سی تھی۔"

"تم نہیں سمجھ سکتے...... اور میں بتا بھی نہیں سکتا۔ یوں سمجھ لو...... وہ تصویر ہر قیمت پر مجھے چاہئے۔ اس کے لئے مجھے کسی کی جان لینا پڑے تو میں بالکل نہیں ہچکچاؤں گا۔"

"تم قومی سطح پر جانے پہچانے لیڈر ہو لیکن اس وقت اپنے صوفیانہ حلئے سے قطع نظر گینگسٹروں کی طرح بات کر رہے ہو۔"

"صرف اس تصویر کی حد تک...... ورنہ میں بہت نرم دل آدمی ہوں۔"

میں مسکرایا۔ "ہاں، تمہاری نرم دلی کے کچھ قصے میں نے سن رکھے ہیں جیسے ملتان میں شوگر مل......"

"فضول باتوں سے گریز کرو۔" وہ بھڑک گیا تھا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"مرشد علی! اگر تمہیں تصویر مل گئی اور تم نے مجھے پھر بھی معاف نہ کیا تو میں تمہارا کیا بگاڑ لوں گا؟"

"تمہارا یہ خدشہ بجا ہے لیکن اپنی طرف سے میں یقین......"

"اپنی یقین دہانی کی بات مت کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "میں تم پر یقین نہیں کر سکتا۔"

"شہباز احمد! مت بھولو کہ اس وقت تم میرے قبضے میں ہو اور پوری طرح مجبور ہو۔ میں کسی بھی طریقے سے وہ تصویر حاصل کر سکتا ہوں۔"

"ایسا دعویٰ مت کرو۔ دوسرے میں بخوشی تصویر والی جگہ کی نشاندہی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ بشرطیکہ تم مجھے ضمانت دو، اس کے بعد مجھے نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔"

"کیسی ضمانت چاہتے ہو؟"

"اس کا بندوبست میرا وکیل کرے گا۔ وہ ایسی شخصیت کو لے آئے گا جس کی ضمانت دونوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔" میں نے تجویز پیش کی۔

اس نے غور کیا۔ "ٹھیک ہے...... میں نے کسی کی ضمانت دے دی اور بعد میں مجھے تصویر نہ ملی...... میرا مطلب ہے کہ تم کسی ایسی جگہ لے جا کر کھڑا کر دو جہاں سرے سے وہ تصویر ہی نہ ہو، تب میں کیا کر لوں گا؟"

''تصویر یقینی طور پر ملے گی۔ مرشد علی ہمارے درمیان باقاعدہ تحریری معاہدہ ہوگا۔ اگر میں تصویر نہ دے سکا تو تم ہر پابندی سے آزاد ہو۔''

مرشد علی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ خاصی دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ ''یہ خاصا طویل معاملہ ہو جائے گا۔ اتنی دیر میں تصویر کو نقصان ہو سکتا ہے، اسے کوئی اٹھا کر لے جا سکتا ہے۔''

''اس بات کی ضمانت میں دیتا ہوں کہ تصویر اپنی جگہ ملے گی۔ میں نے اسے اس طرح رکھا ہے کہ کوئی دوسرا اسے حاصل نہیں کر سکتا۔''

مرشد علی چونکا۔ ''اس کا مطلب ہے تم نے شروع میں مجھ سے جھوٹ کہا تھا۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم اس بار بھی جھوٹ نہیں بول رہے؟''

''میں تمہارے قبضے میں ہوں۔ زیادہ دیر جھوٹ نہیں بول سکتا۔'' میں نے شانے اچکائے۔

''ٹھیک ہے، میں سوچوں گا اور ممکن ہوا تو تمہارے وکیل سے تمہارا رابطہ بھی کرا دوں گا۔'' اس نے کہا۔

''تب تک تمہیں اسی جگہ رہنا ہوگا۔''

''اس بند کمرے میں، میں نے چند گھنٹے اور گزار لئے تو پھر وہاں سے میری لاش ہی نکلے گی۔'' میں نے سادگی سے کہا۔ ''اور لاش تمہیں تصویر کا پتا نہیں بتا سکے گی۔''

اس نے مجھے تیز نظروں سے دیکھا۔ ''ٹھیک ہے، تم دوسرے کمرے میں رہو گے لیکن کوئی شرارت مت کرنا، میرے آدمی بہت خطرناک ہیں۔''

''تمہارے جیسے شخص کے آدمیوں کو خطرناک ہی ہونا چاہئے۔''

اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ ''تم زبان دراز آدمی ہو۔ اپنی زبان قابو میں رکھنا ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔''

''اس سے زیادہ مصیبت اور کیا ہوگی؟'' میں نے سرد آہ بھری تھی۔

وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''بس، اتنی سی مشکل سے گھبرا گئے؟''

مرشد علی کے حکم پر مجھے ایک اور کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ جس میں کھڑکیاں اور روشن دان تھے۔ یہاں بھی گرمی تھی لیکن حبس نہیں تھا۔ کھڑکیوں کی سلاخوں سے تازہ ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ وہاں بستر نہیں تھا۔ فرش پر ایک چٹائی تھی جس پر موٹا سا کھیس ڈال دیا تھا۔ از راہ عنایت مجھے پانی کی بوتل اور ایک پلاسٹک کا گلاس بھی دے دیا گیا تھا۔ روشن دان بہت اوپر تھے اور ان پر بھی سلاخیں لگی تھیں۔ یعنی یہاں سے میرے لئے فرار کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کھیس پر دراز ہو کر میں ان کہانیوں پر غور کرنے لگا جن میں قیدی جیلوں اور جنگی کیمپوں سے حیرت انگیز انداز میں فرار ہو جاتے تھے۔ وہ چمچ سے سرنگ کھود لیا کرتے تھے اور شیو کرنے والے بلیڈ سے سلاخیں کاٹ دیا کرتے تھے مگر میرے پاس نہ تو کوئی چمچ تھا اور نہ ہی بلیڈ...... ورنہ ممکن ہے میں سلاخیں کاٹنے کی کوشش کرتا۔

ندیم اور میرے دوستوں کو میرے غائب ہونے کا علم ہو چکا ہوگا۔ اگر مرشد علی کے آدمیوں نے ذرا احتیاط سے کام لیا ہوگا تو سارے نشان مٹا دیئے ہوں گے اور وہ لوگ مجھے برا بھلا کہہ رہے ہوں گے کہ میں منہ اٹھا کر پھر کسی ایڈونچر پر نکل گیا ہوں۔ انہیں کیا خبر کہ میں دشمن کے ہاتھ لگ گیا ہوں اور میری زندگی کا انحصار اس

تصویر پر ہے جو میں نے ندیم کے حوالے کی تھی۔ مرشد کے انداز سے لگ رہا تھا، وہ ہر قیمت پر تصویر حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھا اور میری نظر میں اس تصویر کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی لہٰذا میں بلا تکلف اسے اپنے سر پر آئی بلا ٹالنے کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مرشد علی میرے خلاف مقدمات ختم کرا دے اور مجھ سے مستقبل میں تعرض نہ کرے تو میں یہ تصویر اسے دے دوں گا۔

ہوش میں آنے کے بعد مرشد علی کے سامنے پیشی تک میرا خیال یہی تھا کہ اب مجھے آزادی نصیب نہیں ہو گی۔ ان لوگوں سے معافی یا رحم دلی کی توقع ایسی ہی تھی جیسے آدم خور بھوکا شیر انسان پر ترس کھا کر اسے جانے دے مگر مقدر مہربان تھا اور ایک تصویر جو محض اتفاق سے میرے ہاتھ لگی تھی، میری فوری بچت کا سبب بن گئی تھی۔ امکان یہ تھا کہ میں بچ جاؤں لیکن اس کا انحصار آنے والے وقت پر تھا۔ مطمئن ہونے اور پیٹ بھرنے کے بعد مجھے اس کھردری جگہ پر بھی نیند آ گئی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو کھڑکی سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ درحقیقت دھوپ منہ پر آنے سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں نے انگڑائی لی اور اٹھ کر دروازہ بجایا۔ اس وقت تک بجاتا رہا جب تک باہر سے کسی نے پوچھا نہیں۔

"کیا بات ہے؟"

"مجھے باتھ روم جانا ہے...... جلدی......"

"ایک منٹ رکو۔" باہر والے نے کہا تھا، کوئی پانچ منٹ بعد دروازہ کھلا اور دو مسلح افراد مجھے اپنی نگرانی میں باتھ روم تک لے گئے۔ رہائشی حصوں کی نسبت باتھ روم خاصا معقول تھا اور وہاں نہانے دھونے کے انتظامات بھی تھے، میں نے ان سے فائدہ اٹھایا۔ دونوں نگرانوں نے مجھے باجماعت لا کر کمرے میں چھوڑا۔ میں نے فریاد کی۔ "بھائیو، بندہ صبح ناشتا بھی کرتا ہے۔"

"ناشتا ابھی آتا ہے۔" ایک بولا اور وہ دروازہ بند کر کے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ناشتے کی ٹرے اندر لا کر رکھ دی۔ لانے والے نے سخت لہجے میں کہا۔

"جلدی سے ناشتا کر لو۔ پیر بادشاہ کے حضور جانا ہے۔"

"ایسی کم تیسی تمہارے پیر بادشاہ کی۔" میں نے دل میں کہا اور اطمینان سے ناشتہ کرنے لگا۔ وہ میرے سر پر کھڑا تھا اور میری رفتار دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کئی بار اس نے مجھے جلدی ناشتہ کرنے کو کہا۔ جب اس کے صبر کا پیمانہ چھلکنے کو تھا تو میں نے ناشتا ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ پھر اس کے ساتھ اس کمرے میں پہنچا جہاں رات مرشد علی سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ رات والے حلیے میں اور کسی قدر متفکر چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں دھڑکتے دل سے منتظر تھا کہ وہ کچھ کہے۔ اس نے میری تجویز مان لی ہے یا مسترد کر دی ہے۔ دوسری صورت میں میرے ساتھ اس کا رویہ بدل جاتا۔

"شہباز!" خاصی دیر بعد اس نے کہا۔ "مجھے وہ تصویر چاہئے۔"

"میں نے جو کہا تھا......؟"

"اسے بھول جاؤ۔" اس نے میری بات کاٹی۔ "اس میں رسک بہت زیادہ ہے اور میں کمزور پڑ جاؤں گا۔ میرے پاس ایک آسان راستہ ہے۔ مجھے تصویر کا پتا تم بتاؤ گے، میرے پاس ایسے آدمی ہیں جو پتھر سے بھی

کوئی بات اگلوا سکتے ہیں۔"

"اکرم چشتی جیسے لوگ؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"اکرم چشتی......!" وہ مسکرایا۔ "وہ سرکاری ملازم ہے، اسے کہیں نہ کہیں مجبور ہونا پڑتا ہے۔ میرے آدمیوں کو تم کسی بھی مرحلے پر مجبور نہیں پاؤ گے۔"

"تم مجھے تشدد کی دھمکی دے رہے ہو؟"

"نہیں، حقیقت بتا رہا ہوں۔ میرے آدمی ماریں گے اور تمہیں مرنے بھی نہیں دیں گے۔ تم مجھے ابھی تصویر کا پتا بتا دو، اس عذاب سے بچ جاؤ گے۔"

"اس کے بعد تمہارے رحم و کرم پر رہ جاؤں اور تم مجھے اپنے بھائی کے حوالے کر دو جو ایک بے بنیاد بات پر پاگل کتے کی طرح میرے پیچھے پڑا ہے۔"

مرشد علی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ "اپنی زبان کو لگام دو۔ ایسا نہ ہو اسے وقت سے پہلے گدی سے کھینچ لیا جائے۔"

"مرشد علی! تم مجھے اپنے جلاّدوں کے حوالے کر دو...... لیکن اس طرح تمہیں تصویر نہیں ملے گی۔ جب تک مجھے ضمانت نہیں مل جاتی کہ تصویر حاصل کرنے کے بعد تم وہ سب کرو گے جس کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، میں تصویر تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔"

"تمہیں اس تصویر سے کیا دلچسپی ہے، اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" وہ غرا کر بولا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے جھوٹ کہا۔ میں نے چند دن پہلے اسے دیکھا تھا۔ مجھے تو اپنی آزادی، سلامتی اور اپنے کاروبار سے دلچسپی ہے۔ اس تصویر کی میرے نزدیک اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں ہے کہ تم اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو میں اپنی قیمت کیوں نہ مانگوں، پھر تم یہ قیمت ادا بھی کر سکتے ہو۔"

"میں تمہیں ہر طرح کی ضمانت دے سکتا ہوں۔"

"زبانی ضمانتوں کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"لگتا ہے، تم اس طرح نہیں مانو گے۔" اچانک مرشد علی دھاڑا۔ "اوئے لے چلو اسے...... ذرا نمونہ دکھاؤ۔" وہ غصے میں اپنے مہذبانہ لبادے سے باہر آ کر فلمی جاگیردار بن گیا تھا جو اس کا اصل روپ تھا۔ مجھے اس کے بارے میں پتا تھا، اس کا کسی گدی نشین خاندان سے تعلق نہیں تھا بلکہ اس کے دادا پر آخری عمر میں دماغی خلل کے دورے پڑتے تھے۔ جسے ان لوگوں نے مجذوبیت مشہور کر دیا اور دادا کے مرنے کے بعد اس کا مزار بنا کر خود سجادہ نشین بن گئے تھے۔ باپ اور چچا کے بعد اب مرشد علی گدی نشین تھا۔ اس کے گرگوں نے مجھے بازوؤں سے بوچ لیا اور کھینچ کر لے جانے لگے۔ وہ مجھے ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں لائے۔ جس کا فرش کچا تھا۔ وہاں ہے کی ایک کرسی رکھی تھی۔ مجھے اس پر بٹھا کر رسی سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ ہاتھ اور پیر کو بھی حرکت نہیں ے سکتا تھا۔ گرفت اتنی سخت تھی کہ رسی میرے جسم میں گڑنے لگی تھی۔ ایک صورت سے سخت اور سفاک نظر آنے لا شخص پلاس نما آلہ لے کر میرے پاس آیا۔

"یہ ایک ایک کر کے تمہارے ہاتھوں اور پھر پیروں کے ناخن کھینچے گا۔" مرشد علی نے مجھے آگاہ کیا۔ "پھر

بھی تم نہ مانے تو یہ اگلے مرحلے میں تمہاری انگلیاں ایک ایک کر کے کٹر سے کاٹے گا۔ تیسرے مرحلے میں تمہارے کان اور ناک کاٹے جائیں گے اور آخری مرحلے میں تمہاری آنکھیں اور زبان نکال لی جائیں گی۔ اس کے بعد تم یقیناً موت کی آرزو کرو گے۔''

اگر یہ کہا جائے کہ میں مرشد علی کی منظر کشی سے ڈرا نہیں تھا تو یہ جھوٹ ہوگا۔ اس کی تقریر سن کر اندر سے میری حالت بری ہونے لگی اس لئے کہ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔ اس کا جلاد میرے سر پر بالکل تیار تھا اور میں قطعی بے بس تھا۔ بچت کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی، سوائے اس کے کہ میں مرشد علی کی بات مان لوں۔ اس صورت میں بھی بچت عارضی تھی۔ مجھے معلوم تھا یہ کینہ پرور شخص مجھے معاف نہیں کرے گا۔ دوسرے میں ندیم کا نام لے کر اسے مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔ میرا ذہن تیزی سے کوئی طریقہ سوچ رہا تھا۔ میں مرشد علی کے جلاد کو نہیں روک سکتا تھا۔ میری مسلسل خاموشی سے تنگ آ کر اس نے سفاک صورت شخص کو اشارہ کیا اور وہ دانت نکالتا ہوا میرے پیروں کی طرف جھک گیا۔ اس نے میرے دائیں پاؤں کی سب سے چھوٹی انگلی پکڑ لی۔

''ٹھیک ہے مرشد علی!'' میں نے ہار ماننے کے انداز میں کہا۔ ''میں تصویر تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں لیکن تصویر میرے بغیر نہیں ملے گی۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے جلاد کو رک جانے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''تصویر بینک لاکر میں ہے اور وہاں سے میں ہی اسے نکال سکتا ہوں۔''

''بکواس مت کرو...... تمہیں موقع کہاں ملا کہ تصویر لاکر میں رکھ سکو؟''

''تمہیں کیا معلوم...... میں نے اگلے ہی روز یہ کام کر دیا تھا۔''

''مجھے بے وقوف بنانا تمہیں مہنگا پڑ سکتا ہے۔'' مرشد علی کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ ''ایک تصویر جو تمہیں ایک نقب زن کے پاس سے ملی تھی، اسے تم نے اگلے روز لاکر میں بھی رکھ دیا؟''

''اس لئے کہ میں اس کی اہمیت سے واقف ہوں۔'' میں نے اقرار کر لیا۔ ''مجھے معلوم ہے، اصل میں یہ تصویر راجا عمر دراز کی ملکیت ہے۔ یہ تصویر میں اس کے محل میں دیکھ چکا ہوں۔ اس کے پیچھے اس زمانے میں بھی خاصا ہنگامہ ہو چکا تھا۔''

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟'' اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ''تم راجا عمر دراز کو کیا جانو......؟''

''تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''میں نے تصویر راجا عمر دراز کی امانت سمجھ کر لاکر میں رکھ دی تھی۔ مجھے معلوم ہے، بعض غیر ملکی اس کے پیچھے پڑے ہیں۔ اب میں یہ تصویر تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں اور اس کے لئے مجھے خود بینک جانا ہوگا۔''

''تم کسی کو پاور آف اٹارنی دے سکتے ہو۔ وہ جا کر بینک لاکر سے نکال سکتا ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اوّل تو بینک اس قسم کی پاور آف اٹارنی تسلیم نہیں کرتا، دوسرے یہ اختیار پہلے ہی میرے وکیل ندیم احمد بھٹی کے پاس ہے۔''

''وہ تصویر لا سکتا ہے۔''

''ظاہر ہے، اس کے پاس پاور آف اٹارنی ہے لیکن اس کو درمیان میں لانے سے تم پہلے ہی انکار کر چکے ہو اس لئے مجھے جانا پڑے گا۔''

میں اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب رہا تھا۔ مرشد علی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ تصویر اس کے لئے زیادہ اہم تھی اور مجھ سے انتقام ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ''شہباز! اگر یہ دھوکا ہوا تو ابھی نہ سہی، بعد میں تمہیں بڑے عبرت ناک حالات سے گزرنا پڑے گا۔''

''مجھے معلوم ہے اس لئے میں نے خلوص کے ساتھ تمہیں اصل بات بتا دی ہے۔ اب تم اس کی تصدیق کرا سکتے ہو تو کرا لو۔''

مرشد علی نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''اسے واپس کمرے میں پہنچا دو اور اس کا خیال رکھنا۔''

''مرشد علی! میرا ایک مشورہ ہے۔ ندیم احمد کو اصل بات بتا دو۔ وہ میرے بدلے تمہیں تصویر دے دے گا ورنہ بات کرنے سے بھی انکار کر دے گا۔''

''تم اس کی فکر مت کرو کہ میں کیا کرتا ہوں۔'' مرشد علی بولا۔ ''بس ایک بات کا خیال رکھنا، اس میں کوئی جھوٹ نہ ہو۔''

''تم خود دیکھ لوگے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

مرشد علی کے آدمی مجھے اس کمرے میں بند کر گئے جہاں میں رات کو رہا تھا۔ کھڑکی سے کوٹھی کا بیرونی حصہ نظر آ رہا تھا۔ اجاڑ لان، بلکہ لان کبھی بنا ہی نہیں تھا، کی زمین پر خودرو گھاس پھوس اور پودے اُگ آئے تھے۔ کوئی تیس گز کے فاصلے پر اونچی دیوار تھی اور فضا میں ایسی خاموشی تھی جیسے یہ کوئی نو آباد علاقہ ہو۔ میں نے اب تک کسی گاڑی کی آواز نہیں سنی تھی۔ یعنی کوٹھی کے سامنے کوئی سڑک نہیں تھی یا یہاں سے گاڑیاں گزرتی ہی نہیں تھیں۔ عین آخری لمحے میں آنے والے خیال نے عارضی طور پر میری جان بچالی تھی۔ اب معاملہ مرشد علی اور ندیم کے ہاتھ میں تھا جو بھی ذرا ہوشیاری دکھاتا، اپنے مقصد میں کامیاب رہتا لیکن مجھے امید تھی ندیم، مرشد علی کے جال میں نہیں آئے گا۔ وہ بے حد ذہین آدمی تھا۔ دوسرے وہ معاملے کی نوعیت سے واقف تھا، اس لئے اسے آسانی سے سب کچھ سنبھال لینا چاہئے تھا۔ مرشد علی کی طرف سے رابطہ ہوتے ہی وہ سمجھ جاتا کہ میں اس کے قبضے میں ہوں اور پھر وہ تصویر کو مجھے رہا کرانے کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ مجھے سو فی صد امید تھی کہ ندیم اپنا کردار خوبی ادا کرے گا۔

مجھے دوپہر کا کھانا ذرا معقول ملا تھا۔ یہ چکن بریانی اور کبابوں پر مشتمل تھا۔ مجھ سے مع گھڑی کے سب لے لیا گیا تھا۔ اس لئے وقت کے بارے میں اندازہ کر سکتا تھا۔ سورج گزر کر دوسری طرف جا چکا تھا اور سائے آہستہ آہستہ طویل ہو رہے تھے۔ گرمی کی شدت میں بھی کمی آئی تھی۔ دن میں ایک بار میں باتھ روم گیا اور اس بار نگرانوں نے مجھ پر سخت نظر رکھی تھی۔ ذرا سا بھی موقع نہیں دیا تھا اور موقع ملتا بھی تو میں کون سا فلمی ہیرو تھا جو دھاڑ کرتا یہاں سے فرار ہو جاتا! شام کے وقت مجھے چائے دی گئی اور رات کا کھانا مجھے سورج غروب ہوتے دے دیا گیا تھا۔ اب تک حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ انتظار میرے اعصاب کے لئے ایک امتحان بنا تھا۔ رات کسی وقت میں نے کوٹھی میں کسی بھاری گاڑی کی آواز سنی۔ اس کا انجن کسی خرابی کی وجہ سے زیادہ

ہی شور مچا رہا تھا۔ میری نیند اچاٹ ہوگئی تھی اور جب خاموش ہونے پر میں دوبارہ سونے کی کوشش کر رہا تھا تو دروازہ کھلا اور نگران اندر آئے۔ ''اٹھو، ہمارے ساتھ چلنا ہے۔'' ایک نے مجھے پاؤں سے ہلایا۔

میں اٹھ بیٹھا۔ ''کہاں؟''

''سوال مت کرو، جو کہا ہے وہ کرو۔'' غرا کر کہا گیا۔

مجھے گن پوائنٹ پر رکھ کر باہر لایا گیا۔ کوٹھی کے احاطے میں ڈبل کیبن جیپ کھڑی تھی، اس کا انجن شور کر رہا تھا کیونکہ اس کے سوا یہاں کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ مجھے اس جیپ کے عقبی حصے میں دھکیل دیا گیا اور میرے اردگرد دو افراد آ کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ اس طرح تاریکی میں مجھے لے کر جا رہے تھے یا تو مسئلہ ان کا تھا یا پھر میرے لئے کوئی مسئلہ کھڑا ہونے والا تھا۔ میرے اندر خدشات سر اٹھانے لگے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک شخص آ بیٹھا۔ لیکن جیپ کی روانگی سے پہلے میرے دائیں طرف بیٹھے شخص نے میری آنکھوں پر کپڑا باندھ دیا اور اوپر سے بڑے سائز کی عینک لگا دی تا کہ باہر سے کپڑا نظر نہ آئے۔ اس کے بعد جیپ اسٹارٹ ہوئی اور کوٹھی سے نکل گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں راولپنڈی یا اسلام آباد کے کس علاقے میں تھا اور مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ میں نے راستے میں ایک دوبار پوچھنے کی کوشش کی لیکن مجھے جھڑک کر خاموش کر دیا گیا۔ ان لوگوں کے رویے سے لگ رہا تھا کہ میرے لئے مرشد علی کے انداز میں نرمی نہیں آئی تھی۔ یہ سفر کوئی آدھے یا پون گھنٹے جاری رہا۔ جیپ کسی جگہ رکی۔ دروازہ کھلا اور جیپ اندر چلی آئی۔ یہ بھی کوئی کوٹھی تھی کیونکہ جیپ مین گیٹ سے خاصی اندر آئی تھی۔ مجھے اتار کر اندر لایا گیا۔ تب میری آنکھ سے پٹی ہٹائی گئی تھی۔ یہ ایک شاندار پیمانے پر آراستہ نشست گاہ تھی اور میں نے صوفے پر بیٹھے شخص کو دیکھ کر چونکا تھا، وہ نادر علی تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ پلاسٹر میں لپٹا گلے میں پڑا تھا۔ ہونٹوں پر نفرت آمیز مسکراہٹ تھی۔

''کیوں شہباز ملک! مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی۔''

''جب تمہارے برادر کلاں کو دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی تو تمہیں دیکھ کر کیوں ہونے لگی۔ یہ بتاؤ کہ مجھے اس انداز میں کیوں بلوایا ہے؟''

''میرا تم سے کچھ حساب نکلتا ہے۔''

''تم بلاوجہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''مری میں جو ہوا وہ تمہاری کارستانی تھی۔'' اس نے غصے سے جواب دیا۔ ''تمہاری وجہ سے میری جیپ کو حادثہ ہوا، میرا ہاتھ ٹوٹا...... مجھے ان سب باتوں کا حساب لینا ہے۔''

''مری میں جو ہوا، اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسرے جیپ کو حادثہ تمہاری اپنی حرکت سے پیش آیا تھا۔ یہ تو تمہاری مجرمانہ حرکت تھی جس کا خمیازہ تم نے بھگتا۔''

''اور تم بچ گئے۔'' وہ ہٹ دھرم لہجے میں بولا۔ ''لیکن اب نہیں بچو گے...... مرشد بھائی تم کو رہا کرنے کو کہہ رہے ہیں، اس سے پہلے میں اپنا بدلہ لوں گا۔''

''مجھے ذرا بھی نقصان ہوا تو اس کا نتیجہ تمہارے بھائی کے حق میں برا نکلے گا۔ اسے اس کی مطلوبہ چیز نہیں ملے گی۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''تم اس کی فکر مت کرو۔ یہ میرا اور بھاجی کا معاملہ ہے۔ تم اپنی فکر کرو۔ میں نے بس یہی بتانے کے لئے تمہیں بلوایا تھا، اسے لے جاؤ۔'' اس نے میرے عقب میں کھڑے افراد کو حکم دیا۔ انہوں نے ایک بار پھر میری آنکھوں پر کپڑا اور عینک چڑھائی اور مجھے اسی طرح جیپ میں بٹھا کر واپس لے آئے۔ جب مجھے کمرے میں دھکیلا گیا تو صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اب نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نادر علی کی دھمکی نے میری نیند اڑا دی تھی۔ ممکن ہے مرشد علی اس کے عزائم سے بے خبر ہو لیکن زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ اپنے بھائی کی آشیرواد سے یہ سب کر رہا ہو۔ اس طرح مرشد علی میری نظر میں اپنی ساکھ بچا رہا تھا اور بعد میں، میں کوئی قدم اٹھاتا تو اس کی لپیٹ میں صرف نادر علی آتا۔ مرشد علی خود کو صاف بچا جاتا۔ یہ قدم شاید ندیم سے رابطہ ہونے اور تصویر اور میرے تبادلے کا فیصلہ طے ہو جانے کے بعد اٹھایا گیا تھا۔ یعنی ندیم نے تصویر دینے کی ہامی بھر لی تھی۔ اس شرط پر کہ مجھے حوالے کیا جائے۔

نادر علی کے خوف ناک عزائم، میں پولیس اسٹیشن میں سن چکا تھا۔ وہ میرے ہاتھ پیر تڑوا کر مجھے اپاہج کر دینا چاہتا تھا اور یہ اس خبیث کے نزدیک کم ترین بدلہ تھا جو وہ مجھ سے لے سکتا تھا۔ روشنی ہونے کے بعد ناشتا آیا تو مارے فکر کے مجھ سے کھایا نہیں گیا تھا۔ مارے باندھے میں نے تھوڑا سا حلق سے اتارا تھا اور چائے پی۔ دوپہر بارہ بجے کے قریب انہوں نے مجھے کمرے سے نکالا اور اس وسیع ہال میں لائے۔ جہاں لوہے کی کرسی سے باندھ کر مرشد علی نے میرے ناخن کھنچوانے کا ارادہ کیا تھا، اب اس کے بھائی کے عزائم میرے ہاتھ پاؤں توڑنے کے تھے۔ میرا اندازہ بلکہ اندیشہ درست نکلا تھا۔ جب مجھے کرسی سے باندھا جانے لگا، میں نے مزاحمت کی تو وہاں موجود چار افراد مجھ سے چمٹ گئے۔ میں نے مقدور بھر ہاتھ پاؤں چلائے مگر ان کا مقابلہ نہ کر سکا۔ انہوں نے مجھے بے بس کر کے کرسی سے باندھ دیا۔ البتہ میرے بائیں ہاتھ کو آزاد رہنے دیا گیا۔ جیسے ہی مجھے باندھا گیا، نادر علی ہال میں آیا۔ اس نے ہاتھ میں لکڑی کا موٹا سا ڈنڈا اٹھا رکھا تھا۔

''تمہیں پتا ہے، میں کیا کرنے والا ہوں۔'' اس نے ڈنڈا لہرایا، یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی، اس کے عزائم اس کی صورت سے عیاں تھے۔

میں نے حوصلے سے کہا۔ ''ہاں، تم میری ہڈیاں توڑ دو گے لیکن اس صورت میں مرشد علی کو وہ تصویر نہیں ملے گی، جس کے پیچھے وہ پاگل ہو رہا ہے۔''

''نہ ملے...... میں بھی تم سے انتقام لینے کے لئے پاگل ہو رہا ہوں۔'' اس نے جنونی لہجے میں کہا اور ایک نگران کو حکم دیا۔ ''اس کا ہاتھ پکڑ کر سیدھا کرو۔''

اس نے میرا آزاد ہاتھ تھام کر اور پنجے میں پنجہ پھنسا کر سیدھا کر لیا۔ میں نے مزاحمت نہیں کی تھی۔ نادر علی آنکھوں میں وحشیانہ چمک لئے آگے آیا اور اس نے سر سے ڈنڈا بلند کر کے پوری قوت سے وار کیا تھا۔ جیسے ہی اس کا ڈنڈا حرکت میں آیا، میں نے جو ہاتھ اب تک ڈھیلے انداز میں سیدھا رکھا تھا، یکدم سخت کرتے ہوئے اس شخص کو اپنی طرف کھینچا، جس نے ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ابتدائی فرماں برداری کے بعد اسے میری طرف سے اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے روکنے کی کوشش کی مگر کرسی زمین میں نصب تھی اور اس کے پیر آزاد تھے۔ وہ کھنچا آیا اور جو ڈنڈا میری کلائی پر لگنا تھا، وہ ٹھک کی آواز کے ساتھ اس کی کلائی پر لگا۔ ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز اس کی

بلبلاہٹ میں دب گئی تھی۔ ایک دھاڑ نادر علی نے بھی ماری تھی۔ وہ پوزیشن بدلتے دیکھ چکا تھا لیکن جسم کی پوری طاقت سے کئے جانے والے اس وار کو روکنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ نگران میرا ہاتھ چھوڑ کر اور دوسرے ہاتھ سے مضروب ہاتھ تھام کر زمین پر لوٹنے لگا تھا۔

''حرامزادے!'' نادر علی دھاڑا۔ ''ٹھیک سے کیوں نہیں پکڑا تھا اپنی ماں کے یار کا ہاتھ۔''

''ہائے ربا!...... میں مر گیا۔'' اس نے چلا کر کہا اور اس کے ساؤنڈ افیکٹس سے لگ رہا تھا کہ وہ سچ مچ نزع کے عالم میں ہو۔ ''شاہ جی...... مجھے اسپتال بھجواؤ۔''

''اوئے...... لے جاؤ اسے کسی زچہ خانے۔'' نادر علی نے بدمزگی سے دوسروں کو حکم دیا۔ ''اتنا شور تو بچہ جننے والی عورت بھی نہیں ڈالتی ہے۔''

دو افراد اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اب ہال میں نادر علی کے ساتھ صرف ایک فرد تھا۔ نادر علی نے اسے حکم دیا۔ ''اس کا ہاتھ پکڑو...... لیکن زور لگا کر...... اس زنخے کی طرح مت پکڑنا۔''

''فکر نہ کرو صاحب! یہ اپنا ہاتھ مر کر بھی نہیں چھڑا سکے گا۔'' اس نے کہا اور میرا ہاتھ سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر میں نے انگلیاں رسی میں پھنسائی تھیں۔ وہ کوشش کے باوجود میرا ہاتھ سیدھا نہ کر سکا تھا۔ میں نے ہانپتے ہوئے نادر علی سے کہا۔ ''ایسا کرو اپنے دو تین چیلے اور بلواؤ تب میرا ہاتھ سیدھا ہوگا۔''

نادر علی کا گرگا میرا ہاتھ نکالنے کی کوشش میں ہانپنے لگا تھا اس نے مشتعل لہجے میں کہا۔ ''چھوڑ...... تیری تو......''

میں نے اچانک رسی سے انگلیاں نکال لیں اور مکا بنا کر اس کے منہ کی طرف اچھالا۔ وہ بھی کھینچ رہا تھا اس لئے مکا دگنی طاقت سے اس کے منہ پر لگا تھا۔ اس نے چلا کر گالی دی اور نادر علی نے مشتعل ہو کر ڈنڈے سے میرے سر پر وار کیا۔ بچتے بچتے بھی ڈنڈا چھوتا ہوا گزر گیا تھا۔ اگر براہ راست سر پر لگتا تو شاید میرا سر کھل جاتا لیکن اب بھی یکدم آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا اور میری مزاحمت دم توڑ گئی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ میرا ہاتھ سیدھا کیا جا رہا تھا اور میں اسے روکنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ مجھے چکراتے پا کر نادر علی نے اپنا کام کر لیا تھا۔ اچانک میرے ہاتھ میں تڑپا دینے والا درد ہوا تھا اور ضبط کے باوجود میرے منہ سے چیخیں نکل گئی تھیں۔

چکراتے سر کے ساتھ میں نے سوکھی شاخیں چٹخنے جیسی آواز سنی۔ یہ میری ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز تھی۔ درد کی ایک لہر میرے وجود سے ٹکرائی تھی۔ اس درد نے سر کا درد دبا دیا تھا اور میں تیزی سے ہوش میں آیا تھا۔ میرا ہاتھ کلائی کے پاس سے سوجنا شروع ہو گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے کلائی اپنے اصل سائز سے دگنی ہو گئی تھی۔ اس شخص نے جھٹکا دے کر میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میرے حلق سے ایک چیخ اور نکلی تھی۔ کلائی واضح طور پر ٹوٹ چکی تھی۔ نادر علی کے چہرے پر فتح اور مسرت کے تاثرات تھے۔ اس نے ایک گونجتا قہقہہ مارا اور اپنے گرگے کو حکم دیا۔

''اس کا دوسرا ہاتھ بھی کھولو۔ میں اسے بھی توڑ دوں گا اور اس کے بعد اس حرافہ کی باری آئے گی۔''

''بکومت......'' میں تکلیف کے باوجود بولا۔ ''تم...... اسے پا نہیں سکتے۔''

''جیسے تجھے تلاش کر لیا ہے...... ایک دن اسے بھی تلاش کر لوں گا۔''

درد کی شدت سے میرا سر چکرانے لگا تھا۔ ہڈی ٹوٹنے کا درد جان نکال لیتا ہے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا

جیسے کلائی کے راستے میری روح نکل رہی ہو۔اس نے ڈنڈے کی نوک سے میری مضروب کلائی کو ہلایا تو ایک بار پھر میری چیخ نکل گئی تھی۔اس دوران میں نادر علی کا آدمی میرا دوسرا ہاتھ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن گرہیں اتنی سختی سے باندھی ہوئی تھیں کہ اس سے کھل نہیں پا رہی تھیں۔دوسری طرف نادر علی میرا دوسرا ہاتھ توڑنے کے لئے بے تاب تھا۔اس نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔

''جلدی کر دمردار! دم نہیں ہے کیا؟''

''کھل نہیں رہا۔کرمو نے بہت کس کر باندھی ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''رسّی کاٹ دے۔'' نادر علی نے حکم دیا تو وہ چاقو لے آیا اور میری رسی کاٹنے لگا۔ہال کے ایک طرف کی دیوار میں خالی کھڑکیاں تھیں۔ان پر لوہے کا جال بھی نہیں تھا۔باہر سے تیز دھوپ آ رہی تھی۔گرگے نے میرے ہاتھ کی رسی کاٹ کر ہاتھ آزاد کرایا اور اسے کھینچ کر سیدھا کر دیا۔میں نے معمولی سی مزاحمت کی، یہ بھی لاشعوری حرکت تھی ورنہ مجھ میں بالکل بھی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔نادر علی نے میرا جائزہ لیا اور ڈنڈا تولتے ہوئے اسے بلند کیا۔میں بے بسی کے عالم میں اسے وار کے لئے تیار دیکھ رہا تھا۔عین اسی لمحے میں نے کھڑکی سے کود کر چند سائے اندر آتے دیکھے۔نادر علی دھاڑا تھا۔الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔میں نے اسے ڈنڈا پھینک کر اپنے لباس سے گن نکالتے دیکھا تھا۔میں نے ہی نہیں بلکہ اندر آنے والوں نے بھی دیکھا تھا کیونکہ فوراً ہی کئی فائر ہوئے اور میں نے نادر علی کے لباس کو رنگین ہوتے دیکھا۔وہ ڈگمگایا اور منہ کے بل زمین پر گر گیا۔اس کے گرگے نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہاتھ بلند کر لئے تھے۔آنے والوں نے آناً فاناً اسے منہ کے بل گرا کر اس کے ہاتھ پشت سے جکڑ دیئے تھے۔میں نے دیکھا، انہوں نے اسے لوہے اور نائلون سے بنی ہتھکڑیاں پہنا دی تھیں۔اس قسم کی ہتھکڑیاں پولیس والے استعمال نہیں کرتے ہیں۔ہتھکڑیاں پہنا کر وہ اسے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے تھے۔وہ سب سیاہ لباس میں اور نقاب پوش تھے۔ہال میں رہ جانے والے دو سیاہ پوش میرے پاس آئے۔ان میں سے ایک نے میرے مضروب ہاتھ کا جائزہ لیا۔

''اس کی کلائی ٹوٹ گئی ہے۔'' اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور سر پر بندھے ہیڈ فون کے مائیک میں کہا۔

''میڈیکل کٹ لے آؤ۔''

وہ نہ صرف مسلح تھے بلکہ انہوں نے سینے پر بلٹ پروف جیکٹیں بھی پہن رکھی تھیں اور ان کا انداز تربیت یافتہ کمانڈوز جیسا تھا۔ایک منٹ کے اندر ایک اور نقاب پوش میڈیکل کٹ لے کر آیا تھا۔اس نے اندر سے دو چھوٹی لکڑیاں نکالیں اور میرا ہاتھ سیدھا کر کے لکڑیاں ٹوٹے حصے کے اوپر نیچے رکھ دیں۔دوسرے نے سخت بینڈیج کر دی تھی۔ضبط کے باوجود میری کراہیں نکل گئی تھیں لیکن کلائی سیدھی ہونے کے بعد میں افاقہ محسوس کرنے لگا تھا۔

''تم......لوگ کون ہو؟'' میں نے گہری سانسیں لیتے ہوئے پوچھا۔

''فی الحال تمہارے ہمدرد ہیں۔'' کٹ منگوانے والے نقاب پوش نے کہا۔''اسے لے چلو۔'' اور اپنے مائیک میں بولا۔''آل کلیئر لیٹس گو ناؤ۔''

میری رسیاں کھول دی گئی تھیں۔سہارا دے کر مجھے کھڑکی کے راستے اتارا گیا۔کوٹھی کے احاطے میں دو

عدد طاقتور بند جیپیں تھیں۔ مجھے ایک جیپ کی عقبی نشست پر بٹھایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ پوش سمٹ کر اس طرف آئے اور جیپوں میں سوار ہو گئے۔ جیپیں حرکت میں آئیں اور کوٹھی سے نکلتی چلی گئیں تب میں نے پہلی بار دیکھا، یہ جی ٹی روڈ پر آباد ہونے والی نئی کالونی تھی۔ کوٹھی اس کے ایک غیر آباد حصے میں تھی اور باہر سے یہ کوٹھی زیر تکمیل تھی۔ البتہ اس کی چار دیواری بلند اور گیٹ مضبوط تھے۔ اس کی حالت ان لوگوں کی سرگرمیوں کے عین مطابق تھی۔ میں نے نشست کی پشت سے سر ٹکا لیا تھا۔ کلائی کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔

''انہیں طبی امداد کی ضرورت ہے۔'' میرے برابر میں بیٹھے سیاہ پوش نے اگلی نشست پر بیٹھے سیاہ پوش سے کہا۔ اس کا لہجہ میرے لیے احترام آمیز تھا۔

''فی الحال ہم کسی اسپتال نہیں جا سکتے۔ ڈاکٹر آ جائے گا۔'' وہ بولا، اس نے ایک موبائل فون نکالا اور نمبر ملا کر بولا۔ ''ایک ڈاکٹر اور پلاسٹر کرنے کے سامان کا بندوبست کرو...... ہری اپ!''

یہ سیاہ پوش کون تھے اور انہوں نے مرشد علی کے اس ٹھکانے پر حملہ کیوں کیا تھا۔ انہوں نے میرے سامنے نادر علی کو گولی ماردی تھی اور چند لمحے پہلے فرعون بننے والا اپنے ہی خون میں ڈوبا پڑا تھا۔ آنے والوں کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ کس پر گولی چلا رہے ہیں۔ بے دھڑک گولی مارنے سے ظاہر تھا کہ ان کی مرشد علی اور نادر علی سے شدید دشمنی تھی۔ اب پتا نہیں وہ نادر علی کو مارنے آئے تھے یا مجھے اس کے چنگل سے بچانے۔ اگر وہ مجھے بچانے آئے تھے تو انہوں نے کسی قدر دیر کر دی تھی اور ساتھ ہی بروقت آئے تھے، میرا دوسرا بازو بچ گیا تھا۔ جیپیں برق رفتاری سے سفر کرتی رہیں۔ میں بار بار ذہن کی طرف آنے والی غنودگی کی لہر کو روک رہا تھا۔ شاید یہ جسم کا خودکار عمل تھا جس کے تحت ذہن درد کی شدت سے بچنے کے لئے بے ہوشی میں پناہ لیتا ہے۔ کیونکہ کلائی ٹوٹنا ایسی چوٹ نہیں تھی کہ آدمی بے ہوش ہو جائے۔ کوئی نصف گھنٹے بعد جیپیں اسلام آباد کی ایک کوٹھی میں داخل ہوئی تھیں۔ مجھے اتار کر اندر پہنچایا گیا۔ جہاں ایک ڈاکٹر میرا منتظر تھا۔ اس نے پٹی اور لکڑیاں ہٹا کر کلائی کا معائنہ کیا۔

''کمپاؤنڈ فریکچر لگ رہا ہے۔ شاید آپریشن کرنا پڑے۔'' اس نے میرے ساتھ آئے سیاہ پوش سے کہا۔ انہوں نے راستے میں نقاب اتار دیئے تھے اور صورتوں سے میرے لئے اجنبی تھے۔ یہ سب نوجوان اور چہرے مہرے سے پڑھے لکھے نظر آنے والے افراد تھے، ان کا سربراہ ایک تقریباً تیس بتیس سال کا ہلکے سانولے رنگ کا خوش شکل جوان تھا۔ وہ ڈاکٹر سے میرے بارے میں بات کر رہا تھا۔ ''ڈاکٹر! آپریشن یہاں ہو سکتا ہے؟''

''نہیں...... یہ کام کسی باقاعدہ آپریشن روم میں ہی ہو سکتا ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔ ''اس کے لئے آلات چاہئیں خاص طور پر ہڈیاں سیٹ کرنے والے آلات۔''

انچارج کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک پین کلر انجکشن دیا تھا اور کلائی پر دوبارہ بینڈیج کر دی تھی۔ پین کلر انجکشن کے بعد میں کسی قدر سکون محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اور انچارج مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں ہلکی سی غنودگی محسوس کرنے لگا تھا۔ انجکشن کے ذریعے دی جانے والی دوا مسکن تھی۔ حالات یوں پلٹا کھائیں گے، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ نادر علی میرا ایک ہاتھ توڑ چکا تھا اور دوسرا توڑنے جا رہا تھا۔ ایسے میں یہ لوگ فرشتہ بن کر آئے اور مجھے اس شیطان کے چنگل سے نکال لیا۔ اب ان کا

مقصد کیا تھا، یہ مجھے کیوں اپنے ساتھ لائے تھے اور آئندہ میرے ساتھ کیا کرتے؟ اس کا جواب آنے والا وقت ہی دیتا۔ فی الحال تو یہ میرے علاج کے لئے فکرمند تھے۔ یہ کوٹھی خاصی بڑی اور شاندار تھی۔ انہوں نے جس طرح کام کیا تھا، اس سے لگتا تھا یہ کوئی منظم گروہ تھا اور طاقت میں کسی طرح مرشد علی سے کم نہیں تھا۔ انچارج کوئی ایک گھنٹے بعد آیا تھا۔

''مسٹر شہباز، ہم کوشش کر رہے ہیں، کسی اسپتال میں آپ کے ہاتھ کا آپریشن ہو سکے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہوا تو ہم آپ کو راولپنڈی اسلام آباد سے باہر کسی دوسرے شہر لے جائیں گے۔''

''آپ لوگ مجھ پر مہربانی کیوں کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں آپ کو جانتا بھی نہیں ہوں۔''

وہ مسکرایا۔ ''ہم بھی آپ کو نہیں جانتے...... لیکن کسی شخص نے ہمیں آپ کے لئے ہائر کیا ہے۔ وہ آپ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ فی الحال ہمارا ایک دوسرے کو نہ جاننا ہی بہتر رہے گا۔''

''میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟'' میں نے بے تکلفی اختیار کی۔

''آپ مجھے وسیم کہہ سکتے ہیں۔'' وہ سوچ کر بولا۔ ظاہر ہے یہ اس کا اصل نام نہیں تھا۔

''او کے مسٹر وسیم، یہ بتاؤ کہ مجھے بچانے یا پانے کے لئے تمہیں کس نے ہائر کیا ہے؟''

''سوری، میں اس کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''لیکن کل شام یا رات تک وہ خود آ جائے گا۔ تب آپ دیکھ لیں گے۔''

''ڈاکٹر میرے ہاتھ کے بارے میں کیا کہتا ہے؟''

''چوبیس گھنٹے کے اندر سرجری ضروری ہے ورنہ گینگرین کا خطرہ ہے۔'' اس نے پھر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''گینگرین......'' میں سن رہ گیا تھا۔ طبی اصطلاح میں گینگرین اس کنڈیشن کو کہتے ہیں جب جسم کا کوئی حصہ مردہ ہو جائے اور اکثر و بیشتر صورتوں میں اس حصے کو کاٹنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا، جسم کا یہ حصہ جو بچپن سے میرے ساتھ تھا۔ کیا مجھ سے الگ ہو جائے گا؟ نہیں...... میں لرز گیا تھا۔ وسیم بغور مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی۔

''شہباز صاحب، فکر نہ کریں...... چوبیس گھنٹے سے بہت پہلے ہی ہم سرجری کا بندوبست کر لیں گے۔''

''یہ تو تم کہہ رہے ہو...... آگے تقدیر نے نہ جانے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''اچھا ہی ہوگا۔'' وہ بولا۔ ''آپ آرام کریں۔ کوئی بھی ضرورت ہو تو یہ بیل بجا دیں۔ میں آپریشن کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد میں بستر پر دراز ہو گیا تھا۔ انجکشن کے اثر سے تکلیف خاصی کم ہو گئی تھی۔ وسیم نے آپریشن کی امید بھی دلائی تھی۔ اس لئے میں خاصا مطمئن تھا مگر میں نے تقدیر کی جو بات کی تھی، وہ اس طرح سچ ثابت ہو گی، اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ شام تک میں دوبارہ تکلیف محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا دوسرے میں نے محسوس کیا کہ سوجن سیاہی مائل چمک دار ہو رہی تھی اور میرے ہاتھ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے علاج بلکہ فوری آپریشن کی اشد ضرورت تھی ورنہ ڈاکٹر کا اندیشہ درست ثابت ہو سکتا تھا۔ میں

جانتا تھا اس وقت کسی بھی اسپتال میں جانے کی صورت میں پولیس مجھے گرفتار کر سکتی تھی۔ نادر علی کے مارے جانے کے بعد حالات میرے لئے مزید خراب ہو گئے تھے۔ ممکن ہے اس کے مارے جانے کا الزام بھی مجھ پر ڈال دیا جائے۔ پولیس نہ سہی مرشد علی کے آدمی مجھے پاگل کتوں کی طرح تلاش کر رہے ہوں گے۔ ان کے ہاتھ آنا زیادہ خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ میری بوٹی بوٹی کرنے کے لئے بے تاب ہوں گے۔ دوسری طرف میرے ہاتھ کا آپریشن نہ ہو سکا تو اپنے ہاتھ سے محروم ہو سکتا تھا۔ معاملات پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے بیل بجائی۔ چند لمحے بعد ایک نوجوان میرے سامنے تھا۔

''میرے ہاتھ میں درد بڑھ رہا ہے۔''

''ابھی ڈاکٹر آ جائے گا۔'' اس نے کہا۔ ''آپ جب سے آئے ہیں، کچھ کھایا نہیں ہے، کیا کھانے کے لئے کچھ لاؤں؟''

''اگر کافی کے ساتھ سینڈوچز مل جائیں۔''

''میں ابھی لایا سر!'' اس نے کہا اور چلا گیا۔ یہ نوجوان بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ جنہوں نے مرشد علی کی کوٹھی پر حملہ کیا تھا اور اس وقت گھریلو ملازم والا کام کر رہا تھا۔ یعنی کوٹھی میں ان لوگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ممکن ہے باورچی بھی انہی میں سے کوئی ہو۔ وہ محض دس منٹ میں سینڈوچز اور کافی لے آیا تھا۔ دونوں چیزیں ذائقے والی تھیں۔ سینڈوچز سے انصاف کر کے میں کافی پی رہا تھا کہ ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے بینڈیج کھول کر میری کلائی کا معائنہ کیا اور مجھے اس کی آنکھوں میں تشویش نظر آئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر، کیا کنڈیشن ہے؟''

''اچھی نہیں ہے۔ اصل میں مجھے شبہ ہے کلائی کی رگیں متاثر ہوئی ہیں اور جلد ہڈی نہ سیٹ کی گئی تو کلائی سے اگلا حصہ خون کی روانی نہ ہونے سے بے جان ہو جائے گا۔ اپنی انگلیاں ہلاؤ۔''

میں نے کوشش کی تو بمشکل اپنا انگوٹھا ہلا سکا تھا۔ میرا ہاتھ مکمل طور پر بے حرکت رہا تھا۔ میرے اندر خوف کی لہر اٹھی تھی، کیا میرا ہاتھ ناکارہ ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا۔

''کنڈیشن ابھی اتنی خراب نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے مجھے تسلی دی۔ ''ہاں، بارہ گھنٹے بعد معاملہ خراب ہونے کے امکان ہے۔ امید ہے اس سے پہلے آپریشن کا بندوبست ہو جائے گا۔'' اس نے مجھے ایک اور انجکشن لگایا۔ ''اس سے آپ مزید چھ گھنٹے تک درد زیادہ محسوس نہیں کریں گے۔''

''شکریہ ڈاکٹر!'' میں نے کہا اور ڈاکٹر کے جانے کے بعد بیل بجا کر نوجوان کو بلایا۔ ''تمہارا انچارج کہاں ہے؟''

''وہ باہر گئے ہیں جناب...... آپ کے آپریشن کے سلسلے میں۔''

''اچھا، وہ جب آئے اسے میرے پاس بھیجنا اور ہاں، نادر علی کے بارے میں کوئی اطلاع آئی ہے؟''

''وہ بچ گیا ہے۔ اس وقت اسپتال میں ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' نوجوان نے بتایا۔ ''اسے تین گولیاں لگی تھیں۔''

''مجھے امید نہیں تھی، وہ بچ جائے گا۔''

''ہم نے جان بوجھ کر اس پر فائر نہیں کیا تھا۔'' نوجوان نے صفائی پیش کی۔ ''اس نے پستول نکال لیا

تھا۔ مجبوراً ہمیں فائر کرنا پڑے۔ اتفاق سے ایک گولی ریڑھ کی ہڈی میں لگ گئی۔ یہی خطرناک ہے ورنہ دو گولیاں اسے ٹانگ اور بازو پر لگی تھیں۔"

"اگر وہ مرجاتا ہے تب بھی تم لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اوّل تو وہ اسی قابل تھا، دوسرے تم لوگوں نے اپنے دفاع میں فائر کئے تھے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "بائی داوے تم لوگوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟"

"ہم کولیگ ہیں۔" اس نے مبہم انداز میں جواب دیا۔ "جناب، آپ کو کسی شے کی ضرورت ہو تو پھر سے یاد کر لیجئے گا۔" وہ کہہ کر چلا گیا۔ شاید میرے مزید سوالوں سے بچنے کے لئے راہ فرار اختیار کی تھی۔ اس بار ڈاکٹر نے زیادہ طاقتور انجکشن دیا تھا۔ مجھے غنودگی محسوس ہونے لگی، اور پھر میں سو گیا تھا۔ اچانک مجھے لگا جیسے کوئی مجھے حرکت دے رہا ہو۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ مجھے بستر سے اٹھا کر ایک اسٹریچر پر منتقل کیا جا رہا تھا، اس قسم کا اسٹریچر عام طور سے ایمبولینسز میں استعمال ہوتا تھا۔ پاس ہی وسیم کھڑا تھا۔

"مجھے...... کہاں لے جا...... رہے ہو؟" میں غنودہ کیفیت سے لڑتے ہوئے پوچھا۔

"لاہور!" وسیم نے جواب دیا۔ "یہاں پر خطرہ تھا، میں نے لاہور کے ایک اسپتال میں آپریشن کا بندوبست کر لیا ہے۔ موٹروے کے راستے آپ چار گھنٹے بعد لاہور میں ہوں گے۔ اسپتال پہنچتے ہی آپ کا آپریشن ہوگا۔

"تھینک یو وسیم!"

"مائی پلیور! بٹ اٹس مائی ڈیوٹی۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ "ایک ڈاکٹر بھی آپ کے ساتھ جائے گا۔ راستے میں کوئی مسئلہ ہوگا، تو یہ دیکھے گا۔"

"کیا لاہور میں مجھے خطرہ نہیں ہوگا، پولیس......"

"آپ بے فکر رہیں، جس اسپتال میں آپ کا آپریشن ہوگا۔ وہاں سب آف دی ریکارڈ ہوگا۔ کلیئر ہوتے ہی آپ کو اس ایمبولینس میں اسپتال سے کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے گا۔"

مجھے اسٹریچر پر لٹا کر بیلٹ سے باندھا جا رہا تھا۔ وسیم کے ساتھ دو اٹینڈنٹ بھی تھے۔ وہی مجھے لے جا رہے تھے۔ اسٹریچر ایک راہ داری سے ہوتا باہر آیا تھا۔ پورچ میں ایک خاصی بڑی اور جدید قسم کی سفید ایمبولینس کھڑی تھی۔ مجھے سیڑھیوں سے اتارا گیا اور جس وقت ایمبولنس کے عقبی حصے میں سوار کرایا جا رہا تھا تو میں نے کسی بڑی گاڑی کے انجن کے غرانے کی آواز سنی۔ آواز نزدیک آ رہی تھی۔ پھر بریک چرچرائے۔ دھڑ ادھڑ دروازے کھلنے کی آواز آئی اور پھر میں نے برسٹ چلنے کی آواز سنی اور کوئی چلایا۔ "خبردار! کوئی حرکت نہ کرے...... ورنہ اسے گولی ماردی جائے گی۔"

وسیم نے جیب ایک طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن اس سے پہلے تین افراد نے ہمیں گھیر لیا تھا اور کوئی نصف درجن افراد بھاگتے ہوئے کوٹھی کے اندر کی طرف گئے تھے۔ اندر سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگی۔ وسیم کا چہرہ ستا گیا۔ فائروں کے ساتھ چیخیں بھی سنائی دی تھیں جن میں موت کا کرب نمایاں تھا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ کسی کو سنبھلنے تو کیا سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ میں اور ایمبولینس کے اٹینڈنٹ دم بخود تھے۔ ڈاکٹر باقاعدہ کانپ رہا تھا۔ ایک مسلح شخص ڈرائیور کو بھی دھکیلتا ہوا لایا۔ "ادھر بیٹھو۔" اس نے پشتون لہجے میں کہا تھا۔ میں نے

دیکھا سب نے ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص اور پگڑیاں پہن رکھی تھیں۔ بعض کے چہروں پر داڑھی تھی اور بعض کلین شیو تھے۔

''تم لوگ کون ہو؟'' وسیم نے پوچھا جواب میں اس کے سر پر رائفل کی نال ماری گئی اور وہ چکرا کر گر گیا۔ یہ کون سی نئی مصیبت نازل ہو گئی۔ تین مسلح افراد ہمیں گھیرے کھڑے تھے۔ نصف درج اندر جا چکے تھے اور کئی کے ایمبولینس کے عقب سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ انہوں نے مین گیٹ بند کر دیا تھا۔ ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ کوٹھی کے باہر بھی بھاگ دوڑ اور شور شرابا جاری تھا۔ کئی گاڑیوں کے رکنے کی آواز آئی تھی۔ ایک پگڑ پوش بھاگتا ہوا آیا۔ ''اندر چلو...... پولیس آ گیا ہے۔''

وہ سب عجلت میں اندر لپکے۔ رائفل کی نوک پر ہمیں بھی اپنے ساتھ ہانک کر اندر لے گئے تھے۔ اٹینڈنٹ بادل ناخواستہ میرا اسٹریچر اٹھائے ہوئے تھے اور ان کی صورتوں سے لگ رہا تھا یہاں آنے پر وہ دل کھول کر پچھتا رہے تھے۔ نشست گاہ میں گھستے ہی ایک خونچکاں منظر سامنے آیا تھا۔ میری خدمت کرنے والا نوجوان، اس کا ایک ساتھی اور تین عدد حملہ آور خون میں لت پت پڑے تھے۔ نوجوان اور اس کا ساتھی مر چکے تھے، ان کو پورے پورے برسٹ لگے تھے۔ تینوں نے انہیں چھلنی کر دیا تھا۔ حملہ آوروں میں سے ایک یقیناً مر چکا تھا، اس کا چہرہ ہی اڑ گیا تھا۔ جبکہ باقی دو آخری دموں پر نظر آئے تھے۔ مجھے لانے والے ایک اٹینڈنٹ نے بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔ اس پر ایک وحشت ناک چہرے والے نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور اس سر سے پستول لگاتے ہوئے غرایا۔

''چپ کر خنزیر......!''

دوسرے ہی لمحے فائر کی آواز آئی اور نوجوان زمین پر گرنے سے پہلے مر گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر گولی ماری تھی۔ وحشت ناک چہرے والے نے ریوالور لہرایا۔ ''اب کسی نے آواز نکالی تو اس کا یہی حشر ہو گا۔ ان کو اندر لے چلو۔''

ہمیں دھکیل کر اندر پہنچایا گیا تھا۔ بچنے والا اٹینڈنٹ اسٹریچر کھینچ رہا تھا۔ یہ بڑا سا کمرا تھا جس پر قالین تھا اور دیواروں کے ساتھ تکیے لگے تھے۔ بے ہوش وسیم کو کھینچ کر ادھر ڈال دیا گیا تھا۔ دو مسلح افراد ہمارے اوپر لگا دیئے گئے تھے۔ جو اس طرح گھور رہے تھے جیسے ابھی کچا چبا جائیں گے۔ اچانک مجھے باہر سے مدھم سی آواز آئی۔ ''تم لوگوں کو چاروں طرف سے پولیس نے گھیر لیا ہے۔ بہتر ہے ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔ ورنہ ہم فائر کھول دیں گے۔''

میں نے محسوس کیا کہ ان دونوں مسلح افراد کی آنکھوں میں خوف نظر آنے لگا تھا۔ ان کے پیچھے پولیس لگی تھی اور وہ پناہ کے لئے اس کھلے گیٹ والی کوٹھی میں گھس آئے تھے۔ یہ ہماری بلکہ کسی حد تک میری بدقسمتی تھی، اگر وہ چند منٹ کی تاخیر سے آتے تو میں ایمبولینس میں نکل چکا ہوتا۔ ہم کل پانچ افراد تھے یعنی ڈاکٹر، اس کا مددگار، ایمبولینس کا ڈرائیور، وسیم اور میں۔ ان لوگوں کی تعداد بھی درجن بھر تھی لیکن وسیم کے ساتھیوں کی فائرنگ سے تین افراد مارے جا چکے تھے۔ مگر اب بھی نو دس افراد تھے اور سب بھرپور طریقے سے مسلح تھے۔ ایک کے ہاتھ میں، میں نے ایل ایم جی بھی دیکھی تھی جسے اسٹینڈ پر رکھ کر چلایا جاتا ہے۔ ان کے پاس اس سے بھی زیادہ تباہ کن اسلحہ

تھا۔ اس کا مجھے بعد میں پتا چلا۔

میرا اسٹریچر زمین کے برابر کر دیا گیا تھا، یہ اوپر نیچے ہونے والا اسٹریچر تھا۔ میرے پاس ہی قالین پر وسیم پڑا تھا، اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ کر چہرے تک آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پولیس نے اپنی وارننگ دہرائی تو کوٹھی کے اندر سے کسی نے رائفل کا برسٹ مارا تھا مگر پولیس نے جوابی فائر نہیں کیا۔ پھر ہم نے کسی کے چلانے کی آواز سنی۔ ''ہم نے کوٹھی والوں کو یرغمال بنالیا ہے، اگر پولیس نے اندر آنے کی کوشش کی تو ہم انہیں قتل کر دیں گے۔''

''نہیں۔'' ڈاکٹر کے منہ سے نکلا۔ ''میں مرنا نہیں چاہتا۔'' وہ باقاعدہ لرز رہا تھا۔

''چوپ کرو...... کتی کا بچہ!'' ایک نگران غرایا۔ میں ان پر غور کر رہا تھا نہ جانے کیوں مجھے ان میں کوئی بات عجیب سی لگی تھی۔ ان کا حلیہ، زبان اور انداز بالکل شمالی قبائلی باشندوں جیسا تھا لیکن کوئی چیز اس سے ہٹ کر تھی۔ شاید ان کا لہجہ...... اچانک مجھے احساس ہوا، وہ پشتو لہجے میں نہیں بلکہ کسی حد تک فارسی لہجے میں اردو بول رہے تھے۔ وہ افغانی تھے، جن کی زبان دری تھی یا اس پر فارسی کے اثرات غالب تھے۔ وہ پاکستانی پشتون نہیں تھے۔ کچھ دیر بعد وسیم ہوش میں آنے لگا۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ نگران اس سے اتنے بے نیاز تھے کہ انہوں نے اس کی جانب دیکھا بھی نہیں اور بدستور ہم چاروں کو گھورتے رہے۔ ان کے انداز میں سفاکی اور بے حسی نمایاں تھی۔ جیسے وہ جذبات اور احساسات سے عاری روبوٹ ہوں۔ ہوش میں آ کر وسیم اٹھ بیٹھا، اس نے اپنے چہرے سے خون صاف کیا اور میری طرف دیکھا۔

''تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں، لیکن ان لوگوں کے عزائم درست نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''انہوں نے تمہارے دونوں ساتھیوں کو مار دیا ہے۔''

''رفیق...... اشرف!'' اس نے جیسے خود سے کہا۔ یہ مرنے والوں کے نام تھے اور اسے یقیناً اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کا شدید دکھ تھا۔ ''انہوں نے مزاحمت کی ہوگی؟''

''ہاں، تین حملہ آور بھی ان کے ہاتھ سے مارے گئے لیکن یہ تعداد میں بہت ہیں...... کم سے کم بھی درجن ہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''کیا کوٹھی میں بس تم تین تھے؟''

''ہاں، باقی افراد دوسری جگہوں پر رہتے ہیں۔'' وہ بھی انگریزی میں بول رہا تھا اور انداز ایسا تھا جیسے میری طبیعت پوچھ رہا ہو۔ وہ میرا جسم ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا اور اس کا مقصد اس وقت سمجھ میں آیا جب اس نے کوئی سخت دھاتی شے میرے دائیں بازو تلے سرکائی۔ یہ اس کی گن تھی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں اسے بالکل نیچے کر لیا۔ وسیم دوبارہ قالین پر دراز ہو گیا۔ افغانیوں کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ انگریزی سے نابلد ہیں۔ باہر ابتدائی فائرنگ کے بعد اب خاموشی تھی۔ شاید یرغمالیوں اور انہیں قتل کی دھمکی نے پولیس کو کنفیوز کر دیا تھا اور وہ اوپر والوں سے اس بارے میں ہدایات لے رہے تھے۔ ایک بات یقینی تھی کہ اس کوٹھی کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا گیا تھا اور یہ لوگ اتنی آسانی سے یہاں سے نہیں جا سکتے تھے۔ اچانک وسیم نے سر اٹھا کر دونوں افغانیوں کو مخاطب کیا۔ ''یہ شخص مریض ہے، اس کا اسپتال میں آپریشن ہونا تھا، اسے جانے دو۔''

''ہم کو نہیں پتا۔''

''تمہارا سردار کون ہے؟''

''بکومت...... چوپ کرو۔'' افغانی کا لہجہ درشت ہوگیا تھا۔ ''ورنہ اب ہم سر میں گولی مارے گا۔''

اسی لمحے دو افغانی اندر آئے۔ ان میں سے ایک پستہ قد اور تانبے جیسے رنگ کا مالک تھا۔ اس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ اس نے تیز نظروں سے ہمارا جائزہ لیا اور اپنی زبان سے نگرانی کرنے والے افغانیوں سے کچھ کہا تو وہ پریشان نظر آنے لگے۔ ان میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا تو پستہ قد ان پر برس پڑا تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا، وہی ان کا سردار ہے۔ دونوں افغانی اپنی رائفلیں شانے پر لٹکائے آگے آئے اور پہلے ڈاکٹر کو کھڑا کر کے اس کی تلاشی لی اور اس کے پاس سے ہر شے ہتھیا لی۔ پھر یہی سلوک ایمبولینس ڈرائیور اور اٹینڈنٹ کے ساتھ کیا تھا۔ پھر وسیم کو کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ سُستی سے کھڑا ہوا۔ اس کی تلاشی لی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میری باری تھی اور میرے پاس سے پستول برآمد ہو جاتا تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ ایک افغانی میری طرف آیا اور اس نے میرے جسم پر ہاتھ پھیرا کر تلاشی لی۔ مگر اس نے میرے جسم کے نچلے حصے کو نہیں دیکھا۔ جہاں گن دبی تھی۔ سوائے میرے باقی چار افراد کو اس طرح دیوار کے ساتھ بٹھا دیا گیا کہ ان کے ہاتھ ان کے سروں پر رکھے تھے۔ میں زخمی کلائی کی وجہ سے ان کی نظروں میں پہلے ہی ناکارہ تھا۔ مجھے اپنی کلائی کی فکر تھی۔ ڈاکٹر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کلائی کا بروقت آپریشن نہ کیا گیا تو گینگرین کا خطرہ تھا۔ جس کے بعد ہاتھ کاٹنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہتا۔ میں نے پستہ قد افغانی کو مخاطب کیا۔ ''کیا تم اردو جانتے ہو؟''

''اچھی طرح۔'' اس نے کھردرے انداز میں کہا۔

''میرے ہاتھ میں فوری آپریشن ہونا ہے، میں اسپتال جارہا تھا۔''

''ابھی تو تم ہاتھ کے بجائے اپنی جان کی فکر کرو۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''ہمیں ایک ایک یرغمال کی اشد ضرورت ہے۔''

''پولیس تمہیں جانے نہیں دے گی۔'' میں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ ہم تم سب کو قتل کر کے پولیس سے لڑیں گے۔ ممکن ہے مر جائیں یا بھاگ جائیں۔''

''مم...... مجھے باتھ روم جانا ہے۔'' ڈاکٹر نے لرزتی آواز میں کہا۔

''یہ باتھ روم ہے۔'' پستہ قد نے ایک دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ ''لیکن ادھر سے نکلنے کا اتنا بڑا راستہ ہے، تم جا کر فارغ ہو لو لیکن دروازہ بند نہیں ہوگا۔''

ڈاکٹر بے چوں و چرا اندر چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پستہ قد نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ فارسی آمیز افغانی بول رہے تھے۔ پستہ قد سردار کا ساتھی باہر چلا گیا۔ جیسے ہی ڈاکٹر آیا، سردار نے اعلان کیا۔ ''یہ کمرا تم لوگوں کے لئے صحیح نہیں ہے، ادھر سے چلو۔''

ہمیں کوٹھی کے اندرونی حصے کے ایک کمرے میں لایا گیا۔ یہ اسٹڈی روم تھا۔ انہوں نے اس کی تلاشی لی اور ہر ایسی شے نکال لی جسے ہم ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتے۔ اس کے ساتھ چھوٹا سا اٹیچ باتھ بھی تھا اور یہاں سے نکلنے کا صرف ایک دروازہ تھا جسے بند کر دیا گیا۔ اب افغانی ہماری طرف سے بے فکر ہو کر پولیس والوں پر توجہ

دے سکتے تھے۔ میرا اسٹریچر ایک طرف دیوار کے ساتھ تھا۔ افغانیوں کے جاتے ہی وسیم حرکت میں آیا، اس نے سب سے پہلے واش روم میں جا کر اپنا زخم دھویا۔ وہاں پر کوئی دوا بھی رکھی تھی۔ جسے لگا کر اس نے خون کو روک دیا پھر وہ میرے پاس آیا۔

''مجھے افسوس ہے شہباز صاحب! میں آپ کو اسپتال پہنچانے کا وعدہ پورا نہ کر سکا۔''

''اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''یہ تو تقدیر کا لکھا تھا۔''

وسیم نے اتنی آہستہ آواز میں کہا کہ دوسرے نہ سن سکیں۔ ''ہم خود کو ان لوگوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمیں پولیس پر انحصار کرنے کے بجائے خود کچھ کرنا ہوگا۔''

''مثلاً......؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''ان نو دس مسلح افراد کے خلاف ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں، لایئے پستول دیں۔'' اس نے پھر آہستہ سے کہا اور پستول نکال کر اپنی قمیص تلے پتلون میں اڑس لیا۔

''مجھے کھولو...... میں اس پوز میں لیٹے لیٹے تھک گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ وسیم نے بیلٹ کھول کر مجھے اسٹریچر سے آزاد کر دیا۔ میں نے اس بیلٹ کی مدد سے بائیں ہاتھ کو گلے سے لٹکا لیا۔ سب سے پہلے میں واش روم گیا۔ شام کے کھائے سینڈوچز ہضم ہو چکے تھے اور مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ مگر فی الحال صرف پانی کا آسرا تھا۔ وسیم بے حد خاموشی اور احتیاط سے اسٹڈی میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ عین ممکن تھا، دروازے کے باہر کوئی ہو اور وہ آوازیں سن کر اندر آ جائے۔ بالآخر وسیم کو مطلوبہ شے مل گئی۔ یہ چاکلیٹ کا بڑا سا ڈبا تھا جو اس نے ایک بک شیلف میں کتابوں کے عقب سے دریافت کیا تھا۔ وہ ڈبا لے کر میرے پاس آیا۔

''مجھے چاکلیٹ پسند ہے۔ اسے میں نے چھپایا تھا۔ کیونکہ رفیق ڈھونڈ کر میری لائی چاکلیٹیں کھا جاتا تھا۔ یہ نہ جانے اس سے کیسے بچ گیا؟'' اپنے ساتھی کا ذکر کرتے ہوئے اس کا لہجہ دکھی ہو گیا تھا۔ ''میرا خیال ہے آپ کو بھوک لگی ہے۔''

''ہاں دوست!'' میں نے ڈبے سے ایک چاکلیٹ نکالی۔ ''تم بھی لو۔''

''نہیں شکریہ...... میں فی الحال ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔'' اس نے انکار کیا، نہ جانے سچ مچ اسے بھوک نہیں تھی یا وہ اس خیال سے نہیں لے رہا تھا کہ میں کھا لوں۔ اسے معلوم تھا، میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ایک چاکلیٹ کھا کر میں نے ہاتھ روک لیا۔ نہ جانے ہمیں کب تک یہاں رہنا پڑے اور دوسرے بھی تھے۔ وسیم نے انہیں بھی پیش کش کی مگر کوئی چاکلیٹ کھانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ سب پہلی بار اس قسم کے حالات سے دوچار ہوئے تھے جب موت سامنے کھڑی نظر آتی ہے۔ ان کی بھوک پیاس اڑ جانا فطری بات تھی۔ وسیم کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اور گزشتہ چند دن میں، جن حالات سے میں گزرا تھا، ایک طرح سے میں بھی عادی ہو چکا تھا اس لئے میری بھوک بھی برقرار تھی اور پیاس بھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ دیئے جانے والے انجکشن کا اثر زائل ہو رہا تھا اور میرے ہاتھ میں تکلیف بڑھنے لگی تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے اس کا ذکر کیا۔ اس نے میری کلائی کا معائنہ کیا۔ ''سوجن خطرناک ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ سے رگیں بلاک ہونے سے پنجے کے مردہ ہونے کا خطرہ ہے۔ ممکن ہے رگوں پر دباؤ کم کرنے کے لئے

کٹ لگانا پڑے لیکن میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"تمہارا میڈیکل بکس کہاں ہے؟" وسیم نے اس سے پوچھا۔

"ایمبولینس میں۔" ڈاکٹر بولا۔ "کاش میں آتا ہی نہیں۔ دو ہزار روپے کے لالچ نے مروا دیا۔"

"اب آ ہی گئے ہو تو رونے سے کیا فائدہ؟" وسیم بولا۔ "ان لوگوں سے تمہارا میڈیکل بکس لینے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"نہیں، یہ ہمیں مار دیں گے۔" ڈاکٹر کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

"فکر نہ کرو...... فی الحال ہم ان کے لئے ضروری ہیں۔" وسیم نے اٹھ کر دروازہ بجایا۔ "فوراً ہی باہر سے غراتی آواز میں کسی نے کچھ کہا، وسیم چلایا۔ "ہمیں مریض کی دوا چاہئے...... دروازہ کھولو۔"

دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور وسیم پھرتی سے پیچھے نہ ہو جاتا تو اس کے منہ پر لگتا۔ افغانی نے اندر آتے ہی اس کے سینے پر رائفل رکھ دی۔ "تم کو کیا تکلیف ہے؟" وہ غرایا۔

"اس کے بازو میں درد ہو رہا ہے۔ اسے دوا کی ضرورت ہے جو باہر ایمبولینس میں رکھی ہے۔"

"اس کا علاج ہم اس سے کرے گا۔" افغانی نے رائفل لہرائی۔ "اب جس نے دروازہ بجایا، ہم اس کا سر میں گولی مارے گا۔" اور دھڑام سے دروازہ بند کر لیا۔

ڈاکٹر نے سکون کا سانس لیا۔ "شکر ہے اس نے گولی نہیں چلائی۔"

"گولی سے ڈرتے ہو...... حالانکہ مقدر میں جو گولی ہے وہ تمہیں کھانی پڑے گی۔" وسیم اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ صرف دکھاوا کر رہا تھا۔ ورنہ ابھی یہ ہمیں گولی نہیں مار سکتے۔ ہمیں ڈھال بنا کر پولیس کے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔"

میں نے میز پر رکھے فون کی طرف دیکھا۔ "یہ کام نہیں کر رہا ہے؟"

"نہیں، انہوں نے تاریں کاٹ دی ہیں بہت چالاک لوگ ہیں۔" وسیم نے سر ہلایا۔ "کاش کہ مجھے باہر رابطہ کرنے کا موقع مل جائے۔"

"میرے لئے مسئلہ ہو جائے گا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اگر ان لوگوں سے بچ گیا تو باہر والے نہیں چھوڑیں گے۔"

"ان کی فکر مت کرو۔" وسیم بولا۔ "فی الحال مسئلہ یہ لوگ ہیں۔"

اسی لمحے کمرے میں عجیب سی آواز گونجی۔ یہ مسلسل تیز مدھم ہوتی آواز تھی۔ اٹینڈنٹ نے جھپٹ کر اپنے گلے میں ہاتھ ڈالا اور سیاہ ڈوری باہر کھینچ لی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا اور پتلا سا موبائل فون لٹکا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی اور آواز رک گئی۔ ریسیو کر کے اس نے کال کاٹ دیا اور موبائل بند کر دیا۔ وسیم جھپٹ کر اس کے پاس پہنچا۔ "احمق آدمی! تم اسے چھپا کر بیٹھے تھے۔"

"ڈاکوؤں کی نظر پڑ جاتی تو وہ چھین لیتے۔ قیمتی موبائل ہے میرے بھائی نے امریکا سے بھیجا ہے۔" وہ گڑگڑا کر بولا تھا۔

"گدھے...... بے وقوف!" وسیم کا غصے سے برا حال تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے دو تین ہاتھ رسید کر

دے گا مگر پھر اس نے خود پر قابو پایا اور اس سے موبائل چھین لیا۔

''اے یہ کیا کر رہے ہو؟'' اٹینڈنٹ نے احتجاج کیا۔

''چپ رہو۔'' وسیم غرایا۔ اسی لمحے دروازہ دھڑام سے کھلا اور افغانی نے اندر جھانکا۔

''اب تم لوگوں کا آواز آیا تو ہم......'' آگے اس نے بے حد شرمناک بات کی تھی۔

''یہ لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔'' وسیم مسکرایا۔ ''میں انہیں چپ کرا رہا تھا۔''

اس نے موبائل اپنی ہتھیلی میں چھپا لیا تھا۔ یہ بے حد مختصر سا تھا۔ شاید اسی وجہ سے تلاشی لینے والوں سے بچ گیا تھا۔ سیاہ ڈوری کو میں تعویذ کی ڈوری سمجھ رہا تھا جیسی کہ اکثر لوگ پہنتے ہیں۔ میری طرح تلاشی لینے والوں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس میں موبائل فون لٹک رہا تھا۔ افغانی کچھ دیر ہمیں گھورتا رہا اور پھر دروازہ بند کر لیا۔ اس کے جاتے ہی وسیم نے جھک کر آہستہ سے اٹینڈنٹ سے کہا۔ ''اب موبائل کا نام بھی مت لینا ورنہ یہ موبائل چھپانے کے جرم میں سب سے پہلے تمہیں مار ڈالیں گے۔''

''م......میں نہیں بولوں گا۔''

''اسی میں تمہاری عافیت ہے۔ یہ بتاؤ کہ اس میں بیلنس کتنا ہے، بیٹری کتنی دیر چلے گی؟''

''ابھی پانچ سو والا کارڈ ڈلوایا ہے۔ اس سے دو گھنٹے سے زیادہ بات ہو سکتی ہے۔''

وسیم سر ہلا کر میری طرف آیا۔ ''میں بات کرنے جا رہا ہوں۔ اگر کوئی آئے تو تم زور سے کراہنا، میں سمجھ جاؤں گا۔''

''تم فکر مت کرو......لیکن جلدی کرو......اب یہ کسی وقت بھی پولیس سے الجھ سکتے ہیں اور سب سے پہلے شامت ہماری آئے گی۔''

وسیم باتھ روم میں چلا گیا تا کہ اس کے بات کرنے کی آواز باہر نہ جائے۔ اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے، میرے بازو کی تکلیف خاصی بڑھ چکی تھی، معمولی سی حرکت سے بھی ایسی ٹیس اٹھتی تھی کہ کراہ نکل جاتی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ میں ہاتھ کو کم سے کم حرکت دوں۔ سوجن اب اتنی بڑھ گئی تھی کہ پٹی کلائی میں گڑ گئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا، اسے ڈھیلا کر دے۔ اس نے پٹی کھولی اور سوجن کا معائنہ کیا۔ میں نے اس کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ صورتِ حال اچھی نہیں ہے۔ سوجن میں ایک نیلاہٹ مائل چمک صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ ''یہ وسیم صاحب جو حرکت کر رہے ہیں کہیں ہم سب ہی نہ مارے جائیں۔'' اس کے انداز میں تلخی تھی۔

''فکر مت کرو وہ خودکشی کرنے والے لوگوں میں سے نہیں ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''اور وہ کچھ نہ بھی کرے تب بھی ہم شدید خطرے میں ہیں۔ یہ سارے مرنے مارنے والے لوگ ہیں۔ اگر پولیس نے ریڈ کر دیا تو یہ مرنے سے پہلے ہمیں مار دیں گے۔''

''وہ ہمیں مروا دے گا۔'' اٹینڈنٹ چیخ اٹھا تھا۔

''خود پر قابو رکھو ورنہ وقت سے پہلے مر جاؤ گے۔'' میں نے دھیمے مگر سخت لہجے میں کہا تھا۔ اسی لمحے افغانی نے پھر دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو سب چپ ہو گئے تھے۔ چند لمحے ہمیں گھورنے کے بعد دروازہ بند کر لیا تھا۔

غالباً اس نے سمجھ لیا تھا کہ ہم چپ نہیں رہیں گے۔ لہٰذا اس نے بھی بولنا بند کر دیا تھا لیکن آواز آنے پر ہماری سرگرمیوں کا جائزہ ضرور لیتا تھا۔ اس نے وسیم کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔ اس کے دروازہ بند کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں نے کراہ کر وسیم کو خبردار نہیں کیا تھا لیکن باتھ روم سے اس کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ افغانی نے بھی غور نہیں کیا تھا کہ وسیم کمرے میں نہیں ہے ورنہ وہ اس کے بارے میں پوچھتا یا اس نے اپنے طور پر فرض کر لیا تھا کہ وہ باتھ روم میں ہے۔

وسیم کچھ دیر بعد آیا تھا۔ اس نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے اپنے ایک واقف کار ایس پی سے بات کی ہے۔ اتفاق سے وہی اس آپریشن کی کمان کر رہا ہے۔ اس نے بتایا، یہ لوگ دہشت گرد ہیں اور انہوں نے راولپنڈی کے ایک تھانے پر حملہ کر کے اپنے دو ساتھیوں کو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ جنہیں پولیس نے دو روز پہلے ایک بس میں بم نصب کرتے ہوئے گرفتار کیا تھا۔ پولیس نے ان کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ خاصی خونریزی ہوئی ہے۔ تھانے پر حملے میں ان کے چھ ساتھی مارے گئے۔ دو پولیس والے بھی ہلاک ہوئے ہیں۔ اس کے بعد یہ فرار پر مجبور ہوئے۔ پولیس ان کے تعاقب میں تھی۔ اس سے بچنے کے لئے یہاں گھس آئے۔ اب یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ صبح چھ بجے تک ان کے دونوں ساتھی رہا کر کے ان تک نہ پہنچائے تو وہ ہر گزرنے والے گھنٹے میں ایک یرغمالی کو ہلاک کر دیں گے۔ میں نے اسٹڈی روم میں لگے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ چار بجنے میں بارہ منٹ تھے۔

''یعنی کوئی سوا دو گھنٹے بعد ہم میں سے کوئی ایک جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔''

''امکان یہی ہے کیونکہ پولیس کے حکام ان دو افراد کو رہا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ان سے دہشت گردوں کے اہم منصوبوں کے انکشاف کی توقع ہے۔''

''اس صورت میں ہمارا ردعمل کیا ہونا چاہئے؟''

''ہم لڑیں گے۔ میں نے ایس پی کو اندر کی صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس نے ایک گھنٹے بعد پھر رابطہ کرنے کو کہا ہے۔''

''بہتر ہے موبائل کہیں چھپا دو۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''نہیں...... میں یہ خطرہ نہیں مول لے سکتا۔'' اس نے کہا۔ ''ممکن ہے یہ ہمیں کسی اور کمرے میں منتقل کر دیں۔ اس صورت میں موبائل ہاتھ سے جائے گا۔''

''مجھے ان لوگوں کی طرف سے خوف ہے۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''یہ خوف زدہ ہیں...... ڈر کر راز نہ کھول دیں۔''

''میں انہیں سمجھاتا ہوں۔''

''ہاں، لیکن حقیقت مت بتانا...... کوئی حوصلہ افزا بات کہنا۔'' میں نے کہا۔ ہم اتنی آہستگی سے بات کر رہے تھے کہ ان تینوں تک آواز بے شک جا رہی ہوگی لیکن الفاظ ان کی سمجھ سے باہر تھے اور انہیں اس کی پروا بھی نہیں تھی کہ ہم کیا بات کر رہے ہیں؟ میرے پاس سے اٹھ کر وسیم ان کے پاس گیا اور آہستہ سے ان سے بات کرنے لگا۔ میرے بازو کا درد رفتہ رفتہ ناقابلِ برداشت حدوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اسٹریچر پر لیٹ گیا اور

درد سے توجہ ہٹانے کے لئے سفیر اور مونا کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے غائب ہونے سے وہ طیش میں اور پھر پریشان ہوں گے۔ پھر مرشد علی نے ندیم سے رابطہ کیا ہوگا تب انہیں پتا چلا ہوگا کہ میں کن لوگوں کے قبضے میں ہوں۔ ندیم نے تصویر کا تبادلہ میرے ساتھ منظور کر لیا ہوگا۔ اچانک مجھے خیال آیا، میں ندیم کو آگاہ کر سکتا تھا۔ اسے تصویر کے تبادلے سے روک سکتا تھا ورنہ مرشد علی اس سے دھوکا کر کے بھی تصویر لے سکتا تھا۔ میں نے اسٹریچر سے اٹھتے ہوئے وسیم کو اشارہ کیا۔ وہ پاس آیا تو میں نے اس سے موبائل مانگا۔ ''مجھے ایک بے حد ضروری بات کرنی ہے۔''

''ضرور کریں...... لیکن خیال رہے، بیٹری پر زور نہ پڑے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے کہا اور موبائل لے کر باتھ روم میں آ گیا۔ اندر سے دروازہ بند کر کے نل کھلا چلایا اور ندیم کا موبائل نمبر ملایا۔ اس نے دوسری بیل پر کال ریسیو کی۔ میری آواز سن کر وہ چلایا۔ ''اوئے شوبی کے بچے! تُو زندہ ہے، ہم تو تیرا سوم کرنے جا رہے تھے۔''

''بکواس بند کر اور غور سے سن...... میں مرشد کے چنگل سے نکل آیا ہوں، اسے تصویر مت دینا۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہے، نادر علی مرتے مرتے بچا ہے۔ پر تُو کہاں ہے؟''

''بدقسمتی سے اس کوٹھی میں...... جس پر دہشت گردوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ کوئی چینل لگا کر دیکھ...... اس کی خبر آ رہی ہوگی۔ امکان یہی ہے اگر دہشت گردوں سے بچ گیا تو پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤں گا اور نادر علی کا کیس بھی میرے سر ڈال دیا جائے گا۔ اس بارے میں کچھ کر اور اس تصویر کو بہت احتیاط سے کہیں چھپا دے۔ مرشد علی سے نمٹنے کے لئے وہ ہمارا ٹرمپ کارڈ ہے، اچھا خدا حافظ...... اس نمبر پر کال مت کرنا کیونکہ میں دہشت گردوں سے چھپ کر کال کر رہا ہوں۔''

''سن تو......'' ندیم چلاتا رہ گیا لیکن میں نے کال کاٹ دی۔ ہاتھ دھو کر میں باہر آیا اور موبائل وسیم کے حوالے کر دیا۔

''اس کی بیل آف کر دو۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔

''یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔'' اس نے کہا۔

چارج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ ایس پی نے وسیم سے پانچ بجے کال کرنے کو کہا تھا۔ وہ مضطرب لگ رہا تھا۔ اس نے میرے پاس آ کر کہا۔ ''کیا آپ کو پستول چلانی آتی ہے؟''

''بہت اچھی طرح...... لیکن اس حالت میں نہ جانے میں کیا کر سکوں گا۔''

''آپ حوصلہ مند آدمی ہیں۔'' اس نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''میرا خیال ہے ان حالات میں ان لوگوں سے زیادہ کام آئیں گے۔'' اس نے ان تینوں کی طرف دیکھا۔

''تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میرا ارادہ نہیں اندازہ ہے کہ ایس پی اندر باہر سے بیک وقت کارروائی کرنے کا منصوبہ پیش کرے گا۔ پہلے میں اندر والے پر قابو پاؤں گا۔ اس کے بعد ہم اس کے اسلحے سے ان لوگوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ دوسری طرف کمانڈوز باہر سے کارروائی کر کے انہیں ٹیک اوور کر لیں گے مگر اس

میں درست ٹائمنگ اور خوش قسمتی ضروری ہے۔"

میں سمجھ رہا تھا۔"اگر کارروائی شروع ہونے کے بعد ہم اس کمرے تک محصور رہے تو نقصان میں رہیں گے۔"

اس نے سر ہلایا۔"ہمیں کم سے کم دو مورچے بنانا ہوں گے۔ اس کمرے سے ذرا آگے ایک دو چھتی ہے۔ وہ اچھی جگہ ہے۔"

اس اثنا میں باہر موجود افغانی نے اندر جھانکا۔ یہ کوئی دوسرا تھا۔ پہلے والا شاید آرام کرنے چلا گیا تھا۔ اس نے دانت نکالے۔"تیار ہو جاؤ، ہم نے پولیس کو چھ بجے کا ٹائم دیا ہے۔"

"کس...... کس چیز کا ٹائم؟" ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا تھا۔

"تم میں سے ایک کام آئے گا۔ قربانی کا بکرا...... اگر پولیس نے ہمارے ساتھی کو نہ چھوڑا تو۔"

ڈاکٹر نے احمقانہ انداز میں وسیم کی طرف دیکھا۔"تم نے تو کچھ اور کہا تھا۔" وہ ہذیانی لہجے میں بولا۔

"تم نے کیا کہا تھا؟" افغانی نے مشکوک نظروں سے وسیم کی طرف دیکھا۔

"میں نے اسے تسلی دی تھی کہ تم ہمیں کچھ نہیں کہو گے۔" وسیم بولا اور اٹھ کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔"فکر نہ کرو، یہ ہمیں ڈرا رہا ہے۔"

حیرت انگیز طور پر ڈاکٹر چپ ہو کر بیٹھ گیا ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ابھی مزید واویلا کرے گا اور ہمارا بھنڈا پھوٹ جائے گا۔ افغانی ہنستا ہوا چلا گیا۔"مزہ کرو جب تک۔" اس نے دروازہ بند کر لیا۔

اس کے جاتے ہی وسیم نے پستول نکال کر ڈاکٹر کے سر پر رکھ دیا اور خونخوار لہجے میں بولا۔"کیا تم مجھے جانتے نہیں ہو؟ اب کسی کے منہ سے ایک لفظ غلط نکلا تو وہ میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔"

ڈاکٹر کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔"مجھے معاف کر دو، میں پاگل ہو گیا تھا۔"

"بہتر ہے اپنے حواسوں میں رہو۔" وسیم نے جھٹکا دے کر اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

"چار بج کر اڑتالیس منٹ ہو رہے تھے۔ وسیم بے چین ہونے لگا۔ اس نے پستول میرے حوالے کیا "میں ایس پی سے بات کرنے جا رہا ہوں، ان کا خیال رکھنا۔"

"فکر نہ کرو۔" میں نے کہا۔ وسیم واش روم میں چلا گیا۔

☆======☆======☆

میں دھڑکتے دل کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ آنے والے لمحات ہمارے لئے کیا لاتے ہیں۔ وسیم کا منصوبہ بظاہر اچھا تھا لیکن اس پر کامیابی سے عمل درآمد کے لئے بہت سارے اتفاقات کا یکجا ہونا ضروری تھا۔ افغانیوں کے بارے میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا، وہ سب بے حد خونخوار اور سفاک قسم کے لوگ تھے۔ ہم سے خطرہ محسوس کرتے تو ہمیں مارنے میں چند لمحے لگاتے۔ پولیس کے گھیرے میں آ کر ان کی حالت زخمی درندے کی سی ہو رہی تھی جو سامنے آنے والے ہر انسان پر جھپٹ پڑتا ہے۔ ابھی وسیم باتھ روم میں تھا کہ افغانی نگران نے اندر جھانکا اور وسیم کو نہ پا کر پوچھا۔"تمہارا ساتھی کدھر ہے؟"

"باتھ روم میں...... اس کا پیٹ خراب ہے۔" میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

افغانی ہنسا۔ ''اسے کہو اپنا پیٹ ٹھیک کر لے......اس کا باری بھی جلد آئے گا۔''
میں نے پستول والا ہاتھ آڑ میں کر لیا تھا۔ افغانی کی بات پر میں نے ان تینوں کا ردِعمل دیکھا۔ ان کے
چہرے خوف سے سفید پڑ گئے تھے۔ اچانک اٹینڈنٹ چلایا۔ ''وہ اندر پولیس والوں سے بات کر رہا ہے۔ اس
میں ہمارا قصور نہیں ہے۔''
''کیا......؟'' افغانی چلایا۔ وہ باتھ روم کی طرف دوڑا اور اس کے دروازے پر ٹکر ماری مگر دروازہ اندر
سے بند تھا۔ ''باہر آؤ......ورنہ ام گولی مار دے گا۔''
میرا دل چاہا کہ اٹینڈنٹ کو گولی مار دوں۔ اس نے نہ صرف وسیم کا منصوبہ ناکام بنا دیا تھا بلکہ اس کی اس
بزدلانہ حرکت کی وجہ سے موت تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔
''یہ بکواس کرتا ہے۔'' میں نے افغانی سے کہا۔ ''وہ بھلا پولیس سے کیسے بات کر سکتا ہے؟''
''اس کے پاس میرا موبائل فون ہے۔'' اٹینڈنٹ نے مزید گل افشانی کی۔ ''اس پر بات کر رہا ہے۔''
''موبائل فون......!'' افغانی سن کر پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر دروازے پر برسٹ مارا۔
کمرے میں فائرنگ کی آہنی جھنکار گونجی۔ مجھے لگ رہا تھا افغانی سامنے آتے ہی وسیم کو مار دے گا یا مار چکا تھا۔ اس
نے دس بارہ گولیاں چلائی تھیں۔ پھر پیچھے ہٹ کر اس نے دروازے پر لات ماری۔ گولیاں لگنے سے اندر سے
کنڈی کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ دروازہ کھل گیا۔ اس سے پہلے کہ افغانی دوبارہ برسٹ مارتا، میں نے عقب سے
اس کے سر میں گولی اتار دی۔ وہ تیورا کر گرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی باہر سے دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگی
تھیں۔

''وسیم!'' میں نے چلا کر کہا۔ ''وہ آ رہے ہیں۔''
وسیم کسی تند بگولے کی طرح واش روم سے نکلا تھا اور مرنے والے افغانی کی رائفل لے کر باہر کی طرف لپکا
تھا۔ دروازے سے نکلتے ہی اس نے فائر کیے۔ چیخوں کی آواز نے بتایا کہ اس کے فائر بے کار نہیں گئے تھے۔ وہ
راہ داری میں غائب ہو گیا۔ مشکل سے ایک منٹ بعد وہ مزید دو عدد رائفلیں اور ان کے میگزین لے کر اندر آ چکا
تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور ان تینوں سے بولا۔ ''منہ کیا دیکھ رہے ہو، یہ الماری کھسکاؤ۔''
وہ تینوں اب تک سکتے کے عالم میں بیٹھے تھے۔ وسیم کے کہنے پر بادلِ نخواستہ حرکت میں آئے اور ایک
بھاری الماری کھسکا کر دروازے کے سامنے کر دی۔ عین اسی لمحے باہر سے کسی نے دروازے پر برسٹ مارا۔ اگر
الماری سامنے نہ ہوتی تو گولیاں اندر تک آ سکتی تھیں۔ لاک ٹوٹتے ہی دروازہ بھی کھل جاتا۔
''ایک اور الماری سامنے کرو۔'' وسیم نے حکم دیا اور ان چاروں نے مل کر کتابوں سے بھری ایک اور
الماری کھسکا کر دروازے کے سامنے کر دی تھی۔ ''تم میں سے کسی کو رائفل یا پسٹل چلانی آتی ہے۔''
''مجھے آتی ہے۔'' ڈرائیور نے اعترافِ جرم کرنے والے انداز میں کہا۔
''اسے سنبھالو۔ اگر کوئی اندر آنے کی کوشش کرے، اسے بے دریغ شوٹ کر دینا۔''
''ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' ڈاکٹر بولا۔
''شٹ اپ......اگر تم کچھ کر نہیں سکتے ہو تو اپنا منہ بند رکھو۔'' وسیم نے اسے جھڑک دیا اور میری طرف

دیکھا۔ ''کیا آپ رائفل چلا سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم ایس پی سے بات کر کے اسے یہاں کی پچویشن بتاؤ۔ ورنہ انہوں نے دستی بم استعمال کیا تو......''

''میں سمجھ گیا۔'' وسیم نے میری بات کاٹی اور موبائل نکال کر رابطہ کرنے لگا۔ کئی بار اس نے کوشش کی مگر کسی وجہ سے موبائل کام کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ ''نیٹ ورک کا مسئلہ آ رہا ہے۔ لائن بزی مل رہی ہے۔''

''حالانکہ اس وقت ایس پی کو اپنا موبائل فری رکھنا چاہئے تھا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''اس نے کہا تھا کہ موبائل فری رکھے گا۔''

''حکام بالا...... یہ بات کہاں سمجھتے ہیں؟ ان کے نزدیک خود صورت حال سے آگاہ رہنا ضروری ہوگا۔'' وسیم بار بار کوشش کر رہا تھا اور کمرے کے باہر سے بھاگ دوڑ کرنے اور افغانیوں کے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ''بہتر ہے، ہم دروازے کے سامنے سے ہٹ جائیں۔''

اسی لمحے باہر سے کسی نے بھاری مشین گن کا برسٹ مارا جس کی گولیاں دروازے اور الماریوں سے گزرتی ہوئی سامنے شیشے کی الماری پر لگی تھیں۔ چھناکے سے سارے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ میں اسٹریچر پر بیٹھا تھا اور بال بال بچا۔ اس کے ساتھ ہی سب بھاگ کر دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے۔ وسیم نے جھنجلا کر موبائل میز پر رکھ دیا اور ہونے والے ایک سوراخ سے اپنی رائفل کی نال نکال کر برسٹ مارا۔ کوئی شامت کا مارا پھر سامنے آ گیا تھا کیونکہ میں نے چیخ کی آواز سنی تھی۔

''وہ مارا!'' وسیم چلایا اور پیچھے ہو گیا۔

ڈاکٹر اور باقی دو افراد سخت ڈرے ہوئے تھے۔ ''سنو، ہمیں باتھ روم جانے دو۔ ان حالات میں ہم یہاں نہیں رک سکتے۔''

''باہر جانے کا ارادہ ہے؟'' وسیم نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

اس نے ڈاکٹر کی پوری بات نہیں سنی تھی۔ ''ہمیں باتھ روم میں جانے دو۔'' ڈاکٹر نے پھر التجا کی۔ باتھ روم باہر والے دروازے کے سامنے تھا اور اگر باہر سے فائرنگ ایک خاص زاویے سے کی جاتی تو گولیاں باتھ روم کے اندر تک رسائی حاصل کر سکتی تھیں۔ وہاں جگہ کم تھی اس لئے بچنے کی گنجائش بھی محدود تھی۔ یہی سوچ کر وسیم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم لوگ اس جگہ زیادہ محفوظ ہو۔''

''ہم باتھ روم میں جائیں گے۔'' ڈاکٹر غصے سے بولا۔ ''یہ ہماری جان کا مسئلہ ہے۔''

اس کی حالت اس کبوتر کی سی ہو رہی تھی جو خطرہ سامنے دیکھ کر آنکھ بند کر لیتا ہے۔ ''میں روک نہیں رہا صرف سمجھا رہا ہوں...... باتھ روم محفوظ جگہ نہیں ہے۔''

''ہم خود بھی عقل رکھتے ہیں۔'' ڈاکٹر بولا اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔ مارے جانے والے افغانی کی لاش دروازے کے عین سامنے پڑی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے پھلانگنے کے لئے قدم بڑھایا تھا کہ باہر سے بھاری مشین گن پھر گرجی اور میں نے ڈاکٹر کی پشت میں کوئی نصف درجن سوراخ نمودار ہوتے دیکھے۔ ڈاکٹر منہ کے بل افغانی کی لاش پر گرا اور شاید گرنے سے پہلے وہ مر چکا تھا۔ برسٹ نے اس کے سارے ہی اعضائے رئیسہ

چھید ڈالے تھے۔ اٹینڈنٹ کے منہ سے چیخ نکلی تھی اور اس نے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا شروع کر دیا تھا۔ ڈرائیور کا چہرہ ست گیا تھا اور میں اور وسیم تاسف بھری نظروں سے ڈاکٹر کی لاش دیکھ رہے تھے۔

''کسی اور نے من مانی کرنی ہے تو اپنا شوق پورا کر لے۔'' وسیم سرد لہجے میں بولا لیکن اٹینڈنٹ اور ڈرائیور اپنی جگہ ساکت رہے تھے۔ وسیم ایک بار پھر ایس پی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر رابطہ ہو گیا۔ میں نے وسیم کو چلاتے سنا۔ ''ایس پی صاحب، آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ ہمیں قتل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم ایک کمرے میں محصور ہو چکے ہیں۔'' وہ چپ ہو کر سننے لگا۔ ''ہمارے پاس تین رائفلیں ہیں لیکن ان سے ہم کب تک مشین گنوں اور بموں کا مقابلہ کریں گے۔ انہوں نے ایک دستی بم اندر پھینک دیا تو ہم سب کے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔ ڈاکٹر مارا جا چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم بھی مارے جائیں، خدا کے لئے اپنی فورس حرکت میں لے آئیں......اوکے......اوکے۔'' اس نے کال ختم کر دی اور مجھے بتایا۔ ''پولیس ریڈ کرنے والی ہے۔''

''خدا خیر کرے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''ہماری پولیس ریڈ کرتے ہوئے اپنے پرائے اور گناہ گار اور بے گناہ میں فرق نہیں کرتی ہے۔ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتی ہے۔''

وسیم ہنسا۔ ''درست کہا آپ نے......ممکن ہے ان افغانیوں سے بچ جائیں اور پولیس کے ہاتھوں مارے جائیں، سب ہوشیار رہیں۔'' اس نے اچانک رائفل دروازے کے ایک سوراخ سے نکالتے ہوئے نیم دائرے میں برسٹ مارا......لیکن اپنے تین چار ساتھی گنوانے کے بعد افغانی بھی ہوشیار ہو گئے تھے۔ میں نے حساب لگایا۔ کم سے کم سات افراد ان کے بھی مارے جا چکے تھے اور اب ان کی تعداد پانچ چھ رہ گئی تھی گویا عددی لحاظ سے برتری زیادہ نہیں تھی جبکہ انہیں باہر پولیس کی کثیر نفری کا بھی سامنا تھا مگر ان کے پاس اسلحہ کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ پتا نہیں پولیس باہر کیا کر رہی تھی۔ ایس پی سے بات کئے پانچ منٹ ہونے کو آئے تھے اور اب تک باہر سے کوئی ردِعمل دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

اچانک کمرے کے دروازے کے سامنے زبردست دھماکا ہوا اور دروازے کے پرخچے اڑ گئے۔ ایک الماری فرش پر آ گری اور دوسری میں کوئی دو فٹ لمبا چوڑا سوراخ ہو گیا تھا۔ اس سوراخ سے دوسرا دستی بم اندر آ کر گرا تھا۔ ہم سب فرش پر اوندھے منہ گرے ہوئے تھے۔ اتفاق سے وسیم نے دستی بم گری ہوئی الماری کے دوسری طرف گرتے دیکھا جس طرف بدنصیب ڈرائیور اور اٹینڈنٹ تھے۔ کانوں کو جھنجھوڑ دینے والے (سماعت شکن) دھماکے نے میرے اعصاب سن کر دیئے تھے۔ کوئی چیز میرے سر کو چھوتی گزری تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کمرے میں دھواں بھرا ہوا تھا اور فضا میں کتابوں کے جلتے اوراق اڑ رہے تھے۔ الماری اور اس طرف سے فرنیچر میں آگ لگی تھی۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ اٹھ کر ڈرائیور اور اٹینڈنٹ کا حشر دیکھوں۔ دوسرے مجھے اپنی فکر تھی، ایک اور دستی بم آ کر اندر گرتا اور میرا حشر بھی یہی ہوتا، میں نے دھویں سے ایک سر برآمد ہوتے دیکھا۔ دروازے کے سوراخ سے ایک افغانی اندر جھانک رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کمرے میں موجود تمام افراد اب مرحوم ہو چکے تھے، جن سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ تب ہی اس نے اپنا سر بے خوف و خطر اندر کر دیا تھا۔ مجھے زندہ پا کر اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ اس نے عجلت میں اپنا سر باہر کرنے کی کوشش کی، میرا ہاتھ جیسے خود بخود بلند ہوا اور میں نے اسے شوٹ کر دیا۔ گولی اس کے سر پر لگی تھی اور وہ تڑپے بغیر سوراخ میں ہی جھول گیا تھا۔ اچانک کسی

نے میرا بازو پکڑ کر کھینچا۔ یہ وسیم تھا جو مجھے کھینچتا ہوا واش روم میں لے آیا تھا۔ یہاں دھواں کم تھا۔ دستی بم کا ٹکڑا اس کے ماتھے پر لگا تھا اور خون بہہ کر رخسار تک آ رہا تھا۔

''وہ دونوں بھی مارے گئے۔'' اس نے تاسف سے کہا۔

''اس معاملے میں ہم بے بس ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ اسی لمحے کمرے میں تیسرا دستی بم گرا تھا۔ اگر ہم اب تک کمرے میں ہوتے تو بلاشبہ مارے جاتے۔ رہی سہی کسر اس دستی بم نے پوری کر دی تھی اور کمرے میں شدت سے آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس کا دھواں باتھ روم تک آ رہا تھا۔ میں نے تشویش سے سوچا۔ اگر افغانیوں سے بچ جاتے تب بھی آگ سے جل کر یا دَم گھٹ کر مارے جاتے، پولیس والے نہ جانے کیا کر رہے تھے۔ ''مجھے لگتا ہے، پولیس ہماری لاشیں اٹھانے آئے گی۔''

وسیم تلخی سے مسکرایا۔ ''انہیں اپنی جانوں کی فکر بھی ہو گی۔ پانچ ہزار روپے تنخواہ پانے والا سپاہی اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالے گا؟''

میں نے باتھ روم کے دروازے سے جھانکا۔ ''انہوں نے افغانی کی لاش دروازے سے ہٹالی ہے۔ شاید وہ ہماری طرف سے مطمئن ہیں۔''

''تین دستی بم ایک کمرے میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔'' وسیم نے سر ہلایا۔ ''یقین کریں شہباز، ہم بہت خوش قسمت ہیں جو اب تک زندہ ہیں۔''

''اگر میں بچ گیا تو ساری عمر آج کے دن پر تعجب کروں گا۔''

آگ بہت زیادہ پھیل چکی تھی اور اب بظاہر باہر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسٹڈی روم میں ہر شے آگ پکڑنے والی تھی۔ لاشیں تک جل رہی تھیں اور ان سے گوشت جلنے کی بو اٹھ رہی تھی۔ میرا دل متلانے لگا تھا۔ آگ سے زیادہ خطرناک وہ دھواں تھا جو اندر بھر رہا تھا۔ دھویں نے سانس لینے کا عمل مشکل بنانا شروع کر دیا تھا اور کچھ دیر بعد اس میں سانس لینا محال ہو جاتا۔ وسیم نے اپنی قمیص اتار کر پھاڑی اور اسے گیلا کر کے ایک حصہ میری طرف بڑھا دیا۔ ''اسے منہ پر رکھ کر سانس لیں، کسی حد تک دھویں سے بچ جائیں گے۔''

گیلے کپڑے میں سانس لینے سے دھویں سے بچت ہو رہی تھی مگر ایک اور مسئلہ گرمی کا تھا۔ کمرے میں آگ بھڑک رہی تھی اور باتھ روم کا اندرونی درجہ حرارت بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے باتھ روم کا نل اور شاور دونوں کھول دیئے۔ وسیم مگ سے پانی لے کر دروازے پر پھینکنے لگا تاکہ اس میں آگ نہ لگ سکے۔ دروازہ جل جاتا تو دھویں کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔ پانی گرنے سے درجہ حرارت میں کمی ہوئی تھی۔ ''شہباز صاحب! بچنا مشکل لگ رہا ہے، اس آگ کو فائر بریگیڈ والے ہی بجھا سکتے ہیں۔''

''ایس پی کو فون کر کے فائر بریگیڈ بلواؤ۔''

''موبائل غائب ہے۔ دھماکے کے بعد مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ موبائل نہ جانے کہاں گیا؟'' اس نے مایوسی سے کہا۔ وہ مگ بھر بھر کر دروازے پر پھینک رہا تھا لیکن دروازے کی حالت بتا رہی تھی، وہ آگ پکڑنے والا تھا۔ یہ ٹھوس لکڑی کا بنا دروازہ تھا۔ اگر پلائی کا ہوتا تو اب تک جل کر خاک ہو چکا ہوتا۔ کمرے سے آگ کے اشیاء کھانے کی آواز اتنی تیز تھی کہ ہمیں کچھ اور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ عین ممکن تھا، باہر پولیس ریڈ کر چکی ہو اور

اب تک افغانیوں پر قابو پا چکی ہو بلکہ انہیں مار چکی ہو۔ مجھے ان لوگوں کے جنونی انداز سے مشکل ہی لگ رہا تھا کہ کوئی زندہ پولیس کے ہاتھ آئے۔ اپنی دانست میں وہ ہمیں مار چکے تھے۔

''یار، کسی کو مدد کے لئے پکارو...... ممکن ہے پولیس اندر آ چکی ہو؟'' میں نے کہا۔

''کوشش کرتا ہوں۔'' وسیم نے سر ہلایا اور کپڑے کو گیلا کر کے انگارے کی طرح گرم ہو جانے والا دروازے کا ہینڈل پکڑ کر گھمایا۔ دروازہ ذرا سا کھلتے ہی جیسے جہنم کا جھونکا آیا تھا۔ بے حد گرم ہوا کے ساتھ دھویں کا ریلا تھا۔ وسیم چلایا۔ ''مدد کرو...... مدد'' اور فوراً دروازہ بند کر دیا۔ ان دو لمحوں میں خاصا دھواں اندر آ چکا تھا۔ ہم کھانسنے لگے۔ صرف شاور کے نیچے کسی حد تک دھواں کم تھا۔ ساتھ ہی باتھ روم کی دیواریں بھی گرم ہو رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شاور کا پانی بھی کسی قدر گرم آنے لگا ہے۔ باتھ روم کے اندر بھاپ پیدا ہونے سے حبس کی کیفیت ہو رہی تھی۔ ہم فرش پر بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ اچانک باتھ روم کا بلب بند ہو گیا۔ شاید کمرے سے اس کا کنکشن آگ کی وجہ سے ناکارہ ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی باتھ روم کا اگزاسٹ فین بھی بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہوا جیسے ہر لمحے کثیف ہونے لگی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار دم گھٹنے کی کیفیت محسوس کی۔ یوں لگا جیسے کوئی ان دیکھی طاقت گلا دبا رہی ہو۔ سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ ذہن پر تاریکی چھانے لگی۔ آکسیجن کی کمی کا نتیجہ دماغ کے بلیک آؤٹ کی صورت میں نکلتا ہے۔ مجھے بھی پتا نہیں چلا کہ کب میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔

جیسے صحرا میں پیاسے بھٹکنے والے کو ٹھنڈے پانی کا کوئی چشمہ مل جائے اور وہ بے تابی سے اس میں سے پانی پیتا ہے۔ بالکل ایسی کیفیت میری تھی۔ میں اس سرد اور جاں فزا ہوا کو بے تابی سے اپنے اندر سمونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس کے لئے نہ جانے کب سے میرے پھیپھڑے ترس رہے تھے۔ ہوا کا یہ خزانہ مجھے کیسے ملا، مجھے نہیں معلوم۔ آکسیجن ملتے ہی دماغ کا بلیک آؤٹ بھی ختم ہو گیا تھا اور میں بہت تیزی سے ہوش میں آیا تھا۔ میں کھلی فضا میں ایک اسٹریچر پر لیٹا تھا اور میرے منہ سے آکسیجن ماسک لگا تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا میرے برابر میں وسیم لیٹا تھا، اس کے منہ پر بھی آکسیجن ماسک تھا لیکن وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔

مجھے بعد میں پتا چلا کہ فائر بریگیڈ کے چار ارکان اپنی جان پر کھیل کر اس کمرے میں داخل ہوئے اور ہمیں بروقت وہاں سے نکال لیا۔ کچھ دیر ہم وہاں اور پڑے رہتے تو آگ ہمیں چاٹ جاتی ورنہ دم گھٹنے سے لازماً ہلاک ہو جاتے۔ پولیس مقابلے میں باقی ماندہ افغانی بھی مارے جا چکے تھے سوائے ایک کے، جو شدید زخمی حالت میں گرفتار ہوا تھا۔ اسے اسپتال روانہ کر دیا گیا تھا۔ اٹینڈنٹ اور ڈرائیور دستی بم کے دھماکے میں مارے گئے تھے اور ان سب کی لاشیں مع ڈاکٹر اور افغانی کے بری طرح جل چکی تھی۔ پولیس اور افغانیوں کے مقابلے میں ایک راہ گیر بھی مارا گیا تھا۔ فائر بریگیڈ نے بمشکل کوٹھی کے پورے وسطی حصے تک پھیل جانے والی آگ پر قابو پایا تھا۔ باقی ماندہ کوٹھی کا حلیہ بے تحاشا فائرنگ نے بگاڑ دیا تھا۔

میرا گلا یوں خشک اور کھردرا ہو رہا تھا جیسے کسی نے حلق میں ریگ مال پھیر دیا ہو۔ میں نے اشارے سے وہاں موجود شخص سے پانی مانگا۔ اس نے ایک بوتل ماسک ہٹا کر میرے منہ سے لگا دی۔ میرے ہاتھ اسٹریچر سے بندھے ہوئے تھے۔ پانی پلا کر اس نے دوبارہ ماسک لگا دیا۔ پھر ہمارے اسٹریچر ایمبولینس میں منتقل کئے جانے لگے۔ میں نے دیکھا، ہمارے پاس دو پولیس اہلکار موجود تھے اور پھر میں نے انسپکٹر اکرم چشتی کی منحوس صورت

دیکھی۔ وہ ڈی ایس پی رینک کے کسی آدمی سے بات کرتا اس طرف آ رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا، یہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات ہوئی تھی۔ میرے لئے اکرم چشتی ان افغانی ڈاکوؤں سے کم خطرناک نہیں تھا بلکہ اس کے عزائم تو زیادہ بھیانک تھے۔ میرے قریب آ کر وہ مخصوص انداز میں مسکرایا۔ ''لو جی...... اپنے شہباز صاحب، ڈاکوؤں کے پاس سے ملے ہیں ان کی تو ہمیں خاصے عرصے سے تلاش تھی۔''

اس نے میرا ہاتھ دیکھا۔ ''افسوس کوئی پہلے ہی کام دکھا گیا ہے۔ خیر اسپتال سے آپ نے ہمارے پاس ہی آنا ہے۔''

میں نے اسے نظرانداز کر کے ڈی ایس پی سے کہا۔ ''جناب! مجھے کچھ افراد کے خلاف رپورٹ کرانی ہے۔ انہوں نے مجھے حبس بے جا میں رکھ کر تشدد کا نشانہ بنایا اور مجھے زخمی حالت میں سڑک پر پھینک کر چلے گئے جہاں سے یہ نیک دل لوگ مجھے اٹھا کر لائے اور ایمبولینس کے ذریعے مجھے اسپتال بھیج رہے تھے کہ ان کے گھر میں ڈاکو گھس آئے۔''

''انکوائری کے بعد تمہیں موقع دیا جائے گا۔'' ڈی ایس پی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''فی الحال تم خود کو زیر حراست سمجھو۔''

''میں اپنے وکیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''تمہیں اس کا موقع دیا جائے گا۔'' ڈی ایس پی نے کہا اور اکرم چشتی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

''پیارے، اپنے دوسرے ہاتھ اور گوڈوں کی خیر مناؤ۔ یہ رپورٹ شپورٹ کا چکر بھول جاؤ۔''

''اکرم چشتی میں اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔'' میں نے بھی آہستہ سے کہا۔ ''اپنے باپ نادر علی کا حشر دیکھ لیا ہوگا۔ مجھے اتنا کمزور بھی مت سمجھو۔''

اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا اور اس نے پولیس کی مخصوص سرکاری زبان استعمال کرتے ہوئے مجھے دھمکی دی۔ ''نادر علی کے ساتھ جو ہوا ہے، اس کا حساب الگ سے دینا ہوگا۔''

''لے سکو تو ضرور لے لینا۔'' میں مسکرایا تھا۔ ''ویسے نادر علی کی حالت اب کیسی ہے؟''

''زخمی سانپ جیسی...... وہ تمہارے پورے خاندان کو مٹانے کی قسمیں کھا رہا ہے۔''

''اس سے کہو خاندان تک جانے کی بات نہ کرے۔ پہلے مجھ سے نمٹ لے۔'' میں نے حقارت سے کہا۔

''لے جاؤ اسے۔'' انسپکٹر اکرم چشتی نے پیرا میڈیکل اسٹاف کو حکم دیا اور سپاہیوں کو میری سخت نگرانی کرنے کا حکم دیا تھا۔ ایمبولینس کا دروازہ بند ہوا اور وہ حرکت میں آ گئی۔ نصف گھنٹے بعد میں ایک سرکاری اسپتال میں تھا کیونکہ پولیس کی تحویل میں ملزمان صرف سرکاری اسپتال میں جا سکتے تھے۔ جہاں میرے ہاتھ کا معائنہ ہوا اور ڈاکٹروں نے گینگرین تشخیص کیا تھا۔ مجھے فوری طور پر آپریشن کے لئے لے جایا گیا تھا اور میرے ہاتھ کے آپریشن کی تیاری شروع کر دی گئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے پیپرز پر سائن لیے تھے۔ آپریشن سے پہلے مجھے بے ہوش کر دیا گیا تھا اور میں نے ذہنی طور پر خود کو اس ہاتھ سے محرومی پر تیار کر لیا تھا۔ عام طور سے آپریشن میں جو مسکن یا بے ہوشی کی دوا استعمال کی جاتی ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی انسان پر اس کے ناگوار اثرات برقرار

رہتے ہیں۔ سر چکراتا ہے اور طبیعت متلاتی ہے۔ یہ بات میں نے دوسروں کی زبانی سنی تھی کیونکہ جب مجھے ہوش آیا تو میری کیفیت معمول کی تھی بس اعصاب ہلکے سے سن ہو رہے تھے لیکن ذہن صاف اور پُرسکون تھا۔ اچانک مجھے اپنے ہاتھ کا خیال آیا اور میں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ اپنے بائیں ہاتھ کو پا کر میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ کلائی والے حصے پر پٹی بندھی تھی اور پورا بازو ایک کھانچے میں اس طرح سے پھنسا تھا کہ الگ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ شاید آپریشن کی وجہ سے پلاسٹر نہیں کیا گیا تھا۔ میں کسی الگ کمرے میں تھا اور فی الحال وہاں کوئی نہیں تھا۔ بازو کے ساتھ ایک ڈرپ لگی تھی اور اس کا رنگین پانی بتا رہا تھا کہ ڈرپ میں طاقت کی اور دوسری دوائیں شامل تھیں۔ اسی وجہ سے مجھے بھوک پیاس کا احساس نہیں تھا حالانکہ میں نے آخری کھانا گزشتہ شام کھایا تھا اور اس وقت یقیناً اگلے روز کی شام ہو چکی تھی۔ آپریشن کے بعد میں پانچ چھ گھنٹے تو بے ہوش رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک موٹی سی لیکن ہنس مکھ چہرے والی نرس آئی۔

"ینگ مین، کیسا ہے تم؟"

"ایک دم فٹ......" میں نے جواب دیا۔ "سسٹر! ڈاکٹر کو بلاؤ...... میں اس سے اپنے ہاتھ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں اور ہاں...... مہربانی کر کے میرے وکیل کو اطلاع کر دو۔"

"ایک آدمی باہر بیٹھا ہے خود کو تمہارا وکیل بتاتا ہے پر سپاہی لوگ اسے اندر آنے نہیں دیتا۔" موٹی نرس نے بتایا۔ "ڈاکٹر ابھی آ جائے گا۔"

"پلیز سسٹر! کسی طرح اسے اندر لے آؤ۔" میں نے التجا کی۔

اس نے سر ہلایا۔ "ابھی کوشش کرتا ہے...... آگے جو پولیس کو منظور۔"

اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ندیم اندر آیا، وہ سخت غصے میں تھا اور محکمہ پولیس کو سخت سُست سنا رہا تھا۔

"کیسا ہے تُو...... ان کی تو......"

"اب بے چاروں پر اپنی انرجی کیوں ضائع کرتا ہے۔ یہ افسران کے حکم سے مجبور ہیں۔"

"افسران کا حکم!" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "ابھی میں سو کا نوٹ دیتا تو یہ میرا شناختی کارڈ بھی نہ دیکھتے اور مجھے توپ سمیت اندر آنے کی اجازت دے دیتے۔ بے شک میں اجرتی قاتل ہوتا۔"

"دفع کر اسے...... یہ بتا کہ حالات کیسے ہیں؟"

"پہلے سے زیادہ بدتر...... نادر علی کی حالت نے مرشد اور اس کے گرگوں کو پاگل کر دیا تھا۔ انہوں نے رات کے وقت تیرے دفتر پر حملہ کیا اور اسے آگ لگا دی۔"

"دفتر کو آگ لگا دی......" میرا دل رک سا گیا تھا۔ "اور سیّد گل......؟"

"اس نے ان لوگوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی۔"

میرے اندر سے کرب کی لہر اٹھی تھی۔ "وہ بے چارہ میرے لئے جان سے گزر گیا، کب کا واقعہ ہے یہ؟"

"کل رات کا...... آج میں اس کی لاش اس کے گاؤں بھجوانے کے انتظامات میں لگا رہا۔ لاش شام کو گئی ہے۔ اُدھر سے سیدھا تیرے پاس آیا ہوں۔"

"اور اس واقعے کی ایف آئی آر؟"

"مرشداوراس کے بھائی کوفریق بنا کر میں نے ایف آئی آر درج کرادی ہے۔"

"بے کار ہے۔ پولیس کچھ نہیں کرے گی۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "بے چارے سیدگل کا خون رائیگاں جائے گا۔"

"فی الحال ایف آئی آر بے کار ہے...... لیکن مستقبل میں یہ کارآمد بھی ہو سکتی ہے۔ حالات بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔"

"میری کیا پوزیشن ہے؟"

"پولیس نے تجھے نادر علی والے جیپ کیس میں گرفتار کرلیا ہے۔ باقی کیسز کا ملبہ بعد میں تجھ پر ڈالا جائے گا۔ خاص طور سے سجاد مہر کے ایکسیڈنٹ کیس کا...... پولیس نادر علی کے زخمی ہونے کا تعلق تجھ سے جوڑنے کی کوشش کرے گی لیکن زخمی ہاتھ تیرا گواہ ہے۔ اگر تیرے خلاف فائرنگ کا کیس بنا تو اس کے خلاف بھی تجھے زخمی کرنے کا کیس بنے گا۔"

"حالانکہ یہ اس کا حرامی پن تھا۔ زخمی اسے کسی اور نے کیا ہے۔" میں نے کہا پھر اسے مختصراً وسیم اور اس کے گروپ کی کارگزاری کے بارے میں بتایا۔ "ہم جو افغانی ڈاکوؤں سے بچ گئے ہیں تو یہ بھی اسی کا کام ہے۔ اس نے حوصلے سے ان کا مقابلہ کیا تھا اور محض ایک پستول سے۔"

"یہ کام کا آدمی ہے، اس سے ملنا ہوگا۔" ندیم سوچ کر بولا۔ "اگر انہوں نے تجھے بچایا ہے تو ممکن ہے بعد میں بھی تیرے کام آئیں۔"

"مجھے اپنے ہاتھ کی فکر ہے۔"

"میں نے ڈاکٹر سے بات کی تھی۔ انہوں نے آپریشن کر کے ہڈیاں سیٹ کی ہیں اور خون کی نالیاں بھی کھول دی ہیں۔ اگر خون کا بہاؤ درست ہو گیا تو گینگرین کا خطرہ ختم ہو جائے گا۔"

"ورنہ میرا ہاتھ کاٹنا پڑے گا۔"

"یہ تو ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے۔" ندیم بولا اور اسی لمحے ڈاکٹر آ گیا۔ وہ سخت خفا لگ رہا تھا۔

"لگتا ہے ہماری پولیس فورس میں چن چن کر جاہل ترین افراد بھرتی کئے جاتے ہیں۔ مجھے اندر نہیں آنے دے رہے، مریض ان کا باپ دیکھے گا؟"

"ڈاکٹر! انہیں جہنم میں بھیجو، یہ بتاؤ...... میرے ہاتھ کی کیا کیفیت ہے؟"

"اچھی نہیں ہے۔ آئی ہوپ...... کہ خون رواں ہو جائے اور تمہارا ہاتھ بچ جائے۔ اگر دو دن میں ہاتھ درست حالت میں نہ آیا تو اسے جسم سے جدا کرنا پڑے گا ورنہ زہر اوپر چڑھنا شروع ہو جائے گا۔"

امکان ذہن میں ہونے کے باوجود ڈاکٹر کے منہ سے یہ سن کر مجھے دھچکا لگا تھا۔ چند لمحے کے لئے میں گم صم ہو گیا تھا۔ ندیم نے پُر ملامت نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ "لیکن تم جوان آدمی ہو، بچنے کے بھی امکانات ہیں۔ آج رات ایک ماہر آ کر تمہارا ہاتھ دیکھے گا۔ وہ زیادہ بہتر رائے دے گا۔"

"ایک ملزم کے لئے ماہر آئے گا؟" میں نے حیرت آمیز طنز کے ساتھ کہا۔

"اس کا ارینج منٹ مسٹر ندیم نے کیا ہے۔"

''تُو فکر نہ کر..... اگر تیرے ہاتھ کے لئے باہر سے کسی کو بلوانا پڑا تو اسے بھی بلوالیں گے۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد ندیم مجھے کچھ دیر سمجھاتا رہا کہ پولیس کو بیان میں کیا کہنا ہے اور کن باتوں سے گریز کرنا ہے۔ خاص طور سے وسیم کی کوٹھی میں ہونے والے واقعات سے لاعلمی اور لاتعلقی ظاہر کرنی ہے۔ میں نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''کہیں میرے اور وسیم کے بیان میں ٹکراؤ نہ ہو جائے؟''

''میں ابھی جا کر اسے سمجھا دیتا ہوں۔''

''کیا تجھے اس سے ملنے دیں گے؟''

''وہ کوئی زیر حراست تھوڑی ہو گا۔ تجھ پر تو کئی کیس ہیں۔'' ندیم اٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہ بتا، کوئی چیز چاہئے..... میں ہو سکتا ہے صبح چکر لگاؤں۔ تجھ سے ضمانت کی درخواست پر دستخط لینے ہیں۔''

''وہ کس لئے..... درخواست تو میری طرف سے ہو گی۔''

''میری جانب سے پولیس اور مرشد علی کے خلاف حبس بے جا اور تشدد کی شکایت پر مبنی درخواست ہو گی۔ اس طرح بائل (ضمانت) کا کیس مضبوط ہو گا۔''

''اور ہاں، مجھے کچھ نہیں چاہئے تُو نے سید گل کے لواحقین کو کچھ بھیجا؟''

''میں نے طاہر کے ہمراہ کی ہے میت۔ وہ بیس ہزار روپے دے گا۔''

''بیس ہزار تو کم ہیں یار! اپنے گھر کا وہ واحد کفیل تھا۔ ایسا کر اسے میرے اکاؤنٹ سے پچاس ہزار روپے اور بھجوا دے۔''

''طاہر آتا ہے تو میں اس سے پتا لے کر یہ کام کرتا ہوں۔''

ندیم کے جانے کے بعد میں آنکھیں بند کر کے اپنے مستقبل پر غور کرنے لگا جو فی الحال خاصا عبرت ناک نظر آ رہا تھا۔ پولیس نے مرشد علی کے اشارے پر میرے خلاف کئی ایک کیسز بنا دیئے تھے، پہلے دشمنی کی وجہ نہایت بچگانہ تھی تو اب اسے ایک پختہ بنیاد مل گئی تھی۔ نادر علی میری وجہ سے زخمی اور معذور ہوا تھا اور ان لوگوں نے اپنے وحشیانہ انتقام کا آغاز میرے کاروبار کو تباہ کر کے کیا تھا۔ میرا ایک ہاتھ زخمی تھا اور ڈاکٹروں کے انداز سے لگ رہا تھا کہ مجھے اس سے محروم ہونا پڑتا۔ کچھ دیر بعد نرس نے آ کر مجھے دوائیاں دیں اور ایک انجکشن لگایا۔

''اگر بھوک لگ رہی ہے تو کچھ دیر میں کھانا آ جائے گا۔'' اس نے اطلاع دی۔

''شکریہ۔ مجھے واش روم جانا ہے۔''

''میں ابھی کسی میل کو بھیجتی ہوں۔'' اس نے کہا، اس کے جانے کے کوئی دس منٹ بعد ایک وارڈ بوائے آ کر مجھے واش روم لے گیا۔ بازو میں فٹ کھانچے کے ساتھ حرکت کرنا آسان تھا لیکن ضروریات سے فارغ ہونا بے حد دشوار تھا۔ بہر حال میں جیسے تیسے اس مرحلے سے گزر گیا تھا منہ ہاتھ دھو کر آیا تو کچھ دیر بعد رات کا کھانا آ گیا۔ اس میں سوائے ابلے ہوئے انڈے اور دودھ کے گلاس کے سب بدمزہ تھا، جسے میں نے کسی نہ کسی طرح حلق سے اتار لیا تھا۔

نو بجے ماہر آیا، اس نے میرے ہاتھ کا معائنہ کیا اور فوری طور پر کچھ دوائیں دینے کی ہدایت کی۔ ''آپ لوگوں کو بہت پہلے یہ دوائیں دے دینا چاہئے تھیں۔'' اس نے ناگواری سے ڈیوٹی ڈاکٹر سے کہا۔

''جناب! یہ سرکاری اسپتال ہے، یہاں لوگوں کو عام دوائیں مل جائیں تو بڑی بات ہے۔'' ڈاکٹر طنزیہ انداز میں بولا تھا۔

''ملنا الگ بات ہے...... آپ کے ڈاکٹر کو دوائیں تجویز کرنی چاہئے تھیں۔ مجھے خطرہ ہے آپ لوگوں کی غفلت سے خاصی تاخیر ہو چکی ہے۔''

''ڈاکٹر! کیا میرا ہاتھ......؟''

''ہم کوشش کر رہے ہیں۔'' ماہر نے میرا شانہ تھپکا۔ وہ ندیم کے قریبی واقف کاروں میں سے تھا۔ اس نے خود ہی دوائیں منگوائیں اور ایک گھنٹے بعد مجھے دو انجکشن لگ چکے تھے۔ ڈاکٹر، جس کا نام شریف احمد تھا، اس نے کہا۔ ''ان کا ردِعمل صبح تک پتا چلے گا۔''

''اور اگر انہوں نے کام نہ کیا تب......؟''

میرے سوال کا جواب ڈاکٹر شریف کے چہرے پر رقم تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی۔ ''یار! ہمیشہ اچھی امید رکھو، خدا سے اچھی امید کرو گے تو وہ اچھا ہی کرے گا۔ وِش یو گڈ لک!''

بارہ بجے کے قریب سفیر اور مونا آئے تھے۔ سفیر نے اس ملاقات کے لئے سپاہیوں کو پانچ سو روپے دیئے تھے۔ اس نے مونا کو میری بہن بتایا تھا۔ وہ برقع میں تھی۔ وہ پوری طرح احتیاط کر کے آئے تھے۔ مونا میرے بازو سے سر ٹکا کر رونے لگی تھی۔ ''پاگل! روتی کیوں ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔ واضح طور پر ندیم کے توسط سے میرے ہاتھ کی رپورٹ ان تک پہنچ گئی تھی۔ ''یار! تجھے مونا کو لانے کی کیا ضرورت تھی۔ مرشد اور اس کے پالتو پاگل ہو رہے ہیں۔''

''تجھے پتا ہے یار! تیرے دفتر کے جلنے اور سیّد گل کے مارے جانے سے مجھے اچھی طرح اندازہ ہے لیکن میں اس پاگل لڑکی کو نہیں سمجھا سکتا۔''

''تُو ابھی سے مستقبل کا زن مرید ثابت ہو رہا ہے۔ بہر حال مجھے یقین ہے مرشد علی کے آدمی اسپتال کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔''

''میں نے باہر دو تین مشکوک حلیئے والے افراد دیکھے ہیں لیکن میں مونا کو لے کر دوسری طرف سے آیا ہوں۔ میں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے اور میں اسے ڈاکٹر کو دکھانے آیا ہوں۔''

''انہیں احمق نہ سمجھ...... بہتر ہوگا سامنے سے نکلنے کے بجائے کوئی عقبی راستہ اختیار کرنا۔ ممکن ہے انہوں نے اسپتال کے کسی فرد کو خرید لیا ہو جو میرے پاس آنے والوں کی اطلاع باہر موجود افراد کو دیتا ہو؟''

''ہاں، تُو ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' سفیر متفکر ہو گیا تھا۔

''رکنے کے بجائے نکلنے کی کرو اور تم دونوں بے حد محتاط رہو۔ حالات میرے حق میں خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ جو میرے قریب ہوگا وہ بھی لپیٹ میں آ جائے گا۔''

''لیکن اس ڈر سے ہم تیرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔'' سفیر کھڑا ہو گیا۔ ''ہم تیری لڑائی میں برابر کے شریک ہیں۔''

''شوبی! اپنا خیال رکھنا۔'' مونا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اچھا دادی اماں! اب جاؤ...... تم لوگوں نے مجھے پریشان کر دیا۔ صبح ندیم سے اپنی خیریت کی اطلاع بھجوا دینا، بس اب جاؤ۔'' میں نے کہا تو وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئے تھے۔ مونا جاتے جاتے بھی رو رہی تھی۔

میں مونا اور سفیر کے لئے فکرمند تھا۔ انہوں نے اس طرح کھلے بندوں آ کر خطرہ مول لیا تھا۔ گزشتہ کچھ عرصے میں مجھے ان لوگوں کا جو تجربہ ہوا تھا اس سے مجھے ان لوگوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ کتے کی دُم تھے جو سو سال نلکی میں رہنے کے باوجود ٹیڑھی رہتی ہے۔ ایک بار مجھ سے دشمنی کا رشتہ قائم ہونے کے بعد وہ ساری عمر اسے نبھانے کے لئے تیار تھے۔ ان کی کینہ پرور فطرت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ مجھے معاف کر دیں یا مجھ سے سمجھوتا کر لیں۔ رات دیر سے نیند آئی اور صبح چھ بجے نرس نے اٹھا کر مجھے دوائیں دیں۔ ڈرپ اتار دی گئی تھی، میں نے نرس کے جانے کے بعد اپنے ہاتھ کا معائنہ کیا جس پر دو انجکشن لگے تھے اور ان کا نتیجہ بارہ گھنٹوں بعد نکلنے والا تھا۔ مجھے رات کے مقابلے میں ہاتھ کی حالت میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی تھی، اس کی سوجن اور نیلگوں مائل سیاہ رنگت برقرار تھی۔ مجھے مایوسی ہونے لگی۔ ہاتھ بالکل بے حس و حرکت تھا۔ میں نے انگلیوں کو جنبش دینے کی کوشش کی لیکن ان میں ذرا بھی حرکت نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی دوسرے ہاتھ سے چھونے پر احساس ہو رہا تھا۔ یوں لگا جیسے میں کسی اور شے کو چھو رہا ہوں، جس کا میرے ہاتھ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ میرا دل مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا تھا۔ میرے جسم کا بچپن کا یہ حصہ اب میرا نہیں رہا تھا۔ اسے وقت سے پہلے مجھ سے جدا ہو جانا تھا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تو میں نے یہ سوچ کر توجہ نہیں دی کہ نرس ہو گی لیکن جب کوئی سامنے نہیں آیا تو میں نے سر گھما کر دیکھا اور دروازے پر مرشد علی کو دیکھ کر چند لمحے کے لئے دم بخود رہ گیا تھا پھر میں سنبھلا۔ ''آؤ مرشد علی! کیا اپنے بھائی کا انتقام لینے آئے ہو یا اس کا کارنامہ دیکھنے؟'' میں نے اپنے مضروب ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، میرے خیال میں نادر علی اپنی حماقت کا شکار ہوا ہے۔ اسے تم سے انتقام لینے کا خبط تھا اور میرے خیال میں حساب برابر ہے۔''

''یہ تم کہہ رہے ہو؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''اچھا...... اچھا، شاید اس کی وجہ وہ تصویر ہے؟''

''چلو، تم ایسا ہی سمجھ لو۔'' مرشد علی میرے بستر کے پاس آیا۔ ''مجھے وہ تصویر چاہئے، کسی بھی قیمت پر۔''

''تم لوگ جو میرے ساتھ کر چکے ہو اس کے بعد بھی توقع رکھتے ہو کہ میں تمہیں وہ تصویر دوں گا۔ ڈاکٹر میرے ہاتھ سے مایوس ہیں۔ شاید اسے کاٹنا پڑے۔''

''میں نے کہا ناں...... مجھے افسوس ہے۔ میں اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکتا لیکن ہرجانے میں تم جو چاہو مجھ سے لے سکتے ہو۔''

''جو چاہوں لے سکتا ہوں؟'' میں نے جذباتی ہو کر کہا۔ ''تب مجھے اپنا بایاں ہاتھ کاٹ کر دے دو۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔ ''میں معاملات سلجھانے آیا ہوں۔''

''مجھے تم سے اب بات نہیں کرنی ہے۔ تمہارا جو دل چاہے کرو۔ میرے خلاف مزید مقدمے بنواؤ یا میرا

دوسرا ہاتھ بھی تڑوا دو۔"

"کیا تمہیں کسی بھی نقصان کی پروانہیں ہے؟" اس نے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔

"کیا مطلب؟" میں چونکا۔

"مطلب یہ کہ...... انسان بعض اوقات اپنے نقصان سے بے نیاز ہو جاتا ہے لیکن اپنے پیاروں کا خیال اسے پھر بھی رکھنا پڑتا ہے۔"

میرے اندر اندیشے سرسرانے لگے تھے۔ "مرشد...... کھل کر کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

مرشد علی میری طرف جھکا۔ "وہ دونوں میرے پاس ہیں۔ صحیح سلامت اور باآبرو...... لیکن مجھے تصویر نہ ملی تو وہ نہ صحیح سلامت رہیں گے اور نہ باآبرو۔"

"کک...... کون؟...... کیا بکواس کر رہے ہو تم؟"

اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ "شہباز! تمہاری ساتھی لڑکی مونا اور اس کا یار سفیر ہمارے پاس ہیں۔ اگر تم نے انہیں واپس حاصل کرنا ہے تو تصویر میرے حوالے کر دو۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم!"

"اچھا...... میں ابھی تمہاری بات کرا دیتا ہوں۔" اس نے موبائل فون پر کوئی نمبر ملایا اور تحکمانہ انداز میں بولا۔ "دونوں کہاں ہیں...... ہاں، موبائل فون لڑکی کو دو۔ لو بات کرو۔" آخری جملہ اس نے مجھ سے کہا اور موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کان سے لگایا۔

"ہیلو...... کون؟"

"شوبی......!" مونا کی آواز آئی۔ "یہ ہمیں پکڑ لائے ہیں۔"

"مونا! کہاں ہو تم...... میری بات سنو!" لیکن اس سے کسی نے موبائل چھین کر کال منقطع کر دی تھی۔ میں نے موبائل دیوار پر دے مارا، اس کے پرزے بکھر گئے تھے۔ "مرشد علی! اگر میرے ساتھیوں کو خراش بھی آئی تو......"

"تو تم ٹینک لے کر میرے گھر پر چڑھ دوڑو گے؟ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر کشتوں کے پشتے لگا دو گے؟" اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا پھر ذرا جھک کر بولا۔ "شہباز احمد! تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتے تو کسی دوسرے کے لئے کیا کرو گے؟ حقیقت تسلیم کرو...... اب بھی وقت ہے، مجھ سے سمجھوتا کر لو۔ مجھے تصویر دے دو، صرف اپنے ساتھی ہی حاصل نہیں کرو گے بلکہ میری دوستی بھی حاصل کر لو گے۔"

"لعنت ہو تمہاری دوستی پر...... اس سے بہتر ہے میں شیطان سے دوستی کر لوں۔"

"تمہیں تو فلموں میں ہونا چاہئے تھا، بالکل فلمی ہیرو کی طرح ڈائیلاگ بولا ہے۔" وہ ہنسا اور یکدم سنجیدہ ہو کر بے حد سرد لہجے میں بولا۔ "ہوش کی دنیا میں آؤ، اپنے ساتھیوں کے لئے مشکلات پیدا نہ کرو۔ میرے ایک اشارے پر ان کے لئے مصائب کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ خاص طور سے وہ لڑکی کسی ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہو سکتی ہے۔" اس کا انداز معنی خیز ہو گیا تھا۔ "تم بھی سوچ سکتے ہو ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ کیا کچھ......"

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' میرا حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔ ''میں وہ لعنتی تصویر تمہیں دے دوں گا مگر پہلے میرے ساتھیوں کو آزاد کرو۔ ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تعلق، کیوں نہیں ہے۔ وہ تمہارے ساتھی ہیں۔ وہ اس وقت رہا ہوں گے، جب تصویر مجھے مل جائے گی۔''

''ایسا کرو، تم ندیم سے رابطہ کرو۔ پہلے بھی اس معاملے کو وہی دیکھ رہا تھا۔ درمیان میں نادر علی گڑبڑ نہ کرتا تو اب تک مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔''

''ایک بات اور...... مجھے نہیں معلوم کہ نادر کو گولی مارنے والے اور تمہیں لے جانے والے کون لوگ تھے مگر میں جلد انہیں تلاش کرلوں گا اور انہیں اس حرکت کا حساب دینا ہوگا۔''

''میں بھی انہیں نہیں جانتا۔ مل جائیں تو ضرور پوچھ لینا۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''وہ زیادہ دیر مجھ سے نہیں چھپ سکتے۔''

''بہتر ہوگا، تم جا کر ندیم سے بات کرو۔ میں اپنے ساتھیوں کو جلد از جلد آزاد دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اگر ابھی مجھے تصویر مل جائے تو میں ابھی انہیں آزاد کر دوں گا۔''

''بات صرف تصویر کی نہیں ہوگی بلکہ میرے ساتھیوں کی رہائی کے ساتھ مقدمات اور تمہاری طرف سے پھر کسی کارروائی کا اعادہ نہ ہونے کی ضمانت بھی ہوگی۔''

''یہ پیش کش میری طرف سے پہلے ہی تھی۔'' اس نے کہا اور فرش پر بکھرے موبائل کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ اس نے اس میں سے سم نکالنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا، وہ میرا دشمن تھا اور دشمن کے بارے میں ہر طرح سے باخبر رہنا ضروری تھا۔ میں بستر سے اترا اور موبائل کے پرزوں میں سے سم نکالی اور باقی پرزوں کو یونہی پڑا رہنے دیا۔ چپ تکیے کے نیچے رکھ لی جیسے ہی میں لیٹا، اکرم چشتی اندر آ گیا۔ اس نے مخصوص شکی انداز میں میرا جائزہ لیا۔ ''خاصے تندرست نظر آ رہے ہو؟''

''کس لئے آئے ہو؟'' میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''تمہارا بیان لینا ہے۔''

''اپنے وکیل کی موجودگی کے بغیر میں کوئی بیان نہیں دوں گا۔''

''وکیل کو بھول جاؤ...... اس وقت تم پولیس کی حراست میں ہو اور ساتھ ہی مفرور مجرم بھی ہو۔''

''میں کبھی گرفتار نہیں ہوا اس سے پہلے...... اس لئے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

اکرم چشتی نے سگریٹ سلگائی۔ ''یہ بتاؤ کہ اتنے دن تم کہاں چھپے رہے؟''

''تمہارے گھر میں...... جا کر اپنے بیوی بچوں کو گرفتار کر لو۔''

اس کی آنکھوں میں خطرناک چمک نمودار ہوئی تھی۔ ''شہباز احمد ملک! مجھے مجبور نہ کرو۔ میں تمہیں اسپتال کے بستر سے کھینچ کر تھانے لے جاؤں گا اور تمہارے ہاتھ پیر توڑ دوں گا۔ کوئی مجھ سے نہیں پوچھے گا۔''

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔''

''تمہارے ہاتھ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''تم زیادہ بہتر جانتے ہو...... نادر علی......''

''ان کا نام مت لو...... وہ اس وقت اسپتال میں تھے۔'' اس نے میری بات کاٹی۔

''ٹھیک ہے پھر یہ تمہارا کام ہے۔ میں دونوں کے خلاف بھی عدالت میں درخواست دوں گا۔''

''جسے مرضی دینا...... جلد ایک اے ایس آئی تمہارا بیان لینے آئے گا، اسے جو بھی چاہے لکھوا دینا مگر دو باتوں کا خیال رہے...... ایک تو نادر علی یا مرشد علی کا نام نہ آئے دوسرے میرا ذکر نہ آئے ورنہ تم ہوتو پولیس کی تحویل میں۔''

''مجھے معلوم ہے تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن ایک ذات ہے جو تمہارے مظالم کا حساب لے گی۔''

''اس کی فکر نہ کرو۔'' اس نے تکبر بھرا قہقہہ مارا۔ ''اپنے پاس پیر صاحب کی سفارش ہے۔''

''اپنے ساتھ پیر صاحب کو بھی لے کر جاؤ گے۔''

''بکومت!'' وہ مشتعل ہو گیا تھا۔ ''پیر صاحب کے بارے میں ایک لفظ کہا تو گدی سے زبان کھینچ لوں گا۔''

''اب تم بھی میرا دماغ مت کھاؤ، جاؤ یہاں سے۔'' میں نے بے زاری سے کہتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کی نظر موبائل کے ٹکڑوں پر پڑ گئی تھیں۔ ''یہ کس کا موبائل تھا؟''

''مجھے کیا پتا، ہوگا کسی کا؟''

''مجھے تو مرشد علی کا لگ رہا ہے۔'' اس نے بیٹھ کر پرزے الٹنا شروع کر دیئے۔ ''اس کی چپ کہاں ہے؟''

''مجھے کیا معلوم......'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''جس کا موبائل ہے اسی سے پوچھو۔''

''اوہ یار! زیادہ اوکھا مت بن۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''خدا نہ کرے، آئندہ مجھے یار مت کہنا۔''

اس کی ہنسی کو بریک لگ گئی تھی اور وہ مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے چند منٹ بعد اے ایس آئی نازل ہو گیا۔ اسے میرا بیان چاہئے تھا۔ میں نے ندیم کے بتائے ہوئے نکات ذہن میں رکھ کر مختصر سا بیان دے کر اس سے جان چھڑائی۔ اس کے جانے کے بعد راؤنڈ کا ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے میرے ہاتھ کا معائنہ کیا اور کوئی تبصرہ کئے بغیر چلا گیا۔ شریف احمد نو بجے آیا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ کا معائنہ کیا اور اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ ''ڈاکٹر! کیا کنڈیشن ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں آپ سے چھپاؤں گا نہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''درحقیقت ہاتھ کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اب ایک آخری دوا ہے۔ اس کے بعد کل صبح تک ہمیں ہاتھ کو لازمی آپریٹ کرنا پڑے گا۔''

اس نے اپنے بیگ سے ایک انجکشن نکالا اور سرنج میں بھر کر آہستہ سے میرے نیلگوں اور سوجے ہوئے ہاتھ میں انجکٹ کر دیا۔ ''آج شام تک اس کا اثر معلوم ہو جائے گا۔''

''شریف احمد! آپ کا شکریہ...... لیکن مجھے لگتا ہے شاید مجھے اس ہاتھ سے محروم ہونا پڑے گا۔''

''آپ مایوس نہ ہوں۔ شہباز صاحب! میں نے ایسے ایسے مریضوں کو ٹھیک ہوتے دیکھا ہے جن کو جسم کے کسی حصے میں کنفرم گینگرین ہو چکا تھا اور وہ ٹھیک ہو گئے۔ ڈاکٹر صرف علاج کرتا ہے لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کے علاج سے مریض صحت یاب ہو گا یا نہیں؟ اسی طرح مریض کے بچنے یا نہ بچنے کے بارے میں بھی ہم اندازہ لگا سکتے ہیں، یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ آپ اللہ سے دل کی گہرائیوں سے مانگیں تو وہ ضرور دے گا۔'' وہ میرا شانہ تھپتھپا کر رخصت ہو گیا۔

میں کچھ دیر اس کے الفاظ پر غور کرتا رہا۔ ایک نظر ایک ہاتھ کو دیکھا اور دل میں دعا مانگی۔ ''اے اللہ، اگر میرا یہ ہاتھ میرا مقدر ہے تو اسے بچا لے اور میرا مقدر نہیں ہے تو اس پر صبر دے۔'' اس دعا کے ساتھ ہی میرے اندر کا بوجھ اور دکھ ہلکا ہونے لگا تھا۔ ناشتا کر کے میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ مونا اور سفیر کا خیال مجھے خاصی دیر سے پریشان کر رہا تھا۔ پتا نہیں ندیم کو ان کی گمشدگی کا پتا تھا یا نہیں۔ ورنہ اسے صبح سویرے میرے پاس آنا چاہئے تھا۔ وہ گیارہ بجے آیا تھا۔

''ندیم! مونا اور سفیر......''

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے خفگی سے کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے مونا اور سفیر سے بات ہوئی ہے۔ یار، تم لوگوں کو سوائے مسائل پیدا کرنے کے اور کوئی کام نہیں ہے؟''

''مسائل نہ ہوں تو تیرا کام کیسے چلے گا؟'' میں مسکرایا۔ ''لیکن ان دونوں نے حماقت کی۔''

''تیرے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ یہاں سائن کر دے۔'' اس نے فائل کھول کر میرے سامنے کی۔ ''شام کو مرشد علی اپنے وکیل کے ساتھ میرے دفتر آئے گا۔''

''سن! مونا اور سفیر کو ہر قیمت پر صحیح سلامت اس کے قبضے سے نکالنا ہے۔ میرے مقدمات ثانوی مسئلہ ہیں۔''

''تم اس مسئلے پر سر نہ کھپاؤ۔ انہیں مجھے دیکھنے دو۔'' اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر نے کیا کہا؟''

''امید کم ہے۔ ایک انجکشن اور دیا ہے اگر شام تک بہتری نہ آئی تو کل لازماً اسے آپریٹ کرنا پڑے گا۔''

''اوہ......!'' ندیم کے منہ سے نکلا تھا، سائن لے کر اس نے فائل بند کی۔ ''میں شام کو آؤں گا۔ یہ بتا، پولیس کو کیا بیان دیا؟''

''میں نے اسے بیان کے بارے میں بتایا۔ وہ بغور سنتا رہا۔ پھر سر ہلا کر بولا۔ ''بالکل ٹھیک بیان دیا ہے۔''

''وسیم سے ملاقات ہوئی؟''

''نہیں......وہ کل شام ہی اسپتال سے غائب ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے ڈسچارج نہیں کیا تھا۔''

''اچھا......وہ مرشد علی سے بچنے کے لئے غائب ہوا ہے لیکن اس کی کوٹھی......''

''کوٹھی کرائے کی ہے کسی غضنفر نامی شخص نے لی تھی۔ مالک بیرونِ ملک ہے۔ اس نے کوٹھی کسی اسٹیٹ ایجنٹ کے ذریعے کرائے پر دی ہے۔ پولیس کو اس کوٹھی میں رہنے والے کسی فرد کے بارے میں نہیں معلوم ہے۔ غضنفر کی تلاش جاری ہے۔ مگر اسٹیٹ ایجنٹ بھی تین سال میں اس کی صورت بھول چکا ہے۔ کرایہ اسے مختلف

افراد آ کر دے جاتے تھے۔"
"تمہیں یہ سب کہاں سے معلوم ہوا؟"
"ایسے ہی کامیاب وکیل نہیں ہوں۔" اس نے فائل بیگ میں رکھی۔ "ہر جگہ لائن بنا کر رکھی ہے۔ تیری وجہ سے میں نے پوری رپورٹ لی ہے۔"
"یہ تو برا ہوا۔"
"نہیں ایک لحاظ سے اچھا ہوا۔ اگر وسیم تیرا ہمدرد ہے تو اسے پولیس سے دور رہنا چاہئے کیونکہ پولیس کے ہاتھ آنے کا مطلب ہے، مرشد علی کے ہاتھ آنا۔ وہ آزادرہ کر تیری بہتر مدد کر سکتا ہے۔"
ندیم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ "تُو کب آئے گا؟"
"دیکھو، ان لوگوں سے کب تک معاملہ طے پاتا ہے۔ مونا اور سفیر محفوظ ہیں اس لئے میں کوشش کروں گا تمام تصفیہ طلب معاملے طے کرلوں۔"
"مرشد علی ضمانت دینے کی بات کر رہا تھا کہ بعد میں مجھے یا میرے واقف کاروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"
"اس قسم کی کوئی ضمانت بے کار ہے۔ یہ لوگ عدالتی ضمانتوں کو اہمیت نہیں دیتے۔"
"اس کا مطلب ہے مستقبل میں بھی ہمیں ان سے خطرہ لاحق رہے گا۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "فی الحال تو پولیس سے جان چھوٹتی نظر نہیں آ رہی ہے۔"
"مجھے بھی تم لوگوں کا یہاں رہنا دشوار لگ رہا ہے مگر اس پر بعد میں غور کریں گے۔ پہلے موجودہ مسائل سے تو نمٹ لیں۔" ندیم اٹھتے ہوئے بولا۔
پین کلر اور اعصاب کو سن کرنے والی ادویات کی بدولت مجھے کلائی میں درد کم لگ رہا تھا۔ مگر ذہنی اذیت اس سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میرے ہاتھ کی پریشانی پس پشت چلی گئی تھی اور مجھے مونا اور سفیر کی فکر لاحق تھی۔ میری وجہ سے انہیں کوئی نقصان ہوتا تو میں کبھی خود کو معاف نہ کرتا۔ ندیم اس معاملے کو بالکل غیر جذباتی انداز میں لے رہا تھا اس لئے مجھے امید تھی، وہ زیادہ بہتر طریقے سے معاملات طے کرلے گا۔ سوچتے سوچتے میں نہ جانے کب سو گیا۔ شاید اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ چار بجے مجھے ایک نرس نے اٹھایا۔
"آپ نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ ابھی آپ کو دوا بھی لینی ہے۔" وہ میرے لئے سوپ لائی تھی، مجھے بھوک لگ رہی تھی، میں نے بستر اوپر کروا کے سوپ پیا۔ اس کے بعد نرس نے مجھے دوائیں دیں۔ میں نے نرس سے کہا۔
"سسٹر! کیا مجھے چائے یا کافی مل سکتی ہے؟"
"اسپتال کی طرف سے نہیں...... لیکن میں آپ کو چائے لا دوں گی۔"
"میں شکر گزار رہوں گا۔" میں نے ممنونیت سے کہا تھا۔
میرے ہاتھ کی رنگت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ مجھے لگ رہا تھا کہ اس کا رنگ مزید سیاہ ہو گیا ہے۔ سوجن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، مجھے اپنا اندر بھی اس ہاتھ کی طرح تاریک اور بے حس لگنے لگا۔ جب نرس چائے

لے کر آئی تو میرا موڈ نہیں تھا۔ چائے برابر میں دراز پر رکھی رکھی سرد ہو گئی۔ میرا ذہن ایک خلا بن گیا تھا جس میں کوئی سوچ نہیں تھی۔ میں اس وقت چونکا جب ڈاکٹر شریف احمد آیا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ کا بغور معائنہ کیا۔ اسے دبا کر دیکھتا رہا، مجھ سے تکلیف اور احساس کے بارے میں پوچھتا رہا ہر بار میرا جواب نفی میں ہوتا تھا۔ اس نے آپریشن کے زخم کی پٹی سرکا کر دیکھی اور آخر میں گہری سانس لے کر بولا۔

''شہباز دوست! مجھے افسوس ہے۔ اٹ ول بی کٹ آف ناؤ۔''

''آپریٹ کب ہو گا؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''جتنی جلد ہو سکے اس طرح ہم زہر کو اوپر چڑھنے سے روک سکیں گے۔ اگر تم پسند کرو تو میں آپریشن کر دوں۔ میری کوشش ہو گی زیادہ سے زیادہ ہاتھ بچایا جا سکے۔ یہاں کے ڈاکٹر شاید زخم کے اوپر سے آپریٹ کر دیں۔''

''میں آپ سے آپریٹ کرواؤں گا۔'' میں نے فوری فیصلہ کیا۔

''اوکے۔ آدھی رات کے بعد کسی وقت آپریشن کریں گے۔ میں آپ کے ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں۔ وہی بتائے گا کہ آپریشن کب ہو گا۔''

''میں تیار ہوں ڈاکٹر!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''مجھے افسوس ہے، میں آپ کے لئے کچھ نہ کر سکا۔'' وہ مغموم لہجے میں بولا اور چلا گیا۔ میرے اندر کا خلا اور خاموشی بڑھ گئی تھی۔ کمرے میں روشنی مستقل جلتی رہتی تھی۔ کھڑکی کے باہر تاریکی چھانے لگی تب مجھے احساس ہوا کہ شام ہو چکی ہے۔ مجھے ندیم کا خیال آیا تو کئی گھنٹوں بعد ذہن میں تحریک پیدا ہوئی تھی۔ مجھے مونا اور سفیر کا خیال ستانے لگا اگر سب کچھ طے پا گیا تھا تو وہ رہا ہو چکے تھے یا ہونے والے تھے۔ مجھے ندیم کا انتظار تھا۔ نرس نے آ کر مجھے شام کی دوائی دی تو میں نے وقت معلوم کیا۔ اس نے بتایا کہ آٹھ بجنے والے ہیں۔ مجھے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک وارڈ بوائے مجھے سپاہیوں کی نگرانی میں باتھ روم لے گیا تھا۔ واپسی پر میرا ڈاکٹر چیک کرنے آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرا آپریشن رات دو بجے ہو گا اس نے ایک فارم دیا۔

''اس پر سائن کر دیں۔''

''اس میں کیا ہے؟'' میں نے فارم دیکھا۔ یہ دراصل ایک طرح کا راضی نامہ تھا کہ میں ڈاکٹروں کو اپنا ہاتھ کاٹنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ میں نے لرزتے ہاتھ سے فارم پر سائن کر دیئے۔ ڈاکٹر مجھ سے فارم لے کر چلا گیا۔ ندیم اب تک نہیں آیا تھا۔ مجھے پریشانی ہونے لگی تھی۔ پولیس کسٹڈی کی وجہ سے میں مجبور تھا۔ کسی طرح اس سے رابطہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد مجھے طاقت کا انجکشن دیا گیا تھا تاکہ میں آپریشن کے لئے جسمانی طور پر تیار ہوں۔ اگرچہ میرے لئے یہ بہت اہم تھا لیکن ڈاکٹروں کی نزدیک یہ عام سا اور مائنر (Miner) قسم کا آپریشن تھا، انہیں میرا ہاتھ قطع کر کے بس کھال سی دینی تھی۔ دواؤں میں مجھے شاید کوئی مسکن دوا دی گئی تھی کیوں کہ میں غنودگی محسوس کر رہا تھا۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ ندیم نہیں آیا تھا اور شاید اب اس کے آنے کا امکان بھی نہیں رہا تھا۔ آج رات میرے لئے تبدیلی لانے والی تھی۔ غنودگی کی کیفیت سے کبھی کبھی چونک کر اس ہاتھ کی طرف دیکھ لیتا تھا جو

مجھ سے جدا ہونے والا تھا۔ بچپن سے آج تک میں نے اسے کبھی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب مجھے اس کا احساس تھا۔ اس چھوٹی سی شے کے نہ ہونے سے میں ادھورا رہ جاتا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے، ایک روپیا ایک لاکھ روپے نہیں ہوتا مگر ایک لاکھ میں سے ایک روپیا نکال دیا جائے تو وہ ایک لاکھ روپیا نہیں رہتا ہے۔ ایسے ہی میرا یہ ہاتھ میرا پورا جسم نہیں تھا لیکن اگر یہ ہاتھ نہ رہتا تو میرا جسم پورا نہیں کہلا سکتا تھا۔

رات کا نہ جانے کتنا حصہ گزر چکا تھا لیکن ابھی دو نہیں بجے تھے، جب مجھے آپریشن تھیٹر میں لے جایا جاتا۔ پھر دروازے پر آہٹ سے میں چونکا۔ دو وارڈ بوائے اسٹریچر اندر لا رہے تھے۔ سپاہیوں نے انہیں آرام سے آنے دیا کیونکہ ان کا تعلق اس اسپتال سے تھا۔ انہوں نے مجھے اسٹریچر پر لٹایا اور لے کر روانہ ہو گیا۔ میں نے سرد آہ بھر کر سوچا۔ وقت آ گیا ہے، اسٹریچر اسپتال کی راہ داریوں سے گزر کر آپریشن روم کی طرف جا رہا تھا۔ وارڈ بوائز کے انداز میں عجلت تھی۔ انہوں نے آپریشن والا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ شاید ڈاکٹر شریف آ چکا تھا اور انتظامات بھی مکمل تھے۔ ایک طویل راہ داری سے گزر کر ہم ایک بڑے دروازے تک پہنچے اور جب اس سے نکلے تو ہم کھلی فضا میں تھے۔

''یہ تم لوگ...... مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کیا میرا آپریشن نہیں ہونا ہے؟''

''نہیں جناب!'' میرے سر کے عقب میں موجود وارڈ بوائے نے سرگوشی کی۔ ''ہم آپ کو یہاں سے لے جا رہے ہیں۔''

''کہاں؟'' میں نے اضطراب سے پوچھا۔ میرے اندر اندیشے سرسرانے لگے تھے۔ ''کون ہو تم...... اسٹریچر روکو ورنہ میں اتر جاؤں گا۔''

مگر اتنی دیر میں وہ اسٹریچر ریمپ سے اتار کر نیچے کھڑی ایمبولینس تک لا چکے تھے۔ ''آپ فکر نہ کریں، آپ دوستوں میں ہیں جناب!''

''بکومت!'' میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرا پھرتی سے میری طرف آیا اور اس نے جیب سے کچھ نکال کر میرے منہ پر رکھ دیا۔ سانس روکتے روکتے بھی اس شے کی تیز بو میرے حواسوں پر طاری ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے بے اختیار سانس لیا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

☆======☆======☆

مجھے چھینک آئی اور میں بیدار ہو گیا اس بار بھی ناک میں تیز بو کا احساس تھا لیکن یہ ہوش میں لانے والی تھی۔ امونیا کی جانی پہچانی بو تھی۔ ذہن صاف ہوا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں ایک صاف ستھرے اور آرام دہ بستر پر تھا۔ مجھے امونیا سنگھانے والا شاید کوئی ڈاکٹر تھا۔ اس نے مجھے انجکشن دیا تھا کیونکہ بازو میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی۔ ''نیوروبیان کا انجکشن ہے، طاقت کے لئے دیا ہے۔''

''میں کہاں ہوں؟'' میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے روک دیا۔

''پلیز، چند منٹ لیٹے رہیں، آپ دوستوں میں ہیں۔''

''دوستوں کو اس طرح بے ہوش کر کے لایا جاتا ہے کیا؟'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم آپ کو کس طرح لایا گیا ہے لیکن میں سو فی صد ذمے داری سے کہہ رہا ہوں، آپ اپنے ہمدردوں میں ہیں۔''

''یہ کس قسم کے ہمدرد ہیں؟'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''مجھے آپریشن روم کے بجائے یہاں لے آئے۔ صبح سے پہلے میرا یہ ہاتھ قطع نہ کیا گیا تو اس کا زہر پھیلنے لگے گا۔''

''مجھے اندازہ ہے۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''لیکن اس بارے میں بھی آپ بے فکر رہیں۔ آپ کو یہاں لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپ کے ہاتھ کو بچانے کی ایک کوشش اور کی جائے۔''

''کیا مطلب...... اس کام کا ماہر ڈاکٹر شریف مایوس ہو چکا ہے...... تو تم لوگ کیا کر سکو گے؟''

''دیکھیں انسان حرف آخر نہیں ہے۔ سب کچھ اس ذات کے ہاتھ میں ہے جسے ہم اپنا رب مانتے ہیں۔ اس سے امید رکھیں، سب بہتر ہوگا۔ یہ بتائیں آپ کچھ کھائیں گے یا چائے کافی کوئی اور مشروب؟''

میں نے صاف انکار کر دیا۔ ''جب تک مجھے معلوم نہیں ہو گا کہ میں کن لوگوں میں ہوں، میں کچھ نہیں کھاؤں پیوں گا۔''

''شہباز صاحب! آپ دوستوں میں ہیں۔'' دروازے سے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ وہاں وسیم کھڑا تھا۔ میں بے اختیار بستر پر بیٹھ گیا۔ وسیم آگے آ کر میرے گلے سے لگا۔ ''میں اسپتال سے نکلنے کے بعد بھی آپ کی خبر رکھے ہوئے تھا اور جیسے ہی اطلاع ملی، آپ کا ہاتھ آپریٹ ہونے والا ہے، ہم نے آپ کو وہاں سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔''

''مگر کیوں......؟ میرے ہاتھ کا آپریشن ہو جانے دیتے اور یہ کیا کہہ رہا ہے......کیا میرے ہاتھ پر کوئی تجربہ کیا جائے گا؟''

''ہاں، ایک اور طریقۂ علاج آزمایا جائے گا۔''

میں نے گہرا سانس لیا۔ ''وسیم، آخر تم بتاتے کیوں نہیں......تم لوگ کون ہو اور میرے لئے اتنی زحمت کیوں کر رہے ہو؟''

وہ مسکرایا۔ ''یہ ابھی ایک راز ہے۔ جس شخص نے ہمیں آپ کے لئے ہائر کیا ہے، وہ جلد یہاں آنے والا ہے۔ اسے دیکھ کر آپ کو آپ کے تمام سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔''

''اور وہ کب تک آئے گا؟''

وسیم نے گھڑی دیکھی۔ ''اس وقت صبح کے سات بج رہے ہیں۔ شاید بارہ ایک بجے تک آ جائے گا۔''

مجھے ندیم، مونا اور سفیر کا خیال آیا۔ ''مجھے اپنے وکیل سے بات کرنی ہے۔''

وہ پھر مسکرایا۔ ''مجھے معلوم ہے......لیکن اس معاملے میں بھی آپ کو تھوڑا صبر کرنا پڑے گا۔ فی الحال رابطہ ممکن نہیں ہے اور ہم آپ کے ساتھیوں کو چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بس یہ پتا چل جائے وہ کہاں رکھے گئے ہیں۔''

مجھے سم کا خیال آیا جو میں نے مرشد علی کے تباہ شدہ موبائل سے نکالی تھی اور وہ بستر کے سرہانے رہ گئی تھی۔ ''کیا موبائل چپ میں موجود نمبروں سے ان کا پتا چل سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں؟'' اس نے چونک کر کہا تب میں نے اسے مرشد علی کی موبائل فون چپ کے بارے میں بتایا۔

''اوہ کاش......! آپ اسے لے آتے......خیر......'' وہ جلدی سے کمرے سے چلا گیا اس کی واپسی کوئی پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔ ''میں نے اپنے آدمی روانہ کر دیئے ہیں۔ خدا کرے چپ مل جائے۔''

''مجھے ندیم کو فون کرنے دو۔ وہ تصویر کی ڈیل کر رہا ہوگا۔''

''مجھے افسوس ہے۔ آپ اسے فون نہیں کر سکتے، اسے ہماری مجبوری سمجھیں۔''

''کیسی مجبوری......؟ کیوں فون نہیں کر سکتا؟'' میں جھنجلا گیا تھا۔

''پلیز شہباز صاحب، ذرا صبر کریں......بس چند گھنٹے کی بات ہے۔ سب آپ کے سامنے آ جائے گا۔ اس وقت تک آپ ناشتا کریں اور آرام کریں۔''

''ان حالات میں کھانا یا آرام کرنا ممکن ہے جبکہ میرے ساتھی ایک کمینے دشمن کے قبضے میں ہیں اور میں بے دست و پا تمہارے پاس ہوں؟''

''لوگوں پر اس سے بھی برا وقت آتا ہے۔ آپ کے ساتھیوں کے بارے میں، میں ضمانت دیتا ہوں۔ مرشد علی ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ وہ تصویر اس کے لئے قیمتی ہے۔''

میں چونکا۔ ''تمہیں اس تصویر کے بارے میں کیا معلوم ہے؟''

''بہت کچھ......لیکن یہ تصویر اسے نہیں ملے گی۔''

''جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ مرشد علی ایک جاہل جاگیردار خاندان سے ہے جسے فنونِ لطیفہ سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے تب تصویر کی اس کے لئے کیا اہمیت ہے؟''

''تصویر اسے اپنے لئے نہیں بلکہ کسی اور کے لئے چاہئے۔''

میں چونکا۔ ''کس کے لئے...... کیا وہ کوئی غیر ملکی ہے۔''

''آپ بھی اس تصویر کے بارے میں خاصے باعلم ہیں۔'' وہ مسکرایا۔ ''میں ابھی ناشتا بھجواتا ہوں۔ دوائیں بھی منگوالی ہیں اور ایک ڈاکٹر ہمہ وقت موجود رہے گا۔''

وہ چلا گیا اور میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میری زندگی کے ہنگامہ خیز دور کا آغاز بھی اس تصویر کی وجہ سے ہوا تھا اور اب جب کہ میں اپنی مشکلات میں گھرا تھا، یہ تصویر ایک بار پھر میرے لئے آزمائش کا باعث بن رہی تھی۔ شاید تقدیر نے یہ تصویر میری زندگی میں شامل کر دی تھی۔ کچھ دیر میں ناشتا آ گیا۔ سلیقے سے سنکے ہوئے توس تھے۔ مکھن اور ابلے ہوئے انڈے تھے۔ جام اور جیلی تھی اور سب سے بڑھ کر ناشتا کرانے کے لئے حسین اور طرح دار نرس تھی۔ وہ پہلی بار آئی تھی اور اس کے آتے ہی کمرے کے بے جان اور ساکت ماحول میں زندگی کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔ یہ لہریں اس کے وجود سے پھوٹ رہی تھیں، اس نے کمرے کے پردے ہٹائے اور ناشتے کی میز بستر کے ساتھ لگا کر اپنے ہاتھوں سے مجھے مختلف چیزیں دینے لگی۔ سنہرے سیب جیسی رنگت، سنہری مائل بال، زندگی سے بھرپور ہنستا اور جگمگاتا چہرہ اور نرس کی یونیفارم میں پارے کی طرح مچلتا بدن۔

''میرا نام جولی ہے سر!'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کی خدمت پر مامور ہوں۔''

''گزشتہ ایک ہفتے میں تم میری نظر سے گزرنے والی سب سے حسین نرس ہو۔''

وہ ہنسی ''سر، یہ توس لیں، میں نے خود جام لگایا ہے۔''

''شکر ہے یہ جام بنانے والے ہاتھ نہیں ہیں۔ میں پیتا نہیں ہوں۔''

''اور سر! اگر میں جام بنانے والی ہوتی؟'' اس کے لہجے میں شرارت نمایاں تھی۔

''تب میں پینے پر غور کرتا۔'' میں نے اس کے لہجے میں کہا۔ اسی طرح باتوں باتوں میں اس نے مجھے پورا ناشتا کرا دیا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ میری فرمائش پر وہ خاص کافی بنا کر لائی اور پھر اپنے دستِ مبارک سے دوا کھلا کر کوئی انجکشن لگایا۔ ''سر! اب آپ آرام کریں۔''

''اور تم......؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''میں یہیں ہوں کوئی کتاب دیکھوں گی، میں بی کام کی تیاری کر رہی ہوں۔ ڈیوٹی کے دورانِ اوقات کچھ تیاری کر لیتی ہوں۔''

''تم نرسنگ کر چکی ہو، پھر بی کام کیوں؟''

''کیونکہ سر! اس پیشے میں عزت نہیں ہے۔ لوگوں کے نزدیک میری خدمت گزاری اور نرسنگ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ مجھے صرف ایک لڑکی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ بی کام کر کے میں کہیں اور جاب کر لوں گی۔''

نہ جانے کیوں میں شرمندہ ہو گیا تھا اور چند لمحے پہلے میں جتنا زندہ دل ہو رہا تھا، اب اندر سے اتنا ہی مر لیا تھا۔ ابھی کل تک میرا دوسری نرسوں سے واسطہ پڑتا رہا تھا۔ میں نے ان سے کوئی فالتو بات نہیں کی حالانکہ

انہوں نے بھی میری اتنی ہی خدمت کی تھی اور نہ ہی ان کی صحبت نے میرے جذبات میں تھرتھری پیدا کی تھی شاید اس لئے کہ وہ سب عام سی شکل صورت کی حامل تھیں اور جولی بے حد حسین تھی۔ میرے تاثرات دیکھ کر اس نے جلدی سے کہا۔ ''سر! میں نے آپ کے حوالے سے یہ بات نہیں کی ہے۔ آپ ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کی آنکھوں میں میل نہیں ہے۔''

میں نے سرد آہ بھری۔ ''پھر بھی میں شرمندہ ہوں۔ کیونکہ اس مرد برادری کا رکن ہوں جو عورت کو کھلونا سمجھتی ہے۔''

''نہیں سر! اس معاشرے میں ابھی اچھے لوگ بھی ہیں اور مجھے یقین ہے، آپ ان میں سے ایک ہیں۔''

''شکریہ جولی۔ تم بھی ایک اچھی لڑکی ہو۔'' میں بستر پر دراز ہو گیا۔

اس نے اپنے بڑے سے بیگ سے بینکنگ کے موضوع پر نصابی کتاب نکالی اور اس کا مطالعہ کرنے لگی۔ اس نے اپنی کرسی کھڑکی کے نزدیک کر لی تھی تاکہ روشنی صحیح طرح سے آئے۔ میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ مونا اور سفیر کے بارے میں وسیم کا رویہ پُرسکون تھا۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ اوّل تو یہ کہ مونا اور سفیر واقعی محفوظ تھے، جب تک تصویر کا حصول ممکن نہ ہو جاتا، قوی امکان تھا کہ مرشد علی انہیں ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ میری گمشدگی کے بعد یہ ڈیل پھر کھٹائی میں پڑ چکی ہو گی۔ وسیم کے انداز سے لگ رہا تھا کہ تصویر اب تک مرشد علی کو نہیں ملی ہے۔ عین ممکن ہے، ندیم نے میری گمشدگی کو مرشد علی کے کھاتے میں ڈال کر میری بازیابی کا مطالبہ بھی کر دیا ہو اور یہی غالباً وسیم کا مقصد تھا کہ ندیم میرے بارے میں کنفیوژ رہے اور تصویر مرشد علی کے حوالے نہ کرے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ وسیم نے اس حوالے سے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ تصویر سے اس کی دلچسپی بھی ظاہر تھی کیونکہ اس نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ تصویر کسی صورت مرشد علی کو نہیں ملے گی۔ یعنی اس مونا اور سفیر کی پروا نہیں تھی۔ میرے لئے وہ اس لئے سرگرم تھا کہ تصویر میرے توسط سے مل سکتی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

''جولی! کیا تمہارے پاس موبائل ہے؟''

''ہے سر! لیکن فی الحال وہ مجھ سے لے لیا گیا ہے۔'' اس نے کہا تو میں سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ وسیم ہر پہلو پر نظر رکھنے والا شخص ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے مجھ پر پابندی لگائی تھی نہ جانے کیوں میرا ذہن اس کے بارے میں منفی انداز میں سوچنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جولی مطالعے میں گم رہی اور میں آرام کرتا رہا۔ دواؤں کے مسلسل استعمال سے کلائی کے آپریشن کی تکلیف خاصی کم ہو گئی تھی لیکن اس سے نیچے ایک عجیب سی اینٹھن اور درد والی کیفیت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی پوری قوت سے میرا پنجہ بھینچ رہا ہو۔ کئی بار میں چونک کر ہاتھ جھٹکتے جھٹکتے رہ گیا تھا۔ سامنے دیوار پر خوب صورت سی وال کلاک لگی تھی۔ میں بھی کبھی اس میں وقت دیکھ لیا کرتا تھا۔ بارہ بجے میری بے چینی عروج پر تھی۔ وسیم نے جس شخص کا ذکر کیا تھا، اسے آ جانا چاہئے تھا یا وہ اب تک آ چکا تھا۔ میں نے جولی سے کہا۔ ''مجھے وسیم سے بات کرنی ہے۔''

''میں انفارم کرتی ہوں سر!'' اس نے کہا اور میز پر رکھے ٹیلی فون کے سیٹ کا کریڈل اٹھا کر ایک لمحہ دبایا۔ ''مسٹر شہباز! وسیم صاحب سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے کہا اور دوسری طرف سے جواب سن کر

شکریہ کہا اور ایک نمبر اور ملایا۔ ''سر! میں جولی بات کر رہی ہوں۔ شہباز صاحب، آپ سے بات کریں گے۔''
اس نے انٹرکام کا ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ ''جی جناب!'' وسیم کی آواز آئی۔
''وسیم، میں اس شخصیت سے ملنے کے لئے بے تاب ہوں جو میرے لئے اتنے جتن کر رہی ہے۔''
''وہ اب سے دو گھنٹے کے اندر یہاں ہوں گے اس میں ذرا تاخیر ہو رہی ہے اور تاخیر بھی اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ وہ آپ کے علاج کی دوا لا رہے ہیں۔''
''چلو، جہاں اتنا وقت گزرا ہے، وہاں دو گھنٹے اور سہی۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''وسیم، کیا تم مجھے باہر کے حالات بتانا پسند کرو گے؟ پولیس، مرشد علی اور میرا وکیل ندیم میری گمشدگی کو کس نظر سے دیکھ رہے ہیں؟''
''میں آپ کے پاس آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور لائن بے جان ہو گئی۔ میں نے ریسیور جولی کو واپس کر دیا۔

وسیم چند منٹ بعد میرے سامنے تھا۔ وہ بالکل تر و تازہ لگ رہا تھا۔ دو روز پہلے کے حادثے کا صرف معمولی سا نشان اس کی کنپٹی کے پاس زخم کا تھا جس پر کھرنڈ آ گئی تھی۔ اس نے خاص نظروں سے جولی کی طرف دیکھا تو وہ چپ چاپ کمرے سے چلی گئی۔ وسیم کرسی کھسکا کر بستر کے پاس بیٹھ گیا۔ ''جولی اچھی لڑکی ہے اور قابل اعتماد بھی ہے اس کے باوجود آپ اپنے یا میرے بارے میں بات کرتے ہوئے محتاط رہیں۔''
''سوری، مجھے خیال نہیں رہا تھا۔''
''معذرت کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ بہر حال آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ پولیس آپ کو مفرور قرار دے رہی ہے۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہیوں کو معطل کر کے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ندیم اسے پولیس کی چال قرار دے رہا ہے اور آج اس نے آپ کی بازیابی کے لئے درخواست عدالت میں دائر کر دی ہے۔ تیسری طرف مرشد علی اسے ہمارے کھاتے میں ڈال رہا ہے۔ اگرچہ وہ ہم سے ناواقف ہے لیکن اتنا جانتا ہے کہ اس کے خلاف آپ کے کچھ ہمدرد موجود ہیں۔''
''مرشد علی کا خیال [illegible]ست ہے۔'' میں مسکرایا۔ ''یعنی وہ ذہین آدمی ہے۔''
''نہیں، یہ بات سمجھنا معمولی ہے، آپ کو اس نے اغوا نہیں کرایا اور نہ ہی پولیس نے غائب کیا ہے۔ پولیس خود اس کی زر خرید ہے اور اس سے چھپ کر ایسا کام نہیں کر سکتی۔ اب ہم رہ جاتے ہیں جو ایک بار پہلے بھی آپ کو اس کے چنگل سے نکال چکے ہیں۔''
''بس ذرا تاخیر سے۔'' میں نے سرد آہ بھر کر اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔
''مجھے ساری عمر افسوس رہے گا اگر ہم چند منٹ جلدی پہنچ جاتے۔''
''بس مقدر میں تھا۔''
''آپ مایوس نہ ہوں۔'' اس نے مجھے تسلی دی۔ ''آج دوا آ رہی ہے، وہ یقیناً اثر دکھائے گی۔''
''خدا کرے۔'' میں نے دل سے کہا۔
''ندیم صاحب کو بے خبر رکھنا زیادہ بہتر ہے۔ اس طرح وہ سچ مچ آپ کی بازیابی کے لئے بھاگ دوڑ کریں گے۔ اس سے مرشد علی اور پولیس کا شبہ تذبذب میں پڑ جائے گا۔''

''ندیم کو پتا چل جائے تب بھی وہ پوری کوشش کرے گا۔'' میں نے کہا۔

''معذرت چاہوں گا لیکن اس کا حکم نہیں ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

کس کا حکم نہیں تھا، ظاہر ہے اس شخص کا جس نے وسیم کو ہائر کیا تھا جو دو بجے تک یہاں آنے والا تھا۔ وسیم کچھ دیر بعد چلا گیا تھا۔ میں واش روم سے آیا تو جولی چکن کارن سوپ کی شکل میں دوپہر کا کھانا لے آئی تھی۔ اسے پی کر میں نے دوالی۔ انجکشن نہیں لگا تھا شاید اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے ہاتھ کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ دو بجے کے قریب وسیم آیا تھا۔ ''جناب! کیا آپ چل سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

''یہیں پاس ایک کمرے [illegible] آ گئے ہیں، آپ کو بلا رہے ہیں۔''

''چلو، میں تو کب سے انتظار کر رہا ہوں۔''

''ممکن ہے آپ حیران رہ جائیں۔'' وہ مسکرایا۔

''گزشتہ کچھ دن سے میں یہی کام تو کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کبھی کبھی تو یہ سب خواب لگتا ہے جیسے ابھی آنکھ کھل جائے گی اور میں اپنی معمول کی زندگی میں ہوں گا۔''

''ایسا بھی ہوگا جناب!'' اس نے گویا مجھے تسلی دی۔ میں اس کے ہمراہ ایک وسیع نشست گاہ میں داخل ہوا جو قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھی۔ صوفے پر ایک شخص سنہری کلاہ پہنے بیٹھا تھا۔ اس کی بھنویں تک سفید تھیں لیکن کمر بالکل سیدھی تھی اور آنکھوں میں عقابی چمک تھی۔ بلند پیشانی اور کھڑی ہوئی ناک اس کے عالی ہمت ہونے کی نشانی تھی۔ وہ راجا عمر دراز تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس نے صوفے سے اٹھتے ہوئے مجھے سینے سے لگا لیا۔ ''کیسے ہو شہباز احمد!''

''آپ کے سامنے ہوں راجا صاحب!'' میں نے حیرت سے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ شخصیت آپ کی ہوگی۔''

''حالانکہ اس شہر میں تصویر دیکھ کر تمہیں سمجھ جانا چاہئے تھا کہ میں بھی آس پاس ہوں گا۔''

''اس کے برعکس تصویر دیکھ کر مجھے کچھ اور خیال آیا تھا خدانخواستہ......''

''میں اس دنیا میں نہیں رہا۔'' وہ مسکرایا۔

''یا پھر اسے آپ کے محل سے چرا لیا گیا تھا؟''

''ہاں......لیکن میرے آدمی چوروں کے پیچھے تھے اور انہوں نے تصویر حاصل کر لی تھی۔ بدقسمتی سے جس کے پاس تصویر تھی، وہ تمہاری گاڑی سے ٹکرا گیا۔''

''اس کی موت میں میرا کوئی قصور نہیں ہے، وہ اتنا اچانک سامنے آیا تھا کہ میں کوشش کے باوجود اسے نہ بچا سکا۔ بہرحال تصویر میں نے اس [illegible] تھی اور وہ اب میرے پاس محفوظ ہے۔''

''مجھے معلوم ہے، یہ ایک حادثہ تھا۔ [illegible] اتفاق سے اس کا بندر تمہارے پاس پہنچ گیا۔''

''وہ بندر اس فقیر کا تھا۔'' میں چونکا پھر مجھے فقیر سے مشابہ حلئے والا شخص یاد آیا جس کے ساتھ بندر چلا گیا تھا۔ میں نے اس کا ذکر راجا عمر دراز سے کیا۔

''وہ اس کا بھائی تھا۔ بندر دونوں نے مل کر پالا تھا اور اب وہ میرے پاس ہے۔'' راجا عمر دراز بولا اور
دی۔ ''جے ڈی...... ادھر آ جاؤ۔''
بندر چاروں ہاتھوں پیروں سے چلتا نشست گاہ میں آیا اور راجا عمر دراز کے قدموں میں بیٹھ گیا، اس نے
ی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''میرا بیٹا!''
جواب میں بندر نے فدویانہ انداز میں دانت نکالے۔ یہ بلاشبہ وہی بندر تھا۔ اس کے دائیں کان پر کسی
ر کے کاٹنے کا نشان تھا۔ اس نے لاتعلقی سے میری طرف دیکھا تھا جیسے مجھے جانتا ہی نہیں ہو۔ میں نے اس
وجہ ہٹا کر راجا کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے میرے لئے اتنی زحمت اسی وجہ سے کی کہ وہ تصویر میرے پاس
''
''اس وجہ سے بھی اور اس وجہ سے بھی کہ میرے دشمن تمہارے دشمنوں کے حلیف بن چکے ہیں۔''
''مرشد علی!'' میں چونکا۔ ''اور آپ کے دشمن......''
''وہی شا خاندان...... لیکن اب اس کا ایک نیا مہرہ سامنے آیا ہے۔ شاید تمہیں علم نہ ہو۔ برٹ شا کو مردہ
دیا چکا ہے اور اس کی جائیداد اس کے ایک کزن کے قبضے میں ہے۔ ڈیوڈ شا نامی یہ شخص بے حد خطرناک
افریقہ میں اپنی قوم کی خدمات کے صلے میں اسے بڑے اعزازات اور جاگیر سے نوازا گیا ہے۔ وہاں یہ
ں طاقتوں کے مفاد میں خانہ جنگیاں کراتا رہا ہے اور اب ولیم شا کے وارث کی حیثیت سے تصویر حاصل
نے آیا ہے۔''
''برطانیہ کا ایک سیاسی اور سرکاری کارندہ!'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''مرشد علی سے اس کا کیا تعلق
تا ہے؟''
''وہی جو آقا سے غلام کا ہوتا ہے۔ مرشد علی خود اس کا مرید بنا ہوا ہے کیونکہ وہ سیاست میں اونچے مقام
پہنچنا چاہتا ہے اور ہمارے ملک میں یہ تصور عام ہے کہ حکومتیں بیرونی اشارے پر تشکیل پاتی ہیں۔'' راجا
راز کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔
''ٹھیک ہے۔ میں قدرتی طور پر آپ کا حلیف بن گیا لیکن سوال یہ ہے کہ میرے ساتھی مرشد علی کی قید
ہیں وہ مجھ سے تصویر کا مطالبہ کر رہا ہے۔ تصویر میرے قبضے میں ہے اور میں آپ کے قبضے میں ہوں۔ تصویر
ی کی ملکیت ہے، ان حالات میں آپ مجھ سے کیا چاہ سکتے ہیں؟''
''فی الحال کچھ نہیں۔ مرشد علی تصویر کے حصول کی امید باقی رہنے تک کوئی قدم اٹھانے کی پوزیشن میں
ں ہے اور میرے آدمی تمہارے ساتھیوں کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''
''اور فرض کریں، انہیں کامیابی نہ ہوئی تب......؟''
''تب بھی اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہو گا۔'' راجا عمر دراز بولا۔ ''میں اپنے ساتھ ذاتی حکیم کو لایا ہوں، وہ
ا علاج کرے گا، تمہیں ایک بار پہلے بھی تجربہ ہو چکا ہے۔''
مجھے وہ حیرت انگیز مرہم یاد آیا جس نے میرے گہرے زخم صرف ایک دن میں بھر دیئے تھے اور میری
پر معمولی سے نشان رہ گئے تھے۔ ''جی یاد ہے...... کیا حکیم وہی مرہم میرے ہاتھ پر آزمائے گا؟''

''نہیں، مرہم کا فارمولا بدل دیا ہے۔ مجھے امید ہے تمہارا ہاتھ چند دن میں اچھا ہو جائے گا۔''

''جناب! میں اپنے وکیل سے رابطہ کرنا چاہتا تھا مگر وسیم نے انکار کر دیا۔''

''اسے میں نے کہا ہے فی الحال تمہارا کسی سے رابطہ مناسب نہیں ہے۔ میں نے معلومات حاصل کی ہیں، تمہارے وکیل نے پولیس کو ہلا کر رکھ دیا ہے، خاص طور سے اس نے اکرم چشتی نامی انسپکٹر کے خلاف درخواست دی ہے کہ تمہیں غائب کرنے میں اس کا ہاتھ ہے۔''

''اس شخص کو پولیس میں نہیں ہونا چاہئے۔'' میں نے انسپکٹر اکرم چشتی کے نام پر دانت پیسے۔

''بہت سارے پولیس والوں کو فورس میں نہیں ہونا چاہئے لیکن وہ ہوتے ہیں۔''

''یہی ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے۔ ہر محکمے میں وہ لوگ بھرے ہیں جن کو وہاں نہیں ہونا چاہئے۔'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''اب میرے لئے کیا حکم ہے؟''

''تم جاؤ...... حکیم آ رہا ہے۔ وہ تمہارا علاج کرے گا اور فکر نہ کرو...... ان شاء اللہ یہ ہاتھ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے اس سے بھی زیادہ خراب حالت میں اعضا ٹھیک ہوتے دیکھے ہیں۔''

بازو میں لگے کھانچے نے میرے مضروب ہاتھ کو اس طرح سنبھال رکھا تھا کہ مجھے نقل و حرکت میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ دوا کے مسلسل استعمال سے بازو کے اوپری حصے کی سوجن بھی خاص حد تک کم ہو گئی تھی۔ مسئلہ میرے ہاتھ کا تھا۔ وسیم کے ساتھ میں کمرے میں آیا جہاں شاہی حکیم راجا عمر دراز کے سیکرٹری بیگ کے ساتھ موجود تھا۔

''خوش آمدید جناب!'' بیگ نے مسکرا کر کہا۔

میں ہنسا۔ ''یہ بات تو مجھے کہنی چاہئے۔''

''یہاں بھی آپ ہمارے مہمان ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔ راجا کی طرح اس کی ساخت میں بھی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ شاید پہاڑوں پر وقت کی رفتار سُست ہو جاتی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی جب راجا عمر دراز کی طرح سیکرٹری بیگ نے بھی مجھ سے سوال نہیں کیا کہ فتح خان کے ساتھ جانے کے بعد مجھ پر کیا گزری تھی؟ کچھ کہانی تو ان تک مقامی انتظامیہ کے توسط سے جا پہنچی ہوگی کیونکہ ایمن نے کھل کر راجا عمر دراز پر الزام لگایا تھا۔ اس کا بیان ریکارڈ پر تھا جسے حاصل کرنا راجا کے لئے مسئلہ نہیں تھا۔ البتہ بعد میں کسی نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ میرا نام پتا بھی ریکارڈ میں شامل ہو چکا تھا اور راجا کے لئے آسان تھا، وہ مجھ تک رسائی حاصل کرتا لیکن اس نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اب بھی راجا اور میرا رابطہ نہ ہوتا اگر تصویر کا مسئلہ ایک بار پھر کھڑا نہ ہوتا۔ راجا نے ایک بار بھی مجھے تصویر دینے کو نہیں کہا تھا، اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ تصویر کے موجودہ مقام سے مطمئن ہے اور اسے کوئی خدشہ نہیں ہے کہ تصویر مرشد علی کے پاس جا سکتی ہے۔

شاہی حکیم اپنے مخصوص لباس میں تھا۔ اگر کمرا ائیر کنڈیشنڈ نہ ہوتا تو اسے خاصی گرمی لگتی۔ یہ لباس پہاڑوں پر چل سکتا تھا۔ نیچے تو آدمی کا اس میں دم گھٹ جائے۔ وہ ایک میز پر اپنے بکس سے مرتبان نکال کر سجا رہا تھا۔ پھر اس نے بیگ سے کچھ کہا اور بیگ نے ترجمہ کیا۔ ''جناب! اگر آپ نے بیت الخلا جانا ہے تو ہو آئیں کیونکہ علاج کے دوران میں آپ کو کم سے کم چھ گھنٹے بستر سے ہلنا نہیں ہے۔''

میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا اور واش روم سے ہو آیا۔ حکیم نے مجھے زمین پر لٹایا تھا۔ میرا بازو پھیلا کر ایک سبز رنگ کے موٹے کپڑے پر رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے میرے بازو کو کھانچے سے آزاد کر کرایا۔ کھانچے سے نکلتے ہی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں نے حرکت کی تو میں تڑپ گیا تھا۔ اگرچہ آپریشن کر کے اندر پلیٹیں ڈال دی گئی تھیں لیکن ہڈیاں درست طور سے جڑنے میں ابھی مہینوں کی مدت درکار تھی۔ حکیم نے میرا ہاتھ سیدھا کیا اور ایک مرتبان سے سبزی مائل گاڑھا مرہم نکال کر میرے ہاتھ اور زخم پر لیپ کرنے لگا۔ ایک طرف لیپ کرنے کوئی پندرہ منٹ بعد حکیم نے ہاتھ کو پلٹا جب مرہم اتنا خشک ہو گیا کہ اب اس کا ہاتھ سے الگ ہونے کا امکان نہیں رہا تھا یہ مہندی کی طرح خشک ہو کر چپک گیا تھا۔ اس عمل میں بھی مجھ پر قیامت گزر گئی تھی اور ضبط کے باوجود میری کراہیں نکل گئی تھیں۔ حکیم نے میری تکلیف پر توجہ دیئے بغیر مرتبان سے مرہم نکال کر لیپنے کا عمل جاری رکھا اور ہاتھ کو آپریشن کے زخم تک مرہم سے ڈھانپ دیا۔ پھر اس نے بیگ سے کچھ کہا اور اس نے اردو میں ترجمہ کیا۔

''جناب! حکیم قاوس کا کہنا ہے کہ آپ اگلے چھ گھنٹے تک اس ہاتھ کو حرکت نہیں دے سکتے۔ یعنی ہاتھ اس کپڑے سے نہیں اٹھا سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔ حکیم ایک ڈبیا سے وہی مینگنی نما گولیاں برآمد کر رہا تھا جیسی کہ آٹھ سال پہلے کھلائی تھیں اور جن کے بارے میں آج تک مجھے شبہ تھا کہ وہ گولیاں تھیں یا مینگنیاں۔ ان کی جسامت، رنگ اور بو بالکل بکری کی مینگنی جیسی ہی تھی۔ بہر حال اس وقت شاہی حکیم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ یہ مینگنی نہیں ہے بلکہ جڑی بوٹیوں سے تیار کی ہوئی جادو اثر گولیاں ہیں۔ اس وقت اس نے ان گولیوں کے خواص پر ایک لمبی چوڑی تقریر بھی کی تھی جس کا بیشتر حصہ میرے سر پر سے گزر گیا تھا۔ حکیم نے گولیاں میرے منہ کی طرف بڑھائیں۔ یعنی وہ اپنے ہاتھ سے مجھے یہ گولیاں کھلانا چاہتا تھا۔ ان سے وہی مخصوص بو اٹھ رہی تھی۔ میں نے رحم طلب نظروں سے بیگ کی طرف دیکھا۔ ''کیا انہیں کھائے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا؟''

وہ مسکرایا۔ ''یہ ضروری ہیں جناب! آپ اللہ کا نام لے کر پانی کے ساتھ نگل جائیں۔''

بادل نخواستہ میں نے یہی کیا تھا۔ گولیاں پانی سے حلق سے اتاریں اور کچھ دیر تک ابکائی روکتا رہا۔ حکیم نے اپنا ساز و سامان سمیٹا اور کچھ کہتا ہوا رخصت ہو گیا۔ بیگ نے مجھے بتایا۔ ''ممکن ہے، اس دوا سے آپ کو نیند آنے لگے تو آپ سو جائیں۔ ایک آدمی ہمہ وقت یہاں رہے گا جو آپ کی نگرانی کرتا رہے گا۔''

''شکریہ بیگ صاحب!'' میں نے جواب دیا۔ مجھے سچ مچ غنودگی محسوس ہو رہی تھی اور کچھ دیر بعد میں سو گیا تھا پھر میری آنکھ تکلیف سے کھلی۔ رات ہو چکی تھی بلکہ دس بج رہے تھے اور میں جناتی قسم کی بھوک محسوس کر رہا تھا جو اس مرہم کی مخصوص نشانی تھی۔ حکیم میرے ہاتھ سے خشک ہو جانے والا لیپ اتار رہا تھا اور مجھے ہاتھ کی حرکت سے تکلیف ہو رہی تھی۔ میں بے چینی سے اپنے ہاتھ کی حالت دیکھنا چاہتا تھا۔ پہلے زخم والے حصے سے لیپ اترا تو اس کی حالت حیرت انگیز طور پر بہتر تھی۔ زخم تقریباً بھر جانے والی کیفیت میں تھا اور ٹانکے خشک ہو چکے تھے۔ البتہ جب ہاتھ پر سے لیپ اترا تو اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہاتھ ویسا ہی سوجا ہوا اور سبزی مائل سیاہ ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی انگلیوں کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ حکیم نے اپنی زبان میں

کچھ کہا۔ ترجمے کے لئے ایک اور شخص تھا، اس نے مجھ سے کہا۔ ''جناب! حکیم صاحب فرما رہے ہیں، آپ کھانے پینے اور دوسری ضروریات سے فارغ ہو جائیں تا کہ اگلا لیپ کیا جائے۔''

اپنے ہاتھ کی حالت میں کوئی بہتری نہ پا کر میں شاک کی کیفیت میں تھا۔ جب اس شخص نے دوبارہ کہا تو میں نے جواب دیا۔ ''کھانا لے آؤ، مجھے بھوک لگی ہے۔''

کھانے سے پہلے اس نے لوٹے اور تسلے میں میرا ہاتھ دھلایا۔ اس کے بعد مقوی غذاؤں سے بھری ایک میز لائی گئی تھی۔ میں نے نیچے ہی بیٹھ کر کھایا اور پہلے ہی کی طرح اپنی معمول کی خوراک سے دگنا کھا گیا۔ کھانے میں شہد اور خوبانی کے سوپ کو ملا کر بنائی گئی سویٹ ڈش بھی تھی۔ میں اس کا پورا ڈونگا صاف کر گیا تھا۔ کھا پی کر میں نے کچھ دیر آرام کیا پھر واش روم سے ہو کر آیا تو شاہی حکیم دوسرے راؤنڈ کے لئے تیار تھا۔ اس نے ایک بار پھر میرے بازو کو کھانچے سے نکال کر پچھلا عمل دہرایا اور میں میٹھی نما گولیاں کھا کر مدہوشی کی نیند سو گیا۔ شاید ان میں کوئی خواب آور جزو بھی تھا۔

صبح کے وقت مجھے تکلیف سے جاگ نہیں آئی بلکہ اس بار جاگنے کا سبب شدید قسم کی بھوک تھی جو میرے پیٹ میں ہلچل مچائے ہوئے تھی۔ میری پہلی نظر اپنے ہاتھ پر گئی، اس پر سے دوسرا لیپ بھی اتار دیا گیا تھا۔ میری کلائی پر آپریشن کا زخم بالکل خشک ہو گیا تھا اور اب کھال پر صرف نشان رہ گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ ہلایا تو مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی تھی البتہ میرا پنجہ بے جان انداز میں جھول رہا تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ سوجن کسی قدر کم ہو گئی ہے اور ہاتھ کی سیاہی مائل رنگت میں بھی بہتری آئی تھی۔ اسی لمحے ایک ملازم ناشتے کی ٹرے لے کر آیا۔ میں حیران ہوا کہ اسے کیسے علم ہوا، میں جاگ گیا ہوں اور بے حد بھوکا ہوں؟

''آپ منہ ہاتھ دھو لیں۔'' اس نے ادب سے کہا۔ ''حکیم صاحب کہہ رہے تھے اب یہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کھانچے کی طرف اشارہ کیا۔ ''لیکن ہاتھ کو کم سے کم حرکت دیں اور اس ہاتھ کو پانی سے بچائیں۔''

میں آرام سے واش روم گیا اور سارے کاموں سے فارغ ہوا۔ مجھے کلائی کی ٹوٹنے والی جگہ ذرا بھی درد نہیں ہو رہا تھا۔ اگرچہ اس مرہم کا مجھے پہلے بھی ایک بار تجربہ ہو چکا تھا مگر مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ مرہم ٹوٹی ہوئی ہڈی کو بھی اتنی جلدی اچھا کر دیتا ہے۔ واپس آ کر میں نے حسبِ معمول ڈٹ کر ناشتا کیا حالانکہ آٹھ گھنٹے پہلے ہی میں اپنے پیٹ کی گنجائش سے زیادہ کھا چکا تھا اور اس وقت مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے پورے چوبیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا ہو۔ ناشتے میں چار عدد ابلے ہوئے انڈے، مکھن کا ایک پیالہ، فرائی کلیجی، دیسی گھی میں بنے پراٹھے اور سبز قہوہ تھا۔ میں نے چائے مانگی تو مجھے بتایا گیا، اس کی ممانعت ہے، مجھے قہوے پر گزارہ کرنا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے ملازم سے وسیم کے بارے میں پوچھا، اس نے بتایا۔ ''وہ باہر گئے ہیں۔''

مجھے باہر کے معاملات کی فکر ہو رہی تھی۔ مرشد علی اور ندیم کی بات چیت کہاں تک پہنچی تھی، ساتھ ہی مجھے یہ فکر بھی تھی کہ مرشد علی کے آدمی کہیں ندیم کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر گزریں۔ وہ بیوی بچوں والا آدمی تھا۔ اگر اس کے بیوی بچوں پر بن آتی تو وہ یقیناً مجھے بھول جاتا اور میں اس پر اسے دوش بھی نہیں دے سکتا تھا۔ باہر کی

صورتِ حال سے مجھے وسیم آگاہ کرسکتا تھا اور وہ خود باہر گیا تھا۔ ناشتے کے آدھے گھنٹے بعد شاہی حکیم مع اپنے سیاہ بکس کے پھر آ گیا۔ وہ آٹھ آٹھ گھنٹے کے وقفے سے مجھے لیپ کررہا تھا اور دو لیپ سے میری کلائی کا زخم بھر گیا تھا۔ نیچے لیٹ لیٹ کر میں تھک گیا تھا۔ ترجمان کے توسط سے میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا میں بستر پر نہیں لیٹ سکتا؟''

ترجمان کے ترجمے کے جواب میں حکیم نے ایک تقریر کی، جس کا خلاصہ ترجمان نے پیش کیا۔ ''اس علاج کے دوران میں سخت زمین پر لیٹنا ضروری ہے تا کہ جسم تھوڑا سا بے آرام رہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نیچے لیٹ گیا۔ حکیم نے اپنا کام شروع کیا، اس کے لیپ کے دوران میں سیکرٹری بیگ آ گیا، میں نے اس سے باہر کے حالات پوچھے، اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں باہر کے معاملات دوسرے لوگ دیکھتے ہیں، مجھے اس بارے میں قطعی علم نہیں ہے۔''

میرے خیال میں وہ غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ وہ راجا کا رازداں اور مقرب تھا، اسے کچھ نہ کچھ علم ضرور تھا۔ بہرحال میں اسے مجبور نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا میرا اگلا سوال ہاتھ کے بارے میں تھا۔ ''حکیم سے پوچھیں یہ میرے ہاتھ کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ کیا میرا ہاتھ بچ جائے گا؟''

''آپ فکر نہ کریں جناب! یہ اپنی پوری کوشش کررہا ہے اور علاج تسلی بخش طریقے سے جاری ہے۔ صحیح صورتِ حال پانچ لیپ کے بعد سامنے آئے گی۔ ویسے کیا آپ فرق محسوس نہیں کررہے ہیں؟''

''ہاں، معمولی سا فرق محسوس ہورہا ہے۔ بلکہ کلائی کا زخم تو غائب ہی ہوگیا ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''جناب! پانچ لیپ میں آپ کی ہڈی لازماً جڑ جائے گی۔ آپ ہاتھ کو حرکت بھی دے سکیں گے لیکن ایک مہینے تک اس ہاتھ سے کوئی بھاری کام مت لیجئے گا۔ باقی ہاتھ کے بارے میں بھی ہم بہت پُرامید ہیں، کم سے کم اسے کاٹنا نہیں آ پڑے گا۔''

''سچ......!'' میں نے امید سے پوچھا۔ ''ایسا ممکن ہے؟''

''بالکل جناب!...... کیونکہ حکیم اس مرہم سے سردی کا شکار ہونے والے افراد کے ہاتھ پیر کٹنے سے بچا چکا ہے۔ ڈاکٹروں کے نزدیک اس کا واحد علاج کاٹ دینا ہے۔ ان میں سے کچھ افراد کے اعضاء پوری طرح بحال نہیں ہوسکے لیکن کٹنے سے بچ گئے۔''

''یہ مرہم حیرت انگیز ہے۔'' میں نے ہاتھ پر لیپ کئے جانے والے اس سبزی مائل گاڑھے مادے کی طرف دیکھا۔ ''اس نے ایک بار پہلے بھی مجھے حیران کیا تھا۔''

''یہ ایک مرہم نہیں ہے بلکہ حکیم مختلف چوٹوں کے لئے اسے مختلف طریقے سے تیار کرتا ہے، اس کا صرف ایک جزو ہمیشہ ایک رہتا ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''مجھے یاد پڑتا ہے راجا صاحب نے کسی معجزاتی اثر رکھنے والے پتھر کا ذکر کیا تھا جسے جلا کر اس کی راکھ مرہم کی تیاری میں استعمال کی جاتی ہے۔''

''وہی اس مرہم کی بنیادی شے ہے۔''

''وہ پتھر راجا صاحب نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''یہ بات راجا صاحب نے آج تک مجھے بھی نہیں بتائی ہے۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔
اپنا کام مکمل کر کے شاہی حکیم نے مخصوص گولیاں میری طرف بڑھائیں۔ میں نے بیگ کی طرف دیکھا۔
''میں اب سونا نہیں چاہتا، کیا ان گولیوں کو کھائے بغیر علاج نہیں ہو سکتا؟''
بیگ نے یہ بات حکیم سے پوچھی۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر حسبِ عادت خاصی لمبی بات کی تھی۔ بیگ نے مجھے بتایا۔ ''گولیاں کھانا ضروری ہیں جناب! اور جہاں تک سونے کا تعلق ہے تو آپ نہ سونے کا ارادہ کر لیں، آپ کو نیند نہیں آئے گی اور نہ غنودگی محسوس ہو گی۔''
''یعنی صرف ارادہ کرنے سے گولیاں مجھ پر اثر نہیں کریں گی؟''
''نہیں جناب! یہ گولیاں عارضی طور پر آپ کے ارادے کو اس قدر مضبوط بنا دیتی ہیں کہ آپ اپنے جسم پر مکمل قابو حاصل کر لیتے ہیں، اپنی مرضی سے سو اور جاگ سکتے ہیں۔''
''اگر میں اپنے اس ہاتھ کو ہلانے کی کوشش کروں؟'' میں نے بے جان ہاتھ کی طرف دیکھا۔
بیگ نے حکیم سے پوچھ کر کہا۔ ''جب تک لیپ ہے، ہاتھ کو حرکت نہیں دینی ہے، اس کے بعد آپ کوشش کر سکتے ہیں۔''
''بیگ صاحب! اگر وسیم آ گیا ہے تو اس سے میری بات کرا دیں۔ ورنہ راجا صاحب سے بات کرا دیں کیونکہ ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک اندیشہ آ رہا ہے۔''
''اگر یہ اندیشہ اپنے وکیل ندیم صاحب کے بارے میں ہے تو آپ بے فکر رہیں۔''
کچھ دیر کے لئے میں بھونچکا رہ گیا۔ ''مگر...... آپ کو کیسے پتا چلا؟''
''کیونکہ میرے سامنے راجا صاحب نے آپ کے وکیل کی حفاظت کے لئے وسیم سے آدمی لگانے کو کہا تھا۔ ان کے ذہن میں یہ خدشہ اسی وقت آ گیا تھا جب انہیں پتا چلا کہ تصویر ندیم صاحب کے پاس ہے۔ بدقسمتی سے آپ کے اور راجا صاحب کے دشمن انسانیت کے احساس سے خالی ہیں۔ ان سے کسی بھی قدم کی توقع کی جا سکتی ہے۔''
''اوہ!'' میں نے کہا۔ ''راجا صاحب کی اس پہلو پر بھی نظر ہو گی کہ تصویر کے حصول کے لئے وہ لوگ میرے ساتھیوں کے ساتھ ندیم کے اہلِ خانہ کو بھی یرغمال بنا سکتے ہیں۔''
''میں نے کہا ناں...... آپ بالکل بے فکر رہیں۔'' بیگ نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ اگر چہ اس سے میری تسلی تو نہیں ہوئی تھی کیونکہ مجھے تجربہ تھا۔ مختصر الوجود بیگ نہایت شاطر آدمی تھا اور دوسرے کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کر دیا کرتا تھا، پھر بھی میری تشویش میں خاصی کمی آئی تھی۔ جولی نامی نرس کل شام کے بعد سے نظر نہیں آئی تھی شاید اسے اور میرا معائنہ کرنے والے ڈاکٹر کو فارغ کر دیا گیا تھا اور مجھے ادویات بھی نہیں دی جا رہی تھیں۔ مجھے کلی طور پر شاہی حکیم کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ گولیاں حلق سے اتار کر میں نے بیگ سے پچھلے دو دن کے اخبارات کی فرمائش کی اور چار پانچ اردو اور انگریزی کے اخبار گنوا دیئے جو مجھے درکار تھے۔ ''میں جلد از جلد منگوا کر آپ کو بھیجتا ہوں، شاید یہیں مل جائیں۔ دوسری صورت میں آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔''
''فکر مت کرو...... میرے پاس انتظار کے لئے وقت ہی وقت ہے۔'' میں نے کہا تو بیگ شاہی حکیم کو لے

ساتھ چلا گیا۔ مجھے لگا جیسے میں آٹھ سال سے خواب دیکھ رہا تھا اور اب میرا خواب ٹوٹ گیا تھا۔ وہی کردار ذرا سی تبدیلی کے ساتھ میرے سامنے تھے۔ لگ نہیں رہا تھا کہ درمیان میں کوئی وقفہ بھی آیا ہے۔ راجا عمر دراز کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ دنیا سے گزر چکا ہے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ صحت مند نظر آ رہا تھا۔ اس کی عمر کم سے کم 80 برس ہو چکی تھی اور دم خم میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ اس کی زندگی شاہانہ ہونے کے ساتھ مشکل کوش بھی تھی۔ اس نے جاگیرداروں والی مخصوص عیاشانہ زندگی گزارنے کے بجائے اپنا وقت تعمیری سرگرمیوں میں لگایا تھا۔

اخبارات کوئی ایک گھنٹے بعد آئے تھے۔ اس وقت میں جاگ رہا تھا اور پوری طرح چاق و چوبند تھا۔ غنودگی کا نام و نشان نہیں تھا یعنی بیگ کی بات درست تھی۔ میں نے اخبارات دیکھنا شروع کئے۔ لیٹ کر محض ایک ہاتھ سے اخبار پڑھنا خاصا مشکل کام تھا۔ تنگ آ کر میں نے موقع پر موجود خادم کو یہ ذمے داری سونپ دی کہ وہ اس کے صفحے پلٹ کر میرے سامنے کرتا رہے اور میں اس میں سے مطلوبہ خبریں دیکھتا رہا۔ کوئی دو گھنٹے میں نے اپنے بارے میں شائع ہونے والی تمام خبریں اور حیرت انگیز طور پر دو آرٹیکل پڑھے تھے۔ میرے بارے میں پولیس کا مؤقف تھا کہ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اسپتال سے فرار ہوا۔ بعض صحافیوں نے اپنے طور پر بھی تحقیق کی تھی اور ایک شخص نے مجھے زبردستی بے ہوش کر کے ایمبولینس میں ڈالے جانے والا سین دیکھ لیا تھا، اس نے صحافیوں کو بتا دیا۔ اب اخبارات پولیس سے سوال کر رہے تھے کہ اگر میں فرار ہوا تھا تو مجھے زبردستی بے ہوش کر کے ایمبولینس میں کیوں ڈالا گیا؟ زیادہ اخبارات ندیم کے مؤقف کی تائید کرتے ہوئے میرے غائب ہونے کا واقعہ پولیس کے کھاتے میں ڈال رہے تھے جو پہلے ہی گرفتار ہونے والوں کو غیر قانونی حراست میں رکھنے کے لئے مشہور ہے۔

ایف آئی آر کی بنیاد پر بعض واقفانِ حال صحافیوں نے ایک با اثر خاندان سے میری جاری تُسل کا ذکر کیا تھا اور اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ میرے خلاف پولیس کی سرگرمی کے پیچھے اس با اثر خاندان کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ نادر علی کے زخمی ہونے کا واقعہ بھی اسی تناظر میں لیا جا رہا تھا اور میرے ایک ہاتھ کے زخمی اور ناکارہ ہونے کا ذکر بھی تھا جسے ڈاکٹر کاٹنے والے تھے اور یہ سوال بھی اٹھایا گیا تھا کہ مجھے عین اس وقت اسپتال سے فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی جب میرا ناگزیر آپریشن ہونے والا تھا اور ڈاکٹر کہہ چکے تھے اگر میرے اس ہاتھ کا بروقت آپریشن نہ کیا گیا تو اس کا زہر جسم کے باقی حصوں تک بھی پھیل سکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے بارے میں اخبارات اور صحافیوں کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ شاید اس کے پسِ پشت ندیم کا ہاتھ تھا۔ اس کے بعض صحافیوں سے اچھے تعلقات تھے۔

تین گھنٹے بعد مجھے دوبارہ بھوک لگنے لگی تھی لہٰذا میں نے سینڈوچز کی فرمائش کی جو نصف گھنٹے بعد مجھے فراہم کر دیئے گئے تھے۔ انہیں کھا کر میں لیٹ گیا بلکہ لیٹا ہوا ہی تھا۔ دوا کی کارکردگی آزمانے کے لئے میں نے سوچا کہ دو گھنٹے کے لئے سو رہا ہوں، اس وقت پونے بارہ بج رہے تھے۔ سچ مچ میں چند منٹ کے اندر سو گیا تھا۔ دو گھنٹے تک گہری نیند ہونے کے بعد پونے دو بجے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ٹھیک پونے دو بج رہے تھے۔ یہ دوا واقعی حیرت انگیز تھی۔ نہ جانے اس شاہی حکیم نے کون سے اجزا ملا کر یہ دوا بنائی

تھی۔ اگر اسے باقاعدہ تیار کر کے دنیا کے سامنے لایا جاتا تو ایک تہلکہ مچ جاتا۔ مشرق کی نہ جانے کتنی معجز اثر ادویات ایسی ہیں جنہیں فرسودہ قرار دے کر رد کیا جا چکا ہے اور اب ان کے فارمولے یا تو دنیا سے مٹ چکے تھے یا شاہی حکیم جیسے چند افراد کے سینوں تک محدود تھے۔

جب سے دواؤں کا کاروبار ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ہاتھ میں آیا ہے، تب سے دنیا بھر میں مقامی دواؤں کو چن چن کر نشانہ بنیا گیا ہے اور روایتی طریقہ علاج کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ جیسے ہمارے حکیموں کو پیچھے دھکیلا گیا ہے، ہومیو پیتھک نے بالآخر اپنی افادیت منوالی ہے لیکن اس کی دوائیں بھی اب ملٹی نیشنل ادارے بنا رہے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اس کا راستہ کھلا چھوڑا گیا ہے۔ مقامی دوائیں غیر قانونی قرار دی جا رہی ہیں اور اب صرف وہی دوائیں استعمال ہوتی ہیں جن کی اجازت حکومت دے۔ طب کی حوصلہ شکنی سے بے شمار پُر افادیت ادویات مٹ چکی ہیں کیونکہ ان کے بنانے والے اب اس دنیا میں نہیں رہے اور اگر کوئی ایسی دوا سامنے آئی بھی تو یا تو اسے مضر قرار دے کر روک دیا جائے گا یا اس کا تجزیہ کرا کے کوئی ملٹی نیشنل کمپنی اس پر قابض ہو جائے گی۔ کھربوں ڈالرز سلانہ کا کاروبار کرنے والی ادویاتی کمپنیاں اپنا نفع برقرار رکھنے کے لئے ایسے ایسے ہتھکنڈے آزماتی ہیں کہ عام آدمی ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

ٹھیک چھ بجے شاہی حکیم آ گیا تھا۔ اس نے بے حد احتیاط سے میرے ہاتھ سے لیپ کی خشک ہو جانے والی تہ اتاری۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ لیپ اتارنا بھی کوئی اہم کام تھا یا شاید وہ اس کی اہمیت جتانے کے لئے خود اتار رہا ہو ورنہ یہ کام کوئی بھی کر سکتا تھا۔ جب لیپ کلائی سے ہٹا تو میں نے دیکھا۔ کلائی کی سوجن مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی۔ آپریشن کے ٹانکے خشک ہو چکے تھے۔ حکیم نے بے پروائی سے انہیں کھینچ لیا اور وہ اتنی آسانی سے میری کھال سے نکلتے چلے گئے جیسے مکھن میں سے بال نکلتا ہے اور ٹانکوں کے نشانات بھی اتنے معمولی سے رہ گئے تھے کہ بغور دیکھنے پر نظر آتے تھے۔ مرہم پہلے کے مقابلے میں زود اثر تھا۔ اس نے چوبیس گھنٹے سے پہلے ہی اتنا گہرا زخم بھر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ لیپ اترنے سے میرا ہاتھ سامنے آ رہا تھا اور ساتھ ہی میری دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ ہاتھ کے ساتھ کلائی کا حصہ جو پہلے سیاہی مائل اور سوجا ہوا تھا، اب اس کی سوجن کم اور کھال ہلکی سی سرخی مائل ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے پورے ہاتھ سے لیپ اتار دیا۔ پنجے میں پہلے کے مقابلے میں سوجن اور سبزی مائل رنگ کم تھا۔ شاہی حکم نے میری طرف دیکھ کر کچھ کہا۔ اس کے ساتھ آنے والے ترجمان نے ترجمہ کیا۔

"حکیم صاحب کہہ رہے ہیں، انگلیاں ہلانے کی کوشش کرو۔"

میں نے انگلیاں ہلانے کی کوشش کی لیکن ان میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ حکیم نے پھر کہا۔ "جناب! پوری توجہ ہاتھ پر دیں اور ذہن میں بار بار دہرائیں، میں اپنی انگلیاں ہلا سکتا ہوں۔" ترجمان نے بتایا۔

میں نے اپنے خیالات کا تمام تر ارتکاز اپنے ہاتھ پر مرکوز کر دیا اور شدت سے ذہن میں الفاظ دہرانے لگا کہ میں اپنی انگلیوں کو حرکت دے سکتا ہوں۔ ساتھ ہی میں انہیں حرکت دینے کی پوری کوشش بھی کر رہا تھا۔ خاصی دیر تک میں پوری توجہ سے یہ کام کرتا رہا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میری انگلیوں میں لرزش پیدا ہو رہی ہے۔ میں نے شاہی حکیم کی طرف دیکھا تو اس نے چلا کر کچھ کہا۔ ترجمان فوراً بولا۔ "جناب! حکیم صاحب فرما رہے

ہیں، اپنی ساری توجہ انگلیوں پر رکھیں۔ آپ انہیں حرکت دے سکتے ہیں۔"

گویا یہ لرزش میں . نے ہی نہیں حکیم نے بھی محسوس کی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اپنی ساری توجہ انگلیوں پر مرکوز کر دی۔ انگلیوں کی لرزش جاری تھی۔ یکا یک انگوٹھے نے واضح طور پر حرکت کی اور اس کے ساتھ ہی میں نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ اس معمولی سے کام نے جیسے میری ساری توانائیاں نچوڑ لی تھیں۔ حکیم نے خادم کو کچھ ہدایت دی اور کمرے سے چلا گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "جناب، آپ آرام کریں۔ میں آپ کے لئے سوپ لاتا ہوں، اس سے آپ کی توانائی بحال ہو جائے گی۔"

"جلدی لاؤ۔" میں نے کمزور لہجے میں کہا۔ سچ مچ میں ایسی کمزوری محسوس کر رہا تھا جیسے میں کتنی توانائی صرف کر چکا تھا۔ بظاہر یہ معمولی سا کام لگ رہا تھا لیکن اس نے مجھے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد خادم بھاپ اڑاتا سوپ کا پیالہ لایا۔ یہ عام روایتی سوپ نہیں تھا بلکہ اس میں گوشت کے ریشوں کے ساتھ کئی اقسام کی سبزیوں کے ٹکڑے بھی تیر رہے تھے۔ چکھنے پر بے ذائقہ سا لگا کیونکہ نمک مرچ بالکل نہیں تھا۔ بہر حال اس وقت مجھے ایسی بھوک لگی تھی کہ سوپ بد ذائقہ بھی ہوتا تب بھی میں اسے پی جاتا۔ سوپ حلق سے اترا تو میری جان میں جان آئی تھی۔

"میں غسل کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے خادم سے پوچھا۔ "حکیم صاحب سے پوچھ کر بتاؤ۔"

اس نے واپس آ کر جواب دیا۔ "وہ اجازت دے رہے ہیں لیکن ہاتھ کو پانی سے بچانا ہے۔ اس پر کوئی شاپر لپیٹ دیں۔"

میں نے ہدایت کے مطابق غسل کیا۔ کئی دن بعد نہایا تو جسم میں ایک فرحت سی آ گئی۔ نہا کر آیا تو دوپہر کا بھاری بھرکم کھانا تیار تھا۔ میں نے ایک بار پھر ڈٹ کر کھانا کھایا۔ چار بجے کے قریب حکیم اگلا لیپ کرنے آیا اور اس کے ساتھ ہی وسیم آ گیا۔ سلام دعا کے بعد اس نے پوچھا۔ "آپ مجھے [illegible] تھے؟"

"ہاں، وسیم میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں پریشان ہوں۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ ہم نے ندیم اور اس کے خاندان کی حفاظت کا بندوبست کر دیا ہے۔ البتہ مونا اور سفیر کا پتا چلانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔"

"مجھے اصل فکر ان کی ہی ہے۔"

"موجودہ صورتِ حال میں جب کہ آپ کا پتا نہیں ہے اور ندیم پولیس کو الزام دے رہا ہے، سنا ہے انسپکٹر اکرم چشتی کو افسران بالا نے طلب کر لیا ہے، مرشد علی کسی قسم کا رسک نہیں لے گا۔ اسے معلوم ہے جلد یا بدیر آپ اپنے ساتھیوں کے لئے اس سے رابطہ کریں گے اور تصویر کے بدلے ان کی رہائی چاہیں گے۔ وہ انہیں نقصان پہنچانے کی حماقت نہیں کرے گا۔"

"سوال یہ ہے کہ وہ کب تک یہ حماقت نہیں کرے گا؟ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو سکتا ہے۔ نادر علی کی معذوری اسے مشتعل کر سکتی ہے۔"

"نادر علی علاج کے لئے دبئی جا چکا ہے۔ مرشد علی واقعی کچھ بھی کر سکتا ہے لیکن آپ ڈیوڈ شا کو بھول رہے ہیں، وہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہے۔ وہ مرشد علی کو ایسا کوئی قدم اٹھانے نہیں دے گا۔"

''تم لوگ کس طرح مونا اور سفیر تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''ہمارا انداز سائنٹفک ہے۔ ہم نے عباسی ہاؤس سے کی جانے والی یا وہاں آنے والی تمام فون کالز کی مانیٹرنگ کا بندوبست کر لیا ہے۔ میرے آدمیوں نے اندر بھی کچھ آلات نصب کر دیئے ہیں۔ وہ لائن مین بن کر اندر گئے اس کے علاوہ مرشد علی کے اہم آدمیوں کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ دو مشکوک ٹھکانے ہمارے علم میں آئے ہیں۔ ایک فتح جنگ کے نزدیک اور آبادی سے دور ڈیرہ نما مکان ہے۔ مرشد علی کا خاص آدمی ارشد جٹ دو بار وہاں جا چکا ہے اور دوسرا ٹھکانہ سیٹلائٹ ٹاؤن کی ایک کوٹھی ہے، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طریقے سے ان کے اندر کا حال معلوم کریں۔''

''کیا تمہارے آدمی ایکشن کر کے اندر نہیں جا سکتے؟'' میں نے پوچھا۔

''شہباز صاحب! یہ اعصاب کا کھیل ہے۔ دونوں میں سے جس فریق کے اعصاب جواب دے گئے، ہار اس کا مقدر بن جائے گی۔''

''ان کا مقصد محض ایک بے جان تصویر ہے اور میں اپنے دو جیتے جاگتے ساتھیوں کے لئے فکرمند ہوں۔ وہ انتظار کر سکتے ہیں۔ میں اپنے ساتھیوں کی قید کی ایک ایک لمحے کی اذیت محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے جذباتی لہجے میں کہا تھا۔ وسیم کچھ دیر چپ رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ''شہباز صاحب، آپ یقین کریں یا نہ کریں، میں اس معاملے میں جتنی کوشش کر رہا ہوں، میں نے کبھی کسی اسائنمنٹ کے لئے اتنی کوشش نہیں کی۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''میں تمہیں الزام نہیں دے رہا ہوں لیکن اگر میرے ساتھیوں پر کوئی آنچ آئی تو میں مجبور ہو جاؤں گا۔ میں وہ تصویر اپنے ساتھیوں کو دیکھے بغیر کسی کو نہیں دے سکتا۔''

''راجا صاحب کو بھی اس بات کا احساس ہے اسی وجہ سے انہوں نے آپ سے تصویر کی بات بھی نہیں کی ہے۔'' وسیم بدستور نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اس کا انداز سمجھانے والا تھا۔

شاہی حکیم اس گفتگو کے دوران میں اپنا کام کرتا رہا تھا۔ نام تو اس کا قادس تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی زمانۂ قدیم کے کسی شاہی طبیب کا خیال آتا تھا۔ اس کے جادوئی لیپ نے اب تک وہ کام دکھایا تھا جو کوئی ڈاکٹر اور کوئی دوا نہیں دکھا سکی تھی۔ لیپ سے فارغ ہو کر اس نے مجھے گولیاں کھلائیں اور بکس سنبھال کر رخصت ہو گیا۔ جذباتی ابال کم ہونے کے بعد مجھے احساس ہوا تھا کہ میں نے وسیم سے زیادتی کی تھی۔ شروع سے اب تک اس کا رویہ میرے ساتھ بہترین اور مؤدبانہ رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔ ''سوری یار! میں جذباتی ہو گیا تھا۔''

''مجھے آپ کی پوزیشن کا احساس ہے۔ آپ کی جگہ میں ہوتا تو اپنے ساتھیوں کے لئے اسی طرح فکرمند ہوتا لیکن جناب انہیں آزاد کرانے کے لئے صبر و تحمل لازمی ہے۔''

''تم نے بتایا کہ نادر علی کو علاج کے لئے دبئی روانہ کر دیا گیا ہے۔ کیا یہ خبر مصدقہ ہے؟''

''سوفی صد..... میرے آدمیوں نے خود اس کا سفری بستر طیارے میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ اسے ایک خاص علاج کے لئے وہاں بھیجا گیا ہے۔ یہاں اس کا علاج ممکن نہیں ہے۔ میرے آدمیوں کی ایک گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں لگی ہے۔ جس سے اس کے جسم کا نچلا حصہ مفلوج ہو گیا ہے۔ مقامی ڈاکٹر اس گولی کو چھیڑتے

ہوئے ڈر رہے ہیں۔ اگر اسپائنل کورڈ (Spinal Cord) کو نقصان ہوا تو وہ مر بھی سکتا ہے اور اس کی معذوری دائمی بھی ہو سکتی ہے۔ دبئی کے اس اسپتال میں اس قسم کے آپریشن کامیابی سے کئے جا چکے ہیں۔ اگر گولی درست طریقے سے نکال لی گئی تو وہ معذور ہونے سے بچ سکتا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، اپنے بھائی کی اس حالت کے باوجود کیا مرشد مجھ سے دیانت داری سے سمجھوتا کر لے گا؟''

''کبھی نہیں۔'' وسیم نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''فی الحال وہ تصویر کی وجہ سے آپ کے سامنے مجبور ہے۔ پھر الیکشن بھی پاس ہیں۔ ان کے بعد وہ پوری قوت سے آپ کے خلاف حرکت میں آ جائے گا۔''

میرا بھی یہی خیال تھا۔ ''وہ کیا کر سکتا ہے؟''

وسیم نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''جناب، وہ کیا نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس درجنوں مفرور ملزمان اور دہشت گرد ہیں۔ سیکڑوں عقل کے اندھے مرید ہیں اور پولیس بھی اس کے ساتھ ہے۔ جس شخص کے پاس اتنی طاقت ہو وہ اپنے مخالفوں کے خلاف جو نہ کر گزرے وہ کم ہے۔ مرشد علی کم ظرف اور گھٹیا دشمن ہے اور میں اس پر ایک فی صد بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔''

''تمہارے خیال میں اپنے ساتھیوں کی رہائی کے بعد کیا کرنا چاہیے؟''

''اگر آپ اس سے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں تو آپ کو اس سے ہر ممکنہ حد تک دور رہنا چاہیے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں اس کے ہاتھوں کی پہنچ سے دور رہوں...... میدان چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔''

''میرا یہی مطلب ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''مکار درندے سے نہتے مقابلہ کرنا دانش مندی نہیں حماقت کہلاتی ہے۔''

وہ درست کہہ رہا تھا۔ میں کسی لحاظ سے بھی مرشد کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ طاقت میں، نہ بدمعاشی میں، نہ اثر رسوخ میں اور نہ دولت میں۔ وہ ہر لحاظ سے مجھ پر حاوی ہوتا جیسے ہرن اور شیر کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ ہرن کی عافیت اسی میں ہے کہ شیر کی پہنچ سے باہر رہے۔ اگرچہ نہ میں ہرن تھا اور نہ ہی مرشد علی شیر تھا لیکن اس کی طاقت کے آگے میں فی الحال بے بس تھا۔ خوش قسمتی سے تصویر کی صورت میں میرے پاس ایک ٹرمپ کارڈ تھا جس کی وجہ سے مرشد علی مجھے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے عزائم پر عمل درآمد سے قاصر تھا۔ میں نے وسیم سے دریافت کیا۔ ''ہم اس وقت کہاں ہیں؟''

''یہ راجا صاحب کی کوٹھی ہے، وہ جب دارالحکومت آتے ہیں، اسی کوٹھی میں ٹھہرتے ہیں، اسے ایک طرح سے کوٹھی کی انیکسی سمجھ لیں۔''

''میں اندر لیٹے لیٹے تنگ آ گیا ہوں۔ جب یہ لیپ اتر جائے تو کیا میں باہر کھلی فضا میں نکل سکتا ہوں؟''

''آپ اس انداز میں پوچھ کر شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو باہر بھی جا سکتے ہیں لیکن ایسا کرنا کتنا مناسب ہے، اس کا فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔''

''میں یہاں لیٹے لیٹے تھک گیا ہوں۔''

''آپ کہیں تو میں اس کمرے میں ٹی وی سیٹ کرا دیتا ہوں۔ آپ اپنی پسند کا چینل دیکھ کر دل بہلا سکتے

یں۔'' اس نے پیش کش کی اور میری رضامندی پا کر باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دو افراد ایک ٹی وی ٹرالی سمیت آئے۔ اس کی تاریں اور کیبل لیڈ سیٹ کر کے اور چلا کر اپنے اطمینان کرنے کے بعد انہوں نے ریموٹ مجھے تھما دیا۔ کیبل بہت اچھی کوالٹی کا اور کوئی دو سو چینلز کا تھا۔ میں چینل بدل بدل کر دیکھتا رہا۔ کچھ نیوز چینل دیکھے۔ اچانک ایک چینل پر ایسا چہرہ نظر آیا کہ میں چونک گیا۔ چینل سرچنگ کرتے ہوئے میں اس چینل سے گزر گیا تھا۔ جلدی سے چینل بیک کیا۔ وہ لڑکی سلسلۂ قراقرم کے ساتھ کھڑی انگریزی میں کمنٹری کر رہی تھی۔ ماحولیات کے اس چینل سے پاکستان کے شمالی علاقے کے پہاڑوں کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری فلم دکھائی جا رہی تھی۔ میں لڑکی کو دیکھ کر چونکا تھا۔ اس کا چہرہ جانا پہچانا تھا۔ اس کے نقوش میں ایمن شا کی جھلک تھی۔ چند لمحے بعد ایک سلائڈ پر اس کا نام آیا تو میرے شک کی تصدیق ہوگئی۔ وہ ایمن شا ہی تھی، برٹ شا کی بیٹی جو شمالی علاقے میں لا پتا ہو گیا تھا اور وہ اس ڈاکومنٹری میں پاکستان میں نظر آ رہی تھی۔ نہ جانے یہ ڈاکومنٹری کب بنی تھی اور ایمن شا کب آئی تھی؟ پاکستان میں تھی یا واپس جا چکی تھی؟

راجا عمر دراز نے مجھے ڈیوڈ شا کے بارے میں بتایا تھا۔ جو لا پتا برٹ شا کا کوئی کزن تھا اور اس کی جائیداد پر قابض ہو چکا تھا۔ کیا ایمن اس ڈیوڈ شا کے ساتھ آئی تھی، جس کے بارے میں خبر تھی کہ وہ بے حد خطرناک آدمی ہے مگر اس کے باپ کی جائیداد پر قبضے کے بعد اس کا امکان کم تھا کہ ایمن شا کا اس سے کوئی تعلق ہو۔ پھر اپنے انداز سے وہ اس چینل کی ملازم لگ رہی تھی۔ ڈاکومنٹری ہائیکنگ سائٹ کے بارے میں تھی۔ پاکستان کے شمالی علاقے دنیا کی بہترین ہائیکنگ سائٹس رکھتے ہیں۔ ایمن شا اس ڈاکومنٹری میں منجھے ہوئے انداز میں میزبانی کر رہی تھی۔ نصف گھنٹے بعد پروگرام ختم ہو گیا۔ اس کی تفصیلات کی جو سلائڈ چل رہی تھی اس میں تاریخ بھی آئی تھی۔ یہ پروگرام دو مہینے پہلے ریکارڈ کیا گیا تھا۔ ان دنوں میں اتفاق سے اسکردو میں تھا اور یہ ٹیم بھی لازماً اسکردو آئی ہو گی۔ بس مقدر سے ان سے سامنا نہیں ہوا۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ میں ایمن شا کے بارے میں کسی کو ایک لفظ نہیں بتاؤں گا۔ راجا عمر دراز کے نزدیک وہ اس کے دشمن خاندان کی لڑکی تھی اور ممکن ہے ڈیوڈ شا کو زک پہنچانے کے لئے وہ ایمن کے خلاف کچھ کر گزرتا۔ اگر اس کی بدقسمتی سے راجا یا اس کے ساتھیوں کو ایمن شا کے بارے میں کسی اور ذریعے سے علم ہوتا تو بے شک ہو جاتا۔

ایمن شا کا بدن پہلے کے مقابلے میں کسی قدر بھر گیا تھا۔ آٹھ سال پہلے والی نوخیز لڑکی کے مقابلے میں اب وہ تقریباً پچیس چھبیس برس کی میچور لڑکی تھی۔ اس کی میچورٹی اس کے انداز اور گفتگو سے بھی جھلک رہی تھی۔ ممکن ہے اپنے باپ کی جائیداد سے محروم ہونے کے بعد وہ بطور پیشہ اس طرف آئی ہو۔ میں نے ایک مقامی خبروں کا چینل لگایا جو آنے والے بلدیاتی الیکشن کے بارے میں پروگرام دکھا رہا تھا۔ مرشد علی کی کوشش تھی کہ سٹی ناظم اس کا آدمی ہو لیکن مخالف پارٹی بھی کمزور نہیں تھی اور اس کے کونسلروں نے سابقہ دور میں خاصا کام کر کے دکھایا تھا اس لئے امکان یہی تھا کہ وہ پھر کامیابی حاصل کرے گی۔ مرشد علی کامیابی کے لئے منفی ہتھکنڈے زیادہ کھل کر استعمال کر رہا تھا۔ پروگرام کرنے والے نے سوال اٹھایا تھا کہ کیا مرشد علی کا بھائی نادر علی کسی سیاسی چپقلش کا شکار ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ خبروں کا چینل مرشد علی کو سپورٹ کر رہا ہے۔ ممکن ہے مرشد علی نے اسے خرید لیا ہو یا کسی اور طریقے سے اثر ڈالا ہو۔

میں نے ایک اور چینل لگایا اور پھر بور ہو کر ٹی وی بند کر دیا۔ گزشتہ کچھ عرصے سے ٹی وی چینلز کی بھرمار ہو گئی تھی لیکن دیکھنے والے بور ہوتے تھے اور شاید چینلز کی بہتات نے لوگوں کو کنفیوز کر دیا تھا کہ وہ کیا دیکھیں اور کیا نہ دیکھیں۔ مجھے یاد ہے میرے بچپن میں جب ہمارے گاؤں میں نئی نئی بجلی آئی تھی تو ابا جی ایک بھدا سا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی لے کر آئے تھے اور ہم کس قدر ذوق و شوق سے اکلوتے چینل کے پروگرام دیکھا کرتے تھے۔ وہ مزہ اور سنسنی آج کے جدید ترین رنگین ٹی وی پر رنگا رنگ چینلز دیکھ کر بھی محسوس نہیں ہوتی۔

جب ویسے بوریت ہونے لگی تو دوبارہ ٹی وی کھول کر ایک مووی چینل لگایا اور اس پر دکھائی جانے والی فلم دیکھنے لگا۔ خوش قسمتی سے فلم اچھی اور مزاحیہ تھی۔ ہنستے ہنستے تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ اس کے بعد رات کا کھانا آ گیا جو میں نے ایک ہاتھ سے کھایا۔ بایاں ہاتھ کپڑے سے اٹھانے کی ممانعت تھی اس لئے اس بار کھانا وقت سے کھایا گیا۔ اس وقت نو بجے تھے اور ابھی لیپ ہٹنے میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ اس کے ہٹنے کے بعد میں باہر جا سکتا تھا اور فی الحال میری یہی خواہش تھی، مزید ایک گھنٹا ٹی وی کی مدد سے گزار لیا۔ پھر حکیم آیا اور اس نے لیپ اتارنا شروع کیا۔ ہاتھ کی حالت میں پچھلی دفعہ کے مقابلے میں معمولی سی بہتری آئی تھی، سوجن کم ہو گئی تھی اور ہاتھ کی رنگت قدرے بحال ہوئی تھی۔ حکیم نے ایک بار پھر مجھ سے انگلیوں کو حرکت دینے کی مشق کرائی۔ شدید کوشش اور محنت کے بعد میں انگوٹھا اور اس کے ساتھ والی انگلی ہلانے میں کامیاب رہا تھا۔ کلائی تو جیسے کبھی ٹوٹی ہی نہیں تھی۔

شاہی حکیم قاوس نے مطمئن ہو کر ترجمان کے ذریعے کہا۔

"ابھی تمہیں اتنے ہی لیپوں سے اور گزرنا پڑے گا۔"

"گزر جاؤں گا لیکن کیا میرا ہاتھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے جواب میں شاہی حکیم نے حسبِ معمول ایک لمبی چوڑی تقریر کی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جو اللہ نے بنایا ہے، ویسا انسان کے لئے بنانا ممکن نہیں ہے۔ میرا ہاتھ بالکل پہلے کی طرح کام کر سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں کمزوری رہ جائے۔ اس کا انحصار بڑی حد تک مجھ پر ہے میں اس ہاتھ کو جتنی توجہ دوں گا، یہ اتنا ہی بہتر کام کرے گا۔ میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ میرا ہاتھ پہلے جیسی قوت اور گرفت حاصل نہیں کر سکے گا لیکن میں توجہ دوں تو یہ ستر اسی فی صد بحال ہو سکتا ہے۔ سوجن اور نیلگوں رنگت میں کمی ظاہر کر رہی تھی کہ گینگرین کا خطرہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ حکیم نے مزید چار لیپ کرنے کی بات کی تھی جبکہ پہلے اس نے کل پانچ لیپ کہے تھے۔ یعنی میرے ہاتھ کی بحالی اس کے اندازے سے زیادہ دشوار ثابت ہو رہی تھی۔ میں باہر نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس بار مجھے انگلیاں ہلانے کی کوشش میں پہلے کے مقابلے میں کم تھکن ہوئی تھی۔ اتنے میں ترجمان خادم ایک بڑا سا پیالا لے کر آیا جس میں مقوی سوپ تھا۔ اگرچہ باہر جانے کی خواہش زیادہ تھی لیکن میں نے سوپ آ جانے پر اسے پی لینا مناسب سمجھا۔ ابھی سوپ ختم کیا تھا کہ خادم ایک اتنے ہی بڑے پیالے میں گرم پانی لے آیا۔ اس کے ساتھ ایک ربر کا ایسا دستانہ تھا جیسا کہ عام طور سے اوون سے ٹرے نکالنے میں استعمال ہوتا ہے۔ بس یہ ہلکا تھا۔

"اس کا کیا کرنا ہے؟"

"حکیم صاحب نے کہا ہے کہ آپ یہ دستانہ پہن کر دس پندرہ منٹ کے لئے ہاتھ گرم پانی میں رکھیں۔"

گیارہ بج چکے تھے اور اگلا لیپ ہونے میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ بیس پچیس منٹ اس میں لگ جاتے تو مجھے

مشکل سے نصف گھنٹا ملتا۔ بہر حال ہاتھ کا معاملہ ہر خواہش پر مقدم تھا اس لئے میں نے ربر کا دستانہ چڑھا کر ہاتھ پیالے میں ڈبو دیا۔ پانی خاصا گرم تھا لیکن مجھے بہت ہلکا سا محسوس ہوا تھا مگر اس ہلکے سے احساس سے مجھے پتا چلا کہ میرے ہاتھ کی محسوس کرنے کی حس واپس آ رہی ہے۔ جب تک پانی کی گرمی برقرار رہی، میں ہاتھ سینکتا رہا تھا۔ اس کے بعد ہاتھ کا معائنہ کیا اور یہ دیکھ کر مجھے بے پناہ خوشی ہوئی کہ میں اپنا انگوٹھا بہ آسانی ہلا سکتا تھا۔ چند روز پہلے اس ہاتھ کو خود سے جدا کرنے پر ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ انگوٹھے کو حرکت دیتا میں خادم کے ہمراہ انیکسی سے باہر آیا۔ اسلام آباد میں رات ہمیشہ خوشگوار ہوتی ہے۔ فضا میں نباتات کی مہک رچی ہوئی تھی۔ میں گہرے گہرے سانس لے کر ٹہلتا رہا تھا۔ مجھے کوئی اور اہم فرد نظر نہیں آیا تھا البتہ ملازمین دکھائی دیئے تھے اور کسی سے ملنے کا وقت بھی نہیں تھا اس لئے میں انیکسی میں واپس آ گیا۔ جب تک واش روم سے فارغ ہو کر آیا، حکیم اپنے چرمی بکس سمیت آ چکا تھا۔ اس نے مجھے فرش پر لٹا کر جس پر قالین بچھا تھا اپنا کام شروع کیا۔ مرہم لیپ کرنے کے بعد اس نے مجھے گولیاں دیں۔ گولیاں وہ ہمیشہ اپنے سامنے کھلاتا تھا یہی نہیں بلکہ جب مرہم خشک ہو جاتا تو اس کے اترنے والے ٹکڑے بھی وہ سمیٹ کر لے جاتا تھا گویا اسے خطرہ تھا کہ اس کی دواؤں کے فارمولے کوئی چرا سکتا ہے۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا تھا۔ مشرقی طبیبوں کی اس حریصانہ فطرت کی وجہ سے نہ جانے کتنی زود اثر اور اچھی دواؤں کے فارمولے قبروں میں جا سوئے تھے۔

حکیم کے جانے کے بعد میں نے سونے کا ارادہ کیا، اس خیال کے ساتھ کہ صبح چھ بجے میری آنکھ کھل جائے گی اور میں چند منٹ کے اندر سو چکا تھا۔ ٹھیک چھ بجے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ شاہی حکیم آنے والا تھا لیکن چھ سے اوپر وقت ہو گیا اور وہ نہیں آیا۔ سوا چھ بجے اس کا خادم ترجمان آیا تھا، اس نے لیپ اتارا اور اسے سبز کپڑے میں سمیٹ کر لے گیا۔ اس کے بعد وہ میرے لئے سکائی کا پانی لے کر آیا۔ سکائی سے فارغ ہو کر میں نے واش روم کا رخ کیا۔ واپسی پر خادم ناشتے کے بجائے اکیلا ہی منتظر تھا۔

"جناب، راجا صاحب آپ کو ناشتے کی میز پر یاد فرما رہے ہیں۔"

"ہم خوش ہوئے۔" میں نے کہا۔ میں بھی روٹین سے اکتا گیا تھا۔ خادم کی رہنمائی میں کوٹھی کے ڈائننگ ہال تک پہنچا جو راجا عمر دراز کے محل کے ڈائننگ ہال کی طرح پُرشکوہ نہیں تھا لیکن قیمتی فرنیچر سے مزین تھا۔ راجا عمر دراز بھری پُری میز پر میرا انتظار کر رہا تھا اور اس نے ایک خادم کو بھی مقرر کیا تھا کہ ایک ہاتھ کی وجہ سے مجھے تکلیف نہ ہو۔ سلام دعا کے بعد میں نے خاموشی سے ناشتا کیا۔ جب چائے آئی تو میں نے حکیم کے بارے میں سوال کیا۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ لیپ والا کام اس کا نائب بھی کر لے گا۔"

"راجا صاحب! میرے ساتھیوں کے بارے میں کوئی اطلاع؟"

"شہباز! اس معاملے میں ہمیں صبر و تحمل سے کام لینا ہو گا۔ بے صبری صرف دشمن کو فائدہ پہنچائے گی۔" راجا عمر دراز نے چائے کی پیالی اٹھائی۔ "میرے آدمی پوری کوشش کر رہے ہیں۔"

"راجا صاحب، دشمن بھی کم چالاک نہیں ہے۔ مونا اور سفیر اس کے لئے ترپ کے پتے ہیں، وہ انہیں ایسی جگہ چھپا کر رکھے گا جہاں کسی کا دماغ بھی نہ جا سکے۔"

''جو بات ایک انسان کا دماغ سوچتا ہے اسے دوسرے انسان کا دماغ بھی سوچ سکتا ہے۔''

''راجا صاحب! مجھے اپنے ساتھیوں کی فکر ہے جب تک وہ دشمن کے رحم وکرم پر ہیں، مجھے چین نہیں آئے گا۔'' میں نے کسی قدر چڑ کر کہا۔

''تب تم کیا چاہتے ہو؟'' راجا عمر دراز نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں انہیں رہا کروانا چاہتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''ممکن ہے وہ تصویر آپ کے نزدیک کئی انسانی جانوں سے زیادہ قیمتی ہو لیکن میرے ساتھی ایسی ہزاروں تصویروں سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں۔''

''تو تمہارے خیال میں وہ صرف ایک تصویر ہے؟'' راجا عمر دراز کا لہجہ سرسراتا ہوا تھا۔ ''نہیں، وہ محض ایک تصویر نہیں ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اتنے لوگ بلاوجہ اس تصویر کے پیچھے نہیں پڑے ہیں۔'' وہ ایک تصویر نہیں ہے۔'' راجا عمر دراز مارے جوش کے کھڑا ہوا گیا تھا۔ ''وہ ایک کنجی ہے......ایک کی ہے......ایک نئی دنیا میں راستے کی......ایسی دنیا جس کے بارے میں انسان نے سوچا ہے......لیکن اسے دیکھا نہیں ہے۔''

''کیا آپ نے دیکھا ہے......؟؟'' میرے لہجے میں طنز تھا جسے محسوس کر کے راجا عمر دراز کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''ہاں، میں نے اسے دیکھا ہے۔''

راجا غالباً اس عمر میں خواب دیکھنے لگا تھا۔ ''راجا صاحب مجھے کسی نئی دنیا سے دلچسپی نہیں ہے۔ انسان پہلے ہی نئی دنیا (امریکا) کا عذاب بھگت رہے ہیں۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی بحفاظت واپسی کے علاوہ اور کسی شے سے دلچسپی نہیں ہے۔''

راجا عمر دراز اٹھ کر میرے عقب میں آیا۔ ''شہباز! تم جذباتی ہو رہے ہو۔ اس عمر میں، میں بھی ایسا ہی بھڑک جانے والا گرم خون رکھتا تھا۔'' وہ کہہ کر چلا گیا۔ چند منٹ بعد ایک ملازم آیا۔

''حکیم صاحب، آپ کو کمرے میں بلاتے ہیں۔''

میں ابھی تک اندر سے کھول رہا تھا۔ میں نے ایک نظر اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا اور اٹھ گیا۔ حکیم اپنا سامان لئے میرا انتظار کر رہا تھا۔ لیپ کر کے اور دوائیں دے کر وہ چلا گیا۔ میں نے اخبار منگوائے تھے۔ خادم کی مدد سے ان کا مطالعہ کرنے لگا۔ کوئی نئی خبر نہیں تھی سوائے اس کے کہ پولیس سرگرمی سے مجھے تلاش کر رہی تھی۔ اخبار پلٹتے ہوئے اچانک ایک سرخی پر نظر جمی گئی۔ یہ ثقافتی صفحہ تھا اور سرخی تھی ''برطانیہ کے مشہور ماہر آثاریات ڈاشا کی پاکستان آمد۔'' شا خاندان کا ایک فرد برٹ شا شمالی علاقے میں غائب ہو گیا تھا اور آج تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ ڈیوڈ شا کا کزن تھا۔ میں نے انٹر کام پر راجا عمر دراز رابطہ کر کے اسے خبر کے بارے میں بتایا، اس نے کہا۔

''میں دیکھ چکا ہوں۔''

''یہی شخص تصویر حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

''ہاں، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو گا۔''

''لیکن وہ تو ماہرِ آثاریات ہے۔''

"یہ صرف پردہ ہے۔ پاکستان اس کی آمد کا واحد مقصد تصویر کا حصول ہے۔"
"راجا صاحب! آخر اس تصویر میں ایسی کیا بات ہے؟"
"میں تمہیں بتا چکا ہوں اور کھلے عام اس قسم کی باتیں مناسب نہیں ہیں۔" اس نے میری بات کاٹی۔
"اوکے۔ میرے ساتھیوں کا کچھ پتا چلا؟"
"خاص نہیں...... کچھ دیر میں وسیم آئے گا۔ اس بارے میں اس کے پاس کوئی نئی خبر ہے۔ میں آتے ہی اسے تمہاری طرف بھیج دوں گا۔"
"شکریہ راجا صاحب!" میں نے کہا اور دوبارہ سے اخبارات کھنگالنے لگا مگر دو گھنٹے بعد بھی اپنے مطلب کی کوئی خبر تلاش نہیں کر پایا تھا۔ مجھے ایمن شا کا خیال آیا۔ ممکن ہے اس کا پروگرام پھر سے دکھایا جا رہا ہو۔ میں نے ٹی وی لگایا اور وہ چینل چیک کیا۔ خوش قسمتی سے ایمن شا والا پروگرام پھر سے دکھایا جا رہا تھا اور اس ڈاکومنٹری فلم کا آغاز تھا۔ ایمن شا نے اسکردو سے ہی اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس کی ٹیم میں کیمرا مین سمیت کئی افراد تھے۔ مقامی گائیڈ اور پورٹر بھی تھے، جب جیپ کا راستہ ختم ہو گیا تو وہ خچروں پر آ گئے تھے۔ شمالی علاقے میں اکثر راستے ایسے ہیں جن پر مشینی ٹرانسپورٹ نہیں چل سکتی ہے لہٰذا یہاں پر خچر کام آتے ہیں۔ پہاڑی اور دشوار گزار راستوں پر سواری کے لئے اس سے بہتر جانور اور کوئی نہیں ہے۔
ابھی میں ڈاکومینٹری دیکھ رہا تھا کہ دستک دے کر وسیم اندر آیا۔ "کیا حال ہیں جناب!"
"بہترین...... آؤ بیٹھو...... راجا صاحب بتا رہے تھے کہ کوئی نئی خبر ہے تمہارے پاس؟" میں نے غیر محسوس انداز میں ٹی وی بند کر دیا۔
"ایسا ہی سمجھ لیں۔ میرے آدمیوں نے فتح جنگ والی عمارت میں ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔ اسے ایک آدمی چند منٹ کے لئے باہر لایا تھا پھر اندر لے گیا۔ لڑکی نے کاسنی رنگ کا لباس پہن رکھا ہے۔"
"مونا نے اسی رنگ کا لباس پہنا تھا جب وہ مجھ سے ملنے اسپتال آئی تھی۔" میں نے بے تابی سے کہا۔
"آج رات میرے آدمی وہاں داخل ہوں گے، آپ اطمینان رکھیں۔ اگر وہ آپ کے ساتھی ہیں تو کل صبح تک بہرصورت آپ کے پاس ہوں گے۔"
"اللہ کرے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔
وسیم نے میرے بازو پر تھپکی دی۔ "شہباز صاحب! نہ جانے کیوں دل آپ کی طرف کھنچتا ہے۔ حالانکہ ہم پیسے کے لئے کام کرنے والے لوگ ہیں...... لیکن آپ کی خاطر دل سے کام کر رہے ہیں۔"
"تم نے کبھی اپنے بارے میں بتایا نہیں؟"
"کبھی موقع ہی نہیں ملا۔" وہ میرے قریب ہو کر قالین پر بیٹھ گیا تھا۔ "یہ بتائیں کہ آپ کے ہاتھ کا کیا حال ہے؟"
"بہت بہتر ہے، حکیم کی دوا اثر کر رہی ہے۔ میں اپنی انگلیوں کو حرکت دے سکتا ہوں۔"
"جب یہ مسخرا حکیم آیا تھا تو مجھے یقین نہیں تھا، یہ آپ کے لئے کچھ بہتر کر سکے گا۔ بلکہ مجھے خطرہ تھا، آپ کا زخم مزید خراب نہ ہو جائے لیکن میں راجا صاحب کے حکم سے مجبور تھا۔"

''میں پہلے بھی ایک بار اس علاج سے گزر چکا ہوں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اور وہ تجربہ بھی حیرت انگیز تھا۔ میرے زخم چوبیس گھنٹے کے اندر بھر گئے تھے۔''

''آپ کو دیکھ کر یقین آیا ہے۔ دنیا میں کچھ ایسی ادویات بھی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تم اسپتال سے کیسے نکلے تھے؟'' میں نے موضوع بدل دیا۔

''بہت آسانی سے...... مجھ پر پہرا نہیں تھا اور زخم بھی معمولی تھے۔ ایک شخص کو قابو کر کے اس کا لباس پہنا اور خاموشی سے نکل گیا۔''

''وہ کوٹھی کس نے کرائے پر لی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''پولیس کوئی اور نام لے رہی ہے۔''

''وہ فرضی نام تھا لیکن مجھے اپنے دونوں ساتھیوں کا ساری عمر افسوس رہے گا۔ اتنے پیارے اور جیالے لوگ کم ہوتے ہیں۔ اتنے مسلح افراد کے سامنے ڈٹ گئے تھے۔''

''درحقیقت ان کی وجہ سے ہم ان لوگوں کے مقابلے میں کامیاب ہوئے۔ پانچ افراد کی کمی سے وہ کمزور پڑ گئے تھے ورنہ......''

''ٹھیک کہا آپ نے...... انہوں نے قربانی دی۔'' وسیم نے سرد آہ بھری تھی۔ ''وہ میرے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے جب ہم معمولی درجے کے جرائم پیشہ ہوتے تھے۔''

''جرائم پیشہ؟'' میں چونکا تھا۔

وہ مسکرایا۔ ''تو اور کیا...... اب ہم ذرا مختلف طریقے اور پیمانے پر جو کرتے ہیں، قانون کی نظر میں وہ جرم ہی ہے۔''

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''تمہارے انداز سے لگتا ہے کہ تم باقاعدہ پڑھے لکھے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے یونیورسٹی سے قانون میں ماسٹر کیا ہے۔''

''قانون میں......؟'' میں دنگ رہ گیا تھا۔ ''اور یہ سب کچھ......''

''اب میں قانون شکنی کے لئے اپنی ڈگری استعمال کر رہا ہوں۔'' وہ بولا۔ اسی لمحے اس کے لباس سے رنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے موبائل نکال کر کال ریسیو کی۔ ''جی راجا صاحب!...... جی ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

اس نے موبائل بند کر کے جیب میں رکھا۔ ''مجھے راجا صاحب نے بلایا ہے۔''

وسیم کے جانے کے بعد خادم میرے لئے سوپ لے کر آیا۔ لیپ کے درمیان مجھے لازماً کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ دیا جاتا تھا ورنہ میں کمزوری محسوس کرنے لگتا تھا۔ سوپ سے فارغ ہو کر میں نے باقی وقت ٹی وی دیکھنے میں گزارا۔ دو بجے حکیم نے آ کر لیپ اتارا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن وہ خود کام کرنے پر مُصر تھا۔ دوائیں لے کر وہ چلا گیا۔ میں نے خود انگلیاں ہلانے کی مشق کی۔ میرے ہاتھ کی حالت ہر لیپ کے بعد بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ کلائی کے جوڑ تک سوجن بالکل اتر چکی تھی اور ہاتھ کی اصل رنگت بھی کسی قدر بحال ہو گئی تھی۔ البتہ ہتھیلی اور انگلیوں پر سوجن اور نیلی رنگت برقرار تھی۔ اس بار میں نے انگلیوں کو زیادہ آسانی سے حرکت دی تھی۔ انگوٹھا مکمل طور پر حرکت کر رہا تھا۔ میں نے ایک طرف رکھا کپ نما شوپیس انگوٹھے سے اٹھانے کی کوشش کی لیکن انگوٹھا اس کا نصف کلوگرام وزن نہیں سہار سکا اور وہ نیچے گر کر کرچی کرچی ہو گیا۔ خادم گرم پانی لے کر آیا۔

اس بار ربر کا دستانہ نہیں تھا اور پیالے کی تہ میں کچھ جڑی بوٹی نما اشیاء پڑی تھیں۔
''اب کے آپ کو براہِ راست پانی میں ہاتھ رکھنا ہے۔ اور حکیم صاحب کی ہدایت ہے، پانی میں اپنے ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کرتے رہیے گا۔''
میں نے حکیم کی ہدایت پر عمل کیا اور پندرہ منٹ تک اس جڑی بوٹیوں والے گرم پانی میں ہاتھ کو حرکت دیتا رہا۔ تین بجے عمر دراز نے مجھے لنچ کے لئے مدعو کر لیا۔ وہ چپ اور کسی سوچ میں گم تھا۔ مجھے لگا جیسے کوئی خاص بات ہوئی ہے۔ کھانے کے بعد راجا نے مجھے نشست گاہ میں لے کر آیا۔ ''راجا صاحب! کوئی خاص بات......؟''
''ہاں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''کل رات ندیم کے مکان میں کچھ افراد نے گھسنے کی کوشش کی تھی۔ وسیم کے آدمیوں نے ان کی کوشش ناکام بنا دی۔ فائرنگ سے دو دراندازمارے گئے اور ایک زخمی حالت میں پولیس کی تحویل میں ہے۔ باقی فرار ہو گئے تھے۔''
''ندیم اور اس کے گھر والے......''
''وہ خیریت سے ہیں...... پولیس اس بات کی تفتیش کر رہی ہے کہ وہ کیوں آئے تھے اور ان پر کس نے حملہ کیا؟''
''وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔'' میں نے مضطربانہ انداز میں کہا۔
''اوچھے ہتھکنڈے ان کا معمول ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ اب تک انہوں نے حملہ کیوں نہیں کیا۔ بہر حال وسیم کے آدمیوں نے ندیم کے بیوی بچوں کو ایک محفوظ مقام پر منتقل کر دیا ہے اور ندیم کے ساتھ بھی تین افراد مستقل رہتے ہیں۔''
''ندیم کو میرے بارے میں پتا ہے؟''
''نہیں، لیکن اسے شبہ ہو گیا ہے۔ وہ کئی بار وسیم کے آدمیوں سے تمہارے بارے میں پوچھ چکا ہے۔''
''اس نے تصویر کہاں رکھی ہے؟''
''یہ اس نے نہیں بتایا اور نہ وسیم کے آدمیوں نے پوچھا ہے۔ وہ مشکوک ہو کر ان لوگوں سے دور ہو جاتا ہے تو مرشد علی کا آسان شکار بن جائے گا۔''
''راجا صاحب، حالات خرابی کی طرف جا رہے ہیں۔ مرشد علی تصویر کی طرف سے مایوس ہو کر محض انتقام کے لئے مونا اور سفیر کو ضرر پہنچا سکتا ہے۔''
''بس آج رات تک صبر کر لو۔''
''راجا صاحب، کیا میں اس مہم میں جا سکتا ہوں؟''
''جا تو سکتے ہیں لیکن قادس کی اجازت سے...... وہی تمہارے ہاتھ کے بارے میں بہتر بتا سکتا ہے۔''
''رات تک ساتواں لیپ ختم ہو جائے گا۔ صرف ایک لیپ رہ جائے گا، وہ میں واپس آ کر بھی کروا سکتا ہوں۔'' میں نے التجا کی۔ ''پلیز راجا صاحب!''
راجا عمر دراز نے بغور میرا ہاتھ دیکھا۔ ''واقعی، اس کی حالت پہلے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔''
میں نے اسے انگلیاں حرکت دے کر دکھائیں۔ ''دیکھیں، میرا ہاتھ حرکت کرنے لگا ہے۔''

راجا عمر دراز نے حکیم قاوس کو بلوالیا اور اس سے میرے بارے میں دریافت کیا۔ یہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ راجا نے میری طرف دیکھا۔ ''مجھے افسوس ہے، شہباز! حکیم کا کہنا ہے، لیپ اپنے معمول کے مطابق ہی ہوں گے ورنہ اس کا اثر ختم ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہاتھ میں موجود زہر ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا ہے اور ایک بار اسے پھیلنے کا موقع مل گیا تو شاید حکیم بھی اس پر قابو نہ پا سکے۔''

میں نے سرد آہ بھر کر سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے راجا صاحب!''

''اور اپنے ساتھیوں کی فکر نہ کرو، وسیم خود اس آپریشن کی نگھان کرے گا۔''

''میں صرف اپنی تسلی چاہتا تھا ورنہ میں اس آپریشن میں کوئی کردار تو ادا نہیں کر سکتا ہوں۔'' میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''جاؤ جا کر لیپ کرواؤ۔ یقین کرو مجھے تمہارے ہاتھ کی بحالی کی بہت فکر ہے۔'' راجا نے میرا شانہ تھپکا اور میں حکیم کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

رات دس بجے جب حکیم ساتواں لیپ اتار رہا تھا، وسیم اندر آیا۔ سیاہ رنگ کی پتلون اور ہم رنگ ہاف جیکٹ میں وہ بالکل ہالی وڈ کی فلموں کا کوئی کمانڈو لگ رہا تھا۔ اس کے شانے سے ایک چھوٹی سی رائفل جھول رہی تھی اور کمر سے پستول بندھا تھا۔ جیکٹ کی متعدد جیبوں میں ان کا ایمونیشن تھا۔

''شہباز صاحب! خدا سے دعا کریں کہ میں کامیاب لوٹوں۔ آج شاید پہلی بار نیکی کا کوئی کام کرنے جا رہا ہوں اور میرا وعدہ ہے اگر زندہ رہا تو آپ کے ساتھیوں کو لے کر ہی آؤں گا۔''

''خدا کرے!'' اس کے لہجے نے مجھے اندر سے ہلا دیا تھا۔ وہ ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ وسیم سے واقفیت چند دن کی بات تھی لیکن میں اس سے ایسی انسیت محسوس کرنے لگا تھا جو برسوں کی جان پہچان کے بعد ہوتی ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی مگر رات کا کھانا میں نے لیپ اترنے کے بعد کھایا۔ کھانا بھی مشینی انداز میں کھایا تھا ورنہ اندر سے خواہش نہیں تھی۔ بس پیٹ کی مانگ تھی جسے پورا کر رہا تھا۔ راجا عمر دراز کوٹھی میں تھا لیکن اس نے مجھے رات کے کھانے پر نہیں بلایا۔ ممکن ہے وہ رات کا کھانا جلد کھا لیتا ہو۔ میں کوٹھی کے لان میں نکل آیا تھا اور رات بارہ بجے تک وہیں ٹہلتا رہا تھا پھر اندر آیا۔ حکیم نے آخری لیپ کیا۔ اس وقت تک ہاتھ کی سوجن تقریباً اتر چکی تھی اور رنگت بھی پہلے جیسی ہو رہی تھی۔ حکیم نے بتایا کہ اس لیپ کے بعد بھی اگر ہاتھ سے نیلگوں رنگت ختم نہ ہوئی تو مزید لیپ کرنا ہوں گے کیونکہ یہ مرہم ہاتھ میں پھیلا زہر کھینچ رہا ہے۔ جب تک یہ زہر نہیں نکلے گا، ہاتھ پہلے والی حالت میں نہیں آئے گا۔ میں لیٹ گیا تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ ان حالات میں نیند آنا بے حد مشکل تھا۔ میں جاگتا رہا اور انتظار کرتا رہا۔ انیکسی کے سامنے کوٹھی کا ڈرائیو وے تھا۔ کوئی گاڑی گزرتی تو مجھے اسکی آواز آتی۔ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ تنگ آ کر میں نے سونے کا فیصلہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید مجھے نیند نہیں آئے گی مگر فیصلہ کرنے کے چند منٹ کے اندر میں سو چکا تھا۔

اچانک میری نیند اچاٹ ہوئی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے باہر ہنگامہ ہو رہا ہو۔ بیک وقت کئی افراد کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لہجہ ایسا تھا جیسے کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ کیا وہ لوگ آ گئے تھے۔ مونا سفیر کو لے آئے تھے؟ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے اور ابھی مجھے دو گھنٹے مزید اسی طرح لیٹ کر گزارنے

تھے۔ میں نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر گیٹ کا نمبر دبایا۔ وہاں چوبیس گھنٹے گارڈ رہا کرتے تھے۔ ''کیا بات ہے، یہ ہنگامہ کیسا ہے؟''

''سر...... وسیم صاحب کے ساتھی واپس آئے ہیں۔'' گارڈز نے بتایا۔

''اور وسیم......؟'' میں نے پوچھا۔

''صاحب وہ زخمی ہیں، ان کے ساتھی انہیں اندر لے گئے ہیں۔''

''میرے خدا...... اچھا سنو، کوئی لڑکی بھی ہے ان کے ساتھ؟''

''میں ادھر گیٹ پر ہوں اور اتنی دور سے بتا نہیں سکتا۔'' اس نے معذرت کی۔

''میں نے باورچی خانے کا نمبر ملا کر اپنے لئے مامور خادم حضور بخش کو طلب کیا۔'' جی جناب! کیا لاؤں؟''

''کچھ نہیں...... یہ بتاؤ کہ جو لوگ آئے ہیں، ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''پتا نہیں صاحب! میں کچن سے آگے نہیں جانتا۔ آپ کہو تو پتا کر کے آؤں؟''

''ہاں، جاؤ اور جلدی آنا اور دیکھو، کوئی لڑکی آئی ہو تو اس کا بھی بتانا۔''

''میں ابھی آیا صاحب!'' وہ کمرے سے نکل گیا۔

اگرچہ ابھی صورتِ حال سامنے نہیں آئی تھی لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ وسیم جو مقصد لے کر گیا تھا اس میں اسے ناکامی ہوئی ہے اور اس نے شاید زیادہ خطرہ مول لیا تھا اور زخمی ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی فکر بھی لاحق ہو گئی تھی۔ خادم پندرہ منٹ بعد آیا۔ اس کے ساتھ وسیم کا ایک ساتھی تھا جسے میں کئی بار دیکھ چکا تھا، نام مجھے یاد نہیں اس لئے ہم اسے نمبر دو فرض کر لیتے ہیں۔ وہ عجلت میں تھا۔ اس نے رپورٹ دینے کے انداز میں کہا۔ ''جناب! آپریشن ناکام رہا۔ وہ لوگ چوکنا تھے، جیسے ہی ہم نے عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ اندر سے شدید فائرنگ شروع ہو گئی۔ کمانڈر سب سے آگے تھے انہیں تین گولیاں لگی ہیں۔''

''اب وسیم کی حالت کیسی ہے؟''

''وہ بے ہوش ہیں۔ ڈاکٹر آنے والا ہے۔''

''اوہ!'' میں نے مایوسی سے کہا تھا۔ ''کوئی اور نقصان تو نہیں ہوا؟''

''نہیں باقی سب محفوظ ہیں۔ کمانڈر کی وجہ سے ہمیں پسپا ہونا پڑا تھا، مجھے افسوس ہے۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے وسیم کے زخمی ہونے کا افسوس ہے۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے جناب یہ ہمارا کام ہے۔''

''پھر بھی مجھے وسیم کے زخمی ہونے کا افسوس ہے۔ اسے اسپتال لے کر کیوں نہیں گئے؟''

''سر، ہمارے گروپ کا اصول ہے، ایسی کنڈیشن میں اسپتال کا رخ نہیں کرتے ہیں۔ ہم پولیس ریکارڈ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ چند ڈاکٹرز ہمارے پے رول پر ہیں۔ ان کو بلا لیتے ہیں۔''

''اگر اسپتال جائے بغیر چارہ نہ ہو تو......؟''

''سر، میں بتا چکا ہوں...... اسپتال ہم کسی صورت نہیں جاتے۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''کمانڈر کے

لئے ڈاکٹر کال کرر ہا ہے، وہ آتا ہوگا۔"

"گولی نکالنے کے لئے آپریشن کی ضرورت پڑے گی۔"

"اس کے لئے کوٹھی میں چھوٹا سا آپریشن تھیٹر ہے۔ ہمارا ایک ساتھی مرہم پٹی کا ماہر ہے۔ وہ ڈاکٹر کی مدد کرتا ہے آپریشن میں۔ اس وقت بھی آپریشن روم تیار کرر ہا ہے۔"

نمبر دو چلا گیا۔ صبح کے پانچ بجے ڈاکٹر آیا تھا۔ اس کے آنے پر معمولی سی ہلچل مچی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب حکیم قاوس جیسا باکمال شخص موجود ہے تو اتنی دیر تک ڈاکٹر کا انتظار کیوں کیا گیا؟ مجھے یاد ہے، ایک بار راجا عمر دراز نے اس مرہم کی ایک خاصیت یہ بھی بتائی تھی کہ اگر گولی کے زخم پر لگایا جائے تو گولی بغیر آپریشن کے خود بخود باہر آ جاتی ہے۔ بشرطیکہ ہڈی یا کسی اعضائے رئیسہ میں نہ پھنسی ہو۔ ممکن ہے وسیم کو کسی ایسی جگہ گولی لگی ہو، ڈاکٹر کے آنے سے پہلے اور بعد میں بھی باہر گاڑیوں کے آنے جانے کا سلسلہ لگا ہوا تھا۔ شاید وسیم کے لئے خون یا جان بچانے والی ادویات کا انتظام کیا جار ہا تھا۔ میں صبر سے ساری آوازیں سنتا رہا۔ چھ بجے شاہی حکیم ترجمان کے ساتھ آیا۔ وہ خاصا ناراض لگ رہا تھا۔ میرے ہاتھ سے لیپ اتارتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑار ہا تھا۔

"آج حکیم صاحب کو کیا ہوا؟"

"یہ ناراض ہیں، ان کے ہوتے ہوئے اس جگہ کسی ڈاکٹر کو قدم رکھنے کی جرأت کیوں کر ہوئی؟ وہ وسیم صاحب کا علاج بھی کرنا چاہتے ہیں۔"

"ویسے وسیم کی حالت کیسی ہے؟"

"آپریشن کر کے گولیاں نکال دی گئی ہیں اور انہیں خون دیا جار ہا ہے۔"

حکیم نے لیپ اتارنے کے بعد میرے ہاتھ کا بغور جائزہ لیا اور ترجمان کے توسط سے کہا۔ "ابھی مزید لیپ ہوں گے۔"

میں نے انگلیاں ہلانے کی مشق کی۔ حکیم نے کہا کہ جب تک اگلا لیپ نہیں لگتا، میں انگلیاں ہلاتا رہوں۔ حتیٰ کہ سنکائی کے پیالے میں بھی حرکت دیتا رہوں۔ خدا خدا کر کے ساڑھے چھ بجے میری جان چھوٹی اور میں کوٹھی میں آیا۔ وسیم آپریشن روم میں ہی بستر پر لیٹا تھا۔ اس کے زرد چہرے پر آکسیجن ماسک لگا تھا۔ ایک بازو میں خون اور دوسرے بازو میں ڈرپ، چڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ہاتھ اور اپنے اوزار دھور ہا تھا۔ اس نے وسیم کی کنڈیشن کے بارے میں بتایا۔ "بہتر نہیں ہے۔ ایک گولی پھیپھڑوں سے گزر گئی تھی۔ اگر اندر خون نہ رکا تو پھیپھڑے اپنا فنکشن روک سکتے ہیں۔"

"خون کیسے رکے گا؟"

"میں نے زخم سی دیئے ہیں، دوائیاں کھلا دی ہیں، باقی اللہ بہتر کرنے والا ہے۔"

"کیا یہ بے ہوش ہے؟"

"نہیں سو رہا ہے، اسے دوا دی گئی ہے...... ورنہ تکلیف کی شدت اس کی جان لے سکتی ہے۔"

"اللہ رحم کرے۔" میرے منہ سے نکلا تھا۔ اسی لمحے راجا عمر دراز بھی اندر آیا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑا وسیم کی طرف دیکھتا رہا، پھر ڈاکٹر سے کہا۔

''اگر اسے اسپتال لے جایا جائے؟''

''تب بچنے کے بہتر امکانات ہیں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''اسے اسپتال لے جانے کا بندوبست کرو۔''

''سوری راجا صاحب! یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے۔'' نمبر دو نے اندر آ کر کہا۔

راجا عمر دراز جھنجلا گیا تھا۔ ''یہاں یہ مر جائے گا۔''

''ممکن ہے۔'' نمبر دو لا پروائی سے بولا۔ ''راجا صاحب، اگر کمانڈر ہوش میں ہوتے تو وہ بھی اس بات کو پسند نہیں کرتے۔''

''انسان کی جان سے زیادہ کچھ قیمتی نہیں ہوتا۔''

''ہوتا ہے...... بعض چیزیں ہر شے سے حتیٰ کہ انسان کی جان سے بھی بڑھ کر ہوتی ہیں۔ کمانڈر کا علاج یہیں ہوگا۔'' نمبر دو کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

راجا کا موڈ آف ہو گیا۔ ''تم میرے گھر میں کھڑے ہو کر مجھ پر حکم نہیں چلا سکتے۔''

''سوری...... میری بات آپ کو بری لگی۔ اس صورت میں بہتر یہی ہے، ہم کمانڈر کو لے کر یہاں سے چلے جائیں۔''

''معاہدے کے تحت تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''تب ہمارے اصولوں کو نہ چھیڑا جائے ورنہ ہم معاہدہ ختم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''او کے!'' راجا عمر دراز غصے سے وہاں سے چلا گیا۔

''وسیم کی حالت خطرے میں ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' نمبر دو آہستہ سے بولا۔ ''لیکن یہ ہماری مجبوری ہے۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' اچانک وسیم کی مدھم سی آواز آئی، وہ ہوش میں آ گیا تھا۔

''وسیم اب کیسے ہو؟'' میں اس کی طرف لپکا۔ ''تمہیں اسپتال لے جانا بہت ضروری ہے۔''

''مجھے افسوس ہے شہباز صاحب! میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔''

''اسے بھول جاؤ۔ مجھے یقین ہے تم نے اپنی پوری کوشش کی ہوگی۔''

''میں اسپتال نہیں جا سکتا۔'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔ چند لمحوں میں وہ دوبارہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ میں نے پریشان ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا لیکن وہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''ان کا ہوش میں آنا اچھی علامت ہے۔ اب مجھے امید ہے یہ جلدی کور کر لیں گے۔''

راجا عمر دراز کا خادم ناشتے کی دعوت لے کر آیا تھا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وسیم کے پاس سے ہٹوں لیکن مجبوری تھی۔ ایک گھنٹے بعد مجھے لیپ کے اگلے مرحلے سے گزرنا تھا۔ ناشتے کی میز پر راجا عمر دراز کسی قدر فکر مند بیٹھا تھا۔ ناشتے کے بعد چائے نوش کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''معاملات بگاڑ کی طرف جا رہے ہیں۔ ہمارے حملے نے انہیں یقین دلا دیا ہوگا کہ کوئی طاقت تمہارا ساتھ دے رہی ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟''

''پڑے گا...... اب وہ محتاط ہو جائیں گے۔ تمہارے ساتھیوں کی نگرانی سخت کر دی جائے گی۔ انہیں رہا کرانا مزید مشکل ہو جائے گا۔''

''راجا صاحب! کیا ہم تصویر دے کر انہیں نہیں چھڑا سکتے ؟''

''تصویر کا نام بھی مت لو۔'' راجا غرایا تھا پھر نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ''اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ وہ تصویر حاصل کرنے کے بعد بھی تمہارے پیچھے پڑا رہے گا۔ میرا اشارہ مرشد علی کی طرف ہے۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ویسی ہی نقلی تصویر بنا کر دے دی جائے۔''

''مرشد علی ہوتا تو اسے یہ دھوکا دیا جا سکتا تھا لیکن ڈیوڈ شا کو دھوکا دینا مشکل ہوگا۔ وہ تصویر کی اصل سے واقف ہوگا۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' میں نے اعتراض کیا۔ ''دوسرے اگر تصویر کا مونا اور سفیر سے تبادلہ ہوا تو کیا ڈیوڈ شا خود اطمینان کرنے آئے گا۔''

''عین ممکن ہے۔ وہ بہت مکار آدمی ہے۔ مجھے اصل خطرہ اس سے ہے۔ ورنہ یہ مرشد علی مسخرے سے زیادہ نہیں ہے۔'' راجا عمر دراز بے پروائی سے بولا۔

''اس مسئلے کا کیا حل نکل سکتا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''حوصلہ رکھو نوجوان! اُس نے میرا شانہ تھپکا۔ ''صبر کرنے سے ہی پھل پکتا ہے ورنہ کچا پھل ہاتھ آتا ہے۔''

میں اپنے کمرے میں آیا۔ جہاں حکیم قادس میرا منتظر تھا۔ اس نے لیپ کیا اور گولیاں دے کر جانے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ''ابھی کتنے لیپ باقی ہیں؟''

ترجمان نے بتایا۔ ''ممکن ہے تین چار لیپ اور کرنا پڑیں۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں لیٹوں نہیں...... بلکہ لیپ خشک ہونے کے بعد ذرا چل پھر لوں؟''

''نہیں۔'' قادس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''چھ گھنٹے سے پہلے ہاتھ کو حرکت دینا مناسب نہیں ہوگا۔''

''جیسے تمہاری مرضی!'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا اور لیٹ گیا۔ رات ٹھیک طرح سے نہیں سو سکا تھا اس لئے میں نے سوچا کہ کچھ دیر سو لیا جائے۔ شب و روز میرے لئے ایک سے ہو گئے تھے۔ چار گھنٹے کا ذہن میں رکھ کر میں نے سونے کا سوچا اور کچھ دیر میں گہری نیند سو چکا تھا۔

☆======☆======☆

میں نے چار کلو کا ڈمبل بہ آسانی اٹھا لیا تھا لیکن جلد ہاتھ لرزنے لگا اور چند سیکنڈ بعد ڈمبل میرے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ تین دن میں میرے ہاتھ کی رنگت، چھونے اور محسوس کرنے کی حسیات مکمل طور پر بحال ہو چکی تھیں لیکن ہاتھ کی قوت ابھی کمزور تھی۔ اگر میں کوئی وزنی شے اٹھانے کی کوشش کرتا تو ہاتھ لرزنے لگتا تھا اور وہ شے میرے ہاتھ سے نکل جاتی تھی۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ میری کلائی کی ہڈی جڑنے کے باوجود پوری طرح مضبوط نہیں ہوئی تھی۔ لیپ ختم کرنے کے بعد شاہی حکیم صبح شام میرے ہاتھ کی کسی خاص تیل سے مالش کرتا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس سے میرے ہاتھ کی کارکردگی بہت جلد بحال ہو جائے گی۔ حالات میں کوئی تبدیلی نہیں

آئی تھی۔ سوائے اس کے کہ میری ایک بار ندیم سے بات ہوئی تھی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں کہاں اور کن لوگوں کے پاس ہوں۔ میری آواز سنتے ہی وہ برس پڑا تھا۔

''ابے کہاں غائب ہو تم سب کے سب۔ میں عذاب بھگتنے کے لئے اکیلا رہ گیا ہوں۔ وہ ماں کا یار مرشد روز میری جان کھاتا ہے۔''

''اسے بہلاتا رہ اور مونا، سفیر سے بات ہوئی تھی؟''

''ہاں، دو روز پہلے ہوئی تھی۔ میں نے مرشد سے صاف کہہ دیا ہے جب تک تُو بحفاظت واپس نہیں آ جاتا، تصویر اسے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''مونا اور سفیر ٹھیک تھے ناں......؟''

''ہاں......تو اپنی سنا، کہاں ہے؟''

''جہاں بھی ہوں، خیریت سے ہوں اور تم اسی طرح واویلا مچاتے رہو۔ خاص طور سے اکرم چشتی کی پٹی ضرور اتروانا۔''

''وہ تو گیا۔'' ندیم نے ہنس کر کہا۔ ''دو روز پہلے لائن حاضر ہوا ہے۔''

''اچھا، اللہ حافظ!'' میں نے کہا اور موبائل بند کر دیا۔ ندیم چلاتا رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کا فون آ گیا مگر نمبر دو نے کرخت لہجے میں انکار کر دیا کہ اس نمبر پر کوئی شہباز ہوتا ہے۔ مونا اور سفیر کے بارے میں جان کر مجھے اطمینان ہوا تھا۔ ندیم نے اشاروں میں بتایا تھا کہ تصویر محفوظ ہے، اتنی عقل اس کے پاس تھی کہ وہ اس سارے کھیل کو سمجھ جاتا جس میں تصویر کا کردار کلیدی تھا۔ لیپ کا چکر ختم ہونے سے پہلے میں نے نمبر دو سے فرمائش کر کے ایک سائلنسر لگا پستول حاصل کر لیا تھا۔ جب باہر نکلنے لگا تو وسیع لان میں اس سے فائرنگ کی مشق کیا کرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا میری زندگی کا دھارا جس سمت میں مڑ گیا تھا، اس میں اسلحے کے استعمال سے شناسائی ضروری تھی۔

پورے چار دن میں نے لیٹ کر بے تحاشا کھایا تھا۔ ممکن ہے عام حالات میں ایسا ہوتا تو میرا وزن بڑھ جاتا لیکن حکیم کے مرہم اور گولیوں میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ میرا جسم بدستور اتنا ہی رہا، یہی نہیں، میں نے اپنی قوت میں بھی کوئی کمی محسوس نہیں کی تھی۔ صبح وسیم کے گروپ کے تمام ارکان لان میں مختلف قسم کی ایکسر سائزز اور آپس میں مارشل آرٹ کی پریکٹس کیا کرتے۔ ڈیڑھ گھنٹے صبح اور ایک گھنٹا شام۔ میں بھی ان مشقوں میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ احتیاط کی وجہ سے مارشل آرٹ کی پریکٹس نہیں کر رہا تھا لیکن ایکسر سائز میں بھرپور حصہ لیتا تھا۔ کچھ دنوں کی ایکسر سائز نے میرے رگ و پٹھے ٹھوس کر دیئے تھے۔

وسیم کی حالت چوتھے دن تک اتنی بہتر ہو گئی تھی کہ وہ خود چل کر باہر تک آیا تھا لیکن خون زیادہ بہہ جانے اور پھیپھڑوں کے زخم کی وجہ سے کمزوری اتنی تھی کہ وہ چند منٹ سے زیادہ نہ رہ سکا تھا۔ میں فارغ وقت اس کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔ راجا عمر دراز ان دنوں کوٹھی میں کم نظر آتا تھا اور کوٹھی میں ہوتا بھی تو اپنے کمرے تک محدود رہا کرتا تھا۔ میری اس سے صرف ناشتے پر ملاقات ہوتی تھی۔ مونا اور سفیر کی بازیابی کا معاملہ اس نے وسیم پر چھوڑ رکھا تھا۔ دوسری طرف وسیم کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ایک مہینے سے پہلے کسی مہم میں حصہ لے سکتا۔ ابھی تو اس

کے زخم بھی نہیں بھرے تھے۔ جسمانی کارکردگی بحال ہونے میں عرصہ تھا۔ وسیم کے آدمی اب دور سے عمارت کی نگرانی کر رہے تھے۔ جہاں مونا اور سفیر تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ مونا اور سفیر ابھی تک اس عمارت میں تھے۔ انہیں کہیں اور لے جانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی شاید اس لئے بھی کہ اس عمارت کے حفاظتی انتظامات سخت تھے اور ان لوگوں کی ناکام مہم جوئی سے بھی یہ بات ظاہر تھی۔ مرشد علی نے اس عمارت کی حفاظت کے انتظامات وسیم کے اندازے سے کہیں زیادہ کرر کھے تھے۔

ایک شام ایکسرسائز سے فارغ ہو کر نہانے کے بعد میں وسیم کے پاس آ گیا۔ اسے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا اور وہ سرہانے سے ٹیک لگائے اپنا پستول صاف کر رہا تھا۔ ''کیا حال ہیں؟''

''بہتر ہیں۔ ممکن ہے ایک دو دن میں ڈاکٹر چلنے پھرنے کی اجازت دے دے گا۔''

''اور یہ کس چیز کی تیاری ہے؟'' میں نے پستول کی طرف اشارہ کیا۔

''اس وعدے کی جو میں نے آپ سے کیا تھا۔''

''فی الحال تم اپنی صحت کی طرف توجہ دو۔''

''صرف یہی ایک طریقہ ہے، میں جلد از جلد صحت یاب ہو سکتا ہوں۔'' اس نے پستول سرہانے رکھ دیا۔ ''ڈاکٹر میری پروگریس سے حیران ہے۔''

''وسیم وہاں کیا ہوا تھا؟''

''غلطی میری تھی، یہ پہلا موقع تھا جب میں نے پروفیشنل ازم کو نظر انداز کیا اور اسی کا خمیازہ بھگتا۔'' اس نے اپنے سینے کی طرف دیکھا۔ ''میں اندر کودا تھا کہ وہاں موجود مسلح افراد نے فائرنگ شروع کر دی۔ وہ سب ناتجربے کار جرائم پیشہ ہیں۔ کاش کہ مجھے گولی نہ لگتی اور میرے دو ساتھی اندر آ جاتے تو میں ان پر آسانی سے قابو پا لیتا لیکن زخمی ہوتے ہی میں نے انہیں اندر آنے سے منع کر دیا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح باہر آ گیا۔ میری حالت کی وجہ سے میرے ساتھی فوری طور پر واپس آ گئے۔ کاش میں بے ہوش نہ ہوتا تو انہیں روک دیتا۔''

''انہوں نے بالکل ٹھیک کیا۔'' میں نے کہا۔ ''وسیم، تمہاری زندگی کی اہمیت کسی طرح میرے ساتھیوں سے کم نہیں ہے۔''

اس نے کسی قدر تعجب سے میری طرف دیکھا۔ ''آپ ایسا سمجھتے ہیں...... میں صرف ایک پیشہ ور شخص ہوں، جسے موت کے منہ میں جانے کے لئے ادائیگی کی جاتی ہے۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا...... میرے نزدیک ہر انسان کی وقعت ہے بشرطیکہ اس میں انسانیت ہو، وہ بھی دوسرے انسان کو اہمیت دیتا ہو۔''

''شہباز صاحب! بس چند دن رک جائیں۔''

''یار، کوئی جلدی نہیں ہے۔'' میں نے اس کے بازو پر تھپکی دی۔ ''میں نے صبر کرنا سیکھ لیا ہے۔''

''میرے اوپر یہ قرض ہے۔''

''میں نے کہا ناں...... تم فکر نہ کرو۔''

میرے ذہن میں ایک دو دن سے کھچڑی پک رہی تھی اور اس سلسلے میں، میں نے راجا عمر دراز سے بات

کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے کمرے میں تھا، میں نے اسے پیغام بھجوایا، کچھ دیر بعد وہ نشست گاہ میں میرے سامنے تھا۔ ''خیریت، تم نے فوری ملاقات کا پیغام بھیجا؟''

''راجا صاحب! میں فارغ بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا ہوں۔''

''تو باہر نکلو، گھومو پھرو...... بس احتیاط کرنا۔''

''میں گھومنا پھرنا نہیں، اپنے ساتھیوں کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس کے لئے وسیم اور اس کے ساتھی......''

''قطع کلامی معاف راجا صاحب......! وسیم ابھی دو تین ہفتے تک کسی مہم میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہے اور اس کے ساتھی محض جسم ہیں۔ دماغ کے بغیر حرکت میں نہیں آ سکتے۔ میرے ساتھی اتنی دیر مرشد علی کی قید میں رہیں، مجھے کسی صورت گوارہ نہیں ہے کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہوں۔''

''تب تم کیا چاہتے ہو؟'' راجا عمر دراز نے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''میں سب سے پہلے اس جگہ کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں جہاں میرے ساتھی قید ہیں۔''

''یہ کام خطرناک ہو سکتا ہے۔''

میں نے لاپروائی سے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے، اب میری زندگی خطروں میں گزرے گی۔''

''میں نے کچھ اور سوچا تھا کہ جب تک تمہارا وکیل یہ مسئلہ حل نہیں کر لیتا ہے تمہیں بیرونِ ملک بھجوا دوں۔''

''جب تک مونا اور سفیر قید میں ہیں، میں کہیں نہیں جا سکتا۔''

''او کے۔ میں وسیم سے کہہ دیتا ہوں...... وہ مطلوبہ ہدایت جاری کر دے گا۔''

''مجھے وسیم کے ساتھیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صرف وہ جگہ دکھا دی جائے۔''

''شہباز! تم کوئی جذباتی قدم نہیں اٹھاؤ گے، جو تمہارے ساتھ مجھے بھی......''

''آپ بے فکر رہیں راجا صاحب!''

رات بارہ بجے میں اور وسیم کے دو ساتھی ایک سیاہ شیشوں والی جیپ پر سوار ہو کر نکلے۔ راجا عمر دراز کی یہ کوٹھی نسبتاً الگ تھلگ جگہ تھی۔ اسلام آباد کی حدود سے گزرتے ہوئے ڈرائیور نے رفتار کم رکھی تھی کیونکہ مقررہ رفتار سے ذرا تیز ہوتے ہی ٹریفک پولیس پیچھے لگ جاتی تھی۔ البتہ جب اسلام آباد کی حدود سے نکل گئے تو اس نے بے فکری سے جیپ دوڑائی تھی۔ فتح جنگ کے نزدیک پہنچ کر اس نے جیپ سڑک سے اتار دی اور کچے راستے پر سفر کرتے ہوئے ایک چھوٹے سے جنگل تک آ پہنچے۔ وسیم کا نمبر دو چلا گیا تھا اور اس کی جگہ شکیل نامی یہ نوجوان آیا تھا جو عقبی نشست پر میرے ساتھ بیٹھا تھا۔

''تمہارے آدمی کہاں ہیں؟''

''ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔'' اس نے کہا اور لباس سے ایک محدود فاصلے میں کام کرنے والا ریڈیو سیٹ نکالا اور کسی نامانوس زبان میں کچھ کہا۔ بلکہ یہ سرے سے کوئی زبان ہی نہیں تھی...... بلکہ اردو، انگریزی اور پنجابی کے الفاظ کا مغلوبہ تھا۔ دوسری طرف سے اسی زبان میں جواب آیا۔ اس نے ریڈیو بند کر دیا اور میری طرف

دیکھا۔ ''تین ساتھی...... تین اطراف سے کوٹھی کی نگرانی کر رہے ہیں۔ بارہ گھنٹے بعد ان کی ڈیوٹی بدل جاتی ہے، ان میں سے ایک ابھی اس طرف آئے گا۔''

''وہ آنے جانے والوں کو بھی دیکھتے ہیں؟''

''ہاں...... کیونکہ وہ آنے جانے والوں کا مکمل ریکارڈ رکھ رہے ہیں۔ ان کے پاس دن اور رات میں نگرانی کرنے والے آلات ہیں۔''

''تم لوگ سائنٹفک انداز میں کام کرتے ہو۔''

شکیل ہنسا۔ ''یہی وجہ ہے، ہمیں کم ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور ہماری ایک ساکھ ہے۔''

چند لمحے بعد نزدیک سے جھینگر بولنے کی آواز آئی۔ جواب میں شکیل نے بھی ویسی ہی آواز نکالی تھی جو حیرت انگیز طور پر جھینگر کے بولنے سے مشابہ تھی۔ مجھے بعد میں پتا چلا، ان کے پاس ایسی سیٹیاں تھیں جن میں پھونک مارنے سے جھینگر کے بولنے جیسی آواز نکلتی تھی کیونکہ جیپ کے اندر تاریکی تھی اس لئے میں شکیل کو سیٹی بجاتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ ایک سایہ جیپ کے نزدیک آیا۔ ہم خاموشی سے جیپ سے اترے اور ایک لفظ کہے بنا سائے کے ساتھ چل پڑے۔ البتہ ڈرائیور جیپ میں ہی رہا تھا۔ جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے گزرتے ہم ایک ٹیلے تک آئے تھے۔ ''اوپر جانا ہوگا۔'' سائے نے دبی آواز میں کہا۔

کسی نہ کسی طرح ہم ٹیلے پر چڑھ گئے۔ جہاں جھاڑیوں کے درمیان نگرانی کرنے والے نے آبزرویشن پوسٹ بنا رکھی تھی اور اس کے پاس تمام ضروری آلات تھے۔ یہاں سے وہ وسیع اور دیہی طرز کی لیکن پختہ عمارت صاف نظر آ رہی تھی جس کے گرد اونچی چار دیواری تھی۔ یہ چار دیواری کوئی ایک ایکڑ کے رقبے میں پھیلی تھی اور اس کا احاطہ تیز روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ دیوار پر ہر چند گز کے بعد تیز روشنی والا بلب لگا تھا اور دیوار پر خاردار تاریں بھی تھیں۔ نگران نے بتایا۔

''یہ تاریں دو دن پہلے لگائی گئی ہیں۔ آدمیوں کا بھی اضافہ کر دیا ہے، اب اس عمارت میں کم سے کم ڈیڑھ درجن مسلح افراد ہیں۔ مین گیٹ پر دو افراد ہمہ وقت رہتے ہیں اور عمارت پر بھی چھ سات افراد کا مستقل پہرا ہے۔''

ٹیلا عمارت سے کوئی پانچ سو گز کے فاصلے پر تھا اور اتنی دور سے محض آنکھ سے نگرانی ناممکن تھی لیکن اس جگہ سے عمارت اور اس کے احاطے کا بیشتر حصہ بڑی اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ میں نے دوربین مانگی۔ اس نے مجھے عام دوربین دی۔ نائٹ وژن کی ضرورت نہیں تھی۔ عمارت والوں نے روشنی کا معقول انتظام کر رکھا تھا۔ ایک طرف احاطے میں دیوار کے ساتھ چند کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی تو احاطہ جیسے چند گز کے فاصلے پر آ گیا تھا۔ یہ دوربین مختصر لیکن بے حد طاقتور تھی۔ احاطے میں گیٹ سے کچھ فاصلے پر چار پانچ گاڑیاں اور چند موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔ میں نے دوربین گھما کر مین گیٹ کی طرف کی۔ وہاں ایک شخص شانے سے کاربائن لٹکائے ٹہل رہا تھا۔ یہ پرانی ساخت کی گن تھی۔ البتہ احاطے میں عمارت کے گرد موجود افراد کے پاس جدید ساخت کی رائفلیں تھیں۔ عمارت ایل شکل کی تھی اور اس کی سیدھی ساخت میرے سامنے تھی یعنی ایل کا کونا میری طرف تھا۔ اس ایک منزلہ عمارت کو سرخ پکی اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ بعض کھڑکیاں روشن تھیں اور بعض

تاریک تھیں۔ میں روشن کھڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ گرمی کی وجہ سے کھڑکیاں کھلی تھیں اوران پر سے پردے بھی ہٹے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں ایک بڑی اور گھنی مونچھوں والا شخص شراب نوشی میں مصروف تھا۔ حلئے اور لباس سے وہ بدمعاش لگ رہا تھا۔ اچانک کھڑکی کے سامنے ایک لڑکی آئی تھی۔ اس نے مختصر سا لباس پہن رکھا تھا۔ اسے پشت کی طرف سے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے میرے دل کی دھڑکن رک گئی تھی کیونکہ پیچھے سے وہ مونا سے بے حد مشابہ لگ رہی تھی خاص طور سے اس کے لیئر کٹ بال بالکل مونا جیسے تھے لیکن جب صوفے پر بیٹھے ہوئے بدمعاش نے اسے اپنی جانب کھینچا اور اس کا چہرہ سامنے آیا تو میں نے سکون کا سانس لیا، وہ مونا نہیں تھی بلکہ صورت سے بازاری خدوخال رکھنے والی عورت نظر آ رہی تھی، اس کے اطوار اور لباس بھی اس کی گواہی دے رہا تھا۔

''لڑکی اچھی ہے۔'' شکیل بھی دوربین آنکھوں سے لگائے اسی جانب دیکھ رہا تھا۔

''میں اسے عقب سے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔'' میں نے اعتراف کیا اور دوسری روشن کھڑکیوں میں جھانکنے لگا۔ پھر ایک کھڑکی کے سامنے آتے ہی میرے ہاتھ رک گئے تھے۔ وہ بلاشبہ مونا تھی۔ دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کی سلاخیں تھامے وہ آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا ستا ہوا چہرہ ان مصائب اور آلام کا آئینہ دار تھا جو اس پر گزر رہے تھے۔ ویسے وہ ٹھیک ٹھاک لگ رہی تھی۔ میں نے دوربین کو مزید فوکس کرتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔ میرا دل کٹنے لگا۔ میرے پیارے صرف میری وجہ سے کتنی پریشانی اٹھا رہے تھے۔ اچانک اس کے عقب سے سفیر نمودار ہوا اس نے مونا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہا تو وہ اس کے شانے سے سر ٹکا کر رونے لگی تھی۔ اس کا ہچکولے لیتا جسم گواہی دے رہا تھا۔ سفیر اسے تسلی دینے لگا اور جب یہ تسلی سنسر کی حدود میں داخل ہونے لگی تو میں نے جھینپ کر دوربین وہاں سے ہٹالی اور احاطے کا جائزہ لینے لگا۔ ساتھ ہی میں نے نگراں سے پوچھا۔

''تمہارے بقیہ دو ساتھی کہاں ہیں؟''

''انہوں نے دوسرے مقامات پر پوسٹیں بنا رکھی ہیں۔ ایک عمارت کے دوسری جانب ہے اور دوسرا اس راستے کی نگرانی کرتا ہے جو پکی سڑک سے حویلی کی طرف آتا ہے۔''

''ممکن ہے عمارت تک آمدورفت کے لئے کوئی اور راستہ بھی اختیار کیا جاتا ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔'' اتنے دن کی نگرانی سے یہ بات حتمی طور پر ثابت ہے۔ یہی ایک راستہ ہے جو شمال میں پکی سڑک تک جاتا ہے۔''

''دو درجن افراد کے لئے روزانہ سامان آتا ہوگا۔ خاص طور سے دودھ، انڈے، گوشت جیسی چیزیں تو روز درکار ہوتی ہیں۔''

''ایک سوزوکی پک اَپ روز سپلائی کر کے جاتی ہے۔''

''کیا اس پک اَپ کو ٹریپ کر کے اندر جانا ممکن نہیں ہے؟''

''میں نے اس کا جائزہ لیا ہے لیکن یہ کام یوں بے حد مشکل ہے کہ پک اَپ کھلی ہوتی ہے اور ڈرائیور اکیلا ہوتا ہے۔ گیٹ کے نگران اس کی صورت دیکھ کر دروازہ کھولتے ہیں۔''

''اس کے علاوہ کوئی آمدورفت؟''

''ہر دوسرے تیسرے دن برقع پوش عورتوں کو لے کر ایک گاڑی آتی ہے۔ عام طور سے رات کے وقت اور صبح سویرے چلی جاتی ہے۔''

''پیشہ ور عورتیں؟'' میں نے پوچھا۔

''امکان یہی ہے ورنہ اس عمارت میں اس طرح عورتوں کے آنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟'' شکیل بولا۔

میں نے نگران سے پوچھا۔ ''کیا آج بھی برقع پوش عورتیں آتی ہیں؟''

''جی جناب!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''رات نو بجے ایک کار میں چار برقع پوش عورتیں آئی تھیں۔ اس وقت وہ احاطے کے ساتھ موجود کوٹھریوں میں ہیں۔''

میں نے دوربین اس طرف گھمائی۔ دیوار کے ساتھ چھ سات کوٹھریاں تھیں۔ کچی مٹی سے بنی ان کوٹھریوں پر ٹین کی شیٹیں پڑی تھیں۔ جب میں دیکھ رہا تھا تو ایک شخص صرف دھوتی میں باہر نکلا اور ایک طرف بنے باتھ روم میں چلا گیا۔ وہ سو رہا تھا یا کسی اور ''مصروفیت'' میں گم تھا، یہ واضح نہیں تھا۔ اچانک ایک اور کوٹھری کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک عورت نکل کر بھاگی۔ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی شے نہیں تھی مگر اسے چند قدم سے آگے جانا نصیب نہیں ہوا۔ کوٹھری سے دو مرد چیتے کی طرح جھپٹے اور اسے کسی بکری کی طرح دبوچ کر لے گئے۔ اگر وہ راضی خوشی آنے والی پیشہ عورتوں میں سے تھی تو اسے اس طرح بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا ان لوگوں نے کسی عورت کو قید کر رکھا تھا اور اس کی بے حرمتی کر رہے تھے؟ میں نے یہ بات نگران سے پوچھی، اس نے نفی میں جواب دیا۔

''ایک ہفتے کے دوران میں، میں نے کسی عورت کو نہیں دیکھا ہے، سوائے مونا بی بی کے۔''

''آپ اس معاملے میں سر نہ کھپائیں شہباز صاحب!'' شکیل بولا۔ ''یہ بتائیں آ کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''حملہ!'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''صبح جب یہ عورتیں واپس جائیں گی تو ہم انہیں ٹریپ کر لیں گے اور پھر ان کے برقعوں میں واپس آئیں گے۔ رات بھر عیاشی کے بعد یہ بے خبر سو رہے ہوں گے اور ہم بہ آسانی ان پر قابو پا سکتے ہیں۔''

''یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ اندر ڈیڑھ درجن کے قریب مسلح افراد ہیں۔ ان میں سے چھ سات ہر وقت پہرے پر رہتے ہیں۔''

''بے خبری میں حملہ کر کے ہم ان پر قابو پا سکتے ہیں۔ پھر ان جگہوں سے بھی ہماری مدد کی جائے گی جہاں سے عمارت کی نگرانی ہوتی ہے۔ تم لوگوں کے پاس دور مار رائفلیں ہوں گی۔''

''شہباز صاحب! اس قسم کے منصوبے اس طرح نہیں بنتے ہیں، ہمیں پوری پلاننگ کے بعد حملہ کرنا ہو گا۔''

''نہیں حملہ آج ہی ہو گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''یہ مت بھولو...... تم سب میرے چارج میں ہو۔''

''اچھا، جیسی آپ کی مرضی۔'' شکیل نے بے بسی سے کہا۔

''کوٹھی سے پانچ افراد...... کم سے کم تین اچھے نشانے باز ہوں اور دور مار رائفلیں ہوں۔ باقی اسلحہ تم اپنی صوابدید پر لا سکتے ہو۔'' میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔'' چار افراد میرے ساتھ جائیں گے۔ چار برقع پوش ہوں گے اور ایک کار کی ڈکی میں ہوگا۔ جیسے ہی ہم اندر جائیں گے، سب سے پہلے مین گیٹ والوں کو شوٹ کرنا ہوگا۔ ہمارے پاس خاموش پستول بھی ہونے چاہئیں۔''

''میں سمجھ گیا۔ ایک تجویز اور ہے۔ ایک تیز گاڑی میں کم سے کم چار افراد پیچھے ہوں جیسے ہی گیٹ والے مارے جائیں، وہ بھی اندر آ جائیں۔''

''یہ بہتر رہے گا۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

مونا اور سفیر کو بے کسی کی حالت میں قید دیکھ کر میرا دل تڑپ گیا تھا اور میں ہر خطرہ مول لے کر انہیں مرشد علی کے چنگل سے نکالنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ شکیل آدمی اور اسلحہ لانے کے لئے چلا گیا۔ میں وہیں رک گیا۔ دوربین سے وقفے وقفے سے عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ نگران نے مجھے تھرماس سے کافی نکال کر دی۔

''سوری سر! کافی باسی ہو چکی ہے۔''

''کوئی بات نہیں، کافی ہے۔'' میں نے کپ لیا۔ میرا ذہن اس پلان میں الجھا تھا۔ درحقیقت مجھے بھی احساس تھا کہ میں نے کوئی بہت اچھا منصوبہ نہیں بنایا ہے۔ یہ بے حد رسکی تھا اور کامیابی غیر یقینی تھی البتہ ایک بات یقینی تھی کہ حملے کی صورت میں دونوں طرف سے کئی جانیں جا سکتی تھیں۔ بہر حال حالات نے مجھے اس رخ پر پہنچا دیا تھا کہ میں اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لئے دشمن کا خون بہانے کے لئے بھی تیار تھا۔ سب سے زیادہ خطرہ گیٹ کے افراد سے تھا اگر وہ خطرہ بھانپ جاتے تو کام بے حد مشکل ہو جاتا۔ ہمیں الٹا لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ انہیں خاموشی سے قابو کرنا بے حد ضروری تھا۔

صبح کے چار بج رہے تھے۔ شروع میں احاطے میں پانچ چھ مسلح افراد تھے۔ ان کی ڈیوٹیاں بدل رہی تھیں۔ اندر سے کوئی ایک آتا تو اس کی جگہ کوئی دوسرا چلا جاتا تھا اور جانے والا بھی آرام نہیں کرتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صبح چار بجے تک صرف دو افراد باہر تھے اور وہ بھی سست انداز میں عمارت کے سامنے والے حصے میں ٹہل رہے تھے۔ اس وقت ریڈیو پر شکیل کے آنے کا اشارہ ملا۔ میں نے اسے اپنی جگہ رکنے کو کہا اور خود نگران کے ساتھ ٹیلے سے اتر کر شکیل کے پاس پہنچ گیا۔ اس بار جیپ میں چار افراد مزید تھے۔ ایک اور جیپ میں چار افراد سڑک کے پاس تھے۔

نگران کو واپس بھیج کر میں شکیل اور دوسرے افراد کے ہمراہ سڑک تک آیا۔ جہاں دوسری جیپ ایک درختوں کے جھنڈ کے عقب میں چھپی تھی۔ مجھے اور شکیل کو ملا کر کل دس افراد تھے۔ ٹیلے والا نگران ماہر نشانچی تھا اور اس کے پاس دور مار رائفل بھی تھی۔ باقی دو نشانچی اور دو مار رائفلیں شکیل اپنے ساتھ لایا تھا۔ انہیں دوسری پوسٹوں پر بھیج دیا گیا اور ان کے نگران ہمارے ساتھ آ ملے۔ ہم سب کے پاس مختصر فاصلے پر کام کرنے والے ریڈیو سیٹ تھے جن سے منسلک ہیڈ فون اور مائیک ہمارے سر پر چڑھے تھے۔ تمام آلات کی عملی مشق کر لی گئی۔

''ہمیں برقع پوش لڑکیوں والی گاڑی کو روکنا ہوگا۔ لڑکیوں کو اتار کر ان کے برقع چار افراد پہنیں گے۔'' میں نے انہیں بریف کیا۔'' اگر کار ہوئی تو ایک آدمی ڈکی میں چھپے گا۔''

''میری ایک تجویز ہے سر!'' شکیل نے کہا۔''ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ پر ایک لڑکی کو بٹھا دیا جائے۔''
''یہ خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا لیکن کام رسکی ہے۔لڑکی بھاگ بھی دوڑ سکتی ہے اور ایک آدمی بھی کم ہو گا۔ اگر مین گیٹ کے گارڈز کو شک ہو جائے تو اسے فوراً شوٹ کر دیا جائے اور اندر جانے والے تمام افراد کے پاس خاموش پستول ہونے چاہئیں۔اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟''
''سر! سب کے پاس خودکار رائفلیں اور پستول ہیں۔ پہلے اندر جانے والے چار یا پانچ افراد کے لئے خاموش پستول ہیں۔چند دستی بم بھی ہیں۔''
''بم انہیں دو جنہیں استعمال کرنے آتے ہیں، کیا کوئی بے ہوش کرنے والا گیس کا بم نہیں ہے؟''
''سوری سر! اس کا خیال نہیں رہا۔'' شکیل نے معذرت کی۔
''کوئی بات نہیں۔ ایک بات یاد رکھیں، آپ کی جان اور یرغمالیوں کی جان سب سے مقدم ہے۔لہٰذا جیسے ہی کوئی مسلح فرد نظر آئے اسے بلا وارننگ شوٹ کر دیں۔''
''یس سر!'' ان سب نے یک آواز کہا تھا۔
''نگرانوں کی طرف سے اشارہ ملتے ہی ہمیں حرکت میں آ جانا ہو گا۔''
دونوں جیپیں کچے راستے کے ایک ایسے مقام پر چھپا دی گئی تھیں جہاں سے فوری طور پر انہیں حرکت میں لا کر راستہ بلاک کیا جا سکتا تھا۔ احتیاطاً ایک شخص کو سڑک کی طرف بھیج دیا گیا تا کہ کوئی اس طرف آئے تو وہ ہمیں پہلے ہی خبردار کر دے۔ ان سارے کاموں میں پانچ بج گئے۔ وسط ستمبر ہونے کی وجہ سے صبح کے نزدیک موسم کسی قدر سرد ہو جاتا تھا۔ نگران کا کہنا تھا کہ برقع پوش عورتیں عام طور سے صبح چھ، ساڑھے چھ بجے واپس جاتی تھیں۔ یعنی صبح سویرے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاتی تھیں تا کہ سارا دن آرام کر کے آنے والی رات کے لئے تیار ہو سکیں۔
شکیل کھانے پینے کا سامان ساتھ لایا تھا۔ میں نے چند بسکٹ اور کافی لی۔ رات کا کھانا بھی میں نے ہلکا لیا تھا۔ اس وجہ سے مجھے ہلکی سی بھوک لگ رہی تھی اور میں پوری طرح چاق و چوبند تھا۔ وقفے وقفے سے میں کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈال رہا تھا۔ منٹ کی سوئی رفتہ رفتہ بارہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آخر چھ بج گئے۔ صبح کی روشنی نمودار ہو چکی تھی اور اردگرد کے درختوں کے پرندے چہچہاتے ہوئے اپنی روزی کی تلاش میں روانہ ہو رہے تھے۔ ابھی تک نگرانوں میں کسی کی جانب سے اشارہ نہیں ملا تھا اور میرے دل میں خدشات جاگنے لگے تھے ممکن ہے عورتیں زیادہ تھکن کی وجہ سے واپس جانے کے بجائے یہیں رک جائیں، اس صورت میں ہمارا پلان ہی فیل ہو جاتا۔ میں بے تاب ہو کر ٹیلے والے نگران سے بات کرنے جا رہا تھا کہ میرے ائیرفون میں اس کی آواز آئی۔
''سر! عورتیں ایک کار میں سوار ہو رہی ہیں، ان کے ساتھ ایک بوڑھا ڈرائیور ہے۔''
''گڈ......تم ہوشیار رہو اور ٹائمنگ کا خیال رکھنا۔''
''آپ بے فکر رہیں سر!'' اس نے جواب دیا۔
دونوں جیپوں کے ڈرائیور تیار تھے۔ اشارہ ملتے ہی وہ جیپیں لا کر راستہ بند کر دیتے۔ ائیرفون کی آواز آئی۔''کار گیٹ سے نکل رہی ہے۔''
''اس میں ڈکی ہے؟''

''جی سر! خاصی بڑی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ساتھیو، تیار ہو جاؤ۔'' میں نے کہا تھا۔

پرانے ماڈل کی یہ بڑی سی سیاہ کرولا کچے راستے پر ہچکولے کھاتی نمودار ہوئی۔ جیسے ہی وہ ایک خاص فاصلے تک آئی، میرے اشارے، پر جیپ حرکت میں آئی اور اس نے راستہ بلاک کر دیا۔ سیاہ کار رکتے بھی جیپ کے نزدیک جا پہنچی تھی۔ بوڑھے ڈرائیور نے خطرہ بھانپ کر کار کو بیک کرنا چاہا لیکن اس اثنا میں دوسری جیپ جھاڑیوں سے نکل کر اس کی واپسی کا راستہ بھی بند کر چکی تھی۔ آناً فاناً چار مسلح ساتھیوں نے کار کو گھیر کر سب سے پہلے ڈرائیور کو اتار کر کار کے بونٹ پر اوندھا لٹا دیا اور اس کی تلاشی لینے لگے۔ باقی دو افراد نے عورتوں کو نیچے اترنے کو کہا تو وہ چلانے لگیں۔ ''ہم نہیں ... گے۔''

''بکومت!'' ایک عورت کو گھسیٹ کر نیچے اتارا گیا تو باقی خود اتر آئیں۔ ان کے جسم تھر تھرا رہے تھے۔ میں نے حکم دیا۔ ''اپنے برقع اتارو۔ جس نے ایک منٹ سے زیادہ لگایا اسے گولی مار دی جائے گی۔''

''پلیز! ہمیں مت مارو...... ہم نے کیا، کیا ہے؟'' وہ گڑگڑاتے ہوئے برقع اتارنے لگیں۔ منٹ سے بھی پہلے چاروں برقع زمین پر ڈھیر تھے۔ برقعے پردے کے لیے نہیں تھے بلکہ وہ اپنی شناخت چھپانا چاہتی تھیں۔ ایک تو اپنی شرٹ کے بٹن بھی کھول رہی تھی، میں نے سخت لہجے میں اسے روک دیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''انہیں جھاڑیوں میں لے جاؤ اور کوئی آواز نکالیں تو گولی مار دینا۔''

''ہم بالکل نہیں بولیں گے۔'' ایک سترہ اٹھارہ سال کی عورت بولی۔ کمسنی کے باوجود اس میں لڑکیوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ دو افراد انہیں ہنکا کر جھاڑیوں میں لے گئے۔ تین افراد کا انتخاب میں پہلے کر چکا تھا۔ یہ تینوں چھریرے جسم کے مالک تھے۔ مناسب قد کے ساتھ برقع میں ان کی مردانگی چھپی رہ سکتی تھی۔ جس کی آنکھیں خوب صورت تھیں اسے اگلی نشست پر بیٹھنا تھا۔ اس دوران میں جب کہ ہم نے برقع پہنے، شکیل خاص زبان میں عمر رسیدہ ڈرائیور کو سمجھا رہا تھا کہ وہ کوئی غلط حرکت کر کے مقررہ وقت سے پہلے مرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں...... کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ مجھے مت مارنا، میں صرف ڈرائیور ہوں۔''

''اوہ چاچا، شرم کرو، اس عمر میں ان کوٹھے والیوں کی چاکری کر رہے ہو۔'' ایک نے اسے شرم دلائی۔

''چاکری کون حرامی کرتا ہے؟'' وہ بھڑک کر بولا۔ ''یہ سب میری بھانجیاں ہیں۔''

''ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تم صرف ڈرائیور ہو۔'' میں نے اسے گھورا۔ ''شرافت سے کار میں بیٹھو اور یاد رکھنا، میں تمہارے پیچھے ہوں گا، کوئی غلط خیال بھی دل میں آیا تو پیچھے سے دل میں گولی اتار دوں گا۔''

''مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''واپس جہاں سے آئے تھے؟'' میں نے نقاب درست کیا۔

''اوہ نہیں جی!...... میں نہیں جاؤں گا، وہ بہت ظالم ہیں۔''

''ہم بھی کچھ کم ظالم نہیں ہیں۔'' میں نے اسے یقین دلایا اور پستول اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ ''گولی چلا کر دکھاؤں؟''

''نہیں جی...... میں جاؤں گا۔'' اس نے دونوں آنکھوں سے پستول کو دیکھ کر لرزتی آواز میں کہا۔

''گڈ چاچا جی...... اب اندر بیٹھو اور واپس چلو۔'' میں نے اسے کار کے اندر دھکیلا اور ہم چاروں بھی سوار ہو گئے تھے۔ میرے منع کرنے کے باوجود شکیل ڈکی میں لیٹ گیا۔ یہ اندر سے بہ آسانی کھل سکتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بعد میں آنے والی جیپ پر سوار ہو مگر وہ نہیں مانا۔ دوسری جیپ میں چار افراد تھے اور ایک کو لڑکیوں پر نگرانی کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ جیسے ہی کار آگے بڑھی، میں نے ریڈیو پر نگرانوں کو ہوشیار رہنے کو کہا۔ ان کا کام یہ تھا کہ جیسے ہی اندر معرکہ گرم ہو، یہ سامنے آنے والے مسلح افراد کو دور مار رائفل کا نشانہ بنائیں۔ میں درمیان میں تھا کیونکہ میری جسامت باقی تین کی نسبت زیادہ تھی اور مجھ پر شک کیا جا سکتا تھا لیکن شک تو کار کے واپس آنے پر بھی ہو سکتا تھا جیسے جیسے عمارت نزدیک آ رہی تھی، میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ڈرائیور فی الحال تو وہی کر رہا تھا جو میں نے کہا تھا لیکن اندر جا کر اس کا کیا ردِعمل ہوتا یہ ابھی کہنا دشوار تھا۔ کار پھاٹک کے سامنے رکی۔ بوڑھے نے ہلکا سا ہارن دیا۔ میں نے اسے تیز ہارن دینے سے منع کیا تھا تا کہ اندر والے نہ چونکیں۔

''اوئے تُو پھر آ گیا؟'' ایک جاہل لہجے والے شخص نے باہر جھانک کر کہا۔ ''کی گل اے؟''

''ایک بی بی کا ہار اندر رہ گیا ہے۔'' ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا۔ ''وہ لینا ہے۔''

''ہار یا کچھ اور۔'' جاہل شخص فحش انداز میں بولا۔ ''یہ ہار بھولنے والی تو نہیں ہیں۔''

''وقت مت خراب کرو۔ دروازہ کھولو، ابھی واپس بھی جانا ہے۔''

''دروازہ تو اب نہیں کھلے گا۔ جس موہنی کا ہار ہے، وہ پیاں پیاں اندر جا کر لے آئے۔'' وہ چھوٹا گیٹ کھول کے باہر آیا۔ ''اگر وہ نہیں جا سکتی ہے تو بازوؤں میں لے جاتے ہیں۔''

''بکواس مت کرو مجھے میاں صاحب سے شکایت کرنی پڑے گی۔'' بوڑھے نے ناراضی سے کہا۔ ''بی بی، پیدل نہیں جا سکتی۔ رات بھر کی تھکی ہوئی ہے۔''

وہ شخص جاہل ضرور تھا لیکن احمق نہیں...... نزدیک آتے ہی اسے شک ہو گیا تھا اور اس نے اپنے شانے سے لٹکی رائفل کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا۔ میرے برابر میں بیٹھے شخص نے اسے اتنی مہارت سے نشانہ بنایا کہ مجھے بھی آواز آنے تک پتا نہیں چلا کہ اسے کس نے گولی ماری ہے۔ اس کے گرتے ہی ہم تینوں پھرتی سے کار سے اتر آئے تھے۔ مقتول کے گرنے کی آواز نے اس کے ساتھی کو چونکا دیا اور وہ اضطراری طور پر سامنے آیا تھا کہ میرے ساتھی نے اسے بھی جہنم رسید کر دیا۔

''تمہارا نشانہ واقعی لاجواب ہے۔'' میں نے کہا اور دونوں لاشیں گھسیٹ کر گیٹ کے ساتھ ڈالنے کی ہدایت کی اور نگرانی سے پوچھا۔ ''کیا صورتِ حال ہے؟''

''صاف ہے دونوں افراد پھاٹک سے دور ہیں۔ انہیں گیٹ کی صورتِ حال کا علم نہیں ہے۔''

''گڈ!'' میں نے کہا اور پھاٹک سے اندر داخل ہو گیا۔ ڈرائیور کے برابر میں بیٹھے شخص نے اس کے سر پر پستول کا دستہ مار کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ ہم چاروں تیزی سے اندر داخل ہوئے تھے۔ نگران میری راہنمائی کر رہا تھا۔ ''ایک پہرے دار کوٹھریوں والی سمت کی طرف گیا ہے، اب عمارت کے سامنے والے حصے میں آ رہا

ہے۔"

میں نے دو افراد کو اس سے نمٹنے بھیجا اور عمارت کی طرف بڑھا۔ میرے ساتھ شکیل تھا۔ ایک ساتھی دوسرے گارڈ کی طرف بھیجا تھا۔ میں خود اس کھڑکی کی طرف بڑھا جس میں مجھے مونا اور سفیر نظر آئے تھے۔ میں نے کھڑکی سے اندر جھانکا تو مجھے دھچکا لگا، کمرا خالی نظر آ رہا تھا مزید تسلی کے لئے میں نے کھڑکی کے اوپر چڑھ کر اندر دیکھا۔ کمرا واقعی خالی تھا۔ مونا اور سفیر اب وہاں نہیں تھے۔ کیا انہیں کمرے سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا تھا۔ یا پھر اس جگہ سے ہی کہیں اور لے جایا گیا تھا؟...... لیکن نہیں رات بھر میں خود یہاں کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ اس جگہ سے باہر کوئی نہیں گیا تھا۔ مونا اور سفیر کو لازماً عمارت کے اندر ہونا چاہئے تھا۔ گارڈز کی طرف بھیجے جانے والے افراد نے یکے بعد دیگرے انہیں ٹھکانے لگائے جانے کی اطلاع دی تھی۔ نگران نے بھی یہی بتایا کہ اب احاطے میں دشمن کا کوئی مسلح فرد نہیں تھا جو بھی تھے، وہ اندر ہی تھے۔ مزید چار ساتھی عمارت کے احاطے میں آ گئے تھے۔

میں نے برقع اتار پھینکا اور عمارت کے اندر جانے کی راہ تلاش کرنے لگا۔ ایل کے کونے پر مجھے ایک دروازہ نظر آیا لیکن اس کے اندر کنڈی لگی تھی۔ میں نے کنڈی والے حصے پر پستول رکھ کر فائر کیا تو ہلکی سی آواز کے ساتھ کنڈی اڑ گئی۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ میں اندر داخل ہو رہا تھا کہ کوٹھی کی جانب سے کسی نے شاٹ گن کا فائر کیا اور یہ دشمن کا فائر تھا کیونکہ ہم میں سے کسی کے پاس شاٹ گن نہیں تھی۔

"سب ہوشیار ہو جاؤ۔" میں نے مائیک میں کہا۔ یہ اس قسم کا سسٹم تھا کہ ایک بولتا تو سب آواز سنتے تھے کیونکہ ریڈیو کی فریکوئنسی یکساں تھی۔ فائر ہوتے ہی کھلبلی مچ گئی تھی۔ اندر سے چیخنے دھاڑنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں اور شکیل اندر گھسے تھے کہ ایک دروازے سے وہی گھنی مونچھوں والا بدمعاش نمودار ہوا جسے میں نے رات کو دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوفناک سی رائفل تھی لیکن وہ اسے استعمال کرنے کی حسرت لئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ میں نے اور شکیل نے بیک وقت فائر کئے تھے نہ جانے وہ کس کی گولی سے مرا تھا۔ ایک انسان پر فائر کرتے ہوئے میرے ہاتھ لرز گئے تھے لیکن جلد ہی میں نے خود پر قابو پا لیا۔ اب عمارت کے مختلف حصوں سے فائرنگ کی بے تحاشا آوازیں آ رہی تھیں۔ درجن بھر آتشیں ہتھیار ہلاکت برسانے میں مصروف تھے۔ کم سے کم پانچ افراد کے مارے جانے سے دشمن کی نفری میں خاصی کمی آ گئی تھی۔ مگر ان کی تعداد پھر بھی ہم سے زیادہ تھی۔

"شکیل...... مونا اور سفیر کو دیکھو۔" میں نے اس کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا جس سے گھنی مونچھوں والا نکلا تھا۔ اندر وہی سیمیں تن لڑکی بت بنی بیٹھی تھی۔ بت ان معنوں میں بھی کہ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی شے نہیں تھی، میں نے دروازہ کھینچ کر باہر سے بند کر دیا۔ یہ خاصا معقول اور صاف ستھرا حصہ تھا اور یہاں شاید یہی دو افراد تھے لیکن تیسرا دروازہ کھلنے کے بعد مجھے اپنے خیال میں ترمیم کرنا پڑی تھی۔ اس کمرے کے فرش میں خلا تھا جس سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ "شکیل ادھر کوئی تہ خانہ ہے۔" میں نے شکیل کو آگاہ کیا۔

"باہر کیا پوزیشن ہے؟" شکیل نے کسی سے دریافت کیا۔

"چار مزید گرا دیئے ہیں۔ ایل کے بڑے حصے کی طرف سے زیادہ مزاحمت ہے۔" کسی نے جواب دیا۔

"گڈ...... زیادہ مزاحمت ہو تو دستی بم استعمال کرنا۔" شکیل نے حکم دیا اور مجھے دروازے کی نگرانی کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے تہ خانے کی طرف بڑھا۔ اس نے محتاط انداز میں اندر جھانکا اور پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔

اچانک مجھے خیال آیا۔ ''مونا......سفیر کہاں ہو تم؟'' میں نے چلا کر پوچھا۔

''ہم یہاں ہیں۔'' فوراً ہی تہ خانے سے مونا کی آواز آئی۔ ''یہ شخص......'' اس کی آواز یوں رک گئی جیسے کسی نے اس کا منہ دبا دیا ہو۔

''سفیر......!'' میں چلایا......مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں تڑپ کر نیچے کی طرف بھاگا۔ شکیل نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ کئی سیڑھیاں بیک وقت پھلانگتے ہوئے میں نیچے پہنچا تو میری نظر سب سے پہلے کرسی سے بندھے سفیر پر پڑی، اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا اور مونا غائب تھی۔ ''مونا، کہاں ہو تم؟'' میں نے پھر چلا کر کہا۔ تہ خانے میں ایک طرف پیٹیوں کا ڈھیر تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس ڈھیر کے عقب میں کوئی تھا۔ میں رائفل تانے محتاط قدموں سے اس طرف بڑھا۔ اچانک ایک جگہ سے مونا اس طرح سامنے آئی کہ اس کی گردن کسی کے بازو میں دبی تھی اور دوسرے ہاتھ سے ایک چاقو اس کے رخسار کو چھو رہا تھا۔

''کون ہو تم؟ چھوڑ دو اسے۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔

''پیچھے ہٹ جاؤ......ورنہ ہم لڑکی کا گردن اتار دے......'' کسی نے پٹھان لہجے میں اردو بولی اس کا لہجہ مجھے جانا پہچانا لگا۔

''لڑکی کو چھوڑ دو......میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔''

''بکواس مت کرو، پیچھے جاؤ۔'' وہ شخص مونا کو لئے سامنے آیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، اس کے خدوخال میں عمر رسیدگی آ گئی تھی۔ سر کے بکھرے بال اور داڑھی سفید ہو رہی تھی لیکن وہ سو فی صد فتح خان تھا۔

وہ بلاشبہ فتح خان تھا۔ دوسرے لمحے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''تم......شہباز!''

''فتح خان میری پہلے بھی تم سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور اب بھی نہیں ہے۔ لڑکی کو چھوڑ دو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔''

''پہلے بھی میں بے وقوف نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہوں......یہ پستول میری طرف پھینک دو......ورنہ میں مرنے سے پہلے لڑکی کا گلا ضرور کاٹ دوں گا۔'' اس کا لہجہ صاف تھا۔ اتنے عرصے میں یہ بھی ایک تبدیلی آئی تھی لیکن اس کی سفاک فطرت ویسی ہی تھی۔ میں نے ایک نظر سفیر پر ڈالی۔ اس کا ہلتا پیٹ بتا رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔

''تم نے اس کے ساتھ کیا، کیا ہے؟''

''کچھ نہیں......تصویر کا پتا پوچھ رہا تھا۔''

''شوبی! اس نے سفیر پر بہت تشدد کیا ہے۔'' مونا روہانسی آواز میں بولی۔

''فتح خان میں اپنے دوست کے ساتھ کیا جانے والا سلوک بھی بھول جاؤں گا لیکن اسے چھوڑ دو۔ مجھ سے پستول لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ باہر راجا عمر دراز کے درجن بھر مسلح افراد ہیں۔ وہ تمہیں نہیں جانے دیں گے۔ تم یہیں تہ خانے میں چھپ جاؤ۔''

''بکواس مت کرو۔ پستول اِدھر پھینکو۔'' اس نے غرا کر کہا اور چاقو کا بلیڈ مونا کی نازک سی گردن میں دبا دیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''اوکے......اوکے تم مرنا چاہتے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' میں نے پستول اس کی طرف اچھال دیا۔

''یہ رائفل بھی۔'' اس نے میرے شانے پر لٹکی رائفل کی طرف اشارہ کیا۔

بادل نخواستہ میں نے رائفل بھی اس کی طرف پھینک دی۔ جیسے ہی رائفل نیچے گری اس نے مونا کو ایک طرف دھکا دیا اور جھپٹ کر پستول اٹھا لیا اس کا رخ میری طرف کرتے ہوئے اس نے رائفل بھی اٹھالی تھی

''اتنے عرصے بعد تمہیں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب میں اپنی قسم پوری کر سکوں گا۔'' اس نے پستول میری طرف کیا تھا۔

''ایک منٹ، کیسی قسم؟''

''جب تم ایمن کو لے کر بھاگ گئے تھے تو میں نے قسم کھائی تھی کہ تمہیں قتل کر دوں گا۔''

فتح خان ایک بار پھر موت کے روپ میں سامنے آیا تھا۔ ''چلو مجھے مار دیا تب اوپر والوں سے کیسے لو گے۔'' وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔

''چلو آج نہیں میں پھر کبھی اپنی قسم پوری کروں گا۔ ابھی تم مجھے اس جگہ سے باہر نکالو اگر کسی نے روکا تو سب سے پہلے تم دونوں مرے گا۔''

''میں اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''راجا عمر دراز کے آدمیوں کے لئے تم زیادہ ضروری شخص ہو۔ صرف میری وجہ سے وہ تمہیں جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔''

''بکومت اوپر چلو۔'' اس نے رائفل سے اوپر اشارہ کیا۔ میں اور مونا ایک ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ میں نے اسے سہارا نہ دے رکھا ہوتا تو وہ شاید گر جاتی۔ اس کا بدن بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔ فتح خان ہمارے پیچھے تھا۔ پہلے میں کمرے میں نکلا اور اسے خالی دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی تھی میرا خیال تھا کہ شکیل کہیں گھات لگائے بیٹھا ہوگا اور دھوکے سے فتح خان کو قابو کر لے گا لیکن وہ شاید باہر چلا گیا تھا۔ فتح خان ہمارے عقب میں کسی چوکنے بھیڑیے کی طرح باہر آیا تھا۔ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ابھی باہر جانے کے لئے جانے تمہیں ایسے کتنے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔''

''تم باہر جا کر گاڑی دروازے کے سامنے لاؤ گے۔'' اس نے میری بات نظر انداز کر کے کہا۔ ''یاد رکھنا پانچ منٹ سے اوپر ہوئے تو میں اس لڑکی کو گولی مار دوں گا۔''

''کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے ریڈیو کے بٹن پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''آل ٹیک اوور سر۔'' کسی نے جواب دیا۔ ''جب ہم اوپر آئے تو فائرنگ رک چکی تھی۔''

''میرے ساتھ لوگ عمارت پر پوری طرح قابض ہو چکے ہیں۔'' میں نے فتح خان کو آگاہ کیا۔

''تمہارے پاس چار منٹ رہ گئے ہیں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور رائفل کا رخ مونا کی طرف کر دیا۔

''اوکے......'' میں نے کہا۔ ''لیکن ہماری گاڑیاں عمارت سے باہر اور دور ہیں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ احاطے میں ایک پجیرو کھڑی ہے وہ میری ہے۔ یہ لو اس کی چابی۔'' اس نے چابی میری طرف اچھال دی۔ ''اب تین منٹ ہیں۔''

''مجھ پر بلاوجہ کا دباؤ مت ڈالو۔ ابھی مجھے ان لوگوں کو بھی سمجھانا ہے ان کی اجازت کے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا ہوں۔''

''یہ سب مجھے نہیں معلوم......بس اتنا یاد رکھنا مقابلے کا موقع آیا تو میں اکیلا نہیں مروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں جانے کے لئے مڑا تھا کہ عقب سے عجیب سی آواز آئی جیسے کسی نے ریت کی بوری پر مکا مارا ہو میں بوکھلا کر پلٹا تو فتح خان زمین پر گرتا نظر آیا، اس کے عقب میں شکیل گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فتح خان منہ کے بل گر کر ساکت ہو گیا اس کے سر کے عقبی حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ میں کچھ دیر کے لئے دم بخود رہ گیا تھا۔ ''تم کہاں سے نازل ہوئے؟''

''اوپر سے۔'' اس نے مسکرا کر اوپر کی طرف اشارہ کیا تب میں نے دیکھا کہ چھت کے ساتھ ایک چھجا سا سامان رکھنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ اپنے سفید رنگ کی وجہ سے وہ چھت کے ہم رنگ ہو رہا تھا اس وجہ سے غور سے دیکھے بغیر نظر نہیں آ رہا تھا۔ فتح خان کے سر پر شکیل نے پستول کا دستہ مارا تھا اور وہ بے ہوش تھا۔ میں اور مونا بیک وقت تہ خانے کی طرف لپکے۔ اچانک مجھے خیال آیا میں نے رک کر شکیل سے کہا۔ ''اس کا خاص خیال رکھنا یہ راجا عمر دراز کا مجرم ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ آپ کا مرد ساتھی کہاں ہے؟''

''تہ خانے میں......دو افراد کو بھجواؤ شاید اسے طبی امداد کی ضرورت ہے۔''

جب تک میں نیچے پہنچا مونا سفیر کی رسیاں کھول چکی تھی میں نے اسے سنبھال کر نیچے لٹایا۔ سفیر کے پیروں اور جسم پر تشدد کے نشان نمایاں تھے میں نے اس کی نبض چیک کی۔ وہ کسی قدر سُستی کے ساتھ مگر باقاعدگی سے دھڑک رہی تھی۔ میں نے مونا سے پانی مانگا اور سفیر کے گال تھپتھپانے لگا۔ مونا کہیں سے پانی لے آئی۔ میں نے پانی اس کے منہ پر چھڑکا، چند قطرے منہ میں ٹپکائے۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ وہ ہلنے جلنے لگا تھا اسی دوران میں ایک فرد نیچے آیا یہ ٹیم کا طبی امداد کا ماہر بھی تھا اس نے سفیر کا معائنہ کیا اور بتایا کہ زخم معمولی نوعیت کے ہیں ان کی مرہم پٹی بعد میں کی جا سکتی ہے۔ پھر اس نے ایک بوتل اپنی جیکٹ سے نکالی اور اسے کھول کر اسے سفیر کی ناک میں لگا دیا۔

''یہ امونیا ہے اس سے یہ جلدی ہوش میں آ جائیں گے۔''

واقعی امونیا سنگھانے کے ایک منٹ کے اندر اندر سفیر ہوش میں آ گیا۔ آنکھیں کھول کر وہ چند لمحے کے لئے خلا میں گھورتا رہا۔ جیسے ہی میں اس کی طرف جھکا وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ''شوبی...... میرے یار......میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں سفی......میری جان میں آ گیا ہوں۔ اب تُو آزاد ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر پیار کیا۔

''جلدی سے اٹھ جا ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

''وہ منحوس شخص کہاں ہے؟'' اس نے چاروں طرف دیکھا۔

''فتح خان......وہ ہمارے قبضے میں ہے اس سے تیرے ایک ایک زخم کا حساب لوں گا۔''

سفیر دنگ رہ گیا تھا ''فتح خان تھا......وہی......''

''ہاں وہی خبیث...... میں اسے دیکھ کر خود حیران رہ گیا تھا۔'' میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ میرا صحیح سالم ہاتھ دیکھ کر سفیر کی آنکھیں ایک بار پھر پھیل گئی تھیں۔

''شوبی تیرا ہاتھ......''

''اس کی کہانی بھی بعد میں سنا دوں گا۔ اب یہاں سے نکلنا ہے اس سے پہلے کہ کوئی اور مصیبت نازل ہو جائے۔'' میں اور مونا سہارا دے کر سفیر کو تہ خانے سے باہر لائے تھے۔ شکیل نے گاڑیاں پہلے ہی نکلوا دی تھیں جو لوگ زندہ بچے تھے انہیں نہتا کر کے ایک کمرے میں بند کیا جا چکا تھا۔ ہم باہر نکلے تو کھلے گیٹ سے ہماری دونوں جیپیں دندناتی ہوئی اندر آئی تھیں۔ میں نے نگرانوں کو بھی چلنے کا حکم دیا۔ احاطے میں کھڑی ایک گاڑی منتخب کی گئی کیونکہ افراد زیادہ تھے اور دو جیپوں میں نہیں آ سکتے تھے۔ البتہ سارا اسلحہ اپنے ساتھ رکھا گیا تھا۔ اب لوگوں کو حکم دیا گیا کہ کار کسی جگہ چھوڑ کر ٹیکسی میں کوٹھی تک آئیں۔

راستے میں شکیل نے موبائل فون پر وسیم کو آپریشن کی کامیابی کی اطلاع دی۔ فتح خان کے بارے میں بتایا تو کچھ دیر بعد راجا عمر دراز کا خود فون آ گیا تھا۔ شکیل نے اس سے بات کی اور موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ راجا کی اضطراری آواز آئی۔ ''شہباز کیا تمہیں یقین ہے...... وہ فتح خان ہی ہے۔''

''سو فی صد راجا صاحب...... اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔''

''شہباز اسے پوری احتیاط سے لانا۔ میں نے اس کی تلاش میں سارا شمالی علاقہ چھنوا دیا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ یہاں چھپا بیٹھا ہوگا۔''

''راجا صاحب اس کا اس کوٹھی میں پایا جانا کسی بڑے ہنگامے کا پیش خیمہ ہے۔ مرشد علی سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے عین ممکن ہے اسے ڈیوڈ شا نے ہائر کیا ہو۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' راجا عمر دراز پُر جوش لہجے میں بولا۔ ''فتح خان شروع سے میرے دشمنوں سے ملا ہوا ہے۔ میں اسے عبرت کا نشان بنا دوں گا۔''

''آپ بے فکر رہیں راجا صاحب۔ یہ چند لمحے بعد آپ کے قدموں میں ہوگا۔'' میں نے کہا اور موبائل بند کیا تھا کہ عقب سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔

''جیپ روکو...... حرامزادہ کود گیا ہے۔''

میں نے مڑ کر دیکھا فتح خان جیپ کے عقبی حصے میں پڑا ہوا تھا اور اس پر ایک ترپال ڈال دی گئی تھی۔ نہ جانے کس وقت ہوش میں آ کر اس نے پہلے سے جیپ کا عقبی دروازہ کھولا اور نیچے کود گیا۔ جب تک جیپ رکتی اور ہم اس کے پیچھے جاتے وہ لنگڑاتا ہوا ہائی وے کے ساتھ جھاڑیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ میں جیپ سے اترتے ہوئے چلایا۔ ''پیچھا کرو اس کا، نکل کر جانے نہ پائے۔''

فتح خان کے اچانک کودنے سے عقب میں آنے والی نئی نویلی دلہن جیسی کار اسے بچانے کی کوشش میں سڑک سے اتر کر درخت سے جا ٹکرائی تھی۔ اسے چلانے والا نوجوان تصادم کے بعد سنبھل کر باہر آ رہا تھا۔ شکیل کے چار ساتھی جیپوں سے اتر کر فتح خان کے پیچھے بھاگے تھے۔ کار والا نوجوان بھنایا ہوا میرے پاس آیا۔ ''یہ کیا حرکت تھی...... کون تھا وہ پاگل کا بچہ۔''

"پاگل ہی ہے بھائی۔" میں نے مغموم لہجے میں کہا۔ میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ فتح خان کے بارے میں کیا کہنا ہے۔ "ہمارا سب سے بڑا بھائی ہے، اسے دورے پڑ رہے ہیں بچپن سے...... اسلام آباد کے ایک اسپتال سے لے کر آ رہے ہیں۔"

"پاگل ہے تو اسے باندھ کر رکھنا تھا۔" نوجوان تلخی سے بولا۔ "میری نئی کار کا بیڑا غرق کر دیا۔"

"مجھے افسوس ہے۔ تمہارا جو نقصان ہوا ہے پورا ہو جائے گا۔" میں نے کہا اور اسے ندیم کا نمبر دیا۔ "یہ میرا وکیل ہے ندیم بھٹی...... اس سے رابطہ کرنا اور مرمت کا بل بھجوا دینا۔"

نوجوان چونکا۔ "آپ ندیم بھائی کے کلائنٹ ہیں۔"

"ندیم بھائی!" میں چونکا۔ "تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"وہ میرے بہنوئی ہیں، ان کی بیوی کزن ہیں میری۔"

"شازیہ تمہاری کزن ہے۔" میں نے جان بوجھ کر ندیم کی بیوی کا نام لیا تا کہ اسے یقین ہو جائے۔ "یہ تو اچھی بات ہے، ورنہ ندیم اتنی آسانی سے معاملہ نہیں کرتا۔"

"اب آپ شرمندہ نہ کریں۔ آپ ندیم بھائی کے کلائنٹ ہیں۔ ویسے بھی کار انشورڈ ہے۔ انشورنس والے اسے ٹھیک کرا دیں گے۔"

خوش قسمتی سے اس کی کار کا زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ میں اسے کار تک لایا اور...... رخصت کر دیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ فتح خان کو اس کے سامنے پکڑ کر لایا یا تو وہ مشکوک ہو جائے گا۔ مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ چار کے بعد مزید چار افراد گئے تھے۔ وہ نصف گھنٹے تک جھاڑیوں میں فتح خان کو تلاش کرتے رہے تھے۔ لیکن وہ گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ نصف گھنٹے تک ایک ایک جھاڑی دیکھنے کے بعد فتح خان کے بارے میں یقین ہو گیا کہ وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اسے جیپ میں ڈالنے والوں سے یہ غلطی ہو گئی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے گئے ورنہ وہ اتنی آسانی سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کی پھرتی اور غائب ہونے میں اتنی تیزی پر رشک آیا تھا۔ فتح خان چالیس سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ اس کے ستے چہرے اور بھاری پپوٹوں سے لگتا تھا کہ وہ سست اور کاہل انسان ہے۔ وہ ایک بار پہلے بھی مجھے اسی طرح حیران کر چکا تھا۔ شکیل ان لوگوں پر برس رہا تھا جنہوں نے فتح خان کو جیپ میں ڈالا تھا میں نے اسے روکا۔ "بس کرو یار...... باقی کارروائی کوٹھی جا کر کر لینا...... کہیں پولیس یا کوئی اور مصیبت نازل نہ ہو جائے۔"

قدرت شاید منتظر تھی کہ ادھر میرے منہ سے الفاظ نکلیں اور ادھر مصیبت نازل ہو جائے۔ سامنے سے ایک موٹر سائیکل سوار آ رہا تھا۔ اس کے نزدیک آنے پر میں جلدی سے جیپ کی آڑ میں ہو گیا وہ انسپکٹر اکرم چشتی تھا۔ جو نہ جانے کہاں سے آ رہا تھا اس کے جسم پر پوری وردی تھی جب کہ اسے معطل کیا جا چکا تھا یہ اس کی لاقانونیت کی ایک مثال تھی کہ معطل ہو جانے کے باوجود وہ فورس کی وردی پہن کر گھوم رہا تھا، اوپر سے وہ جیپ کے پاس آ کر رک گیا۔ مجھے اس کی شکی آواز آئی۔ "کیا بات ہے، کون ہو تم لوگ...... یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

"ہمارا کتا جیپ سے کود کر جھاڑیوں میں گھس گیا ہے اسے تلاش کر رہے ہیں۔" شکیل کی آواز آئی۔

"کتا کہاں ہے؟" اکرم چشتی نے اگلا سوال کیا۔

''نہیں ملا۔'' شکیل نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ''بہت شرارتی ہے اب بھگتے گا جب خود گھر آئے گا۔''
''اچھا...... اچھا!'' اکرم چشتی نے کہا اور موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔
''یہ خبیث کہاں سے آ گیا تھا؟'' میں نے شکیل سے کہا۔ ''یہ انسپکٹر چشتی ہے میرا بدترین دشمن۔''
''اچھا آپ پہلے بتاتے اسے ادھر ہی لٹا دیتے۔''
''نہیں، میں بلاوجہ کے کشت وخون کا قائل نہیں ہوں۔''

سفیر اور مونا نے بھی اکرم چشتی کو دیکھتے ہی اپنے سر نیچے کر لئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اکرم چشتی انہیں جانتا تھا شاید مرشد علی کی قید میں ان سے ملاقات کر چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد انہوں نے سر اوپر کئے۔ سفیر نڈھال ہو رہا تھا۔ اس نے گزشتہ رات کٹھن وقت گزارا تھا۔ میں جلد از جلد اسے طبی امداد اور آرام پہنچانا چاہتا تھا اس لئے چار آدمی فتح خان کی تلاش میں چھوڑ کر باقی لوگوں کے ہمراہ روانہ ہوا۔ ان چاروں کے لئے جیپ ڈرائیور سمیت وہیں چھوڑ دی تھی۔ نصف گھنٹے بعد ہم کوٹھی میں داخل ہوئے تو راجا عمر دراز کوٹھی کے سامنے والے حصے میں صبح کی دھوپ سینکتا نظر آیا۔ میں نے سفیر اور مونا کو اندر پہنچانے کی ہدایت کی اور خود راجا کی طرف بڑھا وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔

''مبارک ہو شہباز تم نے اپنے ساتھیوں کو چھڑا کر کارنامہ انجام دیا ہے۔ فتح خان کہاں ہے؟''
''مجھے افسوس ہے راجا صاحب...... ذراسی غفلت سے وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔''
''فرار ہو گیا۔'' راجا کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ''کیسے؟''

میں نے اسے تفصیل سے فتح خان کے ملنے اور فرار ہونے کی کہانی سنائی۔ ''ان لوگوں سے ذراسی غفلت ہو گئی کہ اس کے ہاتھ پیر نہیں باندھے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ نکل گیا۔''

''لعنت ہو۔'' راجا عمر دراز برافروختہ تھا میں نے کبھی اسے اس طرح جذباتی نہیں دیکھا تھا۔ ''شہباز تم نہیں جانتے اس کا نکل جانا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔''

''مجھے اندازہ ہے راجا صاحب...... سات آٹھ سال پہلے کتنی بار میرا اس سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ وہ تو خدا نے بچایا ورنہ فتح خان مجھے مار چکا ہوتا۔ اب بھی اس نے مجھے قتل کرنے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔''
''فتح خان کے پیچھے آدمی بھیجے ہیں۔''

''ہاں چار آدمی اور گاڑی وہیں چھوڑ آئے ہیں۔ وہ اس علاقے میں فتح خان کو تلاش کر رہے ہیں ممکن ہے وہ پکڑ لیا جائے۔''

''مشکل ہے۔'' راجا عمر دراز مایوسی سے بولا۔ ''وہ بے حد چالاک شخص ہے ایک بار نکل جانے کے بعد اس کا ہاتھ آنا محال ہے۔''

مجھے یاد تھا کہ راجا کے محل میں فتح خان کیسے دندناتا پھرتا تھا۔ جب کہ راجا کے آدمی اسے چاروں طرف تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ میں تھکا ہوا اور بھوکا تھا۔ راجا سے اجازت لے کر اندر آیا۔ انیکسی میں ڈاکٹر نے سفیر کی مرہم پٹی کر دی تھی۔ مونا منہ، ہاتھ دھو کر فریش نظر آ رہی تھی۔ ناشتے کا کہہ دیا تھا اس وقت تک ان کے لئے کافی مہیا کر دی گئی تھی۔ ان کے چہروں کی رونق بحال ہو گئی تھی۔ میں ان کے بارے میں جاننے کے لئے جتنا

بے تاب تھا اس سے زیادہ وہ مجھے اپنی کہانی سنانے کے لئے بے چین تھے لیکن اس وقت خادم نے ناشتا ملنے کی جان فزا خبر سنائی لہٰذا ہم انیکسی کے مختصر ڈائننگ روم میں آئے میں نے ان سے کہا۔ ''تم دونوں ناشتا کر کے آرام کرو۔ جب اٹھو گے تب بات کریں گے۔''

مگر مونا کے پیٹ میں خواتین کی روایت کے مطابق درد ہو رہا تھا۔ ناشتے کے دوران وہ چھوٹے چھوٹے واقعات سناتی رہی اور میں سنتا رہا۔ سفیر نے برائے نام ناشتا کیا وہ جین کلر کے زیر اثر غنودگی محسوس کر رہا تھا۔ درمیان میں معذرت کر کے اٹھ گیا۔ انیکسی کے دو کمرے ان کے لئے کھول دیئے گئے تھے البتہ مونا میرا پیچھا چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ناشتے سے زیادہ اس کا زور باتوں پر تھا۔ ناشتے کے بعد میں چائے لے کر اٹھ گیا کیونکہ حکیم قادس کمرے میں میرا انتظار کر رہا تھا اسے میرے ہاتھ کی مالش کرنا تھی مونا نے اسے دلچسپی سے دیکھا اور انگریزی میں بولی۔ ''یہ کیا نمونہ ہے؟''

''اردو میں بات کرو ممکن ہے اسے انگریزی آتی ہو۔'' میں نے اپنا ہاتھ شاہی حکیم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''شوبی تمہاری تو کلائی ٹوٹ گئی تھی پھر اتنی جلدی......''

''یہ اس حکیم کا کمال ہے صرف کلائی نہیں ٹوٹی تھی بلکہ ہاتھ کاٹنے کی تیاری کی جا رہی تھی کہ یہ لوگ مجھے اٹھا کر لے آئے۔'' میں نے مونا کو اس معجزہ اثر مرہم کے بارے میں بتایا۔ وہ منہ کھولے سن رہی تھی۔

''ناممکن، ہڈی کم سے کم چار پانچ مہینے میں جڑتی ہے اور تمہارا تو کمپاؤنڈ فریکچر تھا۔''

''یقین تو مجھے بھی نہیں تھا لیکن امید ضرور تھی کیونکہ ایک بار پہلے بھی میں اس جادوئی مرہم کی کارگزاری دیکھ چکا تھا۔

مونا نے غور سے میرا ہاتھ دیکھا۔ ''جب میں نے اسے اسپتال میں دیکھا تھا تو یہ بالکل نیلا اور سوجا ہوا تھا، اب اس کی رنگت نارمل ہو گئی ہے۔''

''خدا کے بعد یہی شخص اس کا ذمے دار ہے جسے تم نمونہ قرار دے رہی ہو۔''

میرا سر نیند سے بوجھل ہو رہا تھا۔ اب مونا جماہیاں لے رہی تھی میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ جا کر کمرے میں سو جائے، کوئی بھی مسئلہ ہو یا ضرورت ہو تو بلا تکلف کسی ملازم سے کہہ دینا۔ ''شوبی یہ اس راجا عمر دراز کی کوٹھی ہے جو......''

''ہاں بابا، یہ اسی راجا عمر دراز کی کوٹھی ہے جاؤ، جا کر سو جاؤ۔''

اس کے جانے کے بعد حکیم نے مالش مکمل کر کے مجھے گولیاں کھلائیں اس کا کہنا تھا کہ ان گولیوں کا کچھ عرصے تک استعمال ضروری تھا تا کہ ہاتھ اپنی پوری توانائی حاصل کر سکے۔ اس کے جانے کے بعد میں ہاتھ پر ایک گرم پٹی لپیٹ کر لیٹ گیا اور چند منٹ میں گہری نیند سو چکا تھا۔ پھر میری آنکھ شام چار بجے کھلی۔ کسل مندی دور کرنے کے لئے میں نے غسل کیا اور جب کمرے میں آیا تو مونا ٹی وی لگائے بیٹھی تھی۔ ''تم کب اٹھیں؟''

''میں تو تین بجے اٹھ گئی تھی، زور کی بھوک لگی تھی نہا کر کھانا کھایا۔ سفیر ابھی تک سو رہا ہے اس لئے تمہاری طرف چلی آئی۔''

مجھے بھی شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ کچن کال کر کے اپنے لئے کھانا اور مونا کے لئے چائے منگوالی۔
''ہاں، اب بتاؤ تم لوگوں پر کیا گزری؟''
''وہ لوگ شاید پہلے ہی ہماری تاک میں تھے جیسے ہی ہم اسپتال کی عقبی گلی میں پہنچے، نیچے چار مسلح لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ سفیر ان سے بھڑ گیا تھا لیکن ایک نے اس کے سر پر کچھ مارا وہ گر گیا تھا۔ میں نے چیخ مارنے کی کوشش کی لیکن میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گیا اور اس طرح ہمیں پاس کھڑی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ بڑی سی وین کا پچھلا حصہ تھا جو چاروں طرف سے بند تھا میرے منہ پر ہاتھ رکھنے والے نے کہا کہ اب میں جتنا چاہوں شور کر سکتی ہوں۔ اس وین سے آواز باہر نہیں جا سکتی۔ سفیر کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیئے گئے اور مجھے اس سے دور بٹھا دیا گیا۔ سارے راستے وہ فضول قسم کی بکواس کرتے رہے تھے۔'' یہ بتاتے ہوئے مونا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
''مونا تمہارے ساتھ کسی قسم کی زیادتی تو نہیں ہوئی۔''
''نہیں...... جسمانی طور پر نہیں...... لیکن ذہنی طور پر......'' وہ اچانک پھوٹ کر رو دی تھی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
''پگلی روتی کیوں ہے۔ اب تو محفوظ ہے۔''
''ان دنوں میں نے بے حد اذیت سہی ہے۔ انسان اس قدر غلیظ بھی ہو سکتا ہے۔''
''یہ انسان کہاں ہیں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''یہ حیوان ہیں نفس پرست درندے۔''
''خاص طور سے ایک شاما نامی بندا بہت خبیث تھا۔'' مونا نے بتایا۔ ''گھنی مونچھوں والے اس شخص کے دماغ میں دنیا جہاں کی گند تھی۔''
''خوش ہو جاؤ...... وہ اپنی ساری گند سمیت میرے ہاتھوں جہنم رسید ہو چکا ہے۔''
اس کا چہرہ جگمگا اٹھا تھا۔ ''سچ......! اس نے ایک بار سفیر کو بھی مارا تھا اس نے غصے میں آ کر اسے گالیاں دیں تھیں۔''
''تم لوگوں کو اور کہاں لے جایا گیا تھا؟''
''اور کہاں لے جاتے...... ہم تو شروع سے اسی عمارت میں تھے۔ ہمیں پہلے اوپری کمروں میں رکھا گیا تھا مگر ایک رات فائرنگ کے بعد ہمیں رات کے وقت نیچے ایک تہ خانے میں رکھا جاتا تھا۔ البتہ صبح اوپر لے آتے تھے۔ ایک بار مرشد علی آیا تھا وہ ہم سے تصویر اور تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا ہمیں حیرت ہوئی اس نے بتایا کہ اسپتال سے غائب ہو اور ندیم نے اس پر الزام لگایا ہے۔ وہ بے حد غصے میں تھا خاص طور سے اپنے بھائی کے حوالے سے دھمکیاں دے رہا تھا کہ اس کے بھائی کے ساتھ جو ہوا اس کا خمیازہ خاص طور سے مجھے بھگتنا پڑے گا۔''
''مجھے اس کی نیت کا اندازہ تھا۔ جب تک تصویر میرے پاس تھی وہ تم لوگوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ یہ بتاؤ کہ وہاں کوئی ڈیوڈ شا نامی گورا آیا تھا۔''
''نام تو نہیں پتا لیکن اس فتح خان کے ساتھ ایک برطانوی آیا تھا۔ چھوٹے قد کا اور بھاری جسم کا شخص، یقین کرو شوبی، اس کی آنکھیں ایکسرے کی طرح اندر تک اتر جاتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہمارے ذہن پڑھ رہا ہو۔ مرشد علی اس کے سامنے پالتو کتے کی طرح دُم ہلا رہا تھا اس نے ہم سے تصویر کے بارے میں پوچھا تھا

ہمارے جواب سن کر مرشد علی سے کہا یہ سچ کہہ رہے ہیں اس کی وجہ سے ہمارے ساتھ بہتر سلوک ہونے لگا تھا۔ خاص طور سے ان لوگوں کی بدزبانیاں کم ہوگئی تھیں اس نے مرشد علی کو حکم دیا تھا کہ ہمیں آرام سے رکھے۔''

''ڈیوڈ شا نہایت خطرناک آدمی ہے۔ یہ برٹ شا کا کزن ہے اور تصویر کے چکر میں یہاں آیا ہے ورنہ مرشد علی جیسے جاہل جاگیردار کو تصویر سے بھلا کیا دلچسپی ہوسکتی ہے!''

''اس تصویر میں ایسی کیا خاص بات ہے جو اتنے لوگ اس کے پیچھے دیوانے ہیں۔''

''کم سے کم مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ کسی معروف مصور کی بھی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا سرے سے کوئی مقام نہیں ہے۔''

''کیا میں اس تصویر کو دیکھ سکتی ہوں۔''

''ہاں...... جب میں راجا عمر دراز کے حوالے کروں گا تب دیکھنا۔''

''تصویر کہاں ہے؟''

''ندیم کے پاس...... میں نے خوش قسمتی سے اس کے حوالے کردی تھی ورنہ اس رات کا میج پر حملہ کر کے مجھے اغوا کرلیا گیا تھا۔ حملہ آور تصویر بھی لے جاتے اور اب تک میں قصۂ پارینہ بن چکا ہوتا۔''

خدا نہ کرے۔'' مونا بے اختیار بولی۔

میں نے سر ہلایا۔ ''اگر تصویر مرشد علی کے ہاتھ لگ جاتی تو تم میرا انجام سوچ سکتی ہو۔ صرف تصویر کے حصول کے لئے اس نے مجھ سے نرم رویہ رکھا۔''

''تمہاری کلائی توڑ دی تھی۔'' مونا نے یاد دلایا۔

''وہ نادر علی کی بدمعاشی تھی۔ میرا اندازہ ہے مرشد علی کو اس کی خبر نہیں تھی۔''

''وہ بہت کمینہ شخص ہے، مجھے یقین ہے اسے خبر تھی بلکہ اس نے نادر علی کو تمہارے ساتھ ایسا سلوک کرنے کو کہا ہوگا۔''

''پھر بھی تصویر کی وجہ سے وہ اپنے اصل عزائم پر عمل نہیں کرسکا تھا۔''

اس دوران میں کھانا آ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم سفیر کے کمرے میں آئے۔ وہ جاگ گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر مسکرایا۔ ''بیٹے عیش ہیں تمہارے۔''

''تُو بھی کرلے۔'' میں ہنسا۔ ''بھوک لگ رہی ہے۔''

''زبردست قسم کی۔'' اس نے کہا۔ مونا نے انٹرکام پر سفیر کے لئے کھانا منگوایا۔ میں نے ملازم سے کہہ کر موبائل فون منگوایا۔ وہ کارڈلیس اٹھا لایا۔ میں نے ندیم کا نمبر ملایا۔ وہ دفتر میں نہیں تھا اور گھر بھی نہیں پہنچا تھا اس لئے موبائل پر ٹرائی کیا۔ بیل جاتی رہی خاصی دیر بعد اس نے کال ریسیو کی۔

''ندیم کیا حال ہیں؟ کال کیوں نہیں ریسیو کر رہا تھا؟''

''ٹریفک میں پھنسا ہوں۔'' ندیم نے محتاط اور بے جان انداز میں کہا۔

''ابھی کہاں ہو؟''

''میں...... باہر ہوں۔'' اس نے اسی انداز میں کہا۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ اگر وہ سفر کر رہا تھا تو

ٹریفک کا شور ضرور سنائی دیتا۔

''ندیم کیا چکر ہے کوئی مسئلہ ہے۔''

''نہیں کوئی مسئلہ نہیں۔'' ندیم بولا اور میرے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔

''کیا گھر جا رہے ہو؟''

''نہیں ایک اور جگہ...... مگر دیر سے پہنچوں گا۔'' اس نے کہا اور کال ختم کر دی۔

سفیر غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''یار کوئی چکر ہے، ندیم بہت اکھڑے اکھڑے انداز میں بات کر رہا تھا۔ دوسرے اس نے غلط بیانی کی کہ وہ ٹریفک میں پھنسا ہے جب کہ پیچھے مکمل خاموشی تھی۔''

ہم تینوں کے ذہن میں ایک بات آئی تھی۔ پہل مونا نے کی۔ ''شوبی...... کہیں ندیم کو بھی تو......''

''وہ کھلا ہدف تھا۔'' سفیر بولا۔ ''تصویر بھی اس کے پاس ہے۔''

''میرے خدا۔'' میں اچھل پڑا تھا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

میں تیزی سے باہر نکلا اور وسیم کے پاس آیا۔ ''خیریت شہباز صاحب؟'' اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اسے صورتِ حال بتائی۔ ''ہمیں فوری طور پر ندیم کے گھر پہنچ کر وہ تصویر حاصل کرنی ہے۔ اس سے پہلے کوئی اور یہ کام کر جائے۔''

وسیم نے فوری طور پر شکیل کو بلا کر اسے میرے ساتھ جانے کی ہدایت کی اور پھر موبائل پر ان لوگوں سے رابطہ کیا جو ندیم کے گھر کی حفاظت پر مامور تھے۔ انہوں نے بتایا کہ فی الحال سب ٹھیک تھا۔ پھر وسیم نے اس شخص سے رابطے کی کوشش کی جو بطور محافظ ندیم کے ساتھ ہوتا تھا لیکن اس کی جانب سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ اس سے ہمارے شک کی تصدیق ہوتی تھی۔ شکیل مزید دو لڑکوں کے ساتھ مکمل طور پر تیار ہو کر آیا۔ میں جیپ کی عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ میں بہر حال ایک مفرور ملزم تھا اور پولیس کو میری تلاش تھی۔ میں کھلے عام نہیں پھر سکتا تھا۔ میں نے ایک پی کیپ پہن لی تھی اور سن گلاسز لگا لئے تھے اس سے میرا چہرہ خاصی حد تک چھپ گیا تھا۔

جیپ برق رفتاری سے اسلام آباد کی سڑکوں سے گزرتی ندیم کے گھر کی طرف رواں دواں تھی۔ مری ہائی وے پر آتے ہی ڈرائیور نے رفتار مزید تیز کر دی تھی۔ پندرہ منٹ بعد ہم ندیم کے گھر کے سامنے تھے اب وسیم کے آدمی اس کے بنگلے کے اندر رہا کرتے تھے۔ جیپ دیکھتے ہی انہوں نے گیٹ کھول دیا تھا۔ جیسے ہی شکیل جیپ سے نکلا گیٹ کھولنے والے نے رپورٹ دی، سر ایک مشکوک سفید کار کئی بار بنگلے کے سامنے سے گزری ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ اس میں بیٹھے چار افراد مسلح ہیں۔''

میں اندر کی طرف بڑھا۔ یہاں ندیم کی بیوی شازیہ اپنے لخت جگروں کو باالفاظ دیگر خطاب کر رہی تھی۔ انہوں نے اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھل گئی۔ ''ارے بھیا اتنے دن بعد دکھائی دیئے...... کہاں تھے...... ندیم تمہارے بارے میں پریشان تھے...... کم بختو آرام سے بیٹھو۔''

''بھابی سب خیریت ہے میں تھوڑے وقت کے لئے آیا ہوں۔''

''ارے نہیں...... تم کھانا کھا کر......''

''بھابی...... فی الحال میں یہاں نہیں رک سکتا۔ پولیس میری تلاش میں ہے۔ اگر رکا تو شاید رات کا کھانا حوالات میں کھانا پڑے۔''

اچھا میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں۔ مونا اور سفیر کا کچھ پتا چلا۔''

''ہاں وہ میرے ساتھ ہیں۔''

''اے بھیا...... اب انہیں ٹھکانے لگا دو۔''

''ضرور، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں مگر ابھی میں وہ تصویر لینے آیا ہوں جو میں نے ندیم کے پاس رکھوائی تھی۔''

''کیسی تصویر؟''

''کوئی دس بارہ دن پہلے ندیم پلاسٹک میں لپٹا ایک رول لایا ہوگا۔''

''ہاں...... لائے تو تھے۔ شاید الماری میں رکھا ہے۔ میں چائے لا کر دیکھتی ہوں۔''

''بھابی پہلے اسے دیکھ لیں۔'' میں نے عاجزی سے کہا تو وہ بادل نخواستہ بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ میں بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اگر ندیم بچ بچ ٹریپ ہو چکا ہوتا تو دشمن سب سے پہلے اس سے تصویر کے بارے میں اگلوانے کی کوشش کرتے اور وہ تکلیف برداشت کرنے والا آدمی نہیں تھا وہ انہیں تصویر کے بارے میں بتا دیتا اور وہ اس کے گھر پر چڑھ دوڑتے۔ ایک بار تصویر کا علم ہو جانے کے بعد وہ اسے کسی بھی قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرتے چاہے انہیں اپنے چند آدمیوں کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑتی۔ کرائے کے آدمیوں کے مرنے سے ان کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ میں اس وقت سے پہلے تصویر یہاں سے لے کر نکل جانا چاہتا تھا۔ ندیم کی بیوی بچوں کا جانا بھی ضروری تھا ورنہ حملے کی صورت میں انہیں بھی نقصان ہو سکتا تھا۔ شازیہ چند منٹ بعد آئی تو رول اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے بے تابی سے لے کر اسے کھولا اندر تصویر کو موجود پا کر میں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ ندیم نے اس تصویر کو گھر میں رکھ کر بے شک حماقت کی تھی لیکن وہ تصویر کسی خفیہ مقام پر چھپا دیتا تو وہ ہمیں نہ ملتی۔ غالباً یہی سوچ کر ندیم نے اسے گھر میں رکھا تھا کہ اس کے حادثے کی صورت میں تصویر گمشدہ ہو جاتی۔

''بھیا ایسی کیا بات ہے اس تصویر میں؟'' بھابی مجھے غور سے دیکھ رہی تھیں۔

''بھابی یہ تو میں بھی نہیں جانتا...... لیکن اتنا ضرور پتا ہے کہ ندیم کسی مشکل میں ہے جن لوگوں کو اس تصویر کی تلاش ہے وہ آپ کے گھر پر حملہ کر سکتے ہیں، آپ فوری طور پر بچوں کو لے کر کہیں اور چلی جائیں بلکہ ہمارے ساتھ چلیں۔''

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ ''یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں شہباز بھائی؟''

''آپ دیکھ چکی ہیں ان لوگوں نے پہلے بھی ایک بار حملے کی کوشش کی تھی۔ اس بار وہ شدید حملہ کر سکتے ہیں۔''

''ندیم کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟''

''ندیم کے بارے میں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔''

یہ سن کر شازیہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ ''اللہ خیر کرے۔''

''خیر ہی کرے گا۔ فی الحال آپ چلنے کی کریں۔ میں آپ کو یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔''

میرے لہجے سے اسے معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے حرکت میں آئی۔ میں نے باہر جا

کر شکیل کو بتایا کہ ہم ندیم کے بیوی بچوں کو لے کر جائیں گے۔ وہ اپنی گاڑی میں ہوں گے اور اگر کسی نے تعاقب کیا تو روکا جائے گا۔ شکیل نے سر ہلایا۔ ''میں سمجھ گیا جناب۔ ان کی کار آگے ہوگی اور ہم تعاقب کرنے والوں کو الجھا کر نکلنے کا موقع دیں۔''

''بالکل یہی بات ہے۔''

''میرا خیال ہے کار کے بجائے یہ جیپ میں زیادہ محفوظ ہوں گے۔ کار میں ہم لوگ جاتے ہیں۔ جیپ زیادہ تیز رفتار ہے۔''

''ٹھیک ہے جیپ میں تم ان کے ساتھ جاؤ گے میں کار میں پیچھے آؤں گا۔''

''میری تجویز ہے آپ جیپ میں ان کے ساتھ جائیں۔ میں کار میں آتا ہوں۔''

میں نے غور کیا اصل اہمیت تصویر اور ندیم کے بیوی بچوں کی تھی۔ میرا ان کے ساتھ ہونا ضروری تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم بقیہ افراد کے ساتھ کار میں آؤ۔''

ندیم کی بیوی پریشان تھی بچوں کو تیار کرنے کے دوران وہ بار بار ندیم کے موبائل پر فون کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا اس نے اپنا اور بچوں کا ضروری سامان دو بیگوں میں رکھا اور میرے ساتھ باہر نکل آئی۔ ندیم کے چار بچوں میں سب سے بڑا نو دس سال کا لڑکا تھا پھر دو لڑکیاں جو چھ سات سال کی اور ایک بچہ حال میں معرضِ وجود میں آیا تھا جو گود کا تھا وہ سب جیپ کی عقبی نشست پر آئے۔ شکیل کے ساتھ آنے والے ایک نوجوان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہم روانہ ہو گئے۔

ندیم کی پرانی سفید کار جیپ کے پیچھے تھی جس میں شکیل اور اس کے ساتھی چوکس تھے۔ ہائی وے تک آتے آتے دو گاڑیاں ہمارے پیچھے لگ چکی تھیں۔ ان میں ایک سفید کار تھی اور ایک سرخ رنگ کی ہڈ والی جیپ ہائی وے پر ذرا سا فاصلہ رکھ کر ہمارے پیچھے آنے لگی تھی۔ میں نے موبائل پر شکیل سے رابطہ کیا۔ ''کیا یہ دشمن ہو سکتے ہیں؟''

''امکان ہے جناب...... خاص طور سے سفید کار کے بارے میں میرے ساتھی کو یقین ہے۔ یہ وہی کار ہے جو مشکوک انداز میں ندیم صاحب کے بنگلے کے اردگرد گھوم رہی تھی۔''

''تم اپنی رفتار نارمل رکھو اور دیکھو ہمارے رفتار بڑھانے پر ان کا کیا ردِعمل ہوتا ہے۔'' میں نے فون بند کر کے ڈرائیور سے رفتار بڑھانے کو کہا اس نے ایکسی لریٹر پر زور ڈالا اور جیپ چند سیکنڈ میں ساٹھ میل فی گھنٹا کی رفتار سے نوے میل فی گھنٹا کی رفتار تک جا پہنچی۔ میں نے پلٹ دیکھا۔ شکیل کی کار دور ہو رہی تھی۔ مگر سفید کار کے عقب میں آنے والی سرخ جیپ کی رفتار بڑھی اس نے شکیل والی کار کو اوورٹیک کرنا چاہا۔ وہ کار اس کے سامنے آ گئی۔ اس کا ڈرائیور کار کو لہرا لہرا کر جیپ کو آگے آنے سے روک رہا تھا اتنی دیر میں ہم خاصا آگے نکل چکے تھے۔ میں نے جیپ ڈرائیو کرنے والے نوجوان سے پوچھا۔ ''آگے جا کر کوئی متبادل راستہ ملے گا۔''

''بالکل ملے گا صاحب...... مگر وہ ویرانے سے گزرتا ہے سڑک بھی خراب ہے۔''

''پروا نہیں ہے...... ان لوگوں سے پیچھا چھڑانا ضروری ہے۔''

''کوئی چار کلومیٹر بعد آئے گا راستہ۔'' اس نے بتایا تیز رفتاری کی وجہ سے سب نے سیٹ بیلٹ باندھ لی تھیں۔ اچانک میں نے سفید کار کو لڑکھڑا کر ہائی وے سے اترتے دیکھا۔ وہ کوئی ایک کلومیٹر پیچھے تھی۔ اس کے

عقب میں ریڈ جیپ سے کوئی کارروائی ہوئی تھی یا تو انہوں نے فائر کر کے اس کا ٹائر بے کار کر دیا تھا یا پھر عقب سے ٹکر ماری تھی...... بہر حال شکیل کی کار سڑک سے اتر کر رک گئی تھی۔

''رفتار بڑھاؤ''میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔''وہ آ رہے ہیں۔''

''کون آ رہا ہے شہباز بھائی؟''ندیم کی بیوی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بھابی آپ بچوں کو دیکھیں باقی سب مجھ پر چھوڑ دیں۔''میں نے جواب دیا۔ جیپ اب سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔ اتنی رفتار پر معمولی سا حادثہ بھی ہم کو ختم کرنے کا باعث بن سکتا تھا۔ شکیل اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے رہ جانے سے ہماری عافیت اس میں تھی کہ سرخ جیپ والوں سے دور رہیں۔ اب مجھے ایک فی صد بھی شبہ نہیں تھا کہ جیپ میں ہمارے دشمن تھے۔

''سامنے سے سڑک بند ہے۔''ڈرائیور ہذیانی انداز میں چلایا تو میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ دو بڑی گاڑیوں نے سڑک بند کر دی تھی۔ ان کے عقب میں کچھ مسلح افراد صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے فوری فیصلہ کیا۔''جیپ سڑک سے اتار لو اور کچے سے گزرنے کی کوشش کرو۔''

مگر سڑک ایسی جگہ سے بلاک تھی کہ جیپ کا کچے میں اترنا ممکن نہیں تھا۔ سڑک کے دونوں جانب گہرے نالے تھے۔ اس موقع پر ڈرائیور نے عقل مندی کا ثبوت دیا اس نے بریک لگاتے ہوئے جیپ گھمائی اور اس کا رخ دوسری طرف کر کے ایکسی لریٹر دبا دیا۔ سرخ جیپ والے بوکھلا گئے تھے انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم پلٹ کر ان کی طرف آ جائیں گے۔ وہ لہراتے ہوتے ہوئے زن سے ہمارے پاس سے گزر گئی۔ خاصی دور سفید کار نظر آ رہی تھی۔ میں نے پیروں کے پاس رکھی رائفل اٹھا کر ڈرائیور سے پوچھا۔''تمہارا نام کیا ہے؟''

''بابر جناب۔''

''گڈ...... جب میں کہوں تو جیپ دائیں طرف کچے میں اتار کر دوبارہ اسلام آباد والے رخ پر سفر کرنا...... سمجھ گئے۔''

''جی جناب۔''اس نے مستعدی سے کہا۔ سفید کار تیزی سے نزدیک آ رہی تھی۔ میں نے جیپ کی سرکنے والی چھت ہٹائی اور رائفل سمیت باہر آ گیا۔ کھیاں چھت پر ٹیک کر میں نے کار کے اگلے حصے کا نشانہ لیا اور کوئی پانچ سو گز کے فاصلے پر ایک طویل برسٹ مارا۔ فاصلے کے باوجود خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور کار کے دونوں وہیل پھٹ گئے تیز رفتاری کے باعث کار نے چکر کھایا اور الٹ کر سڑک سے اتر گئی۔ میں نے گھوم کر سرخ جیپ کی طرف دیکھا جو ہمارے تعاقب میں آ رہی تھی۔ سفید کار کا انجام دیکھ کر اس کے ڈرائیور نے رفتار ایک دم کم کر دی تا کہ ہم سے فاصلہ بڑھ جائے۔ میں نے جھک کر بابر سے کہا۔''جیپ کچے میں اتار کر نالے کے دوسرے طرف لے جاؤ۔''

بابر نے مستعدی سے میری ہدایت پر عمل کیا اور سڑک سے جیپ اتار کر کچے میں لے گیا۔ ہائی وے پر سو میل فی گھنٹا کی رفتار کا بھی پتا نہیں چل رہا تھا لیکن کچے میں آتے ہی چالیس کی رفتار پر ایسے جھٹکے لگنا شروع ہو گئے کہ میرے لئے سنبھل کر بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں واپس سیٹ پر آ گیا۔

''اب کہاں جانا ہے جناب؟''

''اس متبادل راستے کی طرف جانے کی کوشش کرو جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔''

''میں سمجھ گیا جناب......آپ سیٹ بیلٹ باندھ لیں۔''

سرخ جیپ ہمارے نزدیک سے گزر کر پیچھے گئی اور پھر جس جگہ سے ہم مڑے تھے وہ بھی اس جگہ سے کچے میں اتر آئے۔اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔سرخ جیپ خاصے فاصلے سے آ رہی تھی۔میں نے بابر کو رفتار بڑھانے کو کہا۔''جناب اس سے زیادہ رفتار ممکن نہیں ہے۔ورنہ جیپ الٹ جانے کا خطرہ ہے۔''

اس کی بات درست تھی۔میں نے دور ہوتی سڑک پر ان بڑی گاڑیوں کو آگے کی طرف جاتے دیکھا۔ جنہوں نے راستہ بلاک کیا تھا۔شاید وہ آگے ہمارا راستہ روکنے کی فکر میں تھے۔اچانک فائر کی آواز آئی۔سرخ جیپ سے ہم پر فائرنگ کی گئی تھی۔ایک گولی ٹن کی آواز کے ساتھ جیپ کے کسی حصے پر لگی اور بھابی نے بچوں کو سمیٹتے ہوئے چیخ ماری تھی۔''جھک جائیں......آپ لوگ جھک جائیں۔''میں نے چلا کر کہا۔ہم فائرنگ کی زد میں تھے۔اچھلتی کودتی جیپ کا توازن برقرار رکھتے ہوئے میں بمشکل کھلے خانے سے باہر نکلا اور رائفل عقب میں کر کے برسٹ مارا۔اس حالت میں درست نشانہ لینا ممکن نہیں تھا۔مگر اس برسٹ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور سرخ جیپ ذرا پیچھے ہو گئی تھی۔اس وقت بابر جیپ کو دو ٹیلوں کے درمیان سے گزار لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔جگہ بے حد تنگ تھی اور ذرا سا توازن خراب ہونے پر جیپ کے پھسل جانے کا اندیشہ تھا۔اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سرخ جیپ تیزی سے نزدیک آنے لگی۔پھر اس کی کھڑکیوں سے دو دو افراد دائیں بائیں سے نکلے اور خود کار رائفلوں سے گولیاں برسانے لگے۔چند گولیاں میرے اوپر سے سنسناتی ہوئی گزریں تو میں جلدی سے اندر ہو گیا۔

''بابر جلدی نکلو......وہ نزدیک آ رہے ہیں۔''

''بس دو منٹ جناب اس جگہ سے نکل گئے تو ان کا باپ بھی ہمیں نہیں پکڑ سکتا۔''

یہ بابر کے آخری الفاظ تھے، کیونکہ اندر آتی ایک گولی عقبی شیشہ توڑ کر اس کے سر میں لگی اور وہ اسٹیئرنگ پر اوندھے منہ گر گیا تھا۔میں چند لمحے کے لئے بھونچکا رہ گیا تھا۔چند لمحے پہلے مجھ سے بات کرنے والا پل بھر میں لاش میں بدل گیا تھا۔شازیہ بچوں سمیت اوندھے منہ گری ہوئی تھی۔اس لئے اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔بابر کے مرنے کے باوجود جیپ چل رہی تھی اور اس سے پہلے کہ کسی حادثے کا شکار ہوتی میں نے ہینڈ بریک کھینچ کر اس کا انجن بند کر دیا۔

سرخ جیپ تیزی سے نزدیک آ رہی تھی۔میں نے بابر کو گھسیٹ کر اپنی نشست پر ڈالا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔اس دوران میں ایک اور برسٹ نے عقبی شیشہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔میں نیچا ہونے کی وجہ سے بچ گیا تھا۔بریک ریلیز کر کے انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ کو اس تنگ جگہ سے نکالنے کی کوششیں کرنے لگا۔سرخ جیپ اتنی تیزی سے نزدیک آ گئی کہ میں اس میں سوار افراد کے چلانے کی آواز بھی سن سکتا تھا۔خوش قسمتی سے ٹیلوں کی وجہ سے اب ہم ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔خدا خدا کر کے جیپ ان ٹیلوں کے درمیان سے نکلی۔بابر درست کہہ رہا تھا۔اس کے بعد خاصا ہموار میدان تھا اور اس کے پار ایک سڑک نظر آ رہی تھی اس طرف آنے والا واحد قابل گزر راستہ ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔جہاں سے ہم آئے تھے۔بابر نے مرنے سے پہلے اپنا کام کر دیا تھا۔میں نے افسوس سے ایک نظر اسے دیکھا اور شازیہ سے پوچھا۔

''بھابھی آپ اور بچے ٹھیک ہیں۔''

''ہم ٹھیک ہیں بھائی۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ کیا موت کے فرشتے پیچھے لگ گئے ہیں۔''

''فکر نہ کریں وہ اب ہمارا پیچھا نہیں کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ میرا اندازہ تھا کہ سرخ جیپ ٹیلوں کے درمیان سے نہیں نکل سکتی تھی کیونکہ وہ خاصی چوڑی تھی۔ سڑک پر آتے ہی میں نے سب سے پہلے موبائل چیک کیا اور سگنل موجود پا کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ میں نے وسیم کے موبائل پر کال کی۔ ''ہیلو کہاں ہیں آپ لوگ۔ میں کتنی دیر سے کوشش کر رہا ہوں۔''

''مسئلہ ہو گیا ہے۔ مرشد علی کے کتے پیچھے لگے ہیں۔''

''یہ مجھے معلوم ہے۔ گدھے شکیل نے بتایا تھا۔''

میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنی روداد سنائی اور بابر کے آنجہانی ہونے کی اطلاع دی۔ وہ چند لمحے کے لئے چپ ہو گیا تھا پھر سنبھل کر بولا۔ ''آپ کہاں ہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ میں اس متبادل سڑک پر ہوں جس کا بابر نے ذکر کیا تھا۔''

''میں آدمی بھیج رہا ہوں۔'' اس نے عجلت میں کہا اور اسی لمحے موبائل سے سگنل ختم ہو گئے۔ ہم سروس کی حد سے نکل گئے تھے۔ میں نے جیپ کی رفتار بڑھائی۔ مگر رفتار بڑھنے کے بجائے کم ہونے لگی۔ میں نے ایکسی لریٹر پر زور دیا۔ کوئی فرق نہیں پڑا۔ تب میری نظر فیول گیج پر پڑی جو آخری دموں پر تھا کچھ دیر پہلے ہی فیول ٹنکی کو نصف سے زیادہ بھرا ہوا دکھا رہا تھا اتنی جلدی ایندھن ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ چند سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انجن جھٹکے کھا کر خاموش ہو گیا۔

''یہ کیا ہوا گاڑی کیوں روک دی۔'' شازیہ نے اتنی دیر میں پہلی بار سر اٹھایا اور پھر بابر کو دیکھ کر چیخ ماری۔

''خود پر قابو رکھیں۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''اسے......اسے کیا ہوا ہے؟''

میں جواب دینے کے بجائے نیچے اترا اور فیول ٹینک چیک کیا۔ وہ بالکل خالی تھا۔ عقب میں دیکھا تو سیاہ سڑک پر ایک لکیر نمایاں تھی۔ ناہموار راستے پر نیچے سے کچھ لگنے سے فیول لائن بریک ہو گئی تھی اور سارا ایندھن بہہ چکا تھا۔ میں حیران پریشان سڑک پر کھڑا تھا۔ اگر اکیلا ہوتا تو اتنا مسئلہ نہیں تھا لیکن ندیم کی بیوی جو قطعی گھریلو عورت تھی اسے اور اس کے چار بچوں کو لے کر کہاں جاتا۔ میں نے موبائل دیکھا اس میں سگنل بدستور غائب تھے۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ عقب سے مجھے ایک بڑی سفید گاڑی کی جھلک نظر آئی۔ یہ دشمن تھا یا نہیں۔ بہرحال اس ایک جھلک نے میرے اندر بجلیاں بھر دی تھیں۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ کچھ دیر میں تاریکی چھا جاتی جو انسان کا سب سے اچھا پردہ رکھتی ہے۔ میں نے جلدی سے جیپ کے اندر سے اسلحہ نکالا۔ عقب میں دو عدد رائفلیں اور ان کے فاصل میگزین رکھے تھے۔ بابر کی کمر سے بندھا پستول اور اس کے کلپ بھی نکال لئے تھے۔ ایک ذاتی پستول میرے پاس تھا۔

''بھابی جلدی اتریں۔ دشمن اس طرف آ رہے ہیں۔'' میں نے کہتے ہوئے تصویر اپنی قمیص میں ڈال لی۔

شازیہ ہراساں سی اتری۔ میں نے اس کی بچیوں کا ہاتھ پکڑا اور سڑک کے دائیں طرف اتر گیا۔ اس جانب ذرا بلندی پر گھنے درخت نظر آ رہے تھے ممکن ہے ہمیں وہاں پناہ مل جاتی۔ ہر ممکن تیز رفتاری سے ہم

درختوں تک پہنچے تو جیپ کے پاس سفید وین آر کی اور اس میں سے مسلح افراد نکل کر جیپ کی طرف لپکے۔ پھر ایک شخص نے ہمیں دیکھ لیا اور چلا چلا کر دوسروں کو بتانے لگا۔ کئی ایک رائفلیں ایک ساتھ گرجیں اور گولیاں ہمارے آس پاس سے گزرتی چلی گئیں اس کے فوراً بعد ہم درختوں میں داخل ہو چکے تھے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ جھنڈ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ میں نے شازیہ اور بچوں کو ایک محفوظ مقام پر بٹھایا "یہاں سے کوئی نکلے نہیں۔"

شازیہ کی حالت بری ہو رہی تھی لیکن بچوں کی خاطر خود کو سنبھال رہی تھی۔ میں واپس آیا اور درختوں کے درمیان سے ان لوگوں کو اوپر آتے دیکھ رہا تھا ان کی تعداد سات آٹھ سے کم نہیں تھی۔ ان کے حلیوں اور انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مرشد علی کے بدمعاش تھے۔ جیسے جیسے وہ جھنڈ کے قریب آ رہے تھے۔ ان کی رفتار سُست ہوتی جا رہی تھی۔ اَن دیکھی موت اور چھپے دشمن سے سب ڈرتے ہیں۔ انہیں معلوم تھا میں مسلح ہوں اور اس جھنڈ میں گھات لگا کر انہیں نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ میں نے درختوں اور زمین کا جائزہ لے کر ایک پلان سوچا اور ان لوگوں کے نزدیک آنے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ پھیل کر اور محتاط انداز میں آ رہے تھے۔ درختوں کے پیچھے تاریکی تھی اور مجھے خدشہ نہیں تھا کہ کوئی مجھے دیکھ سکے گا۔ جب تک میں فائر نہ کرتا میری موجودگی چھپی رہتی۔ سات کے قریب افراد اوپر آ رہے تھے اور ایک نیچے وین کے پاس کھڑا تھا۔ فاصلہ کوئی چار سو گز تھا۔ اتنے فاصلے سے اسے نشانہ بنانا مشکل تھا لیکن میں نے کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ رائفل کو سنگل موڈ پر لا کر احتیاط سے اس کے جسم کے درمیان کا نشانہ لیا اور سانس روک کر فائر کر دیا۔ فائر کی آواز آنے سے پہلے ہی وہ اچھلا اور اپنے پیٹ سے پھوٹتے خون کے فوارے کو روکنے کی کوشش کرتے کرتے ڈھیر ہو گیا۔ فائر کے ساتھ اس کی چیخ کی آواز نے اوپر آنے والوں کو چوکنا کر دیا تھا۔

"وہ رہا۔" کسی نے اس درخت کی طرف برسٹ مارا جس کے عقب میں، میں تھا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور درختوں کی آڑ میں جھنڈ کے دوسرے کنارے تک جا پہنچا۔ وہ سب کے سب اس درخت پر اپنا ایمونیشن ضائع کر رہے تھے جہاں سے میں نے فائر کیا تھا۔ تین افراد ایک دوسرے سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔ کوئی سو گز کی دوری سے میں نے ان کے پیروں کا نشانہ لے کر برسٹ مارا اور ان کے گرنے سے پہلے ہی درخت کی آڑ میں ہو کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ان کی چیخوں نے آنے والوں کو بوکھلا دیا۔ میں بھاگتا ہوا جھنڈ کے دوسرے کنارے پہنچا اور باہر جھانکا تو وہ لوگ اپنے زخمی ہونے والے ساتھیوں کو اٹھا کر وین کی طرف بھاگ رہے تھے میں نے رائفل میں نیا کلپ لگایا اور بھاگنے والوں کو دھمکانے کے لئے برسٹ مارا۔ ان میں سے ایک بدقسمتی سے گولیوں کی زد میں آ گیا اور اپنے زخمی ساتھی کو چھوڑ کر اپنی ٹانگ دبائے وہیں لیٹ گیا۔ اگلا وار میں نے وین کے فیول ٹینک پر کیا۔ وہ جس زاویے سے کھڑی تھی۔ فیول ٹینک صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے رائفل سنگل موڈ پر کرتے ہوئے ٹینک پر لگاتار تین گولیاں چلائیں۔ کوئی گولی ٹینک میں جا لگی اور فیول نے آگ پکڑ لی پھر ایک دھماکے سے پوری وین شعلوں کی زد میں آ گئی تھی۔ تین افراد جو زخمی ہونے سے بچ گئے تھے وین کی تباہی پر مجنونانہ انداز میں فائرنگ کرنے لگے۔ میں درخت کے پیچھے محفوظ تھا۔ چار زخمی ڈھلان پر پڑے مدد کے لئے چلا رہے تھے۔ ان میں سے ایک ساکت تھا مرا تو نہیں تھا شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔

"تم بھی کیا یاد کرو گے مرشد علی۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "تم نے ایک سیدھے سادے بزنس مین

کو خطرناک دشمن میں تبدیل کر دیا ہے۔''

میں سہمی ہوئی شازیہ اور اس کے بچوں کے پاس آیا۔ ''دشمن فی الحال پسپا ہو گیا ہے۔ مگر دوبارہ آئے گا، ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

''میں نے سوچا بھی نہیں تھا بھیا کہ تم اس طرح مار دھاڑ کر سکتے ہو۔'' شازیہ بولی۔

''میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔'' میں پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ''اب چلیں۔''

''انکل میرے ابو کہاں ہیں؟'' ندیم کے بیٹے نے پوچھا۔

''ہم پتا چلالیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔ ایک رائفل میں نے جھاڑیوں میں پھینک دی تھی یہ امریکن ایم سولہ رائفل کی چینی نقل تھی جو بالکل اصل جیسی لگتی تھی اور کارکردگی میں بھی کسی طرح اصل سے کم نہیں تھی۔ تین رائفلوں کو سنبھالنا ذرا مشکل کام تھا۔ اس بار میں نے دونوں بچیوں کو گود میں لے لیا۔

جھنڈ سے نکلے تو سامنے جھاڑیوں سے بھرا میدان تھا۔ دور بلند پہاڑ نظر آرہے تھے یہ شاید مارگلہ کا کوئی حصہ تھا۔ ممکن ہے اس پہاڑ کے عقب میں ہم کسی آبادی میں پہنچ جاتے اس جگہ تو دور دور تک کسی آبادی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ شازیہ کے لئے بچے کو سنبھال کر چلنا بے حد دشوار ہو رہا تھا۔ وہ اس قسم کے حالات سے گزرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ''بھیا کہاں جا رہے ہو؟''

''پتا نہیں بھابی...... فی الحال تو دشمن سے دور جانا ہے۔ میں نے بھی یہ علاقہ پہلی بار دیکھا ہے۔ ممکن ہے آگے کہیں پناہ مل سکے۔''

سورج غروب ہو چکا تھا اور تاریکی تیزی سے چھا رہی تھی۔ ندیم کی تیسرے نمبر کی بیٹی بار بار پانی مانگ رہی تھی اور جب اس سے برداشت نہیں ہو سکا تو اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ شازیہ جھنجھلا کر چیخی۔ ''چپ کر جا...... یہاں تجھے کہاں سے پانی لا کر دوں۔''

''بھابی آہستہ بولیں ممکن ہے وہ تعاقب میں ہوں اور آواز سن لیں۔'' میں نے کہا اور بچی کو پیار سے سمجھانے لگا۔ ''بیٹا آپ بھی چپ ہو جائیں ورنہ جو ہمارے پیچھے آرہے ہیں انہوں نے آپ کی آواز سن لی تو ہمیں پکڑ لیں گے اور مار دیں گے وہ بچوں کو بھی مار دیتے ہیں۔''

''سچ انکل۔'' دوسری لڑکی نے کہا جو اب تک گم صم تھی اور پھر جلدی سے اپنی بہن کو چپ کرانے لگی۔ اس کی کوششوں سے دوسری بہن چپ ہو گئی لیکن جلد مستقبل کی یہ خواتین حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے لگیں اور ان کی باتیں مجھے سننا پڑ رہی تھیں۔ لڑکا ابھی سے سنجیدہ اور بردبار تھا اس نے ایک دفعہ بھی شکایت نہیں کی تھی اور اپنی عمر سے بڑھ کر ساتھ دے رہا تھا بلکہ اس نے مجھ سے ایک بار کہا کہ میں رائفل اسے دے دوں کیونکہ میں نے اس کی بہنوں کو بھی اٹھا رکھا ہے۔ میں نے اسے منع کر دیا۔ ''نہیں بیٹا آپ اپنی امی کو دیکھو، ان کی مدد کرو۔''

وہ مشکل جگہوں پر ماں کو سہارا دیتا تھا۔ اب تک عقب میں کوئی آتا نظر تو نہیں آیا تھا لیکن دشمن آرام سے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ تصویر کے حصول کے لئے وہ اس سے زیادہ آدمی کٹوا سکتے تھے۔ کرائے کے بدمعاشوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ مکمل تاریکی چھانے کے بعد ہم پہاڑ کے دامن تک جا پہنچے تھے۔ بچی نے پیاس کی شدت سے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا تھا شازیہ اور بچے پیاس کے ساتھ تھکن سے بھی نڈھال تھے۔ میں نے انہیں ایک

جگہ بٹھایا۔ تاریکی میں آگے بڑھنا مشکل تھا۔ مجھے چاند نکلنے کا انتظار تھا۔ میں نے شازیہ سے کہا۔
''بھابی...... آپ بچوں کو سنبھالیں۔ میں اردگرد دیکھتا ہوں کہیں پانی یا پناہ گاہ مل جائے۔''
وہ سہم گئی تھی۔ ''بھیا ہمیں چھوڑ کر نہ جانا۔''
''بھابی ایسا ہو سکتا ہے۔ میں جیتے جی آپ اور بچوں کو اس ویرانے میں چھوڑ جاؤں۔'' میں نے شکوہ کیا۔
وہ شرمندہ ہو گئی۔ ''یہ بات نہیں ہے بھیا بس حالات نے مت ماردی ورنہ ندیم بھی ہوتے تو اس سے زیادہ کیا کرتے جو تم نے کیا ہے۔''
''آپ آرام کریں اور کوئی آواز نہ نکالیں اگر آہٹ ہو اور میری آواز نہ آئے تو بچوں کو لے کر کسی جھاڑی میں چھپ جائیے گا۔''
میں اوپر جانے لگا۔ شازیہ کو کوئی اسلحہ دینا بے کار تھا۔ وہ اسے استعمال بھی نہیں کر سکتی تھی۔ تاریکی میں، میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ ذرا سی غلطی مجھے نیچے لے جا سکتی تھی کیونکہ ڈھلان خاصی ترچھی تھی۔ پہاڑ زیادہ بلند نہیں تھا۔ مشکل سے دو سو فٹ اونچا تھا لیکن دشوار ضرور تھا میں پندرہ منٹ میں اوپر پہنچا تھا۔ اس وقت چاند نمودار ہو رہا تھا۔ مجھے دائیں جانب ایک جگہ روشنی نظر آئی جیسے کسی بند جگہ دیا جل رہا ہو۔ شاید وہاں کوئی گھر تھا۔ ان پہاڑوں پر درختوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے اکا دکا چرواہوں اور لکڑہاروں نے مکانات بنا رکھے تھے۔ میں واپس آنے لگا۔ جہاں روشنی تھی وہاں انسان اور پانی ملنے کا امکان تھا۔ ابھی میں نصف رستے میں تھا کہ مجھے اس طرف سے لہراتی روشنیاں نظر آنے لگیں جس طرف سے ہم آئے تھے اور اب دشمن ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ بقیہ راستہ میں نے ہر ممکن تیزی سے طے کیا۔ شازیہ اور بچے خاموش سہمے بیٹھے تھے۔ میں نے آہستہ سے آواز دی تو وہ اچھل پڑے تھے۔
''بھیا...... جلدی کرو...... بچے پیاس سے بے حال ہیں۔'' شازیہ نے کہا۔
''میں نے ایک جگہ دیکھ لی ہے۔'' میں نے بچیوں کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''وہاں سے ہمیں پانی مل سکتا ہے لیکن بالکل خاموشی سے آواز نکالے بغیر چلیں...... دشمن بھی اسی طرف آ رہا ہے۔''
میں ڈھلان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ روشنی ذرا آگے ڈھلان کے گھماؤ پر ذرا بلندی پر نظر آ رہی تھی۔ کوئی دس منٹ چلنے کے بعد روشنی نظر آ گئی تھی۔ یہ بہت مدھم روشنی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اگر چاند نہ نکلا ہوتا تو یہ روشنی نظر نہ آتی۔ محض تاریکی کی وجہ سے نظر آ گئی تھی۔ ڈھلان پر احتیاط سے چڑھنا تھا۔ مجھ پر اسلحے کے ساتھ دو بچیوں کا بوجھ تھا اور مجھے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا تھا۔ موقع کی نزاکت محسوس کر کے بچیاں مجھ سے چمٹ گئی تھیں۔ پیچھے شازیہ بچے کو سنبھالے اور لڑکے کا سہارا لیتی آ رہی تھی۔ ذرا بلندی پر آتے ہی عقب میں لہراتی روشنیاں پھر نظر آنے لگیں۔ وہ اس جگہ سے قریب تھے جہاں کچھ دیر پہلے ہم تھے۔ میرے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ وہ بالکل درست راہ پر تھے یعنی ہمارے پیچھے اس روشنی والی جگہ پر بھی آ سکتے تھے۔
نزدیک آنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تو خودرو جھاڑیوں سے بھرا ایک کسی قدر مسطح قطعہ تھا۔ میں اس میں داخلے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ ایک طرح سے یہ جھاڑیاں قدرتی چار دیواری تھی۔ بالآخر ایک رخنہ نظر آیا۔ میں نے بھابی اور بچوں کو باہر چھوڑا اور خود اس رخنے میں گھس گیا۔ تنگ سا راستہ ایک صحن میں نکلا۔ جس کے آگے کچی

مٹی کا جھونپڑا تھا۔ جھونپڑے کے آگے چھپر کا برآمدہ تھا اور اس میں ایک لالٹین لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ ایک باورچی خانہ تھا یہاں کوئی عورت چولہے پر جھکی پھونکیں مار رہی تھی۔ چھپر کے سامنے کھلے میں پلنگ پر ایک بوڑھا لیٹا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا تھا کہ میں نے رائفل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

''آواز مت نکالنا۔''

بوڑھا پریشان ہو گیا۔ ''بھائی...... ہم غریب لوگ ہیں ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ میرے پیچھے دشمن لگے ہیں۔ ان سے بچنے کے لئے آیا ہوں میرے ساتھ بہن اور اس کے بچے ہیں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''یہاں اور کون ہے؟''

''بھاگ بھری کی ماں ہے بیمار اندر پڑی ہے۔'' بوڑھے نے بتایا۔

''میرے ساتھ چلو۔ بھابی اور بچوں کو لانا ہے اور ہاں یہ لالٹین بجھا دو، اگر دشمنوں نے یہ روشنی دیکھ لی اور ادھر آ گئے تو ہمارے ساتھ تمہیں بھی سارے گھر سمیت مار دیں گے۔''

بوڑھے نے تیزی سے اٹھ کر لالٹین بجھا دی۔ عورت اور بچوں کا سن کر اس کا خوف کسی حد تک کم ہوا تھا۔ وہ میرے ساتھ آ کر شازیہ اور بچوں کو اندر لے آیا۔ میں نے پانی کا کہا تو کونے میں رکھے گھڑے سے پانی مٹی کے کٹورے میں لے آیا۔ پیاس مجھے بھی لگ رہی تھی۔ مگر پہلے بچوں کو پانی دیا۔ ہماری بے تابی بھانپ کر بھاگ بھری کہیں سے صراحی لے آئی تھی۔ بچے پانی پینے کے لئے بے تاب تھے لیکن شازیہ نے عقل مندی کرتے ہوئے انہیں تھوڑا تھوڑا پانی پلایا تھا۔ وقفے کے بعد دوبارہ پانی دیا تھا۔ بوڑھا اندر سے لسی کا جگ لے آیا تھا۔ اس نے ٹھنڈی نمکین لسی دی۔ اسے پی کر طبیعت میں فرحت آ گئی تھی۔ پانی بے حد شیریں اور سرد تھا۔ شدید پیاس کے عالم میں اسے پی کر مزہ آ گیا تھا۔ اچانک اندر سے کوئی عورت چلانے لگی۔ میں نے پریشان ہو کر اس بوڑھے سے کہا۔ ''اسے چپ کراؤ، اس کی آواز سن کر دشمن اس طرف آ سکتے ہیں۔''

بوڑھا اٹھ کر اندر گیا اور اپنی بیوی کو سمجھانے لگا مگر وہ بدستور بلند آواز میں چلا رہی تھی اور اس کی آواز دور تک جاتی محسوس ہو رہی تھی۔ پہاڑی علاقے میں آواز ویسے بھی زیادہ گونجتی ہے۔ موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے بھاگ بھری بھی اندر چلی گئی اور اس نے کسی نہ کسی طرح ماں کو چپ کرا دیا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والے شکاری کتوں نے یہ آواز نہ سن لی ہو۔ میں رائفل سنبھالتا ہوا اٹھا تو شازیہ نے دبی زبان میں کہا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو بھیا؟''

''میں باہر دیکھ کر آتا ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''اگر کوئی خطرہ محسوس ہو تو ہلکی سے چیخ مار دینا۔ میں جاؤں گا اور بچوں کو خاموش رکھیں۔''

چاند خاصا بلند ہو چکا تھا اور ارد گرد کا منظر کسی قدر واضح تھا۔ میں جھاڑیوں کے درمیان کے تنگ راستے سے باہر آیا اور یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا کہ ٹارچ بردار افراد اس جگہ پہاڑی کے عین نیچے تھے اور ان کے کتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ٹارچوں کی تعداد سے میں نے اندازہ لگایا وہ چھ سات افراد تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے ہاتھ میں ٹارچیں نہیں تھیں۔ یعنی ان کی تعداد نو دس بھی ہو سکتی تھی۔ پھر انہوں نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ ان کا رخ اس طرف ہی تھا۔ میں پیچھے ہٹ کر رخنے میں گھس گیا۔ پھر میں نے کسی کی آوازیں سنیں۔

''ادھر رحمت نامی لکڑہارا رہتا ہے وہ لوگ اس کے گھر میں نہ گھس گئے ہوں۔''

''اوئے...... یہ رحمت کون ہے؟'' کسی بدمعاش نے پوچھا۔

''جی ادھر رہتا ہے۔ بیوی اور ایک لڑکی ہے بھاگ بھری۔'' بتانے والے کا لہجہ دیہاتی تھا۔

''بھاگ بھری...... یہ تو رس بھری لگ رہی ہے۔ چل بھئی رحمتے کے گھر۔'' بولنے والے کی آواز میں شیطان تھا۔ ''اگر ہمارے پروہنے نہ ملے تو بھاگ بھری کو ہی دیکھ لیں گے۔''

اب موقع بالکل نہیں تھا۔ اگر وہ ذرا بھی اوپر آ جاتے تو میں مارا جاتا۔ میں اتنے لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کی اور نیم دائرے میں اوپر آنے والے افراد پر پورا کلپ خالی کر دیا۔ اس میں مشکل سے سات آٹھ سیکنڈ لگے۔ سناٹے میں یک دم فائرنگ کے ساتھ چیخوں کا شور بھی گونجا تھا۔ ٹارچیں بند ہو گئیں۔ میں زمین پر گر گیا اور ہر ممکن تیزی سے رینگتا ہوا اندر جانے لگا۔ اگلے لمحے میرے اردگرد گولیاں برس رہی تھیں۔ بیک وقت کئی ہتھیاروں کے دہانے میری طرف کھل گئے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ فائرنگ سے کم سے کم تین افراد زخمی ہوئے یا مارے جا چکے تھے۔ خیریت رہی کہ کسی گولی نے میری طرف رخ نہیں کیا۔ اندر شازیہ بچوں سمیت کوٹھری میں جا چکی تھی۔ یہ اچھا ہوا، کیونکہ گولیاں اب اندر تک آ رہی تھیں۔ میں نے چھلانگ لگا دی اور تین فٹ اونچی کچی مٹی کی دیوار کے دوسری طرف جا گرا۔ کوٹھری کے گرد احاطے یا بارش کا پانی روکنے کی غرض سے یہ دیوار بنائی گئی تھی۔ بچ جانے والے جھاڑیوں پر اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر ایک دوسرے سے کچھ کہہ بھی رہے تھے لیکن فائرنگ کے شور میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ خاصی دیر سے انہیں احساس ہوا کہ وہ اپنا اسلحہ ضائع کر رہے تھے اس لئے فائرنگ روک دی۔ ''اوئے بھاگ بھری کا ماما تو مر گیا۔'' کسی نے شاید رہنمائی کرنے والے کے بارے میں فرمایا۔

''بکواس مت کر بھاگ بھری کے باپ۔'' کسی نے اسے گھر کا۔ ''اپنے بھی دو مر گئے ہیں۔ فیکا اور نیکا زخمی ہیں۔''

''کتے کا بچہ...... حرامزادہ۔'' انہوں نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ میں نے چار بندے بے کار کر دیئے تھے۔ اب بس کم سے کم اتنے ہی مسلح افراد تھے۔ بہر حال دشمن کی نفری میں کمی اطمینان بخش تھی۔ میں جھکا اور اندر کوٹھری میں آیا۔ جہاں سب سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

''اس جگہ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ ''بس جھاڑیوں میں یہی راستہ ہے۔''

''دشمن باہر تک آ چکا ہے اسے ہمارے بارے میں معلوم ہے۔ کسی مقامی شخص نے ان کی رہنمائی کی ہے۔ تمہاری بیٹی کے بارے میں ان کے عزائم درست نہیں ہیں۔''

''میری بیٹی کے بارے میں کس نے بتایا جی؟''

''جو شخص انہیں یہاں لایا ہے اس نے بتایا ہوگا۔ شاید وہ بھی مارا گیا ہے۔''

''مارا گیا ہے۔'' بوڑھے کی حالت غیر ہو گئی تھی۔

''کم سے کم تین آدمی مارے جا چکے ہیں اور دو زخمی ہیں۔ اس وجہ سے دشمن باہر رکا ہے ورنہ اب تک اندر

آ چکا ہوتا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں رائفل یا پستول چلانا آتا ہے۔"

"کیوں نہیں آتا۔ دس سال فوج کی نوکری کی ہے۔" بوڑھے نے فخر سے کہا۔ "اُدھر بیٹ مین تھا پھر پاؤں میں چوٹ لگی تو ریٹائر ہو گیا۔"

اب مجھے پتا چلا کہ اس جنگل میں رہنے والے دیہاتی بوڑھے کا لہجہ اتنا صاف کیوں تھا جب کہ اس کی بیٹی اور بیوی خالص پوٹھوہاری پنجابی بول رہی تھی جو عام مروجہ پنجابی کے مقابلے میں خاصی مشکل ہوتی ہے۔

"میرے ساتھ آؤ...... دشمن اندر گھسنے کی کوشش کرے گا، ہمیں اسے اندر گھسنے سے روکنا ہو گا ایک بار وہ اندر آ گئے تو ہمیں آسانی سے گھیر لیں گے۔"

ہم دیوار تک آئے۔ باہر خاموشی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ لوگ جا چکے تھے۔ وہ آزاد تھے اور مزید کمک منگوا سکتے تھے۔ صرف نو دس افراد نہیں ہوں گے بلکہ ان کی اور ٹیمیں اس علاقے میں گھوم رہی ہوں گی۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں سے زیادہ انہیں ہماری اور درحقیقت تصویر کی فکر تھی انہوں نے ہمیں ایک جگہ گھیر لیا تھا اور اب وہ مزید کمک لا کر ہم پر قابو پانے کی فکر میں تھے۔ تب تک وہ خاموش رہنا چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے اس جگہ سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا۔

"وہ لوگ کدھر ہیں صاحب؟" بوڑھے نے سرگوشی کی۔

"باہر ہیں...... اندر آنے کی فکر میں ہیں۔" میں نے جوابی سرگوشی کی اور رائفل اسے دے کر اسے استعمال کرنے کا طریقہ سمجھانے لگا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر سر ہلا کر بولا۔

"سمجھ گیا صاحب...... اسلحے کو ہاتھ لگائے بھی اتنا عرصہ ہو گیا ہے۔" اس نے رائفل لی اور تین چار بار اسے موڑا اور اَن لوڈ کرنے کا مظاہرہ کیا۔ میگزین نکال کر لگایا۔ میرے پاس دو رائفلیں اور کل پانچ کلپ تھے ان میں سے دو کلپ رائفلوں میں لگے تھے اور تین کلپ اضافی تھے۔ ایک اضافی کلپ بوڑھے کو دے دیا۔ اس کا نام رحمت تھا۔ "رحمت تم اس ویرانے میں کیوں رہتے ہو وہ بھی جوان لڑکی کے ساتھ۔"

"مجبوری ہے صاحب...... کہیں زمین لینے یا مکان بنانے کی حیثیت نہیں ہے۔ لکڑی بیچ کر گزارا کرتا ہوں۔ اس لئے جنگل میں رہنا پڑتا ہے۔"

اس لمحے مجھے پیچھے سے آہٹ ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ بھاگ بھری تھی۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی صحت مند اور دلکش نقوش والی لڑکی تھی۔ سرخی مائل رنگت اس کی کشش میں اضافہ کرتی تھی۔ رحمت نے اسے دیکھ کر ڈانٹا۔ "تُو کیوں ادھر آئی ہے اندر جا بھاگ بھری۔"

"بابا میں تیری مدد کروں گی۔"

"تم اندر جاؤ اور بچوں کو سنبھالنے میں مدد دو۔ انہوں نے بہت دیر سے کھانا نہیں کھایا ہے اگر کچھ کھانے کو ہے تو وہ دو اور ہاں سب کو دروازے کے سامنے سے ہٹا دو۔"

لڑکی سمجھدار تھی خاموشی سے اندر چلی گئی۔ بڑے میاں جوش میں آنے لگے۔ "صاحب باہر نکل کر ان پر حملہ کیوں نہ کریں...... انہیں مار بھگائیں۔"

"نہیں وہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ گھات لگا کر بیٹھے ہوں گے۔ چاند نکل آیا ہے اس کی روشنی میں ہمیں فوراً

دیکھ لیں گے اور گولی مار دیں گے۔"

"اچھا صاحب میں بات کروں...... میری تو ان سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"دشمنی کیوں نہیں ہے، تمہارے گھر میں ان کے دشمن نے پناہ لے رکھی ہے اور اس جگہ سے فائرنگ کر کے ان کے کئی ساتھی مار دیئے ہیں۔ وہ تو تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔"

"اگر میں اسی جگہ سے ان سے بات کروں۔"

"ہاں کر کے دیکھو۔" میں نے غور کر کے کہا۔ "بلکہ ہماری موجودگی سے مکر جانا...... کہنا کہ جو بھی تھے وہ پیچھے کی طرف سے فرار ہو چکے ہیں۔"

رحمت نے سر ہلایا اور اپنی جگہ سے چلا کر بولا۔ "کون ہو تم؟ تم نے میرے گھر پر فیر (فائر) کیوں کئے؟"
اس نے دوبارہ زیادہ بلند آواز سے سوال دہرایا تو ایک سنسناتی ہوئی گولی ہمارے اوپر سے گزر گئی تھی۔

"رحمتے ادھر ہمارے دشمن ہیں، ان سے کہو باہر آ جائیں انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔" کوئی چلایا۔

"وہ تو جی پچھلی طرف سے کب کے جا چکے ہیں۔" رحمت بولا۔ "ادھر میں اور میری بیوی بچی ہے۔"

"اچھا...... ایسا ہے تو تم تینوں سامنے آ جاؤ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔" بولنے والا مکاری سے بولا۔

"یہ چالاکی کر رہا ہے۔ اسے معلوم ہے ہم اندر ہیں۔" میں نے سرگوشی کی۔ "شاید انہیں یہاں لانے والا بتا چکا ہے کہ ان جھاڑیوں میں آمد و رفت کا ایک ہی راستہ ہے۔"

اس دیوار کے دوسری طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ چاروں طرف گزوں پر پھیلی ہوئی جھاڑیاں تھیں لیکن یہ جھاڑیاں گولی کا راستہ نہیں روک سکتی تھیں اور ڈھلان کے سبب کوئی آڑ بھی نہیں تھی۔ بولنے والے نے کہا۔ "بوڑھے اپنی عورت اور بیٹی کو لے کر باہر آ جاؤ ورنہ ہم ان جھاڑیوں کو آگ لگا دیں گے۔"

رحمت نے پریشان ہو کر میری طرف دیکھا۔ "یہ تو جی بڑی خطرناک دھمکی دے رہے ہیں۔"

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا۔ "ان سے کہو اگر جھاڑیوں کو آگ لگا دی تو یہ آگ پہاڑی کی وجہ سے دور سے نظر آئے گی۔ ممکن ہے فائر بریگیڈ یا پولیس والے آ جائیں۔"

اس نے یہی بات بلند آواز سے کہی تو دوسری طرف موجود افراد کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ اس معاملے میں سرکاری مداخلت کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے اگرچہ سرکار کے پٹھو خاصی تعداد میں ان کے ساتھ تھے۔ مگر انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسری پارٹی (عمر دراز) بھی کمزور نہیں ہے اور اس کا بھی اثر رسوخ ہے۔ کچھ دیر بعد اس شخص نے کہا۔ "ہمیں معلوم ہے شہباز یہاں چھپا ہے اس سے کہو...... تصویر ہمیں دے دے، ہم خاموشی سے چلے جائیں گے اپنے ساتھیوں کی موت بھی بھول جائیں گے۔"

"یہ کس تصویر کی بات کر رہے ہیں؟"

"بکواس کر رہے ہیں، بات تصویر کی نہیں یہ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ میں تصویر انہیں دے دوں تب بھی یہ ایسے نہیں جائیں گے۔"

باہر والا دوبارہ بولا۔ "اگر تصویر نہیں دی تو ہم پہلے جھاڑیوں کو آگ لگا دیں گے اور پھر اندر موجود ایک ایک فرد کو گولی مار دیں گے۔ رحمتے تیری بیٹی کو بے آبرو کریں گے اور اسے اپنے ساتھ لے جا کر رکھیل بنا کر رکھ

دیں گے۔اس آدمی سے بول باہر آ جائے۔''

رحمتے کا خون کھولنے لگا۔''حرامزادے۔''اس نے دبی زبان میں گالی دی۔''میری بیٹی کا نام لیا۔''

''رحمت چالاکی سے کام لو، انہیں اندر آنے پر اکساؤ۔ میری موجودگی سے انکار کر دو اور جب یہ اندر آئیں تو ہم انہیں بھون ڈالیں گے۔ راستہ صاف کر کے ہم یہاں سے نکل جائیں گے، اس کے بعد تمہاری، تمہاری بیوی اور بیٹی کی حفاظت ہمارے ذمے ہوگی۔ تمہیں نوکری بھی ملے گی اور رہائش بھی۔''

''صاحب مجھے لالچ مت دو۔ یہ کام میں اپنی حفاظت کے لئے بھی کروں گا میں غریب ہوں پر اب تم میرے مہمان ہو۔ آخری سانس تک تمہاری حفاظت کروں گا۔''

''میں لالچ نہیں دے رہا لیکن جو شخص میرا ساتھ دے، میری خاطر ان درندوں سے ٹکرائے میں اسے ان کے سامنے بے بس نہیں چھوڑ سکتا۔''

رحمت نے چلا کر کہا۔''ادھر کوئی نہیں ہے۔ اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو اندر آ کر دیکھ لو۔''

''رحمتے...... چالاکی نہ کر...... وہ اندر ہی ہیں۔ پیر بادشاہ کے غیظ و غضب کو آواز نہ دے۔''

''کون پیر بادشاہ؟''

''ارے تُو پیر بادشاہ مرشد علی کو نہیں جانتا۔ اس علاقے کا بچہ بچہ ان کا مرید ہے۔''

''تم لوگ جھوٹ کہہ رہے ہو۔'' رحمت نے بے یقینی سے کہا۔''تم مجرم ہو...... پیر بادشاہ سے تمہارا کیا تعلق؟''

''ہم مجرم نہیں پیر بادشاہ کے مرید ہیں۔ یہ شخص جو گھر میں چھپا ہے پیر بادشاہ کا مجرم ہے۔ ان کی ایک قیمتی تصویر چرا کر بھاگا ہے۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سرگوشی کی۔'' بکواس کرتا ہے، تصویر اور پیر بادشاہ سے ان لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ تمہیں صرف بے وقوف بنا رہے ہیں۔''

''تب انہوں نے پیر بادشاہ کا نام کیوں لیا؟''

''یہ تم ان سے پوچھو۔'' میں نے پہلو بدل کر کہا۔ مجھے رحمت کا لہجہ بدلا ہوا لگ رہا تھا۔

اس نے بلند آواز میں پوچھا۔''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے تم پیر بادشاہ کے آدمی ہو؟''

''کیا کوئی پیر بادشاہ کے نام پر جھوٹ بول سکتا ہے؟''اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

رحمت نے میری طرف دیکھا۔''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس علاقے میں پیر بادشاہ کے نام پر کوئی جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔''

میں نے دل ہی دل میں پیر بادشاہ کو بے نقط سنائیں۔''عام لوگ یقیناً پیر بادشاہ کے نام پر جھوٹ نہیں بول سکتے لیکن یہ مجرم ہیں اپنے مطلب کے لئے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' وہ بولا اور رائفل کا رخ میری طرف کر کے بلند آواز سے کہا۔''وہ پیر بادشاہ کے مرید ہیں اور تم ان کے مجرم...... ہاتھ اوپر کرو۔''

''کیا یہ تمہارے پاس ہے؟'' بولنے والے نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں میں نے اس کی رائفل چھین لی ہے۔'' رحمت چلایا۔

''رائفل ادھر دو۔'' میں نے کہا۔ اس نے رائفل بلند کی اور گولی چلا دی۔ سنگل موڈ پر فائر ہوا اور دھماکے نے فضا کو جھنجھوڑ دیا تھا اندر سے عورتیں چلائی تھیں۔ خاص طور پر شازیہ کی چیخ نمایاں تھی۔

''کیا ہوا، یہ فائر کس نے کیا؟'' باہر سے پوچھا گیا۔

''میں نے اسے گولی ماردی۔'' رحمت میری طرف دیکھ کر بولا۔ وہ سراسر جھوٹ کہہ رہا تھا میں زندہ تھا گولی میرے سر کے فٹ بھر اوپر سے گزر گئی تھی۔

''شاباش۔'' باہر والے نے کہا۔ ''اب تم باہر آ جاؤ۔''

''نہیں تم اندر آؤ۔'' رحمت نے کہا اور آہستہ سے بولا۔ ''وہ دھوکے میں اندر آئیں گے۔''

''شکر ہے ورنہ میں سمجھا تھا کہ تم نے مارے عقیدت کے گولی مار ہی دی ہے۔''

''صاحب دس سال فوج میں نوکری کی ہے تھوڑی بہت عقل ہے میرے پاس۔''

''ہم اندر آ رہے ہیں۔'' باہر سے کہا گیا۔ ''لیکن پہلے تم رائفل باہر پھینک دو۔''

''پھینک دو، میرے پاس پستول بھی ہیں۔'' میں نے کہا تو رحمت نے کھڑے ہو کر رائفل باہر کی طرف اچھال دی، جو جھاڑیوں سے ہوتی ہوئی باہر جا گری۔ میں نے اسے پستول دیا اور ہم نے ذرا فاصلے پر مورچہ لئے۔ کوٹھری کے اندر بالکل خاموشی تھی۔ میں نے رحمت سے کہا تھا کہ بالکل رعایت نہیں کرنی ہے سامنے آنے والے کو شوٹ کرنا ہے لیکن وہ دوسرے شخص کو گولی مارے گا۔ پہلا میرا شکار ہوگا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دیوار کے دوسرے کونے کی طرف چلا گیا۔ کوئی ایک منٹ بعد جھاڑیوں میں سرسراتا پہلا سایہ نمودار ہوا تھا۔

''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ اوئے تو کدھر ہے۔'' اس نے چلا کر کہا۔

''آہستہ بول۔'' اس کے پیچھے آنے والے نے کہا تھا اور اسے رحمت نے گولی مار دی۔ دھماکے کے ساتھ وہ چیخ مار کر گرا تھا کہ میں نے اگلے سائے کے پیروں پر ہلکا سا برسٹ مارا۔ وہ دھاڑتا ہوا زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ جھاڑیوں میں ہلچل مچی تو میں نے اگلا برسٹ اس کی طرف مارا لیکن بھاگنے والے بچ گئے میں اچھل کر سامنے آیا اور اپنے شکار کی رائفل پاؤں مار کر دور کر دی پھر اسے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ رحمت کا نشانہ بننے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ غالباً وہ معمولی زخمی ہوا تھا اور بچ نکلا تھا۔ زخمی کراہ رہا تھا اور دبی زبان میں گالیاں دے رہا تھا۔ ''کیا ایک گولی تمہارے منہ میں بھی مارنے پڑے گی۔'' میں نے دھمکی دی۔

''میں مر رہا ہوں۔'' اس نے فریاد کی۔

''اتنی آسانی سے نہیں مرو گے تم کتے کے بچے۔'' میں نے اس کی تلاشی لی تو اس کی شلوار سے ایک ریوالور بھی نکلا تھا۔ دو گولیاں اس کے بائیں گھٹنے کے اوپر نیچے سوراخ کرتی گزر گئی تھیں۔ یہ زخم ایسے نہیں تھے وہ مر جاتا۔ ہاں خون زیادہ بہہ جاتا تو ضرور مر سکتا تھا۔ رحمت رینگتا ہوا نزدیک آیا۔

''میں نے جس کو گولی ماری تھی وہ تو پہلے سے بھاگ گیا۔''

''تمہارا نشانہ خطا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اسے دیکھو۔''

رحمت نے اس کے زخموں پر اس کی قمیص پھاڑ کر پٹیاں باندھ دی تھیں۔ اس کے بعد میں نے اسا

شروع کئے۔ ''باہر اور کتنے ساتھی ہیں تمہارے؟''
وہ چپ رہا تو میں نے اس کا زخمی پاؤں ہلایا۔ ''چار۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔
''مرے اور زخمی کتنے ہیں؟''
''تین مرے ہیں۔ مجھے ملا کر تین زخمی ہیں۔'' اس نے کراہ کر جواب دیا۔
''کل دس افراد ہوئے۔ اس علاقے میں اور کتنے افراد ہیں جو ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔''
''بہت ہیں۔'' وہ نفرت سے بولا۔ ''تم بچ کر جا نہیں سکو گے کچھ دیر میں وہ بھی آنے والے ہیں۔ ہائے۔ میں نے حرامی بالے سے کہا تھا، ان کا انتظار کر لے لیکن اسے نمبر بنانے کا شوق تھا۔ مجھے مروا دیا۔''
''ابھی کہاں مرے ہو تم...... اگر تمہارے ساتھیوں نے حملہ کیا تب ان کی فائرنگ سے مرو گے ہم تمہیں آگے رکھیں گے۔'' میں نے کہا تو ہلکی چاندنی میں اس کے چہرے پر خوف صاف نظر آنے لگا۔
''تم کچھ بھی کر لو بچ نہیں سکتے۔'' اس نے ضدی لہجے میں کہا۔
رحمت جا کر اس کی گن اٹھا لایا تھا۔ یہ طاقتور ٹرپل ٹو رائفل تھی۔ اس کے اضافی میگزین زخمی کے پاس تھے۔ ''اب ہم کیا کر سکتے ہیں جناب۔'' رحمت نے تشویش سے پوچھا۔
''جب تک ہمارے پاس اسلحہ ہے یہ پاس پھٹک نہیں سکتے۔''
''اور اس کے بعد جناب۔''
''اس کے بعد اللہ مالک ہے۔ ویسے میرے ساتھی بھی مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ میرے پاس موبائل فون ہے لیکن اس کے سگنل ہوتے تو میں انہیں بتا سکتا تھا۔'' میں نے کہا اور اچانک مجھے خیال آیا۔ ''رحمت کیا تم یہاں سے نکل کر کسی ایسی جگہ نہیں جا سکتے جہاں سگنل ہوں۔''
''وہ کیا ہوتے ہیں جی۔'' اس نے سادگی سے کہا تو میں نے موبائل نکال کر اسے تفصیل سے سمجھایا کہ اسے کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ وہ سر ہلا کر بولا۔
''میں سمجھ گیا جی، پر میں جاؤں کہاں؟''
''مری ہائی وے یہاں سے کتنی دور ہے؟''
''بہت دور ہے جناب سات آٹھ میل تو ہوگی۔''
''وہاں سگنل مل جائیں گے اور تم مدد لا سکتے ہو۔''
''مجھے تو کال کرنا نہیں آتی۔''
میں نے اسے ایزی ڈائل کا طریقہ سمجھایا اور بار بار اس سے پوچھا۔ دس پندرہ بار کرنے پر وہ رواں ہو گیا تھا۔ ''اس نمبر پر کال کرنا اور میرا نام لے کر بتانا...... وہ مدد کو آئیں گے۔''
''ایک طریقہ ہے۔'' اس نے سوچ کر کہا۔ ''صبح کے قریب چاند ڈوب جائے گا۔ تب میں نکل سکوں گا۔ ذرا آگے برساتی نالا ہے اس تک پہنچ گیا تو کسی کی نظر میں آئے بغیر نکل جاؤں گا۔''
اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ رحمت اندر جا کر میرے لئے روٹی اور اچار لے آیا۔ بھوک شدت کی لگ رہی تھی۔ اس لئے موٹی روٹیاں اور اچار لذیذ ترین کھانوں سے بھی اچھا لگا تھا۔ کھا کر میں نے

شیریں پانی پیا۔ یہاں پانی کا ذائقہ بے حد منفرد اور اچھا تھا۔ پتا چلا کہ رحمت نیچے ایک چشمے سے پانی لاتا تھا۔ رات کو خنکی تھی اور اوپر سے اوس گر رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہم بھیگ گئے مگر اندر نہیں جا سکتے تھے۔ نہ جانے کب دشمن حملہ کر دے۔ زخمی کراہ کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ شاید خون بہہ جانے کی وجہ سے اس پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ فی الحال اس کا خون رک گیا تھا۔ دیوار کی آڑ میں بیٹھے بیٹھے میں اس وقت کے بارے میں سوچنے لگا۔ گزشتہ سات آٹھ گھنٹے بے حد ہنگامہ خیز گزرے تھے اور یہ سارا چکر ندیم کو کال کرنے سے پیدا ہوا تھا۔ میں ندیم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں تھا۔ وسیم کے بارے میں مجھے یقین تھا ہمیں تلاش کرنے کے لئے وہ پوری طرح سرگرم ہو گا۔

رحمت ایک بار جا کر باہر تک ان لوگوں کا معائنہ کر آیا تھا۔ اس نے خطرہ مول لیا تھا کیونکہ جھاڑیوں میں ذرا سی بھی سرسراہٹ ہوتی تو وہ لوگ فائرنگ کر سکتے تھے۔ مگر رحمت اچھی طرح جانتا تھا کہ جھاڑیوں میں بغیر آہٹ پیدا کئے کس طرح گزرنا ہے۔ اس نے واپس آ کر بتایا۔ ''وہ لوگ باہر ہیں، میں نے ان کی باتیں کرنے کی آواز سنی ہے۔''

''رحمت اب مت جانا۔ اگر انہوں نے فائرنگ کر دی تو بچنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔''

''جی ان سے بچنا ہے تو خطرہ مول لینا پڑے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے جا کر شازیہ اور بچوں کو دیکھا۔ بچے سو گئے تھے البتہ شازیہ اور بھاگ بھری جاگ رہے تھے اور آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ بچے کھا پی چکے تھے۔ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر میں واپس آ گیا۔ رحمت نے چائے کا پوچھا۔ ''نہیں اس کے لئے آگ جلانی پڑے گی اور اس وقت آگ جلانا دشمنوں کو......''

''اندر ایک چھوٹا مٹی کے تیل کا چولہا ہے۔''

''تب تو بسم اللہ۔'' میں نے خوش ہو کر کہا تو رحمت اندر چلا گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ دو پیالیوں میں بھاپ اڑاتی چائے لے آیا۔ اس کا ذائقہ اور شیرینی میری پسند سے مختلف تھی لیکن بہر حال یہ چائے تھی جس نے مزہ دیا تھا۔ ذہن اور جسم پر چھائی سُستی چھٹ گئی تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ صبح کے چار بجے چاند ڈوب گیا اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ رحمت نے جانے کا ارادہ کیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ایک بار سوچ لو...... یہ بہت خطرناک لوگ ہیں، اگر پکڑ لیا تو گولی مار دیں گے۔''

''مارنا تو ویسے بھی ہے۔ میں کوشش کیوں نہ کروں جناب...... میری بیوی اور بچی بچ جائیں۔''

رحمت نے سیاہ رنگ کا ایک شلوار سوٹ پہنا تھا۔ میں نے اسے پستول دیا۔ موبائل کا استعمال ایک بار پھر سکھایا۔ اس نے موبائل اور پستول اپنے لباس میں رکھا۔ میرے گلے لگا۔ ''صاحب دعا کرنا۔''

''ان شاء اللہ رحمت...... وہ اپنی رحمت کرے گا۔''

رحمت خاموشی سے جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ میری دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں نے اسے موت کے منہ میں بھیج دیا ہے۔ یہ بات یقینی کہ اب تک ان لوگوں کے مزید آدمی یہاں آ چکے ہوں گے اور اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر رہے تھے۔ ایسے میں رحمت کا ان کے بیچ سے بچ کر نکل جانا ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ شور یا فائرنگ کی آواز کا منتظر رہا۔ کئی بار میرے ذہن میں آیا کہ کیا

جا کر صورتِ حال کا جائزہ لینے کی کوشش کروں۔ مگر میری ہمت نہ ہوئی۔ رحمت کو گئے ہوئے پندرہ منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے اور اب مجھے کچھ کچھ اطمینان ہونے لگا تھا۔ عقب سے آہٹ ہوئی میں نے مڑ کر دیکھا۔ رحمت کی بیٹی بھاگ بھری تھی۔

''بابا کدھر گیا ہے؟''

''پولیس بلانے۔'' میں نے اس کی ذہنی سطح کے لحاظ سے جواب دیا۔ ''تم کیوں باہر آئی ہو؟''

''صاحب...... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ سمٹ کر میرے قریب آ گئی تھی۔ ''اگر یہ ادھر آ گئے تو......''

''کچھ نہیں ہوگا۔ جب تک میرے پاس یہ ہتھیار ہیں میں کسی کو نہیں آنے دوں گا اور ان شاء اللہ اس وقت تک مدد بھی آ جائے گی۔''

''رب کرے۔'' لڑکی نے کہا تھا۔ ''صاحب تیرے لئے چائے لاؤں۔''

''لا سکتی ہو تو لے آؤ۔'' میں نے کہا۔ درحقیقت میں اس وقت شدت سے چائے یا کافی کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ رات بھر جاگنے اور کھلے آسمان تلے رہنے سے میرا جسم اس وقت ٹوٹ رہا تھا اور سر میں درد ہونے لگا تھا۔ ''میری چائے میں دودھ یا چینی نہ ڈالنا۔''

''ایسی چائے کیسے پیئے گا؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ایسی ہی چائے کی ضرورت ہے جو نیند بھگائے۔''

''میں لاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور اندر چلی گئی۔

آسمان کچھ دیر کے لئے سفید ہوا تھا لیکن یہ صبح کا دھوکا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ دوبارہ تاریک ہو گیا۔ مگر اب صبح زیادہ دور نہیں تھی۔ لڑکی پیالے میں چائے بنا کر لے آئی اور پھر کچھ افراد شور کرنے لگے۔ ''پکڑو...... اسے جانے نہ دینا...... مار دو۔'' فائرنگ ایک بار پھر ہوئی تھی اور شور بھی۔ مدھم ہوتے ہوتے یہ بھی ختم ہو گیا تھا میں اور بھاگ بھری دم بخود بیٹھے تھے۔ رحمت کو گئے ہوئے پون گھنٹا ہونے کو آیا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فائرنگ اور شور کی وجہ وہی تھا۔ شاید اسے وہاں سے نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا کسی جگہ دبکا ہوا تھا۔ پھر کسی نے اسے دیکھ لیا۔ اتنی فائرنگ کے بعد اس کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ یہی بات بھاگ بھری سوچ رہی تھی۔ اس نے اچانک بلند آواز سے رونا شروع کر دیا میں نے بوکھلا کر اسے چپ کرانے کی کوشش کی۔

''بھاگ بھری مت رو...... عین ممکن ہے تیرا بابا بچ گیا ہو۔''

''نہیں اسے مار دیا ہے۔'' وہ چلائی۔ اوپر سے اس کی ماں نے اوپر سے چلانا شروع کر دیا اور اچھا خاصا ماتمی ماحول بن گیا۔ جھنجھلا کر میں گرجا۔ ''چپ کرو، وہ بچ گیا ہے لیکن تم لوگ شور مچا کر مارے جاؤ گے۔ ابھی وہ رونا سن کر حملہ کر دیں گے۔''

بھاگ بھری سہم کر خاموش ہو گئی۔ ''سچ کہہ رہے ہو؟'' اس نے آنسو صاف کئے۔

''ہاں اور جا کر اپنی ماں کو بھی چپ کراؤ۔'' میں نے اسے اندر بھیجا۔ مجھے خدشہ تھا کہ جلد یا بدیر حملہ ہوگا۔ رحمت مارا گیا تھا یا بھاگ نکلا تھا دونوں صورتوں میں انہیں پتا چل گیا تھا کہ اندر مدافعت کے لئے میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ بلکہ مجھے خدشہ ہوا کہ وہ عقب سے جھاڑیاں کاٹ کر اندر نہ آ جائیں۔ میں نے اٹھ کر ایک چکر لگایا۔ ہر

طرف خاموشی تھی یہ خاصی سخت قسم کی جھاڑیاں تھیں۔ اگر انہیں کاٹنے کی کوشش کی جاتی تو خاصا شور پیدا ہوتا۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے جھاڑیاں ہٹا کر اندر آنے کا نہیں سوچا تھا۔ اس کے بجائے وہ روشنی ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ دن میں اگر وہ ان جھاڑیوں میں آگ لگا دیتے تو وہ اتنی نمایاں نہیں ہوتی اور ان کا مقصد بھی پورا ہو جاتا۔

''شہباز ملک۔'' اچانک کسی نے للکارتی آواز میں کہا۔ ''بہتر ہے ہتھیار ڈال کر سامنے آ جاؤ ورنہ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ہم کسی پر رحم نہیں کریں گے۔''

میں نے جواب نہیں دیا۔ میں اب تک اس حکمتِ عملی پر کاربند تھا کہ دشمن کو کنفیوز رکھوں، اپنی موجودگی کی خود تصدیق نہ کروں۔ کئی بار مجھے باہر آنے کی ترغیب دی گئی۔ وہ ڈر کر اندر آنے سے گریز کر رہے تھے۔ ان کے کئی ساتھی میرے ہاتھوں مارے جا چکے تھے یا زخمی تھے۔ ایسے میں ان پر دہشت طاری ہونا لازمی تھی لیکن جلد ان پر عقب سے ڈنڈا پڑتا اور وہ جان پر کھیل کر اندر گھسنے کی کوشش کرتے۔ چھ بجے جب روشنی خاصی ہو چکی تو میں نے پہلی بار اس جگہ کو روشنی میں دیکھا۔ جھاڑیوں کے درمیان کوئی تیس گز لمبا اور بیس بائیس گز چوڑا میدان تھا جس پر چار دیواری اور کوٹھری تھی۔ عقب میں چھپر تلے دو بکریاں بندھی تھیں اور ایک طرف مرغی کا ڈربہ تھا۔ کوٹھری زیادہ بڑی نہیں تھی مشکل سے بیس بائیس فٹ کی تھی۔ شازیہ بچوں کو عقبی حصے میں حوائج ضروریہ سے فارغ کرا رہی تھی۔ بھاگ بھری اندر ناشتا بنا رہی تھی جو مکئی کی روٹی اور چائے پر مشتمل تھا بچے خوش تھے۔ ان کے لئے رات کی خوفناکی گزر چکی تھی۔ شازیہ بمشکل انہیں باز رکھ رہی تھی ورنہ وہ اس کھلی جگہ بھاگنا دوڑنا اور کھیلنا شروع کر دیتے۔ وہ ایک ایک کر کے انہیں باہر لے جا رہی تھی۔ جب وہ دوسری بچی کو لے کر آ رہی تھی تو اسی لمحے باہر سے ایک برسٹ فائر ہوا۔

''جلدی سے اندر چلو۔'' میں نے شازیہ سے کہا اور خود بھاگ کر دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ شازیہ بچی کو اٹھا کر اندر کی طرف لپکی تھی۔ پہلے برسٹ کے بعد چاروں طرف سے بے تحاشا فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں جھاڑیوں میں سے گزر کر کوٹھری کی دیواروں میں لگ رہی تھیں۔ بچے رونے اور چلانے لگے تھے۔ میں چیخ کر انہیں فرش پر لیٹنے کو کہنے لگا۔ گولیاں بلندی پر لگ رہی تھیں۔ وہ لوگ بلندی سے فائرنگ کر رہے تھے لیکن عقب سے جھونپڑی محفوظ تھی۔ خطرہ سامنے کی طرف کھلے دروازے سے تھا۔ اس طرح بے تحاشا فائرنگ کر کے وہ ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بائیں طرف سے جھاڑیاں صاف کر کے اندر آ سکتے تھے فائرنگ کے شور میں مجھے بالکل بھی پتا نہیں چلتا۔ یہ جگہ مخدوش بھی تھی کیونکہ مجھے صرف سامنے کی فائرنگ سے دیوار بچا رہی تھی۔ دائیں بائیں سے کی جانے والی فائرنگ میرے لئے خطرہ تھی اور جب ایک بار گولی میرے سر پر سے گزر کر صحن میں رکھے گھڑے پر لگی تو میں نے اندر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ زمین پر لیٹے لیٹے میں پیچھے ہٹا اور رینگتا ہوا کوٹھری کے اندر چلا گیا۔ زخمی باہر دیوار کے ساتھ بے سدھ پڑا تھا۔ شازیہ اور بچے ایک طرف دبکے ہوئے تھے اور بھاگ بھری اپنی بیمار ماں کے ساتھ دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ عورت نے مجھے دیکھا تو اس پر دورہ سا پڑ گیا۔ اس کے بیشتر الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن جو آ رہے تھے ان سے ظاہر تھا کہ وہ مجھے گالیاں دے رہی ہے۔ اپنے خاوند کی موت اور اس مصیبت کا ذمے دار مجھے قرار دے رہی ہے۔ بھاگ بھری اسے چپ کرانے کی کوششیں کر رہی تھی۔

اماں چپ کر جا...... اسے کچھ نہ بول......''

"کیوں نہ بولوں...... یار ہے تیرا وہ جو منع کر رہی ہے۔"

ماں کی بات پر بھاگ بھری کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں لاحول پڑھا۔ شاید صدمے سے عورت کا دماغ الٹ گیا تھا۔ بہر حال میں نے اپنی توجہ باہر کی طرف کر لی۔ فائرنگ ذرا کم ہوئی تھی یعنی وہ پورے برسٹ مارنے کے بجائے سنگل فائر کر رہے تھے۔ زیادہ زور سامنے کی طرف تھا۔ اس طرف سے جھاڑیاں کٹ کٹ کر گر رہی تھیں۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ کوئی جھاڑیوں سے نمودار ہوا۔ اچانک میری نظر زخمی پر پڑی۔ وہ گھسٹ گھسٹ کر باہر جا رہا تھا۔ میں نے رائفل اس کی طرف سیدھی کی لیکن پھر اس پر بے سود گولی ضائع کرنے کے بجائے رک گیا۔ اگر وہ اپنی جان بچا سکتا ہے تو بے شک بچائے۔ کچھ دیر میں وہ جھاڑیوں تک پہنچ گیا تھا اور چلا چلا کر اپنے ساتھیوں کو آواز دے رہا تھا لیکن فائرنگ میں اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی صدا ثابت ہوئی تھی۔ اس نے سرزمین سے بلند کیا اور یہی حرکت اس کی زندگی ختم کرنے کا باعث بن گئی۔ سامنے سے آنے والی ایک گولی اس کے ماتھے کو پھاڑتی سر کے عقبی حصے سے نکل گئی تھی اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ وہ جب تک دیوار کی آڑ میں تھا، محفوظ تھا لیکن اس کا وقت آ گیا تھا، اس لئے وہ اپنی موت کے لئے طے شدہ جگہ تک چلا گیا۔

سورج نکل آیا تھا اور اردگرد کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ جس طرح سکون سے محاصرہ کئے بیٹھے تھے اس سے ظاہر تھا کہ انہیں کسی کا خوف نہیں تھا اور وہ پوری بے فکری سے میرا محاصرہ کر سکتے تھے۔ بے دھڑک کارروائی نہ کرنے کی ایک وجہ شاید تصویر بھی تھی۔ انہیں خوف ہوگا کہ بے دھڑک حملے میں تصویر تباہ ہو جائے گی اس لئے وہ مجھے مجبور کر کے سامنے لانے کی فکر میں تھے۔ انہیں یہ اطمینان تھا کہ میں کسی صورت ان کے محاصرے سے نہیں نکل سکتا تھا ممکن ہے کچھ آدمی عقب کی طرف سے راستہ بنا کر جھونپڑے کے عقب میں پہنچ چکے ہوں۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں ایک بے سود جنگ لڑ رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ کسی طرح رحمت ان لوگوں سے بچ کر مری ہائی وے تک جا پہنچے اور وسیم کو کال کر دے۔ اب اس کا بھی نہیں پتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔

فائرنگ رک رک کر ہو رہی تھی۔ اچانک جھاڑیوں سے ایک شخص نمودار ہوا اور قلابازی کھا کر مٹی کی دیوار کے عقب میں چلا گیا تھا۔ البتہ اس کے پیچھے آنے والے دوسرے شخص کو میں نے موقع نہیں دیا۔ جھاڑیوں سے نکلتے ہی وہ اپنا پیٹ پکڑ کر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے پیچھے آنے والا جھاڑیوں میں گر گیا تھا اور شاید واپس چلا گیا تھا۔ دیوار کے پیچھے پہنچ جانے والے نے اچانک رائفل بلند کر کے کوٹھری کی طرف دس بارہ برسٹ فائر کئے۔ اس کی بیشتر گولیاں دیواروں پر لگیں اور جو ایک دو اندر آ گئیں وہ بھی چھت کی طرف گئی تھیں۔ شازیہ اور بھاگ بھری چلائے تھے۔ میں نے اشارے سے انہیں دروازے کی سائیڈ والی دیوار کی طرف آنے کو کہا۔ پیچھے وہ فائرنگ کی زد میں آ سکتے تھے۔ میں دائیں طرف دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے رائفل شانے پر لٹکا کر پستول نکالا اور اس کی طرف سے دوبارہ فائرنگ کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی وہ دیوار کی آڑ سے نکلا میں نے فائر کئے اور وہ چیخ مار کر آڑ میں ہو گیا۔ اس کا ہاتھ یقینی طور پر زخمی ہوا تھا۔ مجھے منڈیر پر گرنے والے خون کے قطرے نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ چیخ چیخ کر گالیاں دینے لگا۔ "شہباز...... تجھے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اگر کتے کی موت نہیں مرنا چاہتا تو سامنے آ جا۔"

''مجھے تم لوگوں کی موت مرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' میں نے پہلی بار کسی کی بات کا جواب دیا۔''ہاں اگر کسی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو ضرور مارا جائے گا۔''
اس دوران میں مجھے دائیں بائیں سے منڈیر کے پیچھے حرکت کا احساس ہوا۔ کچھ افراد اندر آ چکے تھے اور اب دیوار کے پیچھے مورچے بنا لئے تھے۔ یہ صورتِ حال بے حد خطرناک تھی۔ میں اکیلے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا خاص طور سے جب مجھ پر سات جانوں کے تحفظ کی ذمے داری تھی۔ شاید جلد میرے ہتھیار ڈالنے کا وقت آ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سامنے والی منڈیر سے کوئی نصف درجن آتشیں ہتھیار جھانکنے لگے تھے۔ پھر ایک جانی پہچانی آواز آئی۔
''شہباز...... باہر آ جاؤ...... ورنہ ہم اندر آئے تو کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔''
''فتح خان...... اس روز تم بچ گئے تھے۔ آج کیوں مرنے کے لئے چلے آئے کیا اس جگہ سے جانے والی لاشوں کی گنتی نہیں کی۔''
''بڑا بول مت بولو...... تم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے۔''
''تمہیں کیا معلوم کہ میں اکیلا ہوں یا میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے اور میرے پیچھے کتنے آنے والے ہیں؟''
''بکومت......'' اچانک فتح خان غرایا اس نے اپنی رائفل کا برسٹ مارا۔''وہ تصویر ہمیں دے دو میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔''
''تم اور تمہارے وعدے۔'' میں ہنسا۔''تصویر اندر آ کر لے سکتے ہو تو لے لو۔''
''سنو ہمارے پاس دستی بم بھی ہیں ایک اس کوٹھری کے لیے کافی ہوگا۔''
''ضرور...... اور ساتھ میں یہ تصویر بھی تباہ کر دو گے، پھر اپنے آقا کو لے جا کر کیا منہ دکھاؤ گے؟''
اس پر فتح خان کو سانپ سونگھ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اچانک کوٹھری کی طرف فائر کھول دیا۔ پھر سات خودکار رائفلیں گولیاں برسانے لگی تھیں۔ گولیاں کھلے دروازے سے گزر کر پیچھے لگ رہی تھیں مگر فی الحال...... ہم محفوظ تھے۔ کچی مٹی سے بنی کوئی دو فٹ موٹی دیوار ہمیں تحفظ دے رہی تھی۔ شازیہ، بھاگ بھری اور اس کی ماں دیوار کی جڑ سے لپٹے ہوئے تھے۔ فائرنگ کے شور سے ڈر کر شازیہ کا شیر خوار بچہ اور لڑکیاں رونے لگی تھیں۔ بھاگ بھری کی ماں کے منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ دروازے سے رگڑ کھا کر گزرتی گولیاں لکڑی کے ٹکڑے اڑا رہی تھیں۔ ایک چوکھٹ اس گولی کی تاب نہ لاتے ہوئے دیوار سے نکل گئی اور پٹ سمیت فرش پر گری۔ پیچھے رکھا بیشتر سامان تباہ ہو چکا تھا۔
''بھیا...... خدا کے لئے وہ تصویر ان کے حوالے کر دو۔'' شازیہ روہانسے لہجے میں چلائی۔''ورنہ یہ میرے بچوں کو مار دیں گے۔''
''بھابی...... خدا سے دعا کریں۔ تصویر ان کو دے بھی دی تب بھی یہ ہمیں نہیں بخشیں گے۔''
''میرے بچے۔'' وہ بچوں کو خود سے لپٹا کر رونے لگی تھی۔
میں نے فائرنگ کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس کا فائدہ بھی نہیں تھا وہ سب محفوظ آڑ میں تھے اور میں بھی اس

سامنے آتا تو کوئی نہ کوئی گولی مجھے چاٹ جاتی۔ بازی ہار کے نزدیک تھی۔ اگر یہ چھ افراد اندر گھسنے کی کوشش کرتے تو میں زیادہ سے زیادہ دو تین کو روک سکتا تھا اس کے بعد وہ مجھے مار ڈالتے۔ بچت کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے بے بسی سے سوچا اور قمیص کے اندر سے تصویر کا رول نکالا۔ کیا اسے دینے سے یہ وعدے کے مطابق ہمیں بخش سکتے تھے؟ نہیں یہ بے اعتبار لوگ تھے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔ میں نے کوٹھری میں دیکھا۔ لالٹین ایک طرف دیوار سے لٹکی تھی کسی گولی نے اس کا شیشہ توڑ دیا تھا لیکن نچلا حصہ جس میں تیل جمع ہوتا ہے سلامت تھا۔ اس طرف دیوار کے نیچے بھاگ بھری کی ماں کا بستر تھا۔ میں نے بھاگ بھری سے پوچھا۔ ''ماچس کہاں ہے؟''

اس نے دیوار پر لٹکے ریک کی طرف اشارہ کیا۔ خاص بات یہ تھی کہ وہاں ایک عدد موم بتی بھی رکھی تھی اور اس طرف جانے کے لئے مجھے دروازے کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ فائرنگ رک گئی تھی کبھی کبھی کوئی گولی داغ دیتا تھا۔ میں نے اچانک قلابازی کھائی اور دروازے کے سامنے سے ہوتا دوسری طرف چلا گیا تھا۔ میرے گزرتے ہی ایک بار پھر بے تحاشا فائرنگ شروع ہو گئی تھی لیکن میں اس پر کوئی توجہ دیئے بغیر اپنے کام میں لگ گیا۔ میں نے سب سے پہلے بستر سے گودڑی نما چادر سے کپڑا اپھاڑا اور اسے تصویر پر لپیٹ دیا۔ اس کے بعد ٹوٹی لالٹین سے مٹی کا تیل اس پر انڈیلا۔ مقدار کم رکھی تھی۔ آخر میں موم بتی دیوار کے پاس رکھ کر جلائی تاکہ دروازے سے آتی ہوا اسے متاثر نہ کرے۔ میں جوا کھیلنے جا رہا تھا۔ ممکن ہے میں کامیاب ہو جاتا اور یہ بھی امکان تھا کہ ہار میرا مقدر بنتی۔

میں نے دروازے کی آڑ سے چلا کر کہا۔ ''فتح خان...... کیا تم موجود ہو؟''

''ہاں ہم ہے۔'' اس نے غرور سے کہا۔

''فتح خان تم لوگ تصویر کی وجہ سے میرے پیچھے لگے ہو اگر میں اسے جلا ڈالوں تو......''

''نہیں۔'' فتح خان بے ساختہ چلایا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''کیوں نہیں کر سکتا؟'' میں ہنسا۔ ''میں نے تو انتظام کر لیا ہے۔ یہ دیکھو'' میں نے کپڑا چڑھا رول دروازے سے نکالا۔ ''فتح خان تصویر پر مٹی کے تیل میں لتھڑا ہوا کپڑا ہے۔ میرے پاس موم بتی روشن ہے بس اسے موم بتی کے پاس لے جانے کی دیر ہے۔ چند سیکنڈ بعد اس تصویر کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔ جس کے پیچھے اتنے ہنگامے ہو رہے ہیں۔ کتنے ہی لوگ مارے جا چکے ہیں!''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔ فتح خان اپنے آدمی پیچھے لے جاؤ۔ یہاں صرف تم رہو گے۔ میرے دس تک گنتی گننے تک تمہارے آدمی نہیں گئے تو میں اس تصویر کو آگ لگا دوں گا اس کے بعد مجھے پروا نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔''

''کیا تمہیں عورتوں اور بچوں کی پروا نہیں ہے۔'' فتح خان زہریلے لہجے میں بولا۔

''ان کا اور میرا جینا مرنا ایک ہے۔''

''میرے ساتھی جا رہے ہیں۔'' فتح خان بولا۔ سچ مچ ایک ایک کر کے اس کے ساتھی جھاڑی والے راستے سے جانے لگے جب ایک گزر جاتا تو دوسرا جاتا تاکہ میں فائر بھی کروں تو ایک ہی مرے۔

''اب میرے ساتھی جا چکے ہیں۔''

''فتح خان تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے اس کوٹھری کے گرد تمہارے کئی ساتھی موجود ہیں انہیں بھی ہٹاؤ۔''

''اب کوئی نہیں ہے۔ اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو خود آ کر دیکھ لو۔''

''میں نہیں...... رحمت کی لڑکی آ کر دیکھے گی اور جھاڑیوں کے اندر تمہارا ایک آدمی بھی نظر آیا تو تمہیں پتا ہے میں کیا کروں گا!''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ہار مان لی اور وہاں موجود باقی افراد کو بھی جانے کا حکم دیا۔

مجھے کامیابی کی توقع تو تھی لیکن اتنی نہیں...... تصویر کو جلانے کی دھمکی نے ان کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ کوٹھری کے عقبی حصے سے بھی چار افراد نکل کر چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے بھاگ بھری سے کہا کہ وہ جا کر دیکھے کوئی اور تو نہیں ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے باہر نکل کر معائنہ کیا اور سب صاف کی رپورٹ دی۔

''فتح خان تم جانتے ہو...... یہ تصویر تمہارے آقا کے لئے کتنی ضروری ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے کہا۔ ''اب تم کیا چاہتے ہو شہباز؟''

''میں براہِ راست ڈیوڈ شا سے بات کرنا چاہتا ہوں اسے یہاں بلا کر۔''

فتح خان دنگ رہ گیا تھا۔ ''تم ڈیوڈ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''یہی کہ وہ برٹ شا کا کزن ہے وہی برٹ شا جسے تم نے قتل کر دیا تھا اور ڈیوڈ شا نے اس کی دولت اور جائیداد پر قبضہ کر لیا۔''

''یہ جھوٹ ہے برٹ کو میں نے قتل نہیں کیا۔''

''اگر تم نے قتل نہیں کیا تب بھی وہ تمہاری قید میں ضرور ہے۔'' میں نے کہا تو فتح خان کو سانپ سونگھ گیا یعنی میں نے درست اندازہ لگایا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے سرد لہجے میں کہا۔

کاش کہ میں نے تمہیں پہلا موقع ملتے ہی قتل کر دیا ہوتا۔''

''اب یہ کام کر گزرنا'' میں نے مشورہ دیا۔ ''لیکن جب تک تصویر میرے قبضے میں ہے ایسی حماقت مت کرنا ورنہ مرشد علی اور ڈیوڈ شا تمہارا قیمہ کر کے بھی مطمئن نہیں ہوں گے۔''

''ان کی فکر مت کرو، فتح خان سب سے نمٹ سکتا ہے۔''

''فی الحال تم ڈیوڈ شا کو بلاؤ۔ اس کام کے لئے تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹا ہے۔''

''اتنی جلدی یہ ممکن نہیں ہے۔ ڈیوڈ شا اسلام آباد میریٹ ہوٹل میں ہے اسے وہاں سے یہاں آنے میں کچھ وقت لگے گا۔''

''کتنا وقت؟ جب اسے تصویر کا پتا چلے گا تو وہ جیٹ طیارے کی رفتار سے آئے گا۔ فتح خان باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ اس وقت آٹھ بج کر بارہ منٹ ہوئے ہیں۔'' میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''اگر وہ نو بجے تک یہاں نہیں پہنچا تو تصویر جل کر راکھ ہو جائے گی۔''

فتح خان تیزی سے رینگتا ہوا جھاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ اس کا خیال تھا جیسے وہ میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا، اس طرح میں بھی موقع ملتے ہی اسے گولی مار دیتا۔ وہ بچ کر گیا تھا میں نے بھاگ بھری سے کہا۔ ''تم تھوڑی

دیر بعد احاطے کا چکر لگاؤ اور دیکھتی رہو کوئی چھپ کر اندر تو نہیں آ رہا۔"
وہ سر ہلا کر باہر چلی گئی اور چند منٹ بعد واپس آ گئی۔ احاطے میں کوئی نہیں تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد فتح خان واپس آیا۔" شہباز ہم نے لاشیں اٹھائی ہیں۔"
"شوق سے لے جاؤ لیکن کوئی ایسی حرکت مت کرنا کہ مزید لاشیں گریں اور ڈیوڈ شا کی کیا اطلاع ہے؟"
"اسے بتا دیا ہے اور وہ وہاں سے چل پڑا ہے۔ آنے میں کچھ وقت لگے گا۔"
"نو بجے کا وقت یاد رکھنا۔"
"مجھے بار بار مت دھمکاؤ۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔" اس معاملے سے میرا تعلق نہیں ہے۔"
میں نے قہقہہ لگایا۔" فتح خان مجھے بے وقوف مت بناؤ اس معاملے میں تمہارا بھی مفاد ہے۔"
"میرا کیا مفاد ہو سکتا ہے؟"
"یہ تو میں نہیں جانتا کہ اس تصویر سے کیا چکر وابستہ ہے لیکن تم تصویر کے معاملے میں جس طرح بے تاب ہو اس سے ایسا ہی لگتا ہے۔"
فتح خان واپس چلا گیا تھا، اس کے آدمی لاشیں اٹھا کر جانے لگے تھے۔ میں نے موم بتی بجھا دی کیونکہ وہ زیادہ بڑی نہیں تھی اگر مسلسل جلتی رہتی تو جلد ختم ہو جاتی۔ میں اسے بعد میں جلا سکتا تھا۔ بھاگ بھری دس دس منٹ کے بعد باہر کا چکر لگا رہی تھی۔ اس لڑکی کے حوصلے نے مجھے متاثر کیا تھا۔ ممکن ہے اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو باہر جانے سے انکار کر دیتی۔ مگر وہ میرے دوبارہ کہے بغیر باہر کے چکر لگا رہی تھی۔ میں بھی پوری طرح چوکنا تھا۔ ان لوگوں پر بھروسا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر یہ میرے ساتھ دھوکا کرتے یا حملہ کرتے تو میں تصویر کچ جلا دیتا؟ یہ کہنا مشکل تھا! یہ بات تھی میں نے محض دھمکی دی تھی ابھی تک میرے ذہن میں ایسا خیال نہیں آیا تھا کہ میں تصویر کو کچ آگ لگا دوں۔ مجھے معلوم تھا یہ تصویر جتنی ڈیوڈ شا کے لئے ضروری تھی اس سے زیادہ اہم راجا عمرو دراز کے لئے تھی۔ تصویر سے اس کی وابستگی کسی فائدے کے لئے نہیں بلکہ جذباتی تھی۔ ورنہ اس سے فائدہ اٹھانا اس کے لئے مشکل نہیں تھا۔ تصویر نصف صدی سے زیادہ عرصے سے اس کے پاس تھی، میں اسے ہر ممکن حد تک محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

☆=====☆=====☆

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

کاشف زبیر کے قلم سے ایک تیز رفتار ایکشن سے بھرپور ناول



ایک الگ رنگ لیے بہترین تکنیک اور تیز آہنگ سلسلہ

- کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا کون سا واقعہ مستقبل میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔
- انسانی عقل و فہم محدود ہے۔ وہ صرف محدود دائرے میں مخصوص زاویہ نظر رکھتی ہے۔
- خیر و شر کی اس ازلی جنگ کا قصہ اس کے بغیر فلسفۂ حیات کے اسرار و رموز سے آگاہی ممکن نہیں۔
- اس نوجوان کی کہانی جس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو قتل و غارت گری، تباہی و بربادی اس کی منتظر تھی۔
- اس کی زندگی کے لیے بھی کوئی جائے پناہ نہ تھی لیکن قدرت کو شاید اس سے کوئی اہم کام لینا مقصود تھا۔
- چنانچہ وہ زندہ رہا اور اپنے دشمنوں کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوا۔



علی میاں پبلیکیشنز
۲۰- عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 37247414
E-mail:alimian_publications@yahoo.com